از نگارش
اہلِ قلم کی ایک جماعت
زیرِ نظر
اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی
تفسیر نمونہ
ترجمہ
حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی
مصباح القرآن ٹرسٹ
Presented by Ziaraat.Com

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں.
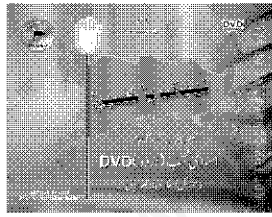
منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

اثرِ نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

اُستادِ محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

جلد ۱۵

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

مصباح القرآن ٹرسٹ

نام کتاب	:	تفسیر نمونہ (۱۵)
زیر نظر	:	آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی
مترجم	:	حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفیؒ
ناشر	:	مصباح القرآن ٹرسٹ (لاہور)
مطبع	:	شوکت پرنٹرز لاہور
اشاعت	:	اپریل 2012ء
تعداد	:	پانچ سو
قیمت	:	

اس کتاب کی اشاعت میں شیخ مہدی رضا صاحب نے تعاون فرمایا ہے خدا تعالیٰ ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔ اور ان کے خاندان کے مرحومین کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

ادارہ

ملنے کا پتہ

قرآن سنٹر

۲۴۔ الفضل مارکیٹ اُردو بازار، لاہور۔

042-37314311, 0321-4481214

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین محترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ ـــ کلامِ حکیم اور عہدِ حاضر کی بعض عظیم تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغاز کار میں موجودہ دور کی شہرۂ آفاق تفسیر ـــ تفسیر نمونہ ـــ کو فارسی سے اُردو زبان میں ترجمہ کروا کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر محسنِ ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی قبلہ اعلی اللہ مقامہ، کی غیر معمولی مساعی، مالی معاونین کی فراخدلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر محیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ستائیس جلدوں میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ شکراً للہ۔

اس ادارے نے نہ صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کُتب کے علاوہ سید العلماء السید علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہ، کی سات جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔ اُردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیرِ قرآن کے جدید اسلوب سے روشناس کراتے ہوئے تفسیر موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی "پیامِ قرآن" از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور "قرآن کا دائمی منشور" از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل یک جلدی قرآنِ پاک عہدِ حاضر کے مقبول اُردو تراجم کے ساتھ زیرِ طباعت ہیں۔ اس سلسلے میں روشن فکر اور جید عالمِ دین حضرت علامہ ذیشان حیدر جوادی مدظلہ کا ترجمہ "انوار القرآن" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری اُمتِ مسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، لہٰذا سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی

طلب میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہلِ علم کی تجویز پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ ستائیس جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں پیدا کی جا سکیں۔

تفسیر نمونہ کی اس ترتیبِ نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ جلدیں مکمل ہو جائیں لیکن اس میں یہ سقم رہ جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سورتوں کا کچھ حصہ ایک جلد میں اور بقایا حصہ اس سے اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت سے بچانے کی خاطر اس تفسیر کو سورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سورت دو حصوں میں تقسیم نہیں ہونے پائی اور ہر جلد کسی نہ کسی سورت کی کامل تفسیر پر ختم ہو گئی۔ اس طرح پوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں آگئی ہے۔

اس جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۱۵ آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں سابقہ جلد ۲۶ سورۂ تکویر تا سورۂ الفجر اور جلد ۲۷ مکمل سورۂ البلد تا سورۂ والنّاس شامل ہیں، چنانچہ یہ جلد سورۂ تکویر تا سورۂ والنّاس کی تفسیر پر مشتمل ہے۔

ہم نے زیرِ نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی آراء ہمارے لیے بہترین رہنما ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے کے سلسلے میں اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں ہم لاہور کے ایک مخلص و مخیّر مردِ مومن الحاج شیخ ظہور علی منگلا سے اظہارِ تشکر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جن کے تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعا گو ہیں کہ خدا تعالیٰ بحق معصومینؑ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسّلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اِھداء

"مرکز مطالعاتِ اسلامی و نجاتِ نسلِ جوان"

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش

تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے

اس نفیس تالیف کو

ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا

چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم

یہ تفسیر

حسب ذیل علماء و مجتہدین کی باہمی کاوش قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبداللہی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

تفسیر مجمع البیان	تالیف	مشہور مفسر طبرسی
تفسیر تبیان	تالیف	عظیم و فقیہ عالم شیخ طوسی
تفسیر المیزان	تالیف	علامہ طباطبائی
تفسیر صافی	تالیف	ملا محسن فیض کاشانی
تفسیر نور الثقلین	تالیف	عبد علی بن جمعہ حویزی
تفسیر برہان	تالیف	سید ہاشم بحرانی
تفسیر روح المعانی	تالیف	علامہ شہاب الدین محمود آلوسی
تفسیر المنار	تالیف	محمد رشید رضا (تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبدہ)
تفسیر فی ظلال القرآن	تالیف	سید قطب
تفسیر قرطبی	تالیف	محمد بن احمد انصاری قرطبی
اسباب النزول	تالیف	ابو الحسن علی بن متویہ واحدی نیشاپوری
تفسیر مراغی	تالیف	احمد مصطفٰے مراغی
تفسیر مفاتیح الغیب	تالیف	فخر الدین رازی
تفسیر روح الجنان	تالیف	ابو الفتوح رازی

گذارش

تفسیر نمونہ (فارسی) ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اُردو ترجمے کے متعدد ایڈیشن بھی ستائیس جلدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ محسنِ ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلیٰ اللہ مقامہٗ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوندِ کریم مولانا مرحوم کو جوارِ معصومینؑ میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

اس تفسیر میں مدِنظر اہداف

پوری دُنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کو نئے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان یہی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک "ایران کا اسلامی انقلاب" اور "دُنیا کے مختلف خطّوں میں اسلامی تحریکیں" ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

بالفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمۂ علم سے محروم نہیں لوٹتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکارِ علماً میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققینِ اسلام کی محنتوں اور حاصل فکر سے استفادہ کرکے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گرہیں کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسّر...؟ وہ تفسیر، کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسّر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسّر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوتے یا جان بوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسّرین اور عالی قدر محققینِ اسلام نے آغازِ اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور زحمتیں اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پرتو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (شکر اللہ سعیہم)۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و مخالفین کے وسوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریات زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دور کی تفاسیر کو دینا ہوگا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے ناقابل ادراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کرسکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیش نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کرسکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہٰذا میں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے ہمقدم اور ساتھی تھے اور ہیں تاکہ مشترکہ ساعی سے یہ مشکل حل ہوسکے۔ الحمد للہ! اس کام کے لیے توفیق شامل حال ہوئی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی بارہ جلدیں جو اس وقت تک منظر عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی تیرہویں جلد ہے) بارہا چھپیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیق الٰہی کا میں از حد شکر گزار ہوں۔

یہاں یہ بات میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱۔ بارہا یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہوگی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہوگی[1]

۲۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرض خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو، یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلا وطنی[2] کے مقام پر، حتیٰ کہ بستر بیماری پر بھی میں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا اس طرح سے کام کرنا چاہیئے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

---

[1] بعد ازاں تعداد ۲۷ تک جا پہنچی۔ (مترجم)

[2] سابق شاہ ایران معدوم کے دور میں مؤلف کو جلا وطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

شروع میں اسلام کا علمی حملہ اہم ترین مسئلہ یعنی مسئلہ توحید و شرک سے متعلق تھا۔ اس سلسلہ میں جو آیتیں نازل ہوئیں وہ اسی موضوع کے گرد گھومتیں۔ چونکہ شدائد و مشکلات کے مقابلہ میں قدم جمانے کی صلاحیت رکھنا اور باطنی طور پر ذمہ داری کو محسوس کرنا ہر دینی انقلاب کی بنیادی صفت ہوتا ہے اس لیے آخرت کی تعلیم اور روزِ قیامت کی عظیم عدالت پر ایمان لائے بغیر اس مقصد میں کامیاب ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ مذکورہ موضوع پر شرک و بت پرستی کی نفی کے ساتھ ساتھ آیات نازل ہوتی تھیں۔ جب حکومتِ اسلامی کے قیام کی راہ پیغمبر اسلامؐ نے ہموار کر دی تو اس کے بعد اسلام کے اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی قوانین یکے بعد دیگرے نازل ہوئے۔ اسلام کی تکوین اور اس کی نشوونما کے زمانے میں متعدد جنگیں پیغمبر اسلامؐ اور مسلمانوں پر مسلّط کی گئیں اور اس صورتِ حال کے ہر مرحلہ میں ضروری اور مناسب قوانین، دستور اور نتائج بصورتِ آیات نازل ہوتے اور اسلامی انقلاب اپنے معیّن نظام کے مطابق آگے بڑھتا رہا۔ اس وجہ سے یہ امر بالکل فطری ہے کہ ایک سورہ کی آیتیں ایک معین موضوع کے بارے میں گفتگو نہیں کرتیں بلکہ اس عظیم آسمانی کتاب میں ایک موضوع سے تعلق رکھنے والے مسائل مختلف مقامات پر مندرج ہیں اور یوں وہ منتشر صورت میں ہیں۔ ایک مثال کو پیش کر کے اس بات کی وضاحت کی جا سکتی ہے اور تفسیرِ موضوعی کی اہمیت کو متعین کیا جا سکتا ہے۔ ہم اگر چاہیں کہ جہاد جو ایک اہم اسلامی موضوع ہے، کے بارے میں معلومات حاصل کریں اور جہاد کے شرائط، اُس کے آداب و مقاصد، صلح کے اصول، قیدیوں کے احکام، تاوانِ جنگ، مالِ غنیمت کی کیفیت، جہاد بالنفس اور باطن کی قبیح صفات کا مطالعہ کریں، تو ہم کو مجموعی طور پر کبھی بھی ان موضوعات سے تعلق رکھنے والی آیتیں قرآن کی کسی ایک سورۃ میں نہیں ملیں گی۔ یہ آیتیں سارے قرآن میں بکھری ہوئی ہیں لہٰذا جہاد کے موضوع کے بارے میں اس کی مختلف جہتوں اور اس کے متعدد پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھ کر بحث کے لیے ضروری ہے کہ سارے قرآن کا مطالعہ کیا جائے اور جس آیت کا کسی بھی پہلو سے جہاد کے موضوع سے تعلق ہو اس کو ایسی ہی دوسری متعلقہ آیتوں کے ساتھ ملا کر ایک مجموعہ تیار کیا جائے اور پھر اس کے دقیق مطالعہ سے ہم مسئلۂ جہاد کے خطوطِ کلّی کو واضح کریں۔ یہی صورتِ حال عدالتِ اجتماعی، اقتصادِ اسلامی اور اعتقادی مسائل (توحید و معاد وغیرہ) کی بھی ہے۔ اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھ کر ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ عام تفسیر (تفسیرِ ترتیبی) اس پوری اہمیت کے باوجود جو اسے حاصل ہے، ہمیں تفسیرِ موضوعی سے بے نیاز نہیں ہونے دیتی۔ خصوصاً وہ محققین جو چاہتے ہیں کہ مختلف مسائل کو ایک ایسی نظر سے دیکھیں جو ہر رُخ کو دیکھنا چاہتی ہے اور وہ ہر مسئلہ کے بارے میں مختلف جہتوں کے حوالہ سے قرآنی نظریات کے متلاشی ہوں، اُن کو اس کی شدید ضرورت ہے۔ اس احتیاج کے احساس نے ہمیں اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ ہم اُن گزشتہ پندرہ سالہ تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، جو ہم نے تفسیرِ نمونہ کی ۲۷ جلدیں تحریر کرنے سے حاصل کیے ہیں، خدائے عظیم و برتر کی مدد سے ایک نئے مرحلے میں داخل ہوں اور پروردگار کے لطف و کرم کے نتیجے میں ممکن ہے کہ ہم عالمِ اسلام کے لیے کوئی نیا ہدیہ فراہم کر سکیں۔ خدا کی بے پایاں رحمت سے یہ چیز کچھ بعید نہیں ہے۔ واضح ہے کہ گزشتہ دَور میں حاصل ہونے والے تجربات جو مسلسل کام کے نتیجے کے سوا کبھی حاصل نہیں ہوتے، اس حقیر کے لیے بھی اور ان دوستوں کے لیے بھی جو میرے شریک کار رہے ہیں، ایک عظیم اور بیش قیمت سرمایہ ثابت ہوں گے۔ مقام

افسوس ہوگا اگر ان تجربات سے ایک اور اہم کام کی راہ میں استفادہ نہ کیا جائے۔ اس اہم کام سے میری مراد تفسیر موضوعی کی ترتیب ہے۔ آخر میں اس نکتہ کا ذکر بھی ضروری ہے کہ وہ روش جو ہم نے تفسیر موضوعی کے لیے استعمال کی ہے وہ ایک نئی روش ہے اور یہ ہمیں انشاء اللہ اپنے مقصد کے حصول میں نہایت تیزی اور آسانی سے کامیابی سے ہمکنار کرے گی۔
ہم نے تفسیر موضوعی کے لیے پیام قرآن کا نام پسند کیا ہے۔ مذکورہ مقصد کی تشریح کا تفسیر موضوعی کی پہلی جلد کے مقدمہ میں آپ انشاء اللہ مطالعہ کر سکیں گے۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ تمام مشکلات اور پیچیدگیوں کے باوجود وہ تاثر جو پیام قرآن میں ہے اس طرح فراہم ہو کہ عامۃ الناس، خواص اور محققین بھی اس سے استفادہ کر سکیں اور بحیثیت مجموعی قرآن کے چشمۂ زلال کے تمام پیاسے اس سے فائدہ اٹھائیں۔

صاحب نظر افراد کے مشورے اور دوستوں کی دعائے خیر انشاء اللہ ضرور مددگار ثابت ہوگی۔ ربنا علیك توکلنا والیک انبنا والیک المصیر۔

قم حوزہ علمیہ ناصر مکارم شیرازی

اس میں ہم آہنگی نہیں ہوگی ۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا ۔ لیکن پھر اس صورت حال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں ۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں ۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث ، گوناگوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو ۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں ۔
(یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے) ۔

خداوندا !

ہماری آنکھوں کو بینا ، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب ، کارساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کر سکیں ۔

خداوندا !

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنانِ اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے ، اس امتِ اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجہ میں اسے خاموش کر دے تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگا لیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں ۔

بار الٰہا !

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کر سکیں ۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یکجا مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کر سکیں ۔

إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (تو ہر چیز پر قادر ہے) ۔

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علمیہ قم ۔ ایران

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

قرآن کا پیغام

تفسیر نمونۂ موضوعی

(فاذا فرغت فانصب و الیٰ ربک فارغب) "جب اہم کام سے تُو فارغ ہو جائے تو دوسرا اہم کام شروع کر دے اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جا" (الم نشرح / ۷، ۸)

تفسیر موضوعی کیا ہے اور وہ کون سی مشکل کو حل کرتی ہے ؟

اس وقت یہ سوال بہت سے لوگوں کی زبان پر ہے کہ تفسیر موضوعی سے کیا مراد ہے اور اس تفسیر کے ذریعہ کون سی مشکل کو حل کیا جا سکتا ہے اور کیا عام تفسیر (تفسیر ترتیبی) کے بعد اس کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے اور اس کی کیا وجہ ہے کہ دوسرے ایسے اہم کام، جو ہمارے پیش نظر ہیں، ان کو نظر انداز کر کے ہم نے اس کام کو منتخب کیا ہے اور تفسیر نمونہ موضوعی پر کام شروع کیا ہے؟ ان تمام سوالوں کا جواب ایک بنیادی نکتہ میں تلاش کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن عام کتابوں کی طرز سے مختلف ہے اس لیے کہ عام کتابوں میں (عام اس سے کہ وہ کلاسک ہوں یا اس کے علاوہ ہوں) کتاب کا مؤلف ایک مخصوص موضوع کو پیش نظر رکھتا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ ہر پہلو کے لیے ایک باب مقرر کرتا ہے پھر کتاب پر ایک مقدمہ کا اضافہ بھی کرتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آخر میں مجموعی طور پر اخذ کیا ہوا ایک نتیجۂ کلام بھی تحریر کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک محقق (گیاہ شناسی) پودوں کے علم کو اپنا موضوع بنا کر ایک کتاب تالیف کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے وہ اس کے ابواب قائم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر شاخیں رکھنے والے درخت، تنے والے درخت، بغیر تنے کے درخت، پھلدار درخت یا بغیر پھل والے درخت، طب میں کام آنے والے پودے یا بطور غذا کام آنے والے درخت، اس کے علاوہ پتوں اور پنکھڑیوں والے پودے اور درخت وغیرہ۔ اس کے بعد مؤلف ہر شعبہ کے لیے ایک باب مقرر کر کے اسے مطالعہ اور تحقیق کا وسیلہ قرار دیتا ہے یہی صورتحال دوسرے موضوعات میں بھی درپیش ہوتی ہے قطع نظر اس سے کہ وہ علم طب ہو یا علم فلسفہ یا علم حقوق وغیرہ۔ اس کے برعکس قرآن مجید ایسی کتاب ہے جو اس طرز پر مرتب نہیں ہوئی بلکہ وہ تیئیس سال کے عرصہ میں مختلف ضرورتوں اور تقاضوں کے پیش نظر ایک عظیم روحانی، معنوی، اجتماعی، اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی انقلاب کو ساتھ لے کر ایک پسماندہ معاشرہ میں پہلے سے نظر نہ آنے والے مختلف النوع حوادث کی خبر دیتی ہوئی نازل ہوئی ہے۔

شروع میں اسلام کا علمی حملہ اہم ترین مسئلہ یعنی مسئلۂ توحید و شرک سے متعلق تھا۔ اس سلسلہ میں جو آیتیں نازل ہوتیں وہ اسی موضوع کے گرد گھومتیں۔ چونکہ شدائد و مشکلات کے مقابلہ میں قدم جمانے کی صلاحیت رکھنا اور باطنی طور پر ذمہ داری کو محسوس کرنا ہر دینی انقلاب کی بنیادی صفت ہوتا ہے اس لیے آخرت کی تعلیم اور روزِ قیامت کی عظیم عدالت پر ایمان لائے بغیر اس مقصد میں کامیاب ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ مذکورہ موضوع پر شرک و بت پرستی کی نفی کے ساتھ ساتھ آیات نازل ہوتی تھیں۔ جب حکومتِ اسلامی کے قیام کی راہ پیغمبرِ اسلامؐ نے ہموار کر دی تو اس کے بعد اسلام کے اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی قوانین یکے بعد دیگرے نازل ہوئے۔ اسلام کی تکوین اور اس کی نشوونما کے زمانے میں متعدد جنگیں پیغمبرِ اسلامؐ اور مسلمانوں پر مسلّط کی گئیں اور اس صورتِ حال کے ہر مرحلہ میں ضروری اور مناسب قوانین، دستور اور نتائج بصورتِ آیات نازل ہوئے اور اسلامی انقلاب اپنے معیّن نظام کے مطابق آگے بڑھتا رہا۔ اس وجہ سے یہ امر بالکل فطری ہے کہ ایک سورہ کی آیتیں ایک معین موضوع کے بارے میں گفتگو نہیں کرتیں بلکہ اس عظیم آسمانی کتاب میں ایک موضوع سے تعلق رکھنے والے مسائل مختلف مقامات پر مندرج ہیں اور یوں وہ منتشر صورت میں ہیں۔ ایک مثال کو پیش کر کے اس بات کی وضاحت کی جاسکتی ہے اور تفسیرِ موضوعی کی اہمیت کو متعین کیا جا سکتا ہے۔ ہم اگر چاہیں کہ جہاد جو ایک اہم اسلامی موضوع ہے، کے بارے میں معلومات حاصل کریں اور جہاد کے شرائط، اُس کے آداب و مقاصد، صلح کے اصول، قیدیوں کے احکام، تاوانِ جنگ، مالِ غنیمت کی کیفیت، جہاد بالنفس اور باطن کی قبیح صفات کا مطالعہ کریں، تو ہم کو مجموعی طور پر کبھی بھی ان موضوعات سے تعلق رکھنے والی آیتیں قرآن کی کسی ایک سورۃ میں نہیں ملیں گی۔ یہ آیتیں سارے قرآن میں بکھری ہوئی ہیں لہٰذا جہاد کے موضوع کے بارے میں اس کی مختلف جہتوں اور اس کے متعدد پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھ کر بحث کے لیے ضروری ہے کہ سارے قرآن کا مطالعہ کیا جائے اور جس آیت کا کسی بھی پہلو سے جہاد کے موضوع سے تعلق ہو اس کو ایسی ہی دوسری متعلقہ آیتوں کے ساتھ ملا کر ایک مجموعہ تیار کیا جائے اور پھر اس کے دقیق مطالعہ سے ہم مسئلۂ جہاد کے خطوط کلی کو واضح کریں۔ یہی صورتِ حال عدالتِ اجتماعی، اقتصادِ اسلامی اور اعتقادی مسائل (توحید و معاد وغیرہ) کی بھی ہے۔ اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھ کر ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ عام تفسیر (تفسیرِ ترتیبی)، اس پوری اہمیت کے باوجود جو اسے حاصل ہے، ہمیں تفسیرِ موضوعی سے بے نیاز نہیں ہونے دیتی۔ خصوصاً وہ محققین جو چاہتے ہیں کہ مختلف مسائل کو ایک ایسی نظر سے دیکھیں جو ہر رُخ کو دیکھنا چاہتی ہے اور وہ ہر مسئلہ کے بارے میں مختلف جہتوں کے حوالہ سے قرآنی نظریات کے متلاشی ہوں، اُن کو اس کی شدید ضرورت ہے۔ اس احتیاج کے احساس نے ہمیں اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ ہم اُن گزشتہ پندرہ سالہ تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، جو ہم نے تفسیرِ نمونہ کی ۲۷ جلدیں تحریر کرنے سے حاصل کیے ہیں، خدائے عظیم و برتر کی مدد سے ایک نئے مرحلے میں داخل ہوں اور پروردگار کے لطف و کرم کے نتیجے میں ممکن ہے کہ ہم عالمِ اسلام کے لیے کوئی نیا ہدیہ فراہم کر سکیں۔ خدا کی بے پایاں رحمت سے یہ چیز کچھ بعید نہیں ہے۔ واضح ہے کہ گزشتہ دَور میں حاصل ہونے والے تجربات جو مسلسل کام کے نتیجے کے سوا کبھی حاصل نہیں ہوتے اس حقیر کے لیے بھی اور ان دوستوں کے لیے بھی جو میرے شریک کار رہے ہیں، ایک عظیم اور بیش قیمت سرمایہ ثابت ہوں گے۔ مقام

افسوس ہوگا اگر ان تجربات سے ایک اور اہم کام کی راہ میں استفادہ نہ کیا جائے۔ اس اہم کام سے میری مراد تفسیر موضوعی کی ترتیب ہے۔ آخر میں اس نکتہ کا ذکر بھی ضروری ہے کہ وہ روش جو ہم نے تفسیر موضوعی کے لیے استعمال کی ہے وہ ایک نئی روش ہے اور یہ ہمیں انشاء اللہ اپنے مقصد کے حصول میں نہایت تیزی اور آسانی سے کامیابی سے ہمکنار کرے گی۔
ہم نے تفسیر موضوعی کے لیے پیام قرآن کا نام پسند کیا ہے۔ مذکورہ مقصد کی تشریح کا تفسیر موضوعی کی پہلی جلد کے مقدمہ میں آپ انشاء اللہ مطالعہ کر سکیں گے۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ تمام مشکلات اور پیچیدگیوں کے باوجود وہ تاثر جو پیام قرآن میں ہے اس طرح فراہم ہو کہ عامۃ الناس، خواص اور محققین بھی اس سے استفادہ کر سکیں اور بحیثیت مجموعی قرآن کے چشمۂ زلال کے تمام پیاسے اس سے فائدہ اٹھائیں۔

صاحبِ نظر افراد کے مشورے اور دوستوں کی دعائے خیر انشاء اللہ ضرور مددگار ثابت ہوگی۔ ربنا علیک توکلنا والیک انبنا والیک المصیر۔

قم حوزہ علمیہ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ جلد ۱۵

فہرست

سورہ مطففین

سورہ انشقاق

سورہ بروج

سورۂ الشمس

سورۂ اللیل

سورہ الضحیٰ

سورہ الم نشرح

سورہ التین

سورہ العلق

سورہ القدر

سورۃ الفلق

سورۃ النّاس

اللهم صل علی محمد و آل محمد و عجل فرجهم

تفسیر نمونہ جلد ۱۵

اس میں مندرجہ ذیل سورتیں شامل ہیں

تمام سورتیں پارہ ۳۰ میں ہیں

سورۃ التکویر: مکی سورت ہے اور اس کی ۲۹ آیات ہیں۔

سورۃ الانفطار: مکی سورت ہے اور اس کی ۱۹ آیات ہیں۔

سورۃ المطففین، مکی سورت ہے اور اس کی ۳۶ آیات ہیں۔

سورۃ الانشقاق، مکی سورت ہے اور اس کی ۲۵ آیات ہیں۔

سورۃ البروج: مکی سورت ہے اور اس کی ۲۲ آیات ہیں۔

سورۃ الطارق، مکی سورت ہے اور اس کی ۱۷ آیات ہیں۔

سورۃ الاعلیٰ، مکی سورت ہے اور اس کی ۱۹ آیات ہیں۔

سورۃ الغاشیہ: مکی سورت ہے اور اس کی ۲۶ آیات ہیں۔

سورۃ التکاثر: مکی سورت ہے اور اس کی ۸ آیات ہیں۔

سُورۃ الفجر: مکّی سُورت ہے اور اس کی ۳۰ آیات ہیں۔

سُورۃ البلد: مکّی سُورت ہے اور اس کی ۲۰ آیات ہیں۔

سُورۃ الشمس: مکّی سُورت ہے اور اس کی ۱۵ آیات ہیں۔

سُورۃ اللّیل: مکّی سورت ہے اور اس کی ۲۱ آیات ہیں۔

سُورۃ الضحٰی: مکّی سُورت ہے اور اس کی ۱۱ آیات ہیں۔

سُورہ الم نشرح: مکّی سُورت ہے اور اس کی ۸ آیات ہیں۔

سُورہ التین: مکّی سُورت ہے اور اس کی ۸ آیات ہیں۔

سُورۃ العلق: مکّی سُورت ہے اور اس کی ۱۹ آیات ہیں۔

سُورۃ القدر: مکّی سُورت ہے اور اس کی ۵ آیات ہیں۔

سُورۃ البیّنہ: مدنی سُورت ہے اور اس کی ۸ آیات ہیں۔

سُورۃ الزلزال: مدنی سُورت ہے اور اس کی ۸ آیات ہیں۔

سُورۃ العٰدیٰت: مکّی سورت ہے اور اس کی ۱۱ آیات ہیں۔

سُورۃ القارعہ: مکّی سورت ہے اور اس کی ۱۱ آیات ہیں۔

سُورۃ العصر ، مکی سُورت ہے اور اس کی ۳ آیات ہیں۔

سُورۃ الھمزہ ، مکی سُورت ہے اور اس کی ۱۱ آیات ہیں۔

سُورۃ الفیل ، مکی سُورت ہے اور اس کی ۵ آیات ہیں۔

سُورۃ القریش ، مکی سُورت ہے اور اس کی ۴ آیات ہیں۔

سُورۃ الماعون ، مکی سُورت ہے اور اس کی ۷ آیات ہیں۔

سُورۃ الکوثر ، مکی سورت ہے اور اس کی ۳ آیات ہیں۔

سُورۃ الکفرون ، مکی سورت ہے اور اس کی ۶ آیات ہیں

سُورۃ النصر ، مدنی سُورت ہے اور اس کی ۳ آیات ہیں۔

سُورۃ المسد ، مکی سورت ہے اور اس کی ۵ آیات ہیں۔

سُورۃ الاخلاص ، مکی سُورت ہے اور اس کی ۴ آیات ہیں۔

سُورۃ الفلق ، مکی سُورت ہے اور اس کی ۵ آیات ہیں۔

سُورۃ الناس ، مکی سُورت ہے اور اس کی ۶ آیات ہیں۔

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا
اس کی ۲۹ آیتیں ہیں

سورۂ تکویر کے مضامین

یہ مکی سورتوں میں سے ہے اور مختلف قرائن اس کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ سورہ اس حقیقت کو پیش کرتا ہے کہ کج فہم اور ہٹ دھرم دشمن پیغمبرِ اسلامؐ پر جنون کی تہمت لگاتے تھے اور یہ صورتِ حال زیادہ تر پیغمبرِ اسلامؐ کے قیامِ مکہ کے زمانے میں تھی، اور ابتدائے تبلیغ میں یہ کیفیت تھی۔ دشمنوں کی کوشش تھی کہ آپؐ کی باتوں کو سنجیدہ نہ سمجھیں اور ان پر زیادہ توجہ نہ دیں۔ بہر حال یہ سورہ دو محوروں کے گرد گھومتا ہے۔

پہلا محور اس سورہ کے آغاز کی آیتیں ہیں جو قیامت کی نشانیوں، اس جہان کے آخر میں عظیم تبدیلیوں اور قیامت کے آغاز کو بیان کرتی ہیں۔ دوسرے محور میں قرآن کے لانے والے کی عظمت اور قرآن کی نفوسِ انسانی میں تاثیر کی گفتگو ہے۔ اس حصہ میں دل ہلا دینے والی اور بیدار کرنے والی قسمیں ہیں۔

اس سورہ کی تلاوۃ کی فضیلت

اس سورہ کی اہمیت اور تلاوۃ کے بارے میں کئی حدیثیں منقول ہیں منجملہ اُن دیگر احادیث کے ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے مروی ہے کہ:

من قرأ سورۃ اذا الشمس کورت اعاذہ اللہ تعالیٰ ان یفضحہ حین تنشر صحیفتہ۔ "جو شخص "اذا الشمس کورت" کو پڑھے تو خدا اسے اس وقت ہر رسوائی سے محفوظ رکھے گا جب اعمال نامے کھولے جائیں گے"[1]

ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ ہی سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

من احب ان ینظر الیّ یوم القیامۃ فلیقرأ اذا الشمس کورت۔ "جو شخص چاہتا ہے کہ قیامت میں میرا دیدار کرے تو وہ سورہ "اذا الشمس کورت" کی تلاوت کرے"[2]

یہ حدیث ایک اور طرح سے بھی نقل ہوئی ہے:

من سرہ ان ینظر الیّ یوم القیامۃ (کانہ رأی عین) فلیقرأ "اذا الشمس کورت" و"اذا السماء انفطرت" و"اذا السماء انشقت"۔ "جو شخص دوست رکھتا

---

[1] و [2] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۴۱۔

ہے کہ قیامت میں مجھے دیکھے (گویا آنکھ سے دیکھے) تو وہ سورہ "اذا الشمس کورت" اور "اذا السماء انفطرت" اور "اذا السماء انشقت" کی تلاوت کرے اس لیے کہ ان سورتوں میں قیامت کی نشانیاں اس طرح بیان ہوتی ہیں کہ تلاوت کرنے والے کو گویا صیحۂ قیامت سے دوچار کر دیتی ہیں۔[1]

ایک اور حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ سے لوگوں نے عرض کیا کہ آپؐ پر اس قدر جلد کیوں بڑھاپے کے آثار نمایاں ہو گئے ہیں تو آپؐ نے فرمایا:

شیبتنی هود والواقعة والمرسلات وعم یتساءلون و اذا الشمس کورت۔

"سورہ ہود، واقعہ، مرسلات، عم اور اذا الشمس کورت نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ اس لیے کہ قرآن کے ہولناک حوادث کی ان میں اس طرح تصویر کشی کی گئی ہے کہ ہر بیدار انسان کو جلد بوڑھا کر دیتی ہے۔[2]

امام جعفر صادقؑ سے بھی ایک حدیث مروی ہے کہ جو شخص سورہ "عبس و تولی" اور "اذا الشمس کورت" کو پڑھے تو پروردگار کے لطف و کرم کے زیر سایہ وہ جنتِ جاوداں میں ہوگا اور خدا کے نزدیک یہ کوئی اہم چیز نہیں ہے کہ وہ ارادہ کرے۔[3]

جو تعبیریں مندرجہ بالا آیتوں میں آئی ہیں وہ بتاتی ہیں کہ مراد ایسی تلاوت ہے جو آگاہی اور ایمان و عمل کا سرچشمہ قرار پاتے۔

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰ ص ۷۰۱۷۔ اس حدیث کے معنی کا سابقہ حدیث میں بھی احتمال ہے۔

[2] تفسیر نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۱۳۔

[3] ثواب الاعمال مطابق نقل نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۱۲۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ ۪ۙ

(۲) وَ اِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ ۪ۙ

(۳) وَ اِذَا الۡجِبَالُ سُیِّرَتۡ ۪ۙ

(۴) وَ اِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ ۪ۙ

(۵) وَ اِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ ۪ۙ

(۶) وَ اِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ ۪ۙ

(۷) وَ اِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ ۪ۙ

(۸) وَ اِذَا الۡمَوۡءٗدَۃُ سُئِلَتۡ ۪ۙ

(۹) بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ ۚ

ترجمہ

اس خدا کے نام سے جو مہربان اور بخشنے والا ہے۔

(۱) جس وقت سورج کو لپیٹا جائے گا۔

(۲) اور جس وقت ستارے بے نور ہو جائیں گے۔

(۳) جس وقت پہاڑ چلنے لگیں گے۔

(۴) جس وقت زیادہ قیمتی مال فراموش کر دیا جائے گا۔

(۵) جس وقت وحوش کو جمع کیا جائے گا۔

(۶) جس وقت دریا جوش مارنے لگیں گے۔

(۷) جس وقت ہر شخص اپنے جیسے کا قرین قرار دیا جائے گا۔

(۸) جس وقت زندہ درگور لڑکیوں سے سوال کیا جائے گا۔

(۹) کہ ان کو کس گناہ کی پاداش میں قتل کیا گیا؟

تفسیر

جس دن کائنات کے دفتر کو لپیٹ دیا جائے گا

اس سورہ کے آغاز میں جیسا کہ ہم نے کہا ہے، مختصر، ہیجان انگیز اور دل ہلا دینے والے اشاروں کے ساتھ اس جہان کے اختتام اور قیامت کی ابتدا کے ہولناک حوادث سے ہمارا آمنا سامنا ہے۔

یہ حوادث ہمیں عجیب وغریب جہانوں کی سیر کراتے ہیں۔ پروردگارِ عالم ان نشانیوں میں سے آٹھ نشانیوں کو بیان کرتا ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے:

"اس وقت جب سورج کا دفتر لپیٹ دیا جائے گا" (اذا الشمس کورت)۔

"کورت" "تکویر" کے مادہ سے اصل میں کسی چیز کے لپیٹنے اور جمع کرنے کے معنی میں ہے (مثلاً سر پر عمامہ لپیٹنا) یہ ایسا مفہوم ہے جو لغت وتفسیر کی بہت سی کتب سے معلوم ہوتا ہے کبھی کسی چیز کے پھینک دینے اور تاریک ہونے کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ دونوں معانی اسی اصلی مضمون کی طرف لوٹتے ہیں۔

بہرحال یہاں مراد سورج کی روشنی کا بجھ جانا ہے۔ اس کا تاریک ہونا ہے یعنی اس کے وجود کا ختم ہو جانا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ فی الحال سورج ایک کُرّہ ہے، حد سے زیادہ گرم اور جلتا ہوا، اس قدر کہ اس کا تمام مواد تہہ بہ تہہ گیس کی شکل میں نکل آیا ہے اور اس کے اردگرد جلانے والے شعلے موجود ہیں جن کی بلندی لاکھوں میٹر ہے۔ اگر کرۂ زمین ان میں سے کسی شعلے کے درمیان الجھ جاتے تو ایک ہی لمحے میں خاک ہو کر تھوڑی سی گیس میں تبدیل ہو جائے لیکن اس جہان کے آخر میں قیامت کی ابتدا پر یہ حرارت ختم ہو جائے گی اور شعلے بجھ جائیں گے، اس کی روشنی ختم ہو جائے گی اور اس کے حجم میں کمی ہو جائے گی۔

تکویر کے یہ معنی ہیں۔ اسی لیے لسان العرب میں آیا ہے:

(کورت الشمس جمع ضوءھا ولف کما تلف العمامہ) سورج کی تکویر کے یہ معنی ہیں کہ اس کی روشنی سمٹ جائے گی اور لپیٹ دی جائے گی جس طرح عمامے کو لپیٹتے ہیں۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی موجودہ علم بھی تائید کرتا ہے۔ سورج کی روشنی آہستہ آہستہ تاریکی کی طرف جارہی ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"اور جس وقت ستارے بے نور ہوکر غائب ہوجائیں گے" (واذا النجوم انکدرت)۔

"انکدرت" "انکدار" کے مادہ سے گرنے اور پراگندہ ہونے کے معنی میں ہے اور کدورت کی اصل کے پیش نظر تیرگی و تاریکی کے معنی میں ہے۔ زیر بحث آیت میں ان دونوں کا جمع ہونا بھی ممکن ہے اس لیے کہ آغاز قیامت میں ستارے اپنی روشنی کھو بیٹھیں گے، منتشر ہوجائیں گے اور گر پڑیں گے اور عالم بالا کا نظام درہم برہم ہوجائے گا جیسا کہ سورہ انفطار کی آیت ۲ میں آیا ہے:

(واذا الکواکب انتثرت) "اور جب ستارے گرکر منتشر ہوجائیں گے" اور جیسا کہ سورہ مرسلات کی آیت ۸ میں آیا ہے (فاذا النجوم طمست) اور جب ستارے مٹ جائیں گے اور تاریک ہوجائیں گے" قیامت کی تیسری نشانی کے سلسلہ میں فرماتا ہے:

"اور جب پہاڑ چلنے لگیں گے" (واذا الجبال سیرت)۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ قرآن کی مختلف آیتوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آغاز قیامت میں پہاڑ مختلف مراحل طے کریں گے۔

پہلا مرحلہ یہ کہ وہ چلنے لگیں گے اور آخری مرحلے میں غبار میں تبدیل ہوجائیں گے۔ (اس سلسلہ میں مزید تشریح اسی جلد میں سورہ نبا کی آیت ۲۵ کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں)۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"جس وقت نہایت قیمتی اموال فراموشی کے حوالے ہوجائیں گے" (واذا العشار عطلت)۔

"عشار" جمع ہے "عشراء" کی جو دراصل حاملہ اونٹنی کے معنی میں ہے جس کے حمل کو دس ماہ گزر چکے ہوں اور وہ بچہ جننے کے قریب ہو یعنی زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ وہ ایک اور اونٹ کو جنم دے گی اور بہت زیادہ دودھ اس کے پستانوں میں ظاہر ہوگا۔

جس وقت یہ آیتیں نازل ہوئیں تو عرب میں اس قسم کی اونٹنی بہت قیمتی شمار ہوتی تھی۔

"عطلت" تعطیل کے مادہ سے سرپرست اور چرواہے کے بغیر چھوڑ دینے کے معنی میں ہے مراد یہ ہے کہ اس دن ہولناکی اس قدر شدید ہوگی کہ ہر انسان اپنے نفیس ترین مال کو فراموش کردے گا۔

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں نقل کرتے ہیں کہ بعض مفسرین نے عشار کو بادل کے معنی میں لیا ہے اور "عطلت" بارش کے معطل ہوجانے کے معنی میں ہے یعنی اس دن آسمان پر بادل تو ظاہر ہوں گے لیکن برسیں گے نہیں۔ (ہوسکتا ہے یہ بادل مختلف گیسوں سے پیدا ہوں یا ایٹمی بادل ہوں، یا گرد و غبار کے تودے جو پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہوجانے سے آغاز قیامت میں ظاہر ہوں گے)۔

لیکن طبرسی مزید کہتے ہیں کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ عشار کی تفسیر بادلوں سے کرنا ایسی چیز ہے جو لغت عرب میں معروف نہیں ہے لیکن اس مطلب کی طرف توجہ سے جو "طریحی" نے مجمع البحرین میں نقل

کیا ہے کہ "عشار" اصل میں حاملہ اونٹنیوں کے معنی میں ہے اور اس کے بعد ہر بار بردار کو کہا گیا ہے۔ ممکن ہے بادلوں پر بھی اس کا اطلاق عام طور پر پانی کا بوجھ اٹھانے کی وجہ سے ہو اگرچہ وہ بادل جو آغازِ قیامت میں نمودار ہوں گے بار بردار نہیں ہوں گے (غور کیجئے)۔

بعض مفسرین نے "عشار" کی تفسیر گھروں اور زرعی زمینوں سے کی ہے جو عرصۂ محشر میں بیکار ہو جائیں گی اور ساکنوں اور زراعت کرنے والوں سے محروم ہوں گی۔ لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مشہور ہے۔ بعد کی آیت میں مزید ارشاد ہوتا ہے:

"اور جس وقت وحشی جانور اکٹھے کیے جائیں گے" (واذا الوحوش حشرت)۔ وہی جانور جو عام حالات میں ایک دوسرے سے دور رہتے اور ڈرتے تھے عرصۂ قیامت کے ہولناک حوادث کی وحشت کی شدت ایسی ہوگی کہ ان کو ایک دوسرے کے گرد جمع کر دے گی اور وہ ہر چیز کو بھول جائیں گے۔ گویا وہ چاہیں گے کہ اپنے اس اجتماع سے اپنے خوف و وحشت میں کمی کریں۔

دوسرے لفظوں میں جس وقت وہ ہولناک مناظر وحشی جانوروں سے ان کے مخصوص خواص چھین لیں گے تو انسانوں سے کیا سلوک کریں گے۔ لیکن بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت قیامت کی عدالت میں وحشی جانوروں کے جمع ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بھی اپنے عالم میں اور اپنی آگاہی اور شعور کے حدود میں رہتے ہوئے جوابدہی کے پابند ہیں اور اگر انہوں نے ایک دوسرے پر ظلم و ستم کیا ہوگا تو وہاں ان سے بدلہ لیا جائے گا۔

اس آیت کی سورہ انعام کی آیت ۳۸ کے ساتھ مشابہت ہے جو یہ کہتی ہے کہ (وما من دآبۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم ما فرطنا فی الکتاب من شیء ثم الی ربھم یحشرون) کوئی زمین میں چلنے والا اور کوئی پرندہ جو اپنے دونوں پروں سے پرواز کرتا ہے موجود نہیں مگر یہ کہ وہ تمہاری طرح کی امتیں ہیں۔ ہم نے کسی چیز کو اس کتاب میں چھوڑا نہیں ہے، اس کے بعد تم اپنے پروردگار کی طرف محشور ہوگے۔

(جانوروں کے حشر و نشر اور حساب و کتاب کے سلسلہ میں تفصیلی بحث سورہ انعام کی اسی آیت کے ذیل میں جلد ۳ ص ۳۶۹ تا ۳۷۲ ہم کر چکے ہیں)۔

جو کچھ یہاں کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ زیر بحث آیات دنیا کے اختتام اور آخرت کے آغاز کی ہولناک نشانیوں کے سلسلہ میں بحث کر رہی ہیں لہٰذا پہلی تفسیر مناسب ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"جس وقت دریاؤں میں آگ لگ جائے گی" (واذا البحار سجرت)۔

"سجرت"، "تسجیر" کے مادہ سے جلانے اور آگ کے ہیجان میں آنے کے معنی میں ہے۔ اور

اگر قرآن کی یہ تعبیر گزشتہ زمانے میں مفسرین کے لیے عجیب و غریب تھی تو اس وقت ہمارے لیے باعث تعجب نہیں ہے اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ پانی دو عناصر، ہائیڈروجن اور آکسیجن، سے مرکب ہے جو دونوں شدید طور پر قابلِ اشتعال ہیں۔

بعید نہیں کہ عرصۂ قیامت میں دریاؤں اور سمندروں کا پانی اس طرح دباؤ اور فشار میں آجائے کہ ان کا تجزیہ ہو جائے اور یہ آگ پکڑ جائیں۔

بعض نے اس لفظ کی پُر ہونے کے معنی میں تفسیر کی ہے جیسا کہ آگ سے پُر تنور کو مسجّر کہا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عرصہ محشر کے زلزلے اور پہاڑوں کا انتشار دریاؤں اور سمندروں کے پُر ہونے کا سبب بنے یا آسمانی پتھروں کے گرنے سے وہ پُر ہو جائیں اور ان کا متلاطم پانی خشکیوں کی سطح پر جاری ہو اور ہر چیز کو غرق کر دے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

۔۔ اور جس وقت ہر شخص اپنے جیسے کا قرین ہو جائے گا (واذا النفوس زوّجت)۔ صالحین صالحین کے ساتھ' اور بدکار بدکار لوگوں کے ساتھ، اصحاب الیمین اصحاب الیمین کے ساتھ اور اصحابِ شمال اصحابِ شمال کے ساتھ' اس دنیا کے برعکس جہاں سب ملے جلے ہیں۔ کہیں مومن کا ہمسایہ مشرک ہے اور کہیں صالح اور نیک کا ہمسایہ غیر صالح ہے۔ لیکن قیامت جو یوم الفصل یعنی جدائی کا دن ہے اس میں یہ صفیں مکمل طور پر الگ الگ اور ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گی۔

اس آیت کی تفسیر میں دوسرے احتمالات بھی پیش ہوتے ہیں منجملہ ایک یہ ہے کہ ارواح ابدان میں پلٹ آئیں گی یا جنتی نفوس حوروں کے ساتھ اور جہنمی نفوس شیاطین کے پاس ہو جائیں گے۔ یا یہ کہ ہر انسان اپنے دوست اور رفیق کے قریب ہوگا بعد اس کے کہ موت ان کے درمیان جدائی ڈال دے گی یا ہر انسان اپنے اعمال کا قرین ہوگا۔

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ سورہ واقعہ کی آیات، سے ۱۱ تک اس کی گواہ ہیں:

(وکنتم ازواجًا ثلاثۃ فاصحاب المیمنۃ ما اصحاب المیمنۃ واصحاب المشئمۃ ما اصحاب المشئمۃ والسابقون السابقون اولٰئک المقربون)

اس دن تم تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے پہلا گروہ اصحابِ میمنہ کا ہے کیا کہنا اصحابِ میمنہ کا۔ دوسرا گروہ اصحابِ شمال کا ہے وہ کیا ہی منحوس گروہ ہے اور تیسرا گروہ سبقت کرنے والوں کا ہے اور سبقت کرنے والے ہی مقربین ہیں۔

حقیقت میں یہ آیت ایسی تبدیلیاں جو قیامت کی تمہید ہیں ان کے ذکر کے بعد اس عظیم دن کے ہراول دستے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ ایسا دن ہے جس میں ہر شخص اپنے قرین کے ہمراہ ہو جائے گا۔

اس کے بعد قیامت کے ایک اور حادثہ کو موضوع بناتے ہوئے مزید فرماتا ہے :

" جس دن زندہ درگور لڑکیوں سے سوال کیا جائے گا " (و اذا الموءودة سئلت) " کہ وہ کس جرم میں قتل کی گئی ہیں " (بای ذنب قتلت) ۔

" موءودة " " وأد " (بروزن رعد) اس لڑکی کے معنی میں ہے جسے زندہ دفن کر دیا گیا ہو بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنی ثقل بوجھ اور سنگینی کے ہیں اور چونکہ ان لڑکیوں کو قبر میں دفن کرتے تھے اور ان پر مٹی ڈال دیتے تھے اس لیے یہ تعبیر ان کے لیے استعمال کی گئی ہے ۔

بعض روایات کے نتیجے میں اس آیت کی تفسیر کو وسعت دی گئی ہے یہاں تک کہ ہر قسم کے قطع رحم یا مودة اہل بیت کو قطع کرنا اس میں شامل ہے ۔

ایک حدیث امام محمد باقرؑ سے مروی ہے کہ جس وقت اس آیت کی تفسیر کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا (من قتل فی مودتنا) اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ہماری محبت کی راہ میں قتل کر دیئے گئے ہیں[1]

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ اس بات کی گواہ آیت قربیٰ ہے (قل لا اسئلکم علیه اجرًا الا المودة فی القربیٰ) " کہہ دے میں تبلیغ نبوت کے سلسلہ میں تم سے کسی قسم کا اجر نہیں چاہتا سوائے اپنے اہل بیت کی مودة کے "[2] (شوریٰ ـ ۲۳) ۔

البتہ آیت کا ظاہری مفہوم وہی پہلی تفسیر ہے لیکن اس میں اس قسم کے مفہوم کی صلاحیت ہے ۔

چند نکات

۱۔ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا

عربوں کے زمانۂ جاہلیت کے دردناک ترین اور نہایت وحشیانہ مظاہر میں سے ایک مظہر لڑکی کا زندہ درگور کر دینا ہے جس کی طرف قرآن مجید میں بارہا اشارہ ہوا ہے ۔ اگرچہ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ قبیح رسم عربوں میں عام نہیں تھی ۔ صرف قبیلہ کندہ یا بعض دوسرے قبائل میں تھی لیکن ظاہر ہے کہ یہ اقدام کچھ عجیب نہیں سمجھا جاتا تھا ۔ ورنہ قرآن اس بارے میں اتنی تاکید کے ساتھ بار بار گفتگو نہ کرتا ۔

بہر حال یہ کام اس قدر وحشت ناک تھا کہ اس کا کبھی کبھی ہونا بھی نہایت قبیح امر ہے ۔ مفسرین نے کہا ہے کہ عربوں کے زمانہ جاہلیت میں جس وقت عورت کے وضع حمل کا وقت قریب آتا تو زمین میں ایک گڑھا کھود دیتے اور اس کے اوپر بیٹھ جاتے اگر نوزائیدہ بچہ لڑکی ہوتا تو اس کو اس گڑھے میں پھینک دیتے

---

[1] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۴۳۲ ، حدیث ۷ و ۱۱ ۔

[2] ایضاً " " " " "

اور اگر لڑکا ہوتا تو اسے زندہ رہنے دیتے۔ اسی لیے ان کے شعراء میں سے ایک شاعر اس سلسلہ میں فخریہ لب و لہجے میں کہتا ہے:

سمیتھا اذا ولدت تموت والقبر صھر ضامن ذمیت

میں نے اس نوزائیدہ لڑکی کا نام اس کی پیدائش کے وقت تموت رکھا (جس کے معنی ہیں مرجائے گی) اور قبر میرا داماد ہے جس نے اسے اپنی بغل میں لے لیا اور اسے خاموش کر دیا[1]

اس جرم کے مختلف اسباب و عوامل تھے

زمانۂ جاہلیت میں عورت کا ایک انسان کے لحاظ سے بے قدر و قیمت ہونا اس شدید فقر و فاقہ کی کیفیت کا نتیجہ تھا جو اس معاشرہ پر مسلط تھا۔ لڑکیاں نہ تو کچھ کما کر دے سکتی تھی نہ ڈاکہ ڈالنے میں شرکت کر سکتی تھیں۔ ایک سبب اور بھی تھا اور وہ یہ کہ اس بات کا امکان تھا کہ مختلف جنگوں میں گرفتار ہو کر لڑکیاں قید ہو جائیں اور ان کی عزت و ناموس دوسروں کے قبضہ میں چلی جائے جس کے نتیجے میں بے غیرتی کا دھبہ متعلقین کے دامن پر لگ جائے۔

یہ چند عوامل لڑکیوں کے زندہ درگور کرنے کا سبب بنے۔ انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ زمانۂ موجودہ میں بھی یہ رسم کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ اور کچھ نہیں تو اسقاطِ حمل کی آزادی کی صورت میں بہت سے متمدن ممالک میں رواج پائے ہوئے ہے۔ اگر زمانۂ جاہلیت کے عرب نوزائیدہ بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے تو ہمارے زمانے کے متمدن انسان انہیں شکم مادر میں قتل کر دیتے ہیں اس کی مزید تشریح جلد ۶ ص ۳۷۲ تا ۳۷۶ پر سورہ نحل کی آیت ۵۹ کے ذیل میں ہم لکھ چکے ہیں۔

۲۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس اقدام کو اس قدر قبیح اور قابلِ نفرت قرار دیا ہے کہ روزِ قیامت دوسرے اعمال کی پرسش سے پہلے اس دادخواہی کا تذکرہ کیا ہے یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ قانونِ اسلام کی رو سے عام انسانوں خصوصاً بے گناہ انسانوں کے خون کی بہت شدید گرفت کی گئی ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں عورت کی کتنی قدر و منزلت ہے۔

۳۔ ایک اور نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ قاتلوں سے سوال کریں گے بلکہ کہتا ہے کہ ان معصوم بچیوں سے سوال ہوگا کہ تمہارا کیا گناہ تھا کہ اس بے رحمانہ طریقہ پر تم کو قتل کیا گیا۔ گویا قاتل اس قابل بھی نہیں ہیں کہ اُن سے اُن کے جرم کے بارے میں پرسش بھی کی جائے بلکہ تنہا ان مقتولین کی گواہی کافی ہے۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۴۴۔

(۱۰) وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝

(۱۱) وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ۝

(۱۲) وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ۝

(۱۳) وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ۝

(۱۴) عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ۝

ترجمہ

(۱۰) جس وقت اعمال نامے کھول دیئے جائیں گے۔

(۱۱) اور جس وقت آسمان سے پردہ ہٹا دیا جائے گا۔

(۱۲) اور جس وقت دوزخ دہک اٹھے گا۔

(۱۳) اور جس وقت جنت قریب کر دی جائے گی۔

(۱۴) اس وقت ہر انسان جان لے گا کہ اس نے کیا کیا ہے۔

تفسیر

اس دن معلوم ہو گا کہ ہم کتنے پانی میں ہیں

اس بحث کے بعد جو گزشتہ آیتوں میں قیامت کے پہلے مرحلے یعنی اس جہان کی ویرانی کے موضوع پر آئی تھی زیر بحث آیتوں میں اس کے دوسرے مرحلہ یعنی دوسرے عالم کے ظہور اور نامہ اعمال کی طرف اشارہ کرکے فرماتا ہے:

"جس روز اعمال نامے کھول دیئے جائیں گے" (واذا الصحف نشرت)۔

"صحف" "صحیفہ" کی جمع ہے۔ یہ اس چیز کے معنوں میں ہے جو صفحۂ رخ کی طرح وسیع ہو۔ اس کا اطلاق ان تختیوں اور کاغذوں پر بھی ہوا ہے جن پر کچھ مطالب لکھتے ہیں۔ قیامت میں اعمال ناموں کے

کھلنے سے مراد یہ ہے کہ جنہوں نے وہ اعمال انجام دیتے ہیں ان کے سامنے ان کے اعمال ظاہر ہو جائیں گے تاکہ وہ اپنا حساب کتاب دیکھ لیں۔ جیساکہ سورہ اسریٰ کی آیت ۱۴ میں آیا ہے:

(اقرأ کتابک کفیٰ بنفسک الیوم علیک حسیباً) اور ان اعمال ناموں کا دوسروں کے سامنے واضح ہونا بھی نیکوکاروں کے لیے ایک تشویق کا عنوان ہے اور بدکاروں کے لیے سزا و رنج اور تکلیف ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"اور جس وقت آسمان کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا جائے گا" (و اذا السماء کشطت)۔

"کشطت" (بروزن کشف) کے مادہ سے اصل میں، جیساکہ راغب مفردات میں کہتا ہے، جانور کی کھال اتارنے کے معنی میں ہے اور ابن منظور کے بقول "لسان العرب" میں کسی چیز کے رُخ سے پردہ ہٹانے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ لہٰذا جس وقت بادل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں تو یہ تعبیر استعمال ہوتی ہے۔

زیر بحث آیت میں اس سے مراد یہ ہے کہ وہ پردے جو اس دنیا میں عالم مادہ اور عالم بالا پر پڑے ہوئے ہیں یعنی لوگ فرشتوں کو یا دوزخ و جنت کو نہیں دیکھ سکتے، وہ ہٹ جائیں گے اور انسان عالم ہستی کے حقائق کو دیکھ سکیں گے۔

جیساکہ بعد والی آیت میں آئے گا کہ جہنم شعلہ ور ہوگا اور جنت انسانوں کے نزدیک ہو جائے گی۔ جی ہاں! قیامت کا دن یوم البروز ہے۔ چیزوں کی ہیئت اس دن آشکار ہو جائے گی اور آسمان کے چہرہ سے پردہ ہٹ جائے گا۔

اس تفسیر کے مطابق مندرجہ بالا آیت قیامت کے دوسرے مرحلہ کے حوادث یعنی انسانوں کی حیاتِ تازہ کے مراحل کی گفتگو کرتی ہے۔

قبل و بعد کی آیات بھی انہی چیزوں کی حامل ہیں اور یہ جو بہت سے مفسرین نے اس آیت کو آسمانوں کے پلیٹے جانے اور قیامت کے پہلے مرحلہ یعنی اس عالم کی فنا سے متعلق سمجھا ہے، یہ بہت بعید نظر آتا ہے اور نہ یہ مفہوم قبل و بعد کی آیات کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اس لیے بعد والی آیات میں مزید فرماتا ہے:

"اور جس وقت جہنم شعلہ ور ہوگا" (و اذا الجحیم سعرت)۔

(و ان جھنم لمحیطۃ بالکافرین)۔ "بے شک دوزخ کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے" (توبہ/۴۹) کے مطابق جہنم اب بھی موجود ہے لیکن اس دنیا کے حجابات اس کے مشاہدہ کی راہ میں حائل ہیں۔ جیساکہ بہت سی آیاتِ قرآنی کے مطابق جنت بھی اس وقت پرہیزگاروں کے لیے تیار ہے۔ اسی بنا پر بعد والی آیت میں فرماتا ہے:

"اور جس وقت جنت پرہیزگاروں کے نزدیک کر دی جائے گی" (و اذا الجنۃ ازلفت)۔ یہی معنی سورہ شعراء کی آیت ۹۰ میں بھی اس فرق کے ساتھ آئے ہیں کہ یہاں متقین کے نام کی تصریح نہیں ہوئی۔

"ازلفت"، "زلف" (بروزن حرف) اور "زلفی" (بروزن کبریٰ) کے مادّہ سے نزدیکی کے معنوں میں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد قرب مکانی ہو یا قرب زمانی یا اسباب و مقدمات کے لحاظ سے یا پھر یہ سب امور ہوں یعنی جنت مکان کے لحاظ سے بھی مومنین کے نزدیک ہو جائے گی اور زمان ورود کے اعتبار سے بھی اور اس کے اسباب و علل بھی وہاں سہل و آسان ہوں گے۔

قابل توجہ یہ ہے کہ یہ نہیں فرماتا کہ نیکوکار جنت کے نزدیک ہو جائیں گے بلکہ فرماتا ہے جنت ان کے نزدیک کر دیں گے اور یہ بہت ہی محترم تعبیر ہے جو اس سلسلہ میں ممکن ہے۔

جیسا کہ ہم نے کہا ہے جنت اور جہنم دونوں اس وقت موجود ہیں لیکن اس دن جنت زیادہ نزدیک اور دوزخ ہر زمانہ کی نسبت زیادہ بھڑک رہا ہوگا۔

آخری زیر بحث آیت میں جو فی الحقیقت تمام گزشتہ آیتوں کی تکمیل کرتی ہے اور تمام شرطیہ جملوں کی جزا ہے جو گزشتہ بارہ آیتوں میں آئے ہیں، فرماتا ہے:

"اس وقت ہر شخص جان لے گا کہ اس نے کیا کچھ حاضر کیا ہے" (علمت نفس ما احضرت)۔ اور یہ تعبیر اچھی طرح بتاتی ہے کہ انسان کے تمام اعمال وہاں حاضر ہوں گے اور وہاں انسان کا علم مشاہدہ لیے ہوتے ہوگا۔

یہ حقیقت قرآن کی متعدد آیات میں آئی ہے۔ سورہ کہف کی آیت ۴۹ میں ہم پڑھتے ہیں (ووجدوا ما عملوا حاضرًا) "جو کچھ انہوں نے اعمال کیے ہیں وہ اسے حاضر پائیں گے" اور سورہ زلزال کی آخری آیات میں آیا ہے: (فمن یعمل مثقال ذرة خیرًا یره ومن یعمل مثقال ذرة شرًّا یره) جس شخص نے ذرہ برابر نیک عمل کیا ہوگا وہ اسے دیکھے گا اور جس شخص نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا۔

یہ آیت بھی اعمال کی تجسیم کو بیان کرتی ہے اور یہ کہ انسانوں کے اعمال جو اس جہان میں بظاہر نابود ہو جاتے ہیں، وہ حقیقتاً نابود نہیں ہوتے۔ اس دن مناسب شکلوں اور صورتوں میں مجسم ہوں گے اور عرصۂ محشر میں حاضر ہوں گے۔

چند نکات

۱۔ نظم آیات

زیر بحث آیتوں میں اور گزشتہ آیتوں میں مسئلہ قیامت کے رابطہ سے بارہ حادثات کی طرف اشارہ ہوا ہے جن میں سے چھ حوادث پہلے مرحلہ یعنی اس جہان کی فنا سے متعلق ہیں اور چھ دوسرے حوادث پھر دوسرے مرحلہ یعنی موت کے بعد کی نئی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

پہلے حصّہ میں سورج کے تاریک و سیاہ ہو جانے، ستاروں کے بے نور ہونے، پہاڑوں کے تزلزل اور

حرکت میں آجانے، سمندروں میں آگ لگ جانے، اموال کو بھول جانے، اور جانوروں کے وحشت زدہ ہو جانے کے بارے میں گفتگو ہے۔

دوسرے مرحلہ میں انسانوں کے الگ الگ صفوں میں محشور ہونے، بے گناہ زندہ درگور لڑکیوں سے سوال کیے جانے، نامہ اعمال کے کھلنے، آسمانوں سے حجابوں کے ہٹ جانے، جہنم کی آگ کے بھڑک اٹھنے، جنت کے نزدیک ہونے اور آخر میں انسان کے اپنے اعمال سے مکمل طور پر آگاہ ہونے کی بات ہوئی ہے۔

یہ آیات، باوجود اختصار، اس قدر پُرمعنی اور دل ہلا دینے والی ہیں کہ ہر انسان کے وجود کو متزلزل کر دیتی ہیں اور اسے غور و فکر پر اس طرح مجبور کر دیتی ہیں کہ وہ اس دنیا کے انجام اور قیامت کی کیفیات کو مختصر عبارتوں میں اپنی آنکھوں کے سامنے مجسم دیکھنے لگتا ہے۔ کس قدر زیبا، خوبصورت اور اثر کرنے والی یہ آیاتِ قرآن ہیں اور کس قدر پُرمعنی اور الہام بخش ان کے نکات ہیں۔

۲۔ کیا نظامِ شمسی ختم ہو جائے گا اور ستاروں کے چراغ گُل ہو جائیں گے؟

ہر چیز سے پہلے ہمیں جاننا چاہیئے کہ ہمارے نظامِ شمسی کا یہ حیات بخش مرکز جسے ہم سورج کہتے ہیں آسمان کے باقی ستاروں کی بہ نسبت، اگرچہ یہ متوسط ستارہ ہے، لیکن اپنی ذات کی حد تک اور کرۂ زمین کی نسبت بہت بڑا ہے۔

ماہرین کی تحقیق اور ان کے مطالعوں کے مطابق اس کا حجم ایک ملین اور تین کروڑ گنا زمین کے مقابلہ میں ہے۔ البتہ یہ چونکہ ہم سے تقریباً ایک سو پچاس ملین کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے لہٰذا وہ موجودہ حجم میں نظر آتا ہے۔

سورج کی عظمت و وسعت کی تصویرکشی کے لیے یہی مقدار کافی ہے کہ اگر چاند اور زمین کو اس فاصلہ کے ساتھ جو اس وقت ان دونوں کے درمیان ہے، سورج کے اندر منتقل کر دیں تو چاند آسانی کے ساتھ زمین کے گرد گردش کر سکتا ہے بغیر اس کے کہ وہ سورج کی سطح سے خارج ہو۔

سورج کی سطح کی حرارت چھ ہزار سنٹی گریڈ سے زیادہ ہے اور اس کے عمق کی حرارت کئی ملین درجوں سے زیادہ ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ سورج کے وزن کو ٹنوں کے حساب سے بیان کریں تو ضروری ہے کہ ہم دو کا عدد لکھیں اور ستائیس صفر اس کے آگے لگائیں یعنی دو ارب ارب ارب ٹن۔

سورج کی سطح سے شعلے بلند ہوتے ہیں جن کا ارتفاع کبھی تو ایک لاکھ ساٹھ ہزار کلومیٹر ہوتا ہے اور کرۂ زمین اس کے اندر آسانی سے گم ہو سکتا ہے کیونکہ زمین کا قطر بارہ ہزار کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے۔ باقی رہا سورج کی نورانی روشنی دینے والی طاقت کا سرچشمہ، اس کے برعکس جو بعض ماہرین نے طے کر رکھا ہے

وہ چلنے سے پیدا نہیں ہوتا۔

جارج گاموف اپنی کتاب "سورج کی پیدائش اور اس کی موت" میں لکھتا ہے کہ اگر سورج کا جسم خالص پتھر کے کوئلے سے بنا ہوا ہوتا اور مصر کے پہلے فرعون کے زمانے میں اسے آگ لگائی گئی ہوتی تو ضروری تھا کہ وہ اب تک سب جل چکا ہوتا اور خاک کے سوا کوئی چیز باقی نہ بچی ہوتی اور کسی قسم کا دوسرا چلنے والا مادہ اگر پتھر کے کوئلے کی جگہ ہم فرض کریں تو وہ بھی یہی اشکال رکھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ چلنے کا مفہوم سورج پر صادق نہیں آتا۔ اس میں جو کچھ ہے وہ ایٹمی تجربوں سے حاصل شدہ طاقت ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ طاقت (انرجی) بہت زیادہ اور بڑی ہے اس بنا پر سورج کے ایٹم انرجی کی تبدیلی میں مصروف ہیں جو ماہرین کے حساب کے مطابق ہر سیکنڈ میں چار ملین ٹن کم ہو جاتے ہیں مگر سورج کا حجم اتنا بڑا ہے کہ ہزارہا سال گزرنے کے باوجود اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور اس کی کیفیت وضع میں معمولی سا تغیر بھی واقع نہیں ہوتا۔

لیکن جاننا چاہیئے کہ یہی چیز ایک مدت دراز کے بعد سورج کے فنا ہونے کا سبب بنے گی اور آخرکار یہ جرم عظیم لاغر، کمزور، پتلا اور بے نور ہو جائے گا۔ اور یہی چیز ستاروں پر بھی صادق آتی ہے[1]

اس بنا پر جو کچھ اوپر والی آیات میں سورج کے تاریک ہونے اور ستاروں کے بکھر جانے کے سلسلہ میں آیا ہے وہ ایسی حقیقت ہے جو موجودہ زمانے کے علم کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور قرآن نے اس وقت ان حقائق کو بیان کیا ہے جب نہ صرف جزیرۃ العرب کے ماحول میں بلکہ اس زمانے کی علمی دنیا کی محفلوں میں بھی ان مسائل کی کوئی خبر نہیں تھی۔

---

[1] اقتباس از کتب "پیدائش و مرگ خورشید" و "نجوم بی تلسکوپ" اور "ساختمان خورشید"

(۱۵) فَلَآ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ ۙ

(۱۶) الۡجَوَارِ الۡكُنَّسِ ۙ

(۱۷) وَالَّيۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ ۙ

(۱۸) وَالصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۙ

(۱۹) اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ ۙ

(۲۰) ذِىۡ قُوَّةٍ عِنۡدَ ذِى الۡعَرۡشِ مَكِيۡنٍ ۙ

(۲۱) مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيۡنٍ ؕ

(۲۲) وَمَا صَاحِبُكُمۡ بِمَجۡنُوۡنٍ ۚ

(۲۳) وَلَقَدۡ رَاٰهُ بِالۡاُفُقِ الۡمُبِيۡنِ ۚ

(۲۴) وَمَا هُوَ عَلَى الۡغَيۡبِ بِضَنِيۡنٍ ۚ

(۲۵) وَمَا هُوَ بِقَوۡلِ شَيۡطٰنٍ رَّجِيۡمٍ ۙ

ترجمہ

(۱۵) قسم ہے ان ستاروں کی جو پلٹ آتے ہیں۔

(۱۶) چلتے ہیں اور نگاہوں سے چھپ جاتے ہیں۔

(۱۷) اور قسم ہے رات کی جبکہ وہ پشت پھیرے اور آخر کو پہنچ جائے۔

(۱۸) اور صبح کی جب وہ تنفس کرے۔

(۱۹) کہ یہ قرآن باعظمت بھیجے ہوئے کا کلام ہے (جبرائیل امین)۔

(۲۰) جو صاحبِ قدرت ہے اور صاحبِ عرش خدا کے ہاں بلند مقام کا حامل ہے۔

(۲۱) فرمانروا اور امین ہے۔

(۲۲) اور تمہارا ساتھی (پیغمبرؐ) دیوانہ نہیں ہے۔

(۲۳) اُس نے اُس کو (جبرائیل کو) روشن افق میں دیکھا۔

(۲۴) وہ اس کے بارے میں جسے اس نے وحی سے حاصل کیا ہے بخیل نہیں ہے۔

(۲۵) یہ قرآن شیطانِ رجیم کا قول نہیں ہے۔

تفسیر

وحیِ الٰہی اس پر نازل ہوئی

پروردگارِ عالم گزشتہ آیتوں کے بعد، جو قیامت و معاد اور اس کے مقدمات اور محشر کے عظیم دن کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں، ان آیتوں میں قرآن کی حقانیت اور پیغمبرِ اسلامؐ کی گفتار کے سچ ہونے کی بحث کو پیش کرتا ہے اور معاد کے بارے میں جو کچھ گزشتہ آیات میں آیا، حقیقت میں اس کی تائید کرتا ہے اور آگاہی بخشنے والی قسموں کے ساتھ ان مطالب کی تائید کرتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے:

"قسم ہے ستاروں کی جو لوٹتے ہیں" (فلا اقسم بالخنس)[1] "چلتے ہیں اور نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں" (الجوار الکنس)۔

"خنس"، "خانس" کی جمع ہے "خنس" (بروزن شمس) کے مادہ سے اصل میں انقباض، بازگشت اور پنہاں ہونے کے معنی میں ہے۔ اور شیطان کو اس لیے خناس کہتے ہیں کہ وہ خود کو چھپائے رکھتا ہے اور جس وقت خدا کا نام لیا جاتا ہے تو وہ منقبض ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: (الشیطان یوسوس الی العبد فاذا ذکر اللہ خنس) شیطان ہمیشہ خدا کے بندوں کو وسوسہ میں ڈالتا ہے لیکن جس وقت خدا کو یاد کریں تو پلٹ جاتا ہے[2]

---

[1] یہ کہ لا اقسم میں "لا" نافیہ ہے یا زائد اور تاکید کے لیے ہے مفسرین نے اس سلسلہ میں کئی بحثیں کی ہیں۔ اور چونکہ سورہ قیامت کی ابتدا میں اسی جلد میں اس عنوان پر ہم بحث کر چکے ہیں لہٰذا تکرار کی ضرورت نہیں۔

[2] لسان العرب مادہ خنس۔

«جوار» «جاریہ» کی جمع ہے جس کے معنی تیز رفتار کے ہیں۔ «کنس» کانس کی جمع ہے۔ «کنس» (بروزن شمس) کے مادہ سے چھپ جانے کے معنی ہیں۔ اور کناس (بروزن پلاس) پرندوں کے گھونسلوں، ہرنوں اور دوسرے وحشی جانوروں کے چھپنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔

یہ کہ ان قسموں سے کیا مراد ہے بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس سے نظام شمسی کے پانچ سیاروں کی طرف اشارہ ہے جو دوربین کے بغیر دیکھے جا سکتے ہیں۔ (عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری، زحل) اس کی وضاحت یہ ہے کہ اگر ہم پے درپے چند راتوں کو آسمان پر نگاہ لگائے رکھیں تو اس حقیقت کو سمجھنے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ آسمان کے ستارے اجتماعی طور پر بتدریج طلوع ہوتے ہیں اور اکٹھے ہی غروب ہوتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے فاصلوں میں کوئی تبدیلی رونما ہو۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایسے مروارید ہیں جو ایک سیاہ پارچہ پر معین و مقرر فاصلوں پر ٹانکے گئے ہیں۔ اس پارچہ کو ایک طرف سے اوپر لے جاتے ہیں اور دوسری طرف سے نیچے کھینچتے ہیں۔ صرف پانچ ستارے ہیں جو اس قانون کلی سے مستثنیٰ ہیں یعنی دوسرے ستاروں کے درمیان چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ گویا پانچ مروارید ٹنکے ہوئے نہیں ہیں اور اس پارچہ پر آزاد قرار دیئے گئے ہیں اور وہ لوٹتے پوٹتے رہتے ہیں۔

یہ وہی مذکورہ بالا پانچ ستارے ہیں جو نظام شمسی کے خاندان کے ارکان ہیں اور ان کی حرکت قریب ہونے کی وجہ سے ہمیں محسوس ہوتی ہے ورنہ آسمان کے تمام ستارے ہی اس قسم کی حرکات کے حامل ہیں۔ لیکن چونکہ وہ ہم سے دور ہیں لہٰذا ہم ان کی حرکات کو محسوس نہیں کرتے۔

پھر اس نکتہ کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ علمائے ہیئت نے ان ستاروں کا نام «نجوم متحیرہ» رکھا ہے اس لیے کہ ان کی حرکات خط مستقیم پر نہیں ہے اور اس طرح نظر آتا ہے کہ ایک مدت تک سیر کرتے ہیں پھر تھوڑا سا واپس پلٹ آتے ہیں۔ دوبارہ اپنی سیر شروع کر دیتے ہیں جس کے اسباب کے بارے میں علم ہیئت میں بہت سے مباحث ہیں۔

مندرجہ بالا آیات ہو سکتا ہے کہ اس طرف اشارہ ہوں کہ یہ ستارے حرکت رکھتے ہیں (الجوار) اور اپنی سیر و حرکت میں رجوع و بازگشت رکھتے ہیں (الخنس) اور انجام کار سورج کے طلوع کے وقت پنہاں ہو جاتے ہیں ان ہرنوں کی طرح جو راتوں کو بیابانوں میں اپنی غذا تلاش کرنے کے لیے پھرتے رہتے ہیں اور صبح کے وقت شکاریوں اور وحشی جانوروں کے خوف سے اپنے کناس اور غار میں مخفی ہو جاتے ہیں (الکنس)

یہ احتمال بھی ہے کہ کنس سے مراد ان کا سورج کی شعاؤں میں پوشیدہ ہونا ہے اس اعتبار سے سورج کے گردش کرتے وقت کبھی اس نقطہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ سورج کے قریب ہو جاتے ہیں اور پھر بالکل نظر نہیں آتے جسے علمائے نجوم احتراق سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے جو ان ستاروں کی

وضع وکیفیت کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہوتا ہے۔

بعض مفسرین کنس کو ان ستاروں کے آسمان کے برجوں میں قرار پانے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو ہرنوں کے اپنے ٹھکانوں میں پنہاں ہونے سے مشابہت رکھتا ہے۔البتہ یہ معلوم ہے کہ نظامِ شمسی کے سیارے صرف ان پانچ تک محدود نہیں ہیں اور تین دوسرے سیارے اورانوس، پلوٹون اور نپٹون بھی موجود ہیں جو صرف ان دوربینوں سے دیکھے جا سکتے ہیں جو ستاروں کو دکھاتی ہیں اور وہ کرۂ ارض کے ساتھ مل کر نظامِ شمسی کے نو سیاروں کو تشکیل دیتے ہیں (البتہ یہ نو سیارے ایک یا کئی چاند رکھتے ہیں جن کا حساب اس جمع سے الگ ہے)۔

"جواری" جو جاریہ کی جمع ہے اور جس کے معنی وہ کشتیاں ہیں جو چل رہی ہوں،ایک لطیف تعبیر ہے جو ان ستاروں کی آسمان کے سمندر میں حرکت اور چلنے کو کشتیوں کے سمندروں اور دریاؤں میں چلنے سے تشبیہ دیتی ہے۔

بہرحال قرآن مجید گویا یہ چاہتا ہے کہ ان پُرمعنی اور ایک قسم کے ابہام کی آمیزش رکھنے والی قسموں کے ساتھ افکار انسانی کو بیدار کرے اور انہیں آسمان کے ستاروں کی عظیم فوج اور دستوں کے درمیان جو ان سیاروں کی مخصوص اور استثنائی وضع وکیفیت ہے اس کی طرف متوجہ کرے تاکہ ان اجرامِ فلکی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ غور وفکر کے بعد دماغِ انسانی اس عظیم دست گاہ کو عالمِ وجود میں لانے والے کی عظمت سے آشنا ہو۔

بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیات کی کچھ اور تفسیریں بھی کی ہیں لیکن چونکہ وہ قابلِ ملاحظہ نہیں لہٰذا ان کا ذکر چھوڑ دیا گیا ہے۔

ایک حدیث میں جو امیر المومنینؑ سے منقول ہے' آیا ہے کہ آپ نے ان آیات کی تفسیر میں فرمایا (ھی خمسة انجم زحل والمشتری والمریخ والزھرة وعطارد) وہ پانچ ستارے ہیں زحل، مشتری، مریخ، زہرہ اور عطارد ہیں[1]

پس دوسری مرتبہ قسم کھا کر فرماتا ہے: "قسم ہے رات کی جب وہ اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ (والیل اذا عسعس)

"عسعس"، "عسعسة" کے مادہ سے اصل میں رقیق اور ہلکی تاریکی کے معنی میں ہے اور چونکہ رات کی ابتدا اور انتہا میں تاریکی زیادہ ہلکی ہوتی ہے لہٰذا یہ معنی رات کے پشت پھیرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اور لفظ "عسعس" کا اطلاق رات کو گردش کرنے والے ملازمین پر بھی اسی مناسبت سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے اگرچہ یہ لفظ مکمل طور پر دو مختلف معانی رکھتا ہے لیکن یہاں بعد میں آنے

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۴۶۔

والی آیت کے قرینے کے پیش نظر جو صبح کی بات کرتی ہے مراد رات کا اختتام ہی ہے اور حقیقت میں اس قسم کے مشابہ ہے جو سورہ مدثر کی آیت ۳۳ میں آئی ہے (واللیل اذ ادبر)

اصولی طور پر رات جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے خدا کی عظیم نعمتوں میں سے ہے جو جسم و رُوح کے آرام و سکون کا باعث بھی ہے اور حرارت آفتاب کے اعتدال اور موجودات کی زندگی کے جاری رہنے کا سبب بھی ہے لیکن اختتامِ شب پر انحصار ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ وہ روشنی اور نور کی طرف رخ کیے ہوتے ہے اور اس سے قطع نظر پروردگار سے مناجات اور عبادت کرنے کے لیے بہترین وقت ہے اور عالم زندگانی کے آغاز و حرکت کا لمحہ ہے۔

آخر کار تیسری اور آخری قسم کی جانب رُخ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"قسم ہے صبح کی جبکہ وہ سانس لے" (والصبح اذا تنفس)۔ کیا ہی عمدہ اور جاذب توجہ تعبیر ہے۔ صبح کو زندہ موجود سے تشبیہ دی ہے کہ اس کے تنفس یعنی سانس لینے کی ابتدا طلوعِ سپیدۂ سحری سے ہوتی ہے وہ تمام موجودات میں روحِ حیات پھونکتی ہے۔ گویا ایک کالے حبشی لشکر کے ہاتھ اور پاؤں کے نیچے اس کا سانس رُک گیا تھا اور نور و روشنی کی پہلی شعاع کے چمکنے سے اس کے چنگل سے آزاد ہو کر تازہ سانس لینے لگی ہے۔

یہ تعبیر اس تعبیر کے مشابہ ہے جو سورہ مدثر میں رات کی قسم کے بعد آئی ہے جس میں فرماتا ہے: (والصبح اذا اسفر) "قسم ہے صبح کی جب وہ اپنے چہرہ سے نقاب ہٹاتے" گویا رات کی تاریکی سیاہ نقاب کے مانند ہے جو صبح کے چہرہ پر پڑی ہے۔ سپیدۂ سحر کے وقت نقاب ہٹا کر اپنا نورانی اور حیات افزا چہرہ جو زندگی کی نشانی ہے، ساری دنیا کو دکھاتی ہے۔

بعد والی آیت میں اس چیز کو جس کی خاطر یہ ساری قسمیں کھائی گئی ہیں پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"یقیناً یہ قرآن صاحب عزت اور عظیم بھیجے ہوتے کا کلام ہے (جبرائیل امینؑ) جسے وہ خدا کی طرف سے اس کے پیغمبرؐ کی طرف لایا ہے" (انہ لقول رسول کریم)۔ یہ ان لوگوں کا جواب ہے جو پیغمبرؐ پر اتہام لگاتے تھے کہ قرآن انہی کا بنایا ہوا ہے اور اس کو خدا سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

اس آیت میں اور بعد والی آیت میں جبرائیل امینؑ جو خدا کے پیک وحی ہیں ان کے پانچ اوصاف بیان ہوتے ہیں جو درحقیقت ایسے ہیں جو ہر جامع الشرائط بھیجے جانے والے کے لیے لازمی ہیں۔

اس کی پہلی توصیف کریم ہونا ہے جو اس کے وجود کی قدر و قیمت کی طرف اشارہ ہے۔ جی ہاں وہ خداوند بزرگ کی طرف سے ہے اور قیمتی وجود کا حامل ہے۔

اس کے بعد اس کے دوسرے اوصاف پیش کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "وہ صاحب قدرت ہے

اور عرش والے خدا کی بارگاہ میں بلند مقام کا حامل ہے" (ذی قوۃ عند ذی العرش مکین) [1]

ذی العرش خدا کی پاک ذات کی طرف اشارہ ہے۔ اگرچہ وہ تمام عالم ہستی کا مالک ہے لیکن چونکہ عرش، چاہے وہ اس عالم کے معنی میں ہو جو ماوراے طبیعت ہے یا خدا کے علمِ مکنون کے مقام کے معنی میں ہو بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے لہٰذا صاحبِ عرش کہہ کر اس کی تعریف کی گئی ہے۔

"ذی قوۃ" (صاحبِ قدرت) کی تعبیر جبرائیلؑ کے بارے میں اس بنا پر ہے کہ اس قسم کے عظیم پیغام کے حصول اور اس کے باریک بینی پر مبنی ابلاغ کے لیے بڑی قدرت و توانائی کی ضرورت ہے اور اصولی طور پر ہر رسول کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی رسالت کے حدود میں صاحبِ قدرت ہو اور بالخصوص ہر قسم کی فراموشی سے مبرّا ہو جو ابلاغ کی راہ میں حائل ہو۔

مکین اس شخص کے معنوں میں ہے جو صاحبِ منزلت و مکانت ہو۔ بنیادی طور پر ضروری ہے کہ رسول کی شخصیت عظیم ہو تاکہ خدا کی رسالت اور نمائندگی کا فریضہ انجام دے سکے اور مقرب بارگاہِ الٰہی ہو۔ اور یہ مسلّم ہے کہ عند کی تعبیر حضورِ مکانی کے معنوں میں نہیں ہے، وہ اس لیے کہ خدا کوئی مکان نہیں رکھتا۔ اس سے مراد حضورِ معنوی ہے۔

چوتھی اور پانچویں توصیف میں کہتا ہے "وہ فرشتوں کا فرمانروا اور مطاع ہے" (مطاع ثم امین)۔

ثَمَّ کی تعبیر جو اشارہ بعید کے لیے استعمال ہوتی ہے اس حقیقت کو پیش کرتی ہے کہ پیک وحیِ الٰہی عالمِ فرشتگان میں موردِ اطاعت ہے اور ان تمام چیزوں سے قطع نظر پیامِ الٰہی کے ابلاغ میں انتہائی امین ہے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی جبرائیل امین قرآن کی آیات کے پہنچانے کے سلسلہ میں فرشتوں کے ایک عظیم گروہ کے ہمراہ آتے تھے اور یقیناً ان کے درمیان مطاع تھے یعنی سب فرشتے ان کی اطاعت کرتے تھے اور ایک رسول و سفیر کے لیے ضروری ہے کہ اس کے تمام ہمراہی اس کی اطاعت کرتے ہوں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ ان آیات کے نزول کے موقع پر پیغمبر اکرمؐ نے جبرائیل امین سے فرمایا:

ما احسن ما اثنی علیک ربک: ذی قوۃ عند ذی العرش مکین مطاع ثم امین فما کانت قوتک؟ وما کانت امانتک؟ تیرے پروردگار نے تیری کیا ہی عمدہ تعریف کی ہے کہ فرمایا ہے صاحبِ قدرت ہے اور صاحبِ عرش خدا کے ہاں قرب رکھتا ہے اور وہاں فرمانروا ہے اور امین ہے،

---

[1] "مکین"، "مکانت"، کے مادہ سے مقام و منزلت کے معنوں میں ہے اور جیسا کہ راغب کے مفردات میں کلمات سے اور دوسرے مفسرین سے معلوم ہوتا ہے یہ اصل میں کون کے مادہ سے اسم مکان ہے۔ اس کے بعد کثرتِ استعمال کی بنا پر اسے مادہ فعل کے برابر قرار دیا گیا ہے اور تمکن اس سے مشتق ہوا ہے تمسکن کی طرح جو سکون کے مادہ سے ہے۔

لہٰذا اپنی قدرت و امانت کا نمونہ پیش کر۔

تو جبرائیلؑ نے جواب میں عرض کیا "میری قدرت کا نمونہ یہ ہے کہ میں قوم لوط کے شہروں کی تباہی پر مامور ہوا وہ چار شہر تھے اور ہر شہر میں چار لاکھ جنگجو افراد موجود تھے۔ ان کی اولاد اس کے علاوہ تھی۔ میں نے ان شہروں کو اٹھالیا اور میں انہیں آسمان کی طرف لے گیا یہاں تک کہ آسمان کے فرشتے ان کے جانوروں کی آواز سننے لگے۔ پھر انہیں زمین کی طرف لے آیا اور انہیں زیر و زبر کر دیا۔

"باقی رہا میری امانت کا نمونہ تو وہ یہ ہے کہ کوئی حکم ایسا نہیں ہے جو مجھے دیا گیا ہو اور اس میں میں نے معمولی سا تجاوز بھی کیا ہو"[1]

اس کے بعد لوگ وہ ناروا نسبت، جو پیغمبر کی طرف دیتے تھے، اس کی نفی کرتے ہوئے فرماتا ہے، تمہارا صاحب دیوانہ نہیں ہے (وما صاحبکم بمجنون)۔

"صاحب" کی تعبیر جو ہمیشہ ساتھ رہنے والے رفیق، دوست اور ہم نشین کے معنی میں ہے، علاوہ اس کے کہ پیغمبرؐ تمام لوگوں کے ساتھ اخلاق و تواضع سے پیش آتے تھے اور کبھی کسی کے مقابلہ میں برتری کا دعویٰ نہیں رکھتے تھے۔

اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپؐ نے سالہا سال تمہارے درمیان زندگی گزاری ہے اور تمہارے ہم نشین رہے ہیں اور تم نے انہیں عاقل و امین دیکھا ہے اور سمجھا ہے تو اب کس طرح ان کی طرف جنون کی نسبت دیتے ہو، سوائے اس کے کہ وہ بعثت کے ساتھ ایسی تعلیمات اپنے ہمراہ لائے ہیں جو تمہارے تعصبات، ہوا و ہوس اور کورانہ تقلید کے ساتھ سازگار نہیں ہیں۔

لہٰذا اس خیال سے کہ تم اپنے آپ کو ان کے قوانین اور احکامات کی اطاعت سے بچائے رکھو، اس قسم کے اتہام ان پر لگاتے ہو۔ جنون کا الزام ان تمام الزامات میں سے ایک ہے جو، آیاتِ قرآن کے مطابق، خدا کی طرف سے آئے ہوئے پیغمبروں پر ہٹ دھرم دشمنوں کی طرف سے لگائے گئے۔

(کذالک ما اتی الذین من قبلھم من رسول الّا قالوا ساحر او مجنون) بات اس طرح ہے کہ ان سے پہلے کوئی پیغمبر کسی قوم کی طرف نہیں بھیجا گیا مگر یہ کہ اس نے کہا کہ یہ ساحر اور جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔ (ذاریات۔ ۵۲)۔

ان کی منطق میں عاقل وہ شخص تھا جو فاسد ماحول میں گھل مل جائے اور ویسی ہی خواہشات کی پیروی کرے۔ جدھر کی ہوا ہو ادھر کو چلے اور ہر اصلاحی و انقلابی تحریک سے بے تعلق رہے۔ اس معیار اور ضابطے کے مطابق دنیا پرستوں کی تاریک نگاہ میں تمام پیغمبر دیوانے تھے۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۴۶۔ یہی مضمون تفسیر درالمنثور میں بھی زیر بحث آیات کے ذیل میں آیا ہے۔

اس کے بعد پیغمبر اسلامؐ کے جبرائیل امین سے ارتباط کی تاکید کے لیے مزید فرماتا ہے: "اس نے یقینی طور پر جبرائیل کا واضح اور آشکار افق میں مشاہدہ کیا ہے" (ولقد راٰہ بالافق المبین)۔

افق مبین سے مراد وہی افق اعلیٰ اور فرشتوں کو آشکار کرنے والا افق ہے جس میں پیغمبر اکرمؐ نے جبرائیل کا مشاہدہ کیا۔

بعض مفسرین نے سورہ نجم کی آیت، کو جس میں ہے (وھو بالافق الاعلیٰ) اس تفسیر پر شاہد سمجھا ہے لیکن جیسا کہ سورہ نجم کی تفسیر میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ آیت اس سورہ کی باقی آیات کی طرح ایک دوسری حقیقت کو بیان کرتی ہے جو اس کی طرف رجوع کرنے سے واضح ہوگی۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ پیغمبرؐ نے جبرائیلؑ کا ان کی اصلی شکل و صورت میں دوبار مشاہدہ کیا۔ ایک دفعہ آغازِ بعثت میں کہ جبرائیل آنحضرتؐ کے سامنے افق بالا پر ظاہر ہوئے اور تمام مشرق و مغرب کو ڈھانپ لیا اور دوسری مرتبہ معراج میں کہ پیغمبرؐ نے انہیں اوپر والے آسمان میں اُن کی اصلی شکل میں دیکھا اور مفسرین زیرِ بحث آیت کو اسی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ خدا کی مراد ایسا مشاہدہ ہو جو شہودِ باطنی کے لحاظ سے ہو۔ مزید وضاحت کے لیے جلد ۲۲ ص ۷۰۴ سے آگے سورہ نجم کی آیت ۵ تا ۱۳ کی طرف رجوع فرمایئے۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "پیغمبر اس چیز کے بارے میں جو اس نے بطریق وحی عالم غیب سے حاصل کی ہے بخیل نہیں ہے" (وما ھو علی الغیب بضنین)۔ ہر چیز بے کم و کاست بندگانِ خدا کے اختیار میں دے دیتا ہے۔

وہ بہت سے دوسرے لوگوں کے مانند نہیں کہ جب کسی اہم حقیقت پر دسترس حاصل کر لیتے ہیں تو اس کو چھپانے پر اصرار کرتے ہیں اور اکثر اس کے بیان کرنے پر بخل سے کام لیتے ہیں اور بسا اوقات ان معلومات کو اپنے ساتھ قبر میں لے جاتے ہیں۔

پیغمبرؐ ایسے نہیں ہیں، وہ پورے جود و سخا کے ساتھ، جو کچھ حاصل کرتے ہیں اُسے تمام ضرورت مندوں کے سامنے بیان کر دیتے ہیں حتیٰ کہ انہیں بھی بتا دیتے ہیں جو بلندی اور قرب کے قائل ہی نہیں ہیں اس امید پر کہ شاید ہدایت حاصل کریں اور راہِ حق کو اختیار کریں۔

"ضنین" "ضنّۃ" (بروزن منّۃ) نفیس اور قیمتی اشیاء کے بارے میں بخل کرنے کے معنی میں ہے اور یہ ایک ایسا عیب ہے جو کبھی کسی پیغمبر میں نہیں ہوتا اور اگر دوسرے افراد اپنے علوم کے بارے میں ایسے عیب کا شکار ہیں تو ہوا کریں، پیغمبر جس کے علم کا سرچشمہ علم خدا کا بیکراں سمندر ہے، اس قسم کی باتوں سے مبرا ہے۔

پروردگارِ عالم مزید فرماتا ہے: "اور وہ شیطانِ رجیم کی کہی ہوئی بات نہیں ہے" (وما ھو بقول

شیطان رجیم) ۔ یہ آیاتِ قرآنی ہرگز کاہنوں کی باتوں کی طرح نہیں ہیں جو شیاطین سے تعلق کی وجہ سے معلوم کر لیتے تھے ۔ اور پھر اس حقیقت کی نشانیاں اس کے کلام سے ظاہر ہیں ۔

اس لیے کہ کاہنوں کی باتیں جھوٹی ہوتی تھیں ۔ ان میں بہت سے شبہات ہوتے تھے اور وہ غلطیوں کی آمیزش سے ملوث ہوتی تھیں ، اور شیطانی میلانات و خواہشات کے گرد گھومتی تھیں ۔ اس چیز کا قرآن مجید سے کوئی تعلق نہیں ۔

یہ حقیقت میں ان کی دوسری تہمت کا جواب ہے ۔ مشرکین کہتے تھے کہ پیغمبر اسلامؐ (معاذ اللہ) کاہن ہیں اور جو کچھ وہ لائے ہیں انہوں نے شیاطین سے لیا ہے ۔ حالانکہ شیطانی باتیں گمراہ کن ہوتی ہیں اور قرآنی آیات سراسر نورِ ہدایت اور روشنی ہیں اور یہ حقیقت قرآنی آیات کو دیکھتے ہی ثابت ہو جاتی ہے ۔

لفظ " رجیم " اصل میں رجم اور " رجام " (بروزن لجام) کے مادہ سے پتھر کے معنی میں لیا گیا ہے ۔ اس کے بعد ہر قسم کے دور کرنے کے معنی میں آیا ہے اور شیطان رجیم سے مراد یہاں یہی معنی ہیں ، یعنی وہ شیطان جو بارگاہِ خداوندی سے نکالا گیا ہے ۔

ایک نکتہ

رسول کی شائستگی کی شرطیں

پانچ صفتیں جو مندرجہ بالا آیات میں جبرائیل امین کے لیے پیغمبر گرامی اسلامؐ کی طرف خدا کے بھیجے ہوئے قاصد کے عنوان کے ماتحت آئی ہیں ، ان میں سے دو صفتیں ایسی ہیں جو ہر رسول اور فرستادۂ خدا میں سلسلہ مراتب کو نظر میں رکھتے ہوئے پائی جانی ضروری ہیں ۔

پہلی صفت کرامت اور عمدہ صفاتِ نفسی کا حامل ہونا ہے جو اس کو رسالت جیسے اہم کام کا اہل بنا دیں ۔

دوسری صفت قدرت کا حامل ہونا ہے ۔ (ذی قوۃ) تاکہ اپنے اثر رسالت کو لے کر قاطعیت اور توانائی کے ساتھ وہ آگے بڑھے اور ہر قسم کے ضعف اور کمزوری سے دور ہو ۔

اس کے بعد اُس ہستی کی بارگاہ میں مقام و منزلت رکھنا جس کی رسالت کو اس نے قبول کیا ہے (مکین) تاکہ پیغامات کو اچھی طرح حاصل کرے اور اگر جواب کی ضرورت ہو تو بغیر کسی خوف و خطر کے اس کا ابلاغ کرے ۔

چوتھی صفت یہ کہ اگر امرِ رسالت اہمیت رکھتا ہو تو اس کے معاون ہونے چاہئیں جو اس کی مدد کریں ۔ ایسے معاون جو اطاعت گزار و فرمانبردار ہوں ۔ (مطاع)

سلامتی کے دشمن ہو؟اس کے بعد مزید فرماتا ہے :

"یہ قرآن تمام لوگوں کے لیے نصیحت ہی نصیحت ہے" (ان ھو الّا ذکر للعالمین) سب کو نصیحت کرتا ہے تاکہ وہ خواب غفلت سے بیدار ہوں اور چونکہ ہدایت و تربیت کے لیے فاعل کی صرف فاعلیت ہی کافی نہیں ہے بلکہ قابل کی قابلیت بھی درکار ہے لہٰذا بعد میں آنے والی آیت میں مزید فرماتا ہے :

"قرآن ان لوگوں کے لیے ہدایت کا باعث ہے جو تم میں سے چاہتے ہیں کہ صراطِ مستقیم اختیار کریں" (لمن شاء منکم ان یستقیم) ۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں فرماتا ہے کہ قرآن تمام لوگوں کے لیے نصیحت و بیداری کا سبب ہے اور اس آیت میں صرف ایک گروہ کا ذکر کرتا ہے، وہ لوگ جو ہدایت کو قبول کرنے اور راہ راست اختیار کرنے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں ۔

یہ فرق اس بنا پر ہے کہ گزشتہ آیت فیضِ الٰہی کی عمومیت کو بیان کرتی ہے اور یہ آیت اس فیض سے فائدہ اٹھانے کی شرط کو پیش کرتی ہے ۔ تمام مواہب اور نعمتیں اسی طرح ہیں کہ اصل فیض عام ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانا ارادہ کی پختگی سے مشروط ہے ۔

انہی معانی کو لیے ہوتے سورہ بقرہ کی آیت ۲ بھی آئی ہے (ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدًی للمتقین) اس کتاب میں کوئی شک و تردد نہیں ہے اور یہ پرہیزگاروں کے لیے سبب ہدایت ہے ۔

بہرحال یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو بتاتی ہیں کہ خدا نے انسان کو آزاد اور خود مختار پیدا کیا ہے اور راہ حق و باطل کو طے کرنے کا آخری فیصلہ اس کے اختیار میں ہے ۔

یستقیم کی تعبیر جاذبِ توجہ اور عمدہ ہے جو بتاتی ہے کہ راہِ اصلی جو انسان کے سامنے قرار پائی ہے وہ راہِ ہدایت و سعادت ہے، باقی سب راستے منحرف کر دینے والے ہیں ۔

انسان کی تمام اندرونی اور بیرونی توانائیاں مجتمع ہیں کہ اسے راہِ مستقیم پر چلائیں اور اگر افراط و تفریط، شیطانی وسوسے اور گمراہ کرنے والے پروپیگنڈے درمیان میں نہ ہوں تو انسان ندائے فطرت کے ذریعہ اس صراطِ مستقیم پر قدم رکھ سکتا ہے ۔

ہمیں معلوم ہے کہ خطِ مستقیم ہمیشہ مقصد کی نزدیک ترین راہ ہوتا ہے لیکن چونکہ اس بات کا امکان ہے کہ انسان کا ارادہ یہ توہم پیدا کرے کہ آدمی اس طرح آزاد ہے کہ اس راستے کو طے کرنے میں الٰہی توفیق کی کوئی احتیاج نہیں رکھتا تو بعد میں آنے والی آیت میں، جو اس سورہ کی آخری آیت ہے فرماتا ہے :

"تم ارادہ نہیں کرتے مگر یہ کہ عالمین اور تمام جہانوں کا پروردگار ارادہ کرے" (وما تشاؤون الّا ان یشاء اللہ رب العالمین) ۔ درحقیقت ان دونوں آیات کا مجموعہ اس دقیق و ظریف مسئلہ امرٌ بین الامرین کو بیان کرتا ہے ۔ ایک طرف کہتا ہے ارادہ کی پختگی تمہارے اپنے اختیار میں ہے اور دوسری طرف کہتا ہے جب تک خدا نہ چاہے تم ارادہ نہیں کر سکتے یعنی اگر تمہیں مختار و آزاد پیدا کیا گیا ہے تو یہ اختیار و آزادی بھی خدا کی جانب سے

شیطان رجیم)۔ یہ آیاتِ قرآنی ہرگز کاہنوں کی باتوں کی طرح نہیں ہیں جو شیاطین سے تعلق کی وجہ سے معلوم کر لیتے تھے۔ اور پھر اس حقیقت کی نشانیاں اس کے کلام سے ظاہر ہیں۔

اس لیے کہ کاہنوں کی باتیں جھوٹی ہوتی تھیں۔ ان میں بہت سے شبہات ہوتے تھے اور وہ غلطیوں کی آمیزش سے ملوث ہوتی تھیں، اور شیطانی میلانات و خواہشات کے گرد گھومتی تھیں۔ اس چیز کا قرآن مجید سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ حقیقت میں ان کی دوسری تہمت کا جواب ہے۔ مشرکین کہتے تھے کہ پیغمبر اسلامؐ (معاذ اللہ) کاہن ہیں اور جو کچھ وہ لائے ہیں انہوں نے شیاطین سے لیا ہے۔ حالانکہ شیطانی باتیں گمراہ کن ہوتی ہیں اور قرآنی آیات سراسر نورِ ہدایت اور روشنی ہیں اور یہ حقیقت قرآنی آیات کو دیکھتے ہی ثابت ہو جاتی ہے۔

لفظ "رجیم" اصل میں "رجم" اور "رجام" (بروزن لجام) کے مادہ سے پتھر کے معنی میں لیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہر قسم کے دور کرنے کے معنی میں آیا ہے اور شیطان رجیم سے مراد یہاں یہی معنی ہیں، یعنی وہ شیطان جو بارگاہِ خداوندی سے نکالا گیا ہے۔

ایک نکتہ

رسول کی شائستگی کی شرطیں

پانچ صفتیں جو مندرجہ بالا آیات میں جبرائیل امین کے لیے پیغمبر گرامی اسلامؐ کی طرف خدا کے بھیجے ہوئے قاصد کے عنوان کے ماتحت آئی ہیں ان میں سے دو صفتیں ایسی ہیں جو ہر رسول اور فرستادۂ خدا میں سلسلہ مراتب کو نظر میں رکھتے ہوئے پائی جانی ضروری ہیں۔

پہلی صفت کرامت اور عمدہ صفاتِ نفسی کا حامل ہونا ہے جو اس کو رسالت جیسے اہم کام کا اہل بنا دیں۔

دوسری صفت قدرت کا حامل ہونا ہے۔ (ذی قوۃ) تاکہ اپنے اثر رسالت کو لے کر قاطعیت اور توانائی کے ساتھ وہ آگے بڑھے اور ہر قسم کے ضعف اور کمزوری سے دور ہو۔

اس کے بعد اُس ہستی کی بارگاہ میں مقام و منزلت رکھنا جس کی رسالت کو اس نے قبول کیا ہے (مکین) تاکہ پیغامات کو اچھی طرح حاصل کرے اور اگر جواب کی ضرورت ہو تو بغیر کسی خوف و خطر کے اس کا ابلاغ کرے۔

چوتھی صفت یہ کہ اگر امرِ رسالت اہمیت رکھتا ہو تو اس کے معاون ہونے چاہئیں جو اس کی مدد کریں۔ ایسے معاون جو اطاعت گزار و فرمانبردار ہوں۔ (مطاع)

آخری صفت اس کا امانت دار ہونا ہے تاکہ وہ لوگ جو اس رسول سے پیغام لیں اس پر اعتماد کریں اور اس کی گفتگو بے کم و کاست اُس کا کلام شمار ہو جس کی طرف سے وہ آیا ہے۔

جب یہ پانچ اصول پورے ہوں تو پھر حق رسالت و پیغمبری ادا ہوگا۔ اسی لیے ہم پیغمبر اسلامؐ کے حالات اور آپؐ کی تاریخ زندگی میں دیکھتے ہیں کہ آپؐ اپنے بھیجے ہوئے ایلچیوں کو بہت زیادہ احتیاط سے ساتھ ان افراد میں سے جو ان صفات کے حامل ہوتے تھے منتخب کرتے تھے جس کا ایک زندہ نمونہ جناب امیرالمومنین حضرت علیؑ کی ذات ہے اور پیغمبرؐ کی طرف سے سورہ برأت کی ابتدائی آیات کی مشرکین مکہ کے سامنے ان خاص حالات میں تبلیغ ہے جس کی تفصیل سورہ برات میں آچکی ہے۔

حضرت فرماتے ہیں: (رسولك ترجمان عقلك وكتابك ابلغ ماينطق عنك) تیرا بھیجا ہوا تیری عقل کو نمایاں کرتا ہے اور تیرا خط تیری بات کا نہایت پرگو ناطق ہے [1]

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار کلمہ ۳۰۱۔

(۲۶) فَاَیۡنَ تَذۡهَبُوۡنَ ؕ
(۲۷) اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ۙ
(۲۸) لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ یَّسۡتَقِیۡمَ ؕ
(۲۹) وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۠

ترجمہ

(۲۶) پس تم کہاں جا رہے ہو؟
(۲۷) یہ قرآن عالمین کے لیے صرف نصیحت ہے۔
(۲۸) ان لوگوں کے لیے جو چاہتے ہیں کہ نصیحت حاصل کریں۔
(۲۹) اور تم نہیں چاہتے مگر وہ جو عالمین کا پروردگار چاہے۔

تفسیر

اے غافلو! کہاں جا رہے ہو؟

گزشتہ آیات میں یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے اس لیے کہ اس کے مضامین سے ہویدا ہے کہ یہ شیطانی کلام نہیں ہے بلکہ رحمٰن کا کلام ہے جو پیک وحیِ الٰہی کے ذریعہ، قدرت و امانتِ کلی کے ساتھ، اس پیغمبر پر، جو انتہائی طور پر اعتدالِ عقلی کا حامل ہے، نازل ہوا ہے۔ ایسا پیغمبر جس نے تبلیغ رسالت کے سلسلہ میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا اور جو کچھ اسے تعلیم دی گئی ہے اس نے اسے بے کم و کاست بیان کیا ہے۔

پروردگارِ عالم زیر بحث آیات میں مخالفین کو اس عظیم کلام کی پیروی نہ کرنے کی وجہ سے مستحق سرزنش قرار دیتا ہے اور ایک استفہام توبیخی کے ساتھ فرماتا ہے:

"ان حالات میں تم کہاں جا رہے ہو" (فاین تذهبون)۔ کیوں راہ راست کو چھوڑ کر بے راہ روی اختیار کرتے ہو اور کیوں اس چراغ فروزاں سے منہ موڑ کر تاریکی کی طرف رواں دواں ہو۔ کیا تم اس سعادت و

سلامتی کے دشمن ہو؟ اس کے بعد مزید فرماتا ہے :

"یہ قرآن تمام لوگوں کے لیے نصیحت ہی نصیحت ہے" (ان ھو الّا ذکر للعالمین) سب کو نصیحت کرتا ہے تاکہ وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہوں اور چونکہ ہدایت و تربیت کے لیے فاعل کی صرف فاعلیت ہی کافی نہیں ہے بلکہ قابل کی قابلیت بھی درکار ہے لہٰذا بعد میں آنے والی آیت میں مزید فرماتا ہے :

"قرآن ان لوگوں کے لیے ہدایت کا باعث ہے جو تم میں سے چاہتے ہیں کہ صراطِ مستقیم اختیار کریں" (لمن شاء منکم ان یستقیم)۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں فرماتا ہے کہ قرآن تمام لوگوں کے لیے نصیحت و بیداری کا سبب ہے اور اس آیت میں صرف ایک گروہ کا ذکر کرتا ہے، وہ لوگ جو ہدایت کو قبول کرنے اور راہ راست اختیار کرنے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں۔

یہ فرق اس بنا پر ہے کہ گزشتہ آیت فیضِ الٰہی کی عمومیت کو بیان کرتی ہے اور یہ آیت اس فیض سے فائدہ اٹھانے کی شرط کو پیش کرتی ہے۔ تمام مواہب اور نعمتیں اسی طرح ہیں کہ اصل فیض عام ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانا ارادہ کی پختگی سے مشروط ہے۔

انہی معانی کو لیے ہوئے سورہ بقرہ کی آیت ۲ بھی آئی ہے (ذالک الکتاب لا ریب فیہ ھدًی للمتقین) اس کتاب میں کوئی شک و تردد نہیں ہے اور یہ پرہیزگاروں کے لیے سبب ہدایت ہے۔

بہر حال یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو بتاتی ہیں کہ خدا نے انسان کو آزاد اور خود مختار پیدا کیا ہے اور راہِ حق و باطل کو طے کرنے کا آخری فیصلہ اس کے اختیار میں ہے۔

یستقیم کی تعبیر جاذبِ توجہ اور عمدہ ہے جو بتاتی ہے کہ راہِ اصلی جو انسان کے سامنے قرار پائی ہے وہ راہِ ہدایت و سعادت ہے۔ باقی سب راستے منحرف کر دینے والے ہیں۔

انسان کی تمام اندرونی اور بیرونی توانائیاں مجتمع ہیں کہ اسے راہِ مستقیم پر چلائیں اور اگر افراط و تفریط، شیطانی وسوسے اور گمراہ کرنے والے پروپیگنڈے درمیان میں نہ ہوں تو انسان خدائے فطرت کے ذریعہ اس صراطِ مستقیم پر قدم رکھ سکتا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ خطِ مستقیم ہمیشہ مقصد کی نزدیک ترین راہ ہوتا ہے لیکن چونکہ اس بات کا امکان ہے کہ انسان کا ارادہ یہ توہم پیدا کرے کہ آدمی اس طرح آزاد ہے کہ اس راستے کو طے کرنے میں الٰہی توفیق کی کوئی احتیاج نہیں رکھتا تو بعد میں آنے والی آیت میں، جو اس سورہ کی آخری آیت ہے فرماتا ہے :

"تم ارادہ نہیں کرتے مگر یہ کہ عالمین اور تمام جہانوں کا پروردگار ارادہ کرے" (وما تشاؤون الّا ان یشاء اللہ رب العالمین)۔ درحقیقت ان دونوں آیات کا مجموعہ اس دقیق و ظریف مسئلہ امرٌ بین الامرین کو بیان کرتا ہے۔ ایک طرف کہتا ہے ارادہ کی پختگی تمہارے اپنے اختیار میں ہے اور دوسری طرف کہتا ہے جب تک خدا نہ چاہے تم ارادہ نہیں کر سکتے۔ یعنی اگر تمہیں مختار و آزاد پیدا کیا گیا ہے تو یہ اختیار و آزادی بھی خدا کی جانب سے

ہے۔ اس نے چاہا ہے کہ تم ایسے رہو۔

انسان اپنے اعمال میں نہ مجبور ہے نہ سو فیصدی آزاد ہے۔ نہ طریقۂ جبر صحیح ہے نہ طریقۂ تفویض۔ بلکہ جو کچھ انسان کے پاس ہے وہ جسم و ہوش، عقل و توانائی، ارادہ کی پختگی کی قوت، وہ سب خدا کی جانب سے ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جو ہمیشہ اسے ایک طرف تو خالق کا محتاج و نیاز مند بناتی ہے اور دوسری طرف اس کی آزادی اور اختیار کے تقاضے کی بنا پر اسے ذمہ داری سونپتی ہے۔

"رب العالمین" کی تعبیر اچھی طرح بتاتی ہے کہ مشیت الٰہی بھی انسان اور تمام عالمین کی تربیت، تکامل اور ارتقاء کی راہ میں دخل رکھتی ہے وہ کبھی بھی نہیں چاہتا کہ کوئی گمراہ ہو اور گناہ کر کے اس کے جوارِ رحمت سے دور ہو۔ وہ اپنے ربوبیت کے تقاضے سے ان تمام لوگوں کی مدد کرتا ہے جو چاہتے ہیں کہ راہِ ارتقاء میں قدم رکھیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ مسلکِ جبر کے طرفدار صرف دوسری آیت سے چمٹے ہوتے ہیں جبکہ ممکن ہے کہ تفویض کے طرفدار بھی پہلی آیت سے متوسل ہوں۔ آیات کو ایک دوسرے سے جدا کرنا جو عام طور پر پہلے سے کیے ہوتے غلط فیصلوں کا معلول ہے گمراہی کا سبب ہے۔

آیاتِ قرآن کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھ کر ان کے مجموعہ سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ جب پہلی آیت "لمن شاء منکم ان یستقیم" نازل ہوئی تو ابوجہل نے جو عملی طور پر نظریہ تفویض کا حامی تھا، کہا بڑا اچھا ہوا کہ تمام اختیارات ہمیں دے دیئے گئے ہیں۔ یہی موقع تھا کہ دوسری آیت نازل ہوئی "وما تشاءون الا ان یشاء اللہ رب العالمین"[1]

خداوندا! ہم جانتے ہیں کہ راہ مستقیم کو طے کرنا تیری توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ہمیں اس راہ کو طے کرنے کی توفیق عطا فرما۔

پروردگارا! ہماری خواہش ہے کہ ہم راہِ ہدایت پر چلیں تو بھی ارادہ فرما کہ اس راہ میں ہماری دستگیری فرمائے۔

بارالٰہا! محشر کا منظر اور تیری دادگاہِ عدل و انصاف بہت ہولناک ہے اور ہمارا نامہ اعمال حسنات سے خالی ہے ہمیں اپنے عفو و فضل کی پناہ میں جگہ دے، نہ کہ میزان عدل و انصاف کے سامنے۔ آمین یارب العالمین۔

سورۂ تکویر کا اختتام

---

[1] روح المعانی، جلد ۳۰ ص ۶۲۔ اور روح البیان، جلد ۱۰ ص ۳۵۴۔

سورۃ
انفطار

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا
اس میں ۱۹ آیتیں ہیں ۔

سورۂ انفطار کے مضامین

یہ سورہ قرآن مجید کے آخری پارے کی بہت سی سورتوں کی مانند قیامت سے متعلق مسائل کے بارے میں ہے اور اس کی آیتوں میں مجموعی طور پر اس تعلق کے پانچ موضوعات کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

۱۔ اشراط الساعۃ یعنی وہ عظیم حوادث جو اس جہان کے اختتام اور قیامت کی ابتدا پر رونما ہوں گے۔

۲۔ انسان کی توجہ خدا کی نعمتوں کی طرف جنہوں نے اس کے سارے وجود کو گھیر رکھا ہے، اور اس کے غرور کو توڑنے کی جانب، تاکہ وہ اپنے آپ کو معاد کے لیے تیار کرے۔

۳۔ ان فرشتوں کی طرف اشارہ جو انسانوں کے اعمال کو ثبت کرنے پر مامور ہیں۔

۴۔ قیامت میں نیک و بد لوگوں کی سرنوشت۔

۵۔ اس عظیم دن کی سختیوں کا ایک گوشہ۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ (من قرأ ھاتین السورتین "اذا السماء انفطرت" و "اذا السماء انشقت" وجعلھما نصب عینہ فی صلوٰۃ الفریضۃ والنافلۃ لم یحجبہ من اللہ حجاب ولم یحجزہ من اللہ حاجز ولم یزل ینظر الی اللہ و ینظر اللہ الیہ حتی یفرغ من حساب الناس) جو شخص ان دو سورتوں سورہ انفطار اور سورہ انشقاق کی تلاوت کرے اور دونوں کو نماز فریضہ و نافلہ میں اپنا نصب العین بنا لے تو کوئی اسے خدا سے محجوب نہیں کر سکے گا اور کوئی چیز اس کے اور خداوند متعال کے درمیان حائل نہیں ہوگی۔[1]

یقیناً سب سے بڑی نعمت بارگاہِ خداوندی میں حضوری ہے اور بندہ کے اور خدا کے درمیان سے حجابوں کا ہٹ جانا اس کے لیے ہے جو ان دونوں سورتوں کو اپنے دل و جان کی گہرائیوں میں جگہ دے اور اپنی اس بنیاد پر اصلاح کرے نہ یہ کہ صرف زبانی جمع خرچ پر اکتفا کرے۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۴۴ و نور الثقلین جلد ۵ ص ۵۲۰ (از کتاب ثواب الاعمال)۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

(۱) اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ ۙ

(۲) وَ اِذَا الۡكَوَاكِبُ انۡتَثَرَتۡ ۙ

(۳) وَ اِذَا الۡبِحَارُ فُجِّرَتۡ ۙ

(۴) وَ اِذَا الۡقُبُوۡرُ بُعۡثِرَتۡ ۙ

(۵) عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَ اَخَّرَتۡ ؕ

ترجمہ

خدا کے نام سے جو مہربان اور بخشنے والا ہے۔

(۱) جس وقت (کرات آسمانی) پھٹ جائیں گے۔

(۲) جس وقت ستارے پراگندہ ہو کر گر پڑیں گے۔

(۳) اور جس وقت سمندر ایک دوسرے سے مل جائیں گے۔

(۴) اور جس وقت قبریں زیر و زبر ہوں گی۔ (اور مُردے خارج ہوں گے)۔

(۵) اس وقت ہر شخص جان لے گا کہ اس نے آگے کیا بھیجا ہے اور پیچھے کیا چھوڑا ہے۔

تفسیر

جس وقت اس جہان کا نظام زیر و زبر ہو جائے گا

ہم پھر اس سورہ کے آغاز میں بعض ایسے وحشت ناک حوادث کا سامنا کر رہے ہیں جو آغاز قیامت میں سارے جہان کو گھیر لیں گے۔ پہلے فرماتا ہے:

"جس وقت آسمان میں شگاف پڑ جائیں گے" (اذا السماء انفطرت)۔ اور جس وقت ستارے

پراگندہ ہو کر گرنے لگیں گے » (واذا الکواکب انتثرت) ۔ عالم بالا کا نظام درہم وبرہم ہو جائے گا اور ہولناک دھماکے سارے آسمان کے کُرّوں کو گھیر لیں گے۔ تمام منظومے اپنے نظام کھو بیٹھیں گے۔ اور ستارے اپنے مدار سے نکل جائیں گے اور شدید تصادم کی وجہ سے ادھر ادھر بکھر جائیں گے۔ اس جہان کی عمر ختم ہو جائے گی اور عام چیزیں ویران ہو جائیں گی تاکہ ان کی ویرانی سے آخرت کا جہاں آباد ہو جائے۔

« انفطرت » انفطار کے مادہ سے شگافتہ ہونے کے معنوں میں ہے۔ اس تعبیر کی نظیر بہت سی آیات میں آئی ہے۔ منجملہ دیگر تعبیرات کے سورہ انشقاق کی آیت ۱ میں ہم پڑھتے ہیں (اذا السماء انشقت) اور سورہ مزمل کی آیت ۱۸ میں فرماتا ہے: (السماء منفطر بہ)

"انتثرت" اصل میں مادہ نثر (بروزن نصر) سے پراگندہ کرنے اور ہونے کے معنی میں ہے اور چونکہ ستاروں کا پراگندہ ہونا گلوبند کی طرح جس کا دھاگہ ٹوٹ جائے) سبب بنتا ہے کہ ہر ایک کسی گوشہ میں جا گرے۔

بعض مفسرین نے ستاروں کے سقوط اور ان کے گرنے سے تفسیر کی ہے اور یہ پراگندگی کے معنی کا لازمہ ہے۔

« کواکب » کوکب کی جمع عربی زبان میں بہت سے معانی میں آتی ہے۔ دوسرے ستارے بطورِ عام اور زہرہ ستارہ بطور خاص۔

وہ سفیدی جو آنکھ میں ظاہر ہوتی ہے، بلند گھاس، درخت کا شگوفہ، فولاد کی چمک، زیبا وخوبصورت نوجوان، تلوار، پانی اور کسی جمعیت کا رئیس۔

لیکن ظاہری طور پر اس کے حقیقی معنی وہی درخشاں اور فروزاں ستارہ ہیں۔ باقی معانی مجازی شمار ہوتے ہیں جن میں اصلی معانی کی مشابہت پائی جاتی ہے۔

یہ کہ ستاروں کا پراگندہ ہونا اور آسمانی کواکب کا انفجار اور پھٹنا اور ان کے نظام کا درہم برہم ہونا کن عوامل واسباب کے زیرِ اثر رونما ہوگا۔ کیا فطرت کا اعتدال درہم وبرہم ہو جائے گا یا کوئی عظیم مرموز قوت اسے اپنے تحت الشعاع قرار دے گی یا عالم کا عظیم تدریجی انبساط اور پھیلاؤ جو موجودہ زمانے میں ماہرین کے نقطۂ نظر سے اثبات کے درجہ کو پہنچ گیا ہے یہاں تک ہو جائے گا کہ جس کے بعد یہ نتیجہ برآمد ہوگا۔ کوئی شخص ٹھیک طرح نہیں جانتا۔

لیکن ہمیں اتنا معلوم ہے کہ جس وقت یہ عظیم آسمانی کُرے اس قسم کی صورت حال سے دوچار ہوں گے تو اس وقت کمزور وضعیف انسان کا جو حال ہوگا وہ ظاہر ہے۔

یہ سب کچھ اس جہان کے فنا ہونے کے بارے میں انسان کو خبردار کرنا ہے اور اسے تنبیہ کرنا ہے تاکہ وہ اس دنیا کو ایسا جاودانی گھر نہ سمجھ بیٹھے جس میں اسے ہمیشہ رہنا ہے تاکہ اس سے دل نہ لگائے اور اس کے لیے ہزار ہا گناہوں سے آلودہ نہ ہو۔

اس کے بعد آسمان سے ہٹ کر زمین کو موضوع بناتا ہے اور فرماتا ہے:

"جس وقت سمندر اور دریا آپس میں مل جائیں گے" (واذا البحار فجرت)۔ اگرچہ اس وقت بھی روئے زمین کا عام سمندر، سوائے کچھ چھوٹے دریاؤں کے، ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں لیکن یوں نظر آتا ہے کہ ابتدائے قیامت میں شدید زلزلوں کی بنا پر یا پہاڑوں کے پراگندہ ہونے اور سمندر میں گر پڑنے کی وجہ سے سمندر اس طرح پُر ہو جائیں گے کہ پانی تمام خشکیوں کو گھیرے گا اور سارے دریا ایک وسیع تر سمندر کی شکل اختیار کر لیں گے جیسا کہ سورہ تکویر کی آیت ۶ (واذا البحار سجرت) کی ایک یہ بھی تفسیر ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

دوسرا احتمال، جو اس آیت کی تفسیر میں اور اسی طرح سورہ تکویر کی آیت ۶ کی تفسیر میں پیش کیا گیا ہے، یہ ہے کہ فجرت اور سجرت وہی انفجار یعنی پھٹنا اور جلنا ہے جو تمام سمندروں اور دریاؤں کو آگ کے ایک عظیم ٹکڑے میں تبدیل کر دے گا۔

جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے پانی دو عناصر سے تشکیل پاتا ہے جو دونوں شدید طور پر قابلِ احتراق یعنی جلنے کے قابل ہے۔ اب اگر سمندروں کے پانی کا تجزیہ ہو اور وہ کچھ عوامل و اسباب کے زیرِ اثر آکسیجن اور ہائیڈروجن میں تبدیل ہو جائے تو ایک ہی شعلے کے زیرِ اثر سب آگ میں تبدیل ہو جائیں۔

اس کے بعد قیامت کے دوسرے مرحلہ کے بارے میں جو اس جہان کی تجدید حیات اور مُردوں کی زندگی کی تجدید کا مرحلہ ہے فرماتا ہے:

"اور جس وقت قبریں زیر و زبر ہوں" (واذا القبور بعثرت)۔ اور مُردے باہر آکر حساب کتاب کے لیے آمادہ ہوں۔

"بعثرت" کے معنی زیر و زبر ہونا اور منتشر ہونا ہے۔ راغب مفردات میں بعید نہیں سمجھتا کہ یہ لفظ دو الفاظ سے مرکب ہو۔ "بعث" اور "اثرت" اسی لیے دونوں کے معنی اپنے اندر لیے ہوئے ہیں اور نتیجہ زیر و زبر ہونے کے معانی کی صورت میں نکلا ہے۔ (مثل بسملہ کے جو بسم اور اللہ سے لیا گیا ہے)۔

بہرحال جو کچھ اوپر والی آیات میں آیا ہے اس چیز کے مشابہ ہے جو ہم سورہ زلزال میں پڑھتے ہیں: (واخرجت الارض اثقالھا) "زمین اپنے ذخائر باہر نکالے گی" (اس بنا پر اس سے مراد زمین میں دفن شدہ مردے ہوں گے جو اس آیت کی مشہور تفاسیر میں سے ایک ہے)۔ یا اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ نازعات کی آیہ ۱۳ اور ۱۴ میں آئی ہے۔ (فانما ھی زجرۃ واحدۃ فاذاھم بالساھرۃ) "صرف ایک ہی صیحہ ہوگا جس کے بعد اچانک سب کے سب صفحۂ زمین پر ظاہر ہوں گے۔

یہ سب تعبیریں بتاتی ہیں کہ مُردوں کا زندہ ہونا اور قبروں سے خارج ہونا نہایت تیزی سے ناگہانی طور پر صورت پذیر ہوگا۔ ان نشانیوں کو بیان کرنے کے بعد جو قیامت سے قبل اور اس کے بعد صورت پذیر ہوں گی آخری بات کو اس طرح بیان کرتا ہے:

"اس دن ہر شخص جانتا ہے کہ اس نے آگے کیا بھیجا ہے اور پیچھے کیا رکھا ہے" (علمت نفس ما قدمت و اخرت)۔ جی ہاں! اس دن حجابات ہٹ جائیں گے، غرور و غفلت کے پردے چاک ہو جائیں گے اور حقائقِ جہاں آشکار ہو جائیں گے۔ اور چونکہ وہ دن یوم البروز ہے لہٰذا ہر چیز ظاہر ہو جائے گی اور یہ وہی وقت ہے کہ انسان اپنے تمام اعمال کو دیکھے گا اور اپنے نیک و بد سے آگاہ ہوگا۔ کون سے اعمال وہ آگے بھیج چکا ہے اور کون سے کام ہیں جن کے آثار اس کے بعد دنیا میں باقی رہ گئے ہیں اور اس کے نتائج اس تک پہنچے ہیں۔

خیرات اور صدقہ جاریہ کے مثل۔ اور وہ تعمیرات و آثار جو مقاصد رحمانی یا مقاصد شیطانی کے لیے اس نے بنائی ہیں اور اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ یا کتابیں اور دیگر علمی آثار وغیرہ۔ علمی آثار جو نیک و بد مقاصد کے لیے اس نے اپنے بعد چھوڑے ہیں اور وہ دوسروں کے لیے استفادہ کا باعث بنے ہیں۔ ایسے نیک و بد سنن و طرق جنہوں نے اقوام و ملل کو اپنی طرف کھینچا ہے یہ ہیں اُن کاموں کے نمونے جن کے نتائج انسان کے بعد اس تک پہنچتے ہیں اور جو اوپر والی آیت میں "اخرت" کا مصداق ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان اس دنیا میں بھی اجمالی طور پر اپنے اعمال سے باخبر ہے لیکن بھول جانا اور اپنے اعمال کی پرستش کرنا عام طور پر مانع ہوتا ہے کہ انسان ان سب کو اپنے دل میں جگہ دے اور اپنے اعمال کے آثار کی گہرائی اور عمق سے واقف ہو۔

لیکن اس دن جب ہر چیز میں انقلاب برپا ہوگا تو انسان کی روح اور جان بھی اس قسم کے انقلاب سے متاثر ہوگی یہ وہ جگہ ہوگی جہاں انسان اپنے تمام اعمال کا تفصیلی علم حاصل کرے گا بلکہ سورہ آلِ عمران کی آیت ۳۰ (یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضرًا وما عملت من سوء) سب کو اپنے سامنے حاضر پائے گا۔

بعض مفسرین نے اس آیت کے لیے اور تفاسیر بھی بیان کی ہیں۔ منجملہ دیگر تفاسیر کے مراد وہ کام ہیں جنہیں ابتدائے عمر میں مقدم رکھتا تھا اور وہ کام جو اواخر عمر کے لیے چھوڑ رکھے تھے لیکن پہلی تفسیر ہر جہت سے زیادہ مناسب ہے نفس سے مراد یہاں نفوس انسانی میں سے ہر فرد ہے اور اس میں تمام افرادِ بشر شامل ہیں۔

ایک نکتہ

وہ آثار جو انسان کے بعد باقی رہ جاتے ہیں

علاوہ اس چیز کے جو اوپر والی آیات میں آئی ہے اسلامی روایات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ہو سکتا ہے کچھ آثار انسان کے بعد باقی رہ جائیں جن کی برکتیں یا بُرے نتائج سالہا سال تک حتیٰ کہ

قیامت تک اس شخص کو پہنچتے رہیں۔

ایک حدیث امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے (لیس یتبع الرجل بعد موتہ من الاجر الا ثلاث خصال صدقۃ اجراھا فی حیاتہ فھی تجری بعد موتہ وسنۃ ھدی سنّھا فھی تعمل بھا بعد موتہ وولد صالح یستغفر لہ) انسان کی موت کے بعد اس کے اعمال کی کتاب بند ہو جاتی ہے اور سزا یا جزا اُسے نہیں ملتی لیکن تین طریقوں سے اجر یا سزا مل سکتی ہے۔ عمارتیں یا مفید چیزیں جو لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے وہ اپنی طرف سے بطور یادگار چھوڑ گیا ہے، جو اس کے بعد باقی ہیں۔ دوسرے ہدایت کرنے والی سنت جسے وہ وجود میں لایا ہے اور اس کی موت کے بعد اس پر عمل ہو رہا ہے اور تیسرے وہ نیک اور صالح بیٹا جو اس کے لیے استغفار کرتا ہے [1]

ایک دوسری روایت میں یہ چھ امور شمار کیے گئے ہیں جو مومنین کی حالت کے لیے ان کی موت کے بعد مفید ہیں، نیک بیٹا، وہ قرآن جس کی وہ تلاوت کرتا تھا، وہ کنواں جو اس نے کھودا، وہ درخت جو اس نے بویا، پانی مہیا کرنا اور سنت حسنہ جو اس کے بعد رہ جائے اور مورد توجہ قرار پائے [2]

بعض روایات میں اس علم و دانش پر جو کسی کی جانب سے لوگوں میں رہ جائے انحصار کیا گیا ہے [3]

خصوصیت کے ساتھ نیک یا بد سنت کے بارے میں کئی روایتیں ہمارے پاس ہیں جو لوگوں کو خبردار کرتی ہیں کہ وہ اس بات کا خیال رکھیں کہ ان کے اعمال کے نتیجے میں کس قسم کی سنت لوگوں کے درمیان باقی رہتی ہے۔

مرحوم طبرسی زیر بحث آیات کے ذیل میں اسی مضمون کی ایک حدیث نقل کرتے ہیں۔ ایک دن ایک شخص بارگاہِ پیغمبرؐ میں کھڑا ہو گیا اور اس نے لوگوں سے مدد طلب کی تو سب لوگ خاموش رہے۔ اس موقع پر ایک صحابی نے اس سائل کو کوئی چیز دے دی، باقی اصحاب نے بھی اس کی پیروی کی اور وہ بھی اس ضرورت مند کی مدد کرنے لگے۔ اس پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

(من استن خیرًا فاستن بہ فلہ اجرہ ومثل اجور من اتبعہ غیر منتقص من اجورھم ومن استن شرًا فاستن بہ فعلیہ وزرہ ومثل اوزار من اتبعہ غیر منتقص من اوزارھم)

---

[1] بحار الانوار، جلد ۱، ص ۲۵۷۔

[2] ایضاً " " " "

[3] منیۃ المرید ص ۱۱۔

"جو شخص کوئی نیک سنت جاری کرے اور دوسرے اس کی پیروی کریں تو وہ اپنا اجر تو رکھتا ہی ہے اس کے علاوہ ان لوگوں کے اجر کے برابر بھی جنہوں نے اس کی پیروی کی ہے بغیر اس کے کہ ان پیروی کرنے والے لوگوں کے اجر میں کوئی کمی ہو اور جو شخص بُری سنت جاری کرے اور لوگ اس کی پیروی کریں تو اس کا اپنا گناہ تو ہے ہی اس کے علاوہ جن لوگوں نے اس کی پیروی کی ہے ان کے گناہوں کے برابر بھی اس کا گناہ ہے بغیر اس کے کہ پیروی کرنے والوں کے گناہوں میں کچھ کمی ہو۔"

یہ وہ مقام تھا جہاں اصحاب پیغمبر میں سے حذیفہ نے آیت (علمت نفس ماقدمت واخرت) کی تلاوت کی۔[1]

امیرالمومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں: (فکیف بکم لوتناهت بکم الامور و بعثرت القبور هنالك تبلوا کل نفس ما اسلفت و ردوا الی الله مولاهم الحق وضل عنهم ما کانوا یفترون) تمہارا کیا حال ہوگا جس وقت تمام امور اختتام پذیر ہوں گے قبریں زیر و زبر ہوں گی اور تم سب کے سب عرصہ محشر میں قیام پذیر ہو گے وہاں ہر شخص ہر عمل کو جسے اس نے پہلے انجام دیا ہوگا آزمائے گا اور سب کے سب خدا کی طرف پلٹ جائیں گے جو ان کا حقیقی مولا و سرپرست ہے اور جنہیں جھوٹ موٹ اس کی مثل قرار دیا تھا ان کے دل سے محو ہو جائیں گے۔[2]

یہ آیات و روایات انسان کی ذمہ داری کی حدود کو اس کے اعمال کے مقابلہ میں اسلامی نقطۂ نظر سے معین کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ کس حد تک ہر انسان اپنے اعمال کے سلسلہ میں جوابدہ ہے یہاں تک کہ ممکن ہے کہ ہزارہا سال گزرنے کے بعد اس کے لیے اچھا اجر حاصل کریں یا اس پر لعنت و گناہ کا بوجھ ڈالیں۔ اس سلسلہ میں جلد ۱ ص ۲۰۲ تا ۲۰۴ (سورہ نحل کی آیت ۲۵ کے ذیل میں) پر بھی ہم بحث کر چکے ہیں۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۴۹۔

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۶۔

(٦) يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۝

(٧) الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ۝

(٨) فِي أَيِّ صُورَةٍ مَا شَاءَ رَكَّبَكَ ۝

(٩) كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالدِّينِ ۝

(١٠) وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ۝

(١١) كِرَامًا كَاتِبِينَ ۝

(١٢) يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ۝

ترجمہ

(٦) اے انسان تجھے کس چیز نے اپنے کریم پروردگار کے مقابلہ میں مغرور کر دیا ہے؟

(٧) وہ خدا جس نے تجھے پیدا کیا، پھر تجھے درست کیا، پھر تجھے اعتدال پر رکھا۔

(٨) اور جس شکل میں چاہتا تھا تجھے مرکب کیا۔

(٩) جیسا تم خیال کرتے ہو ویسا نہیں ہے بلکہ تم روزِ جزا کے منکر ہو۔

(١٠) اور اس میں شک نہیں کہ تم پر نگہبان مقرر کیے گئے ہیں۔

(١١) بلند منزلت والے اور لکھنے والے (تمہارے نیک و بد اعمال کے)۔

(١٢) وہ جانتے ہیں کہ تم کیا کرتے ہو۔

تفسیر

اے انسان تجھے کس چیز نے مغرور کر دیا ہے؟

گزشتہ آیتوں کے بعد جو قیامت کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں زیرِ بحث آیتوں میں انسان کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے اور اس کو خدا کے سامنے اس کی ذمہ داریوں کے طرف توجہ دلاتے ہوتے پہلے اسے مخاطب کیا ہے اور تیز ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ جس میں ایک طرح کا لطف و کرم بھی ملا ہوا ہے فرماتا ہے:

"اے انسان تجھے کس چیز نے تیرے کریم پروردگار سے غافل کر دیا ہے اور اس کے مقابلہ میں مغرور کیا ہے" (یاایھا الانسان ماغرك بربك الكريم)۔

یہاں انسان کا اس کی انسانیت کے لحاظ سے جس میں اس جہان کے باقی موجودات کے مقابلہ میں تمام امتیازات کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے مخاطب کیا ہے اس کے بعد اُسے اس خدا کے سامنے پیش کیا ہے جو رب بھی ہے اور کریم بھی ہے۔ جس نے اپنی ربوبیت کے تقاضے سے ہمیشہ اسے اپنی رحمت سے نوازا ہے اور اس کی تربیت و تکامل و ارتقا کا ذمہ لیا ہے اور اپنے تقاضائے کرم سے اسے اپنے خوانِ نعمت پر جگہ دی ہے۔ اور اپنی تمام مادی و معنوی نعمتوں سے اُسے سرفراز کیا ہے بغیر اس بات کے کہ اس سے وہ کوئی توقع رکھتا ہو اور ان نعمتوں کا کوئی اجر اس سے طلب کرے حتیٰ کہ اس کی خطاؤں سے بھی چشم پوشی کرتا ہے اور اپنے لطف و کرم سے اسے موردِ عفو و بخشش قرار دیتا ہے۔

کیا یہ مناسب ہے کہ اس قسم کا وجود ایسے پروردگار کے مقابلہ میں جسارت و غرور سے کام لے یا ایک لمحے کے لیے بھی اس سے غافل ہو اور اس کے فرمان کی انجام دہی میں جو خود اس کی سعادت کا ضامن ہے قصور و کوتاہی کا ارتکاب کرے۔

اسی لیے ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے مروی ہے کہ آپؐ نے اس آیت کی تلاوت کے موقع پر فرمایا (غرّہ جھلہ) اس کی جہالت و نادانی نے اسے مغرور و غافل بنایا ہے[1]

یہاں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مقصد یہ ہے کہ اپنی ربوبیت و کرم پر انحصار کرتے ہوئے وہ انسان کے غرور و غفلت کو ختم کرے۔ اس طرح سے جیسا کہ بعض نے خیال کیا ہے کہ مقصودِ کلام یہ ہے کہ آدمی کو تلقین کی جاتے کہ خدا سے عذر خواہی کے سلسلہ میں وہ جواب میں کہے: "تیرے کرم نے مجھے مغرور کیا ہے"۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۴۹۔ یہی حدیث در المنثور، روح البیان، روح المعانی اور قرطبی میں بھی زیرِ بحث آیت کے ذیل میں نقل ہوئی ہے۔

نیز جو کچھ فضیل ابن عیاض سے نقل ہوا ہے کہ اس سے سوال کیا گیا کہ اگر تجھے خدا قیامت کے دن اپنے حضور میں طلب کرے اور تجھ سے سوال کرے، "ما غرک بربک الکریم"، تو جواب میں تو کیا کہے گا۔ اس نے کہا میں جواب میں کہوں گا "غرنی ستورک المرخاۃ" جو پردے تو نے میرے گناہ پر ڈالے ہوتے تھے انہوں نے مجھے غافل و مغرور کیا ہے۔

یہ سب مفہوم آیت کے ساتھ سازگار نہیں ہے بلکہ آیت کے مفہوم کے تضاد سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے کہ مقصودِ آیت غرور کو ختم کرنا ہے اور خوابِ غفلت سے بیدار کرنا ہے، نہ یہ کہ نیا پردہ غفلت کے پردوں پر ڈالنا ہے اس بنا پر مناسب نہیں ہے کہ آیت کو اس کے مقصد سے دور لے جائیں اور اس کی متضاد کیفیت سے نتیجہ کلام اخذ کریں۔

"غرک" غرور کے مادہ سے اصل میں بیداری کے موقعہ پر غفلت کے معنی میں ہے دوسرے لفظوں میں ایسے مقام پر غفلت سے کام لینا جہاں غفلت کرنا بالکل نامناسب ہو۔ اور چونکہ غفلت بعض اوقات جسارت یا احساسِ برتری کا سبب بنتی ہے لہٰذا غرور کے لفظ کی ان معانی سے بھی تفسیر ہوئی ہے اور شیطان کو اسی وجہ سے غرور (بروزن شرور) کہتے ہیں۔ وہ انسان کو اپنے وسوسوں سے فریب دیتا ہے اور اسے غافل و مغرور کر دیتا ہے۔

"کریم" کی تفسیر میں مفسرین نے انواع و اقسام کی تعبیریں پیش کی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ کریم وہ بخشنے والا ہے جس کے تمام افعال احسان ہیں اور وہ کبھی اتنی بخشش کے ہوتے ہوئے نفع و نقصان کا خیال نہیں کرتا۔ بعض نے کہا ہے کہ کریم وہ شخص ہے جو طلب سے زیادہ بخش دے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ کریم وہ شخص ہے جو تھوڑی سی متاع کو قبول کر لیتا ہے اور اس کے مقابلے میں زیادہ قیمت دیتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ سب چیزیں کریم کے مفہوم میں شامل ہیں۔

خدا کے کرم کے سلسلہ میں بس اتنا کافی ہے کہ وہ صرف گنہگاروں کو معاف کر کے راضی نہیں ہوتا بلکہ شائستہ افراد کے گناہوں کو حسنات میں تبدیل کر دیتا ہے۔ امیرالمومنین حضرت علیؑ اس آیت کی تفسیر میں عجیب و غریب جملے ارشاد فرماتے ہیں:

یہ آیت سننے والے کے سامنے بہت مضبوط دلیل ہے اور ایسے شخص کے سامنے جسے جہالت و نادانی نے مغرور کر دیا ہو قاطع عذر ہے۔ خدا فرماتا ہے:

"اے انسان تجھے کس چیز نے گناہ کرنے پر جرأت دلائی ہے اور کس چیز نے تجھے تیرے پروردگار کے مقابلہ میں مغرور کر دیا ہے اور کس چیز نے اپنی ہلاکت کے ساتھ تعلق پیدا کر دیا ہے؟ کیا تیری اس بیماری کے لیے صحتمند ہونا نہیں ہے یا تیرے اس خواب کے لیے بیداری نہیں ہے۔ تو خود پر کم از کم اتنا تو رحم کر جتنا تو دوسروں پر کرتا ہے۔

تُو جب کسی کو جلانے والے سورج کی دھوپ میں دیکھے تو اس پر سایہ کرتا ہے جب کسی بیمار کو دیکھے کہ درد و تکلیف نے اسے سخت نالاں کر دیا ہے تو تُو اس پر رحم کھا کر آنسو بہاتا ہے تو وہ کیا شئے ہے جس نے اپنی بیماری پر تجھے ایک طرح کا صبر کرنے والا بنا دیا ہے اور اپنی مصیبت پر مطمئن کر دیا ہے اور خود پر گریہ کرنے سے باز رکھا ہے حالانکہ تیرے نزدیک عزیز ترین افراد میں سے تُو خود ہے تو پھر کس طرح رات کو نزولِ بلا کے خوف نے تجھے بیدار نہیں کیا حالانکہ گناہ و معصیت میں تُو غوطہ زن ہے اور اس کے غلبہ سے باہر بھی نہیں ہے۔

آ اور اس غفلت کی بیماری کا عزم صمیم کی دوا سے علاج کر اور اس خوابِ غفلت کو جس نے تیری آنکھوں کو گھیر رکھا ہے، بیداری سے برطرف کر۔ آ خدا کا مطیع و فرمانبردار بن جا اور اس کی یاد سے مانوس ہو۔

اچھی طرح جان لے کہ تیرے خدا سے غفلت کرنے کے موقع پر وہ نعمتیں دینے پر تجھ سے عنایت کرتا ہے اور تجھے اپنے عفو و کرم کی طرف بلاتا ہے اور اپنی برکتوں کے زیرِ سایہ تجھے دیکھنا چاہتا ہے حالانکہ تُو نے اس کی طرف پشت کر رکھی ہے اور دوسرے کی طرف رخ کر رکھا ہے۔

بزرگ و عظیم ہے وہ خدا جو باوجود اس عظیم قدرت کے کریم ہے لیکن تُو باوجود اس ضعف و حقارت کے اس معصیت پر کس قدر جری ہے [۱]

اس کے بعد اس غافل انسان کو بیدار کرنے کے لیے اپنے لطف و کرم کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"وہ خدا جس نے تجھے پیدا کیا ہے پھر تیرے وجود کی دستگاہ کو منظم کیا اور اسے اعتدال بخشا" (الذی خلقك فسوّاك فعدلك)۔ "اور جس شکل میں چاہتا تھا تیری ترکیب کی" (فی ای صورة ماشاء رکّبك) [۲]

اور اس طرح خلقت کے چار عظیم مرحلوں کو یعنی اصل خلقت، پھر اس کی تنظیم، پھر اس میں اعتدال آخر میں ترکیب بندی کو چار مختصر سی پُر معنی عبارتوں میں بیان کرتا ہے۔

پہلے مرحلے میں اصل خلقتِ انسانی قرار پاتی ہے کہ اسے ناچیز و حقیر نطفہ سے رحم کے ظلمت کدے میں خلق کیا۔ بعد کے مرحلہ میں جو تسویہ و تنظیم کا مرحلہ ہے اس کے پیکر کے اعضا میں سے ہر عضو کو تنظیم کے ساتھ

---

[۱] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۲۳۔

[۲] "ماشاء" میں ما زائدہ ہے بعض مفسرین نے احتمال پیش کیا ہے کہ ما شرطیہ ہے لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

موزوں کیا۔ آنکھ، کان، دل، رگیں اور باقی اعضا جن میں سے اگر انسان ہر ایک کی ساخت، بناوٹ اور نظام پر غور و فکر کرے اور خدا کے لطف و کرم کو ان میں سے ایک ایک میں دیکھے تو علم و قدرت اور لطف و کرم کی ایک دنیا اپنی آنکھوں کے سامنے مجسم دیکھے گا۔

وہ نعمتیں کہ ہزارہا سال گزرنے کے بعد بھی ماہرین علوم طبعی ان کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں لیکن ابھی آغاز کار ہے اور وہ ابھی تحقیق کی ابتدا ہی میں ہیں۔

اس کے بعد ایک تیسری نعمت کو موضوع گفتگو بناتا ہے اور وہ اعضائے جسم انسانی کے درمیان اعتدال و ہم آہنگی ہے۔ جسم انسانی دو حصّوں پر مبنی پیدا کیا گیا ہے جو دونوں ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان، استخواں، عروق و اعصاب و عضلات جسم کے دونوں حصوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے والے اور ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں۔

علاوہ ازیں مختلف اعضا بھی ایک دوسرے کے کام کی تکمیل کرتے ہیں، مثلاً سانس لینے کا نظام گردشِ خون کی مدد کرتا ہے اور گردشِ خون کا نظام تنفس کے ساتھ مل کر غذا کے لقمے کو نگلنے کے لیے اور دانت، زبان، لعابِ دہن کے غدود اور اطرافِ دہن کے عضلات اور گلا یہ سب ایک دوسرے کے دست بدست کام کرتے ہیں، یہاں تک کہ لقمہ ہاضمہ کے نظام میں داخل ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد بھی بہت سی ہم آہنگیاں صورت پذیر ہوتی ہیں تاکہ غذا جزوِ بدن ہو سکے اور قوت و حرکت وسعی و کوشش کو پیدا کرے۔ یہ سب "فعدلک" کے جملہ میں پنہاں ہیں۔ بعض اس جملہ کو تمام انواعِ حیوانات میں سے انسان کے سیدھے قد کی طرف، جو اس کی بہت ہی فضیلت کا باعث ہے، اشارہ سمجھتے ہیں۔ یہ معانی بعد والے مرحلہ کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں لیکن پہلے معانی زیادہ جامع ہیں۔

انجام کار آخری مرحلہ، دوسرے موجودات کے مقابلہ میں اس کی ترکیب اور صورت پذیری کا آن پہنچنا ہے۔ جی ہاں! خدا نے نوعِ انسان کو دوسرے حیوانات کے مقابلہ میں موزوں تر اور زیبا تر بنایا ہے اور اسے عمدہ شکل عنایت کی ہے اور ایسی سیرت دی ہے جس میں زیبائی و خوبصورتی کے ساتھ فطری بیداری بھی ہے اور ایسی ترکیب جو علم، آگاہی، تعلیم و تربیت کو قبول کرنے پر آمادہ ہے۔

اس سے قطع نظر افرادِ انسانی کی صورتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور جیسا کہ سورہ روم کی آیت ۲۲ میں آیا ہے: "تمہارے رنگوں اور زبانوں کا اختلاف خدا کی آیات میں سے ہے۔" (ومن اٰیاتہ خلق السماوات والارض واختلاف السنتکم والوانکم) اگر یہ اختلاف نہ ہوتا تو نوعِ بشر کی اجتماعی زندگی کا نظام معطل ہو جاتا۔

اس اختلافِ ظاہری کے علاوہ استعداد، ذوق اور سلیقے کے اختلاف قرار دیئے ہیں اور ان کی دو صورتیں بنائیں جن کا اس کی حکمت تقاضا کرتی تھی تاکہ ان کے مجموعہ سے ایک صحیح و سالم معاشرہ وجود میں

آئے جو اپنی تمام ضرورتوں کو پورا کرے اور انسانوں کے ظاہری و باطنی قویٰ ایک دوسرے کے تکمیل کنندہ نہیں، اور مجموعی طور پر، جیسا کہ سورہ "تین" کی آیت نمبر ۴ میں آیا ہے: (لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم) "خدا نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا ہے"

خلاصہ کلام یہ کہ ان آیتوں میں اور بہت سی دوسری قرآنی آیات کی طرح خدا اس بھلا دینے والے اور مغرور انسان کو اپنی معرفت کی راہ دکھاتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ رحم مادر سے لے کر اپنے پیدا ہونے تک کے زمانے کا اور اس وقت سے لے کر مکمل نشوونما کی منزل تک پہنچنے کے عہد کا بغور مطالعہ کرے اور یہ دیکھے کہ منعم حقیقی کی جانب سے ہر قدم پر ایک نئی نعمت اس کے پاس آئی ہے۔

اس طرح اس کو معلوم ہوگا کہ وہ سر سے پیر تک خالق کے احسانات کے بوجھ تلے دبا ہُوا ہے۔ اس کو چاہیئے کہ غرور و غفلت کو خیرباد کہے اور پروردگارِ عالم کی محبت کا طوق اپنی گردن میں ڈالے۔

اس کے بعد قرآن ان کے غرور و غفلت کو موضوعِ گفتگو بنا کر کہتا ہے: "جیسا تم گمان کرتے ہو ایسا نہیں ہے تم روزِ جزا کے منکر ہو" (کلا بل تکذبون بالدین)۔ نہ تو خدا کا کرم تمہارے غرور کا سبب ہے اور نہ اس کی نعمتوں کا سلسلہ بلکہ اس کا اصلی سبب تمہارا روزِ قیامت پر ایمان نہ لانا ہے[1]

جی ہاں! اگر ہم مغرور اور غافل افراد کی حالت پر غور کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اصلی سبب یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے افراد کی روح کی گہرائیوں میں قیامت کے بارے میں شک یا اس کا انکار پوشیدہ ہے اور باقی امور تو صرف بہانے ہیں۔ لہٰذا اگر ان کے دلوں میں قیامت پر ایمان پیدا ہو جائے تو یہ غرور اور غفلت سب ختم ہو کر رہ جاتے۔

دین سے مراد یہاں جزا اور روزِ جزا ہے اور یہ جو بعض مفسرین نے احتمال پیش کیا ہے کہ یہاں مراد دینِ اسلام ہے بعید نظر آتا ہے اس لیے کہ ان آیتوں میں گفتگو کا جو محور ہے وہ معاد و قیامت ہے۔

اس کے بعد اسباب غرور و غفلت کو ختم کرنے اور قیامت پر ایمان کو تقویت دینے کے لیے مزید

---

[1] "کلا" حرف ردع ہے اور پہلے سے ذکر شدہ یا توہم شدہ مطلب کے انکار کے لیے ہے اور یہ کہ کلا اس آیت میں کس چیز کی نفی کرتا ہے اس سلسلہ میں مفسرین نے کئی احتمال پیش کیے ہیں۔ سب سے پہلے وہی احتمال ہے جس کا اوپر ذکر ہوا ہے یعنی یہاں کلا غرور و غفلت کے تمام سرچشموں کی نفی کرتا ہے سوائے قیامت کی تکذیب اور انکار کے جس کا "بل" کے بعد ذکر ہوا ہے۔ راغب نے مفردات میں (بل کے مادہ کے سلسلہ میں) ان معانی کو منتخب کیا ہے اور اوپر والی آیت بیان کرنے کے بعد کہتا ہے (کانه قیل لیس فیهما مایقتضی ان یغرهم به تعالٰی ولکن تکذیبهم هو الذی حملهم علٰی ما ارتکبوه)۔ گویا کہا گیا ہے کہ یہاں کوئی ایسی چیز نہیں جو انہیں اللہ کے مقابلہ میں مغرور کرے لیکن ان کا تکذیب کرنا وہ ہے جس نے اس کا ارتکاب کیا ہے۔

کہتا ہے: "اس میں شک نہیں کہ تم پر نگران مقرر کیے گئے ہیں" (وان علیکم لحافظین)[1]

ایسے نگران و نگہبان جو پروردگار کی بارگاہ میں مقرب و محترم ہیں اور وہ ہمیشہ تمہارے اعمال کو تحریر کرتے ہیں (کراماً کاتبین)۔ اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو اس سے آگاہ ہیں اور سب کچھ اچھی طرح جانتے ہیں۔ (یعلمون ما تفعلون)۔

"حافظین" سے مراد یہاں وہ فرشتے ہیں جو انسانوں کے اعمال کی نگرانی پر مامور ہیں، اس سے قطع نظر کہ اعمال اچھے ہوں یا بُرے۔ ان فرشتوں کو سورہ ق کی آیت ۱۸ میں رقیب و عتید سے تعبیر کیا گیا ہے (ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید) انسان کوئی بات نہیں کرتا مگر یہ کہ اس کے پاس فرشتہ ہے جو نگرانی کا فرض انجام دینے کے لیے مستعد ہے۔ اسی سورہ ق کی اس سے پہلے کی آیت میں فرماتا ہے:

(اذ یتلقی المتلقیان عن الیمین و عن الشمال قعید) "یاد کر اس وقت کو جب وہ دو فرشتے جو دائیں بائیں سے تجھے پکڑے ہوتے ہیں، تیرے اعمال ثبت کرتے ہیں" قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی ان فرشتوں کی طرف اشارہ ہوا ہے جو نگرانِ اعمال ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ خدا ہر شخص سے پہلے اور ہر شخص سے بہتر اعمالِ انسانی کا شاہد و ناظر ہے لیکن اس نے مزید تاکید کے لیے اور زیادہ احساسِ ذمہ داری پیدا کرنے کے لیے نگران فرشتے مقرر کیے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور نگران بھی ہیں جو انسان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں جن سب کا قیامت کی دادگاہ کے گواہوں کے عنوان کے ماتحت سات حصّوں میں جلد ۱۱ کے صفحہ ۴۰۵ تا ۴۰۹ پر ہم نے ذکر کیا ہے۔ (سورہ حٰم سجدہ کی آیت ۲۰ اور ۲۱ کے ذیل میں) یہاں ان کی طرف فہرست وار اشارہ کیا جاتا ہے۔

پہلا گواہ خدا ہے جو فرماتا ہے: "جو عمل تم انجام دیتے ہو ہم اس کے شاہد و ناظر ہیں" (یونس۔ ۶۱)۔ "اس کے بعد انبیاء و اوصیاء ہیں" (نساء۔ ۴۱)۔ اس کے بعد "زبان، ہاتھ، پاؤں اور پیکرِ انسان کے تمام اعضاء و جوارح" (نور۔ ۲۴)۔ ایک گواہ جسم کی کھال ہے (حٰم سجدہ۔ ۲۱)۔ اور گواہ فرشتے ہیں (ق۔ ۲۱) اور زیر بحث آیت .... اس کے بعد وہ زمین جس پر انسان زندگی بسر کرتا ہے اور اس پر اطاعت کی جاتی ہے اور گناہ ہوتے ہیں (زلزال۔ ۴)۔ اور آخر میں وہ وقت و زمانہ جس میں اعمال انجام پاتے ہیں (سفینۃ البحار جلد ۲ مادہ یوم)۔

احتجاج طبرسی میں آیا ہے کہ ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے دریافت کیا کہ انسانوں کے نیک و بد اعمال کے تحریر کرنے پر جو فرشتے مامور ہیں اس کا کیا سبب ہے جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ خدا عالم السر و ما ھو اخفیٰ

---

[1] بعض مفسرین مثلاً روح البیان اور روح المعانی کے مؤلف نے کہا ہے کہ واؤ یہاں حالیہ ہے لیکن استینافیہ کا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

ہے یعنی ہر وہ چیز جس سے زیادہ پوشیدہ کوئی چیز نہیں ہے وہ اسے جانتا ہے تو امامؑ نے جواب میں فرمایا:

استعبد هم بذالك وجعلهم شهودًا على خلقه ليكون العباد لملازمتهم اياهم اشد على طاعة الله مواظبة وعن معصيته اشد انقباضًا وكم من عبد يهم بمعصية فذكرمكانهما فارعوى وكف فيقول ربى يرانى وحفظتى على بذالك تشهد وان الله برأفته ولطفه وكلهم بعباده يذبون عنهم مردة الشياطين و هوام الارض وآفات كثيرة من حيث لا يرون باذن الله الى ان يجئ امر الله عز وجل۔

خدا نے ان فرشتوں کو اپنی عبادت کے لیے بلایا اور انہیں اپنے بندوں پر گواہ قرار دیا تاکہ بندے ان کی نگرانی کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ خدا کی اطاعت کریں اور اس کی نافرمانی سے انہیں زیادہ سے زیادہ پریشانی اور دکھ ہو۔ بہت سے ایسے بندے ہیں جو گناہ کا پختہ ارادہ کر لیتے ہیں اور پھر اس فرشتے کو یاد کرتے ہیں اور اپنے آپ کو گناہ سے باز رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہمیں دیکھتا ہے اور نگران فرشتے بھی گواہی دیں گے۔ اس کے علاوہ خدا نے اپنی رحمت اور مہربانی سے انہیں بندوں پر مامور کیا ہے تاکہ حکم خدا سے سرکشی کرنے والے شیاطین کو ان سے دور رکھیں اور زمین کے جانوروں اور بہت سی آفات و بلیات کو جنہیں بندے اس وقت تک نہیں دیکھتے جب تک حکم خدا یعنی ان کی موت نہ آجائے[1]

اس روایت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ وہ تحریر اعمال کی ذمہ داری کے علاوہ ناگوار حادثوں مصیبتوں اور شیاطین کے وسوسوں سے انسانوں کو محفوظ رکھنے پر بھی مامور ہیں (خدا کے فرشتوں کی مختلف ذمہ داریوں کے بارے میں ایک تفصیلی بحث جلد ۱۰ ص ۱۶۸ تا ۱۷۲ سورہ فاطر کی آیت ۱ کے ذیل میں آچکی ہے)۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات ان فرشتوں کی تعریف و توصیف میں کہتی ہیں وہ کریم اور بزرگ فرشتے پروردگار کی بارگاہ میں بلند مقام کے حامل ہیں تاکہ انسان اپنے اعمال پر زیادہ توجہ دیں اس لیے کہ انسان کے اعمال کی نگرانی کرنے والا جس قدر بلند شخصیت رکھتا ہے انسان اس کا زیادہ لحاظ کرتا ہے اور گناہ کے انجام دینے سے زیادہ شرمندہ ہوتا ہے۔ کاتبین کی تعبیر درحقیقت اس بات کی تاکید ہے کہ وہ حافظہ پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ باریک بینی کے ساتھ لکھتے ہیں، اس انداز سے کہ کبھی کوئی چیز ان سے نظر انداز نہیں ہوتی اور وہ ہر چھوٹے بڑے عمل کو ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں (یعلمون ما تفعلون) "جو کچھ تم انجام دیتے ہو وہ اسے جانتے ہیں"۔

---

[1] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۲۲۔

یہ اس حقیقت پر ایک مزید تاکید ہے کہ وہ تمہارے اعمال سے بغیر استثناء آگاہ ہیں اور ان کا لکھنا اسی آگاہی کی بنیاد پر ہے۔ یہ تمام تعبیریں انسان کے اختیار اور ارادے کی آزادی کو بیان کرتی ہیں اس لیے کہ اگر انسان کو کوئی اختیار حاصل نہ ہوتا تو اعمال کے تحریر کرنے والے فرشتوں کے مقرر کرنے کا اور ان سب تنبیہوں کا کوئی صحیح مفہوم نہ ہوتا۔

اور پھر یہ سب چیزیں اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ حساب و کتاب کا ہونا اور جزا و سزا کا ملنا قطعی اور حتمی ہے اس لیے کہ خدا نے اسے حد سے زیادہ اہمیت دی ہے اور اس حقیقت کی طرف توجہ اور اس پر ایمان اس مقصد کے لیے ہے کہ انسان کی تربیت کرے اور اسے اس کی ذمہ داریوں سے آشنا کرے اور غلط کاموں پر حد سے زیادہ روکنے والا اثر ڈالے۔

ایک نکتہ

ثبت اعمال کے مامورین

نہ صرف اوپر والی آیات میں بلکہ بہت سی دوسری آیات قرآنی میں اور اسلامی روایات میں ان معانی کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ خدا نے ہر انسان پر نگہبان و نگران مقرر کیے ہیں جو اس کے اعمال قطع نظر اس کے کہ وہ اچھے ہوں یا بُرے، تحریر کرتے ہیں اور اس کا اعمال نامہ روز جزا کے لیے تیار کرتے ہیں۔

ان فرشتوں کی خصوصیات کے بارے میں معنی خیز اور خبردار و ہشیار کرنے والی تعبیریں اسلامی روایات میں وارد ہوئی ہیں منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ کسی شخص نے امام موسیٰ کاظمؑ سے سوال کیا کہ جو انسان کے اعمال تحریر کرنے پر مامور ہیں کیا وہ انسان کے ارادہ اور نیک یا بد کام کرنے کے باطنی عزم سے بھی باخبر ہوتے ہیں؟ تو امام نے جواب میں فرمایا:

"کیا بچے کچھے اور گندے پانی کے کنویں کی بُو اور عطر کی خوشبو ایک جیسی ہوتی ہے؟"

راوی نے عرض کیا نہیں، تو امامؑ نے فرمایا:

"کہ جب انسان کوئی اچھا کام کرنے کی نیت کرتا ہے تو اس کا سانس خوشبو دار ہو جاتا ہے تو وہ فرشتہ جو دائیں طرف ہے (اور حسنات کے ثبت کرنے پر مامور ہے) بائیں طرف والے فرشتے سے کہتا ہے اٹھ کھڑا ہو کہ اس نے نیک کام کا ارادہ کیا ہے اور جب وہ اس کام کو انجام دے دیتا ہے تو اس انسان کی زبان اس فرشتے کا قلم بن جاتی ہے اور لعاب دہن سیاہی بن جاتا ہے لیکن جب انسان گناہ کا ارادہ کرے تو اس کا سانس بدبودار ہو جاتا ہے اس وقت بائیں طرف کا فرشتہ دائیں طرف والے فرشتے سے کہتا ہے اٹھ کھڑا ہو کہ اس نے معصیت و نافرمانی کا ارادہ کیا ہے اور جب وہ نافرمانی انجام دے دیتا ہے تو اس کی زبان اس فرشتے کا

قلم اور لعابِ دہن سیاہی بن جاتا ہے اور وہ اسے لکھ دیتا ہے[1]

یہ حدیث اچھی طرح بتاتی ہے کہ انسان کی نیت اس کے وجود پر اچھی طرح اثر انداز ہوتی ہے اور فرشتے اس کے اندرونی اسرار سے باہر کے آثار کے ذریعہ آگاہ ہو جاتے ہیں اور اگر آگاہ نہ ہوں تو انسان کے اعمال کو اچھی طرح ضبطِ تحریر میں نہیں لا سکتے تاس لیے کہ نیت کی کیفیت عمل کی آلودگی اور خلوص کے سلسلہ میں حد سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے یہاں تک کہ پیغمبر اسلامؐ نے مشہور حدیث میں فرمایا ہے :

(انما الاعمال بالنیات) اعمال نیتوں سے وابستہ ہیں۔ دوسرے یہ کہ فرشتے خود انسان سے لیتے ہیں اور اسی پر خرچ کرتے ہیں۔ ہماری زبان ان کا قلم اور ہمارا لعابِ دہن ان کی سیاہی ہے۔

۲۔ وہ مامور ہیں کہ جب انسان نیک کام کی نیت کرے تو اسے ایک نیکی کی حیثیت سے تحریر کریں اور جس وقت اسے انجام دے دے تو دس نیکیاں لکھ دیں۔ لیکن جب انسان گناہ کا ارادہ کرتا ہے تو جب تک عمل نہ کرے کوئی چیز اس کے خلاف نہیں لکھتے اور گناہ کے ارتکاب کے بعد بھی صرف ایک ہی گناہ لکھتے ہیں[2]

یہ تعبیر انسان پر خدا کے انتہائی لطف و کرم کو بیان کرتی ہے کہ گناہ کی نیت کو وہ بخش دیتا ہے اور فعلِ گناہ کی عدل کے مطابق سزا دیتا ہے لیکن اطاعت کے سلسلہ میں ہر نیت ایک نیکی ہے اور ہر نیک کام کی وہ اپنے تفضل کے مطابق جزا دیتا ہے نہ کہ میزانِ عدل کے مطابق اور یہ نیک اعمال کی تشویق ہے۔

۳۔ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ رسولِ خداؐ نے ان دونوں فرشتوں کے موجود ہونے اور دس گنی حسنات کی جزا کے لکھنے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرمایا :

جب انسان کسی بُرے کام کو انجام دیتا ہے دائیں طرف کا فرشتہ بائیں طرف کے فرشتے سے کہتا ہے اس گناہ کے لکھنے میں جلدی نہ کر شاید اس کے بعد کوئی نیک کام انجام دے جو اس کے گناہ پر پردہ ڈال دے جیسا کہ خدائے عظیم فرماتا ہے :

(ان الحسنات یذھبن السیئات) "نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں"

یا یہ کہ توبہ و استغفار کرے اور (گناہ کا اثر ختم ہو جاتے) گناہ کا فرشتہ سات گھنٹے تک گناہ کے تحریر کرنے سے رکا رہتا ہے اگر اس گناہ کے بعد کوئی استغفار یا نیک کام نہ ہو تو پھر حسنات والا فرشتہ سیئات والے فرشتے سے کہتا ہے کہ اس بدبخت محروم کا گناہ لکھ دے[3]

---

[1] اصول کافی، جلد ۲ باب من یھم بالحسنۃ او السیئۃ حدیث ۳۔

[2] ایضاً " " " " " " " " "۔

[3] ایضاً " " " " " " حدیث ۴۔

۴۔ ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ جب مومنین کسی خصوصی مجلس میں ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں تو محافظینِ اعمال ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ ہم ان سے دور ہو جائیں شاید ان کا کوئی راز ہے جسے خدا نے پوشیدہ رکھا ہے[1]

۵۔ حضرت علیؑ اپنے خطبہ میں جس میں لوگوں کو تقویٰ اور خوفِ خدا کی دعوت دیتے ہیں فرماتے ہیں کہ:

"اے بندگانِ خدا! جان لو کہ خود تم میں سے کچھ نگران تم پر مقرر کیے گئے ہیں وہ تمہارے بدن کے اعضا ہیں اور یہ بھی جان لو کہ سچے حساب کرنے والے تمہارے اعمال کو لکھتے ہیں یہاں تک کہ تمہارے سانسوں کی تعداد کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ نہ شبِ تاریک کی سیاہی تمہیں ان سے پوشیدہ رکھ سکتی ہے اور نہ محکم اور بند دروازے۔ اور آج سے کل کس قدر قریب ہے[2]

---

[1] اصول کافی مطابق نقل نور الثقلین، جلد ۵ ص ۱۱۰۔

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵۷۔

۱۳ اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِیۡ نَعِیۡمٍ ۚ
۱۴ وَ اِنَّ الۡفُجَّارَ لَفِیۡ جَحِیۡمٍ ۚ ۖ
۱۵ یَّصۡلَوۡنَہَا یَوۡمَ الدِّیۡنِ ۝
۱۶ وَ مَا ہُمۡ عَنۡہَا بِغَآئِبِیۡنَ ؕ
۱۷ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ ۙ
۱۸ ثُمَّ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ ؕ
۱۹ یَوۡمَ لَا تَمۡلِکُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡـًٔا ؕ وَ الۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰہِ ؑ

ترجمہ

۱۳ یقیناً نیک افراد نعمت فراواں میں ہیں۔
۱۴ اور بدکار دوزخ میں ہیں۔
۱۵ جزا کے روز اس میں وارد ہوں گے اور جلیں گے۔
۱۶ اور کبھی بھی اس سے غائب اور دور نہیں ہوں گے۔
۱۷ تو کیا جانے کہ قیامت کا دن کیا ہے؟
۱۸ پھر تو کیا جانے کہ قیامت کا دن کیا ہے؟
۱۹ ایسا دن ہے جس میں کوئی شخص کسی دوسرے کے حق میں کسی کام کے انجام دینے پر قدرت نہیں رکھتا اور اس دن سب امور اللہ سے مخصوص ہیں۔

تفسیر

وہ دن جس میں کوئی شخص کسی کیلئے کوئی کام انجام نہیں دے گا

اس بحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں فرشتوں کے ذریعہ انسانوں کے اعمال کے ثبت وضبط کے سلسلہ میں آئی ہے ان آیتوں میں اس حساب وکتاب کے نتیجے اور نیکوں اور بُروں کی جو رہگذر ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروردگار عالم فرماتا ہے:

"یقیناً نیک وصالح افراد خدا کی عظیم نعمت میں ہیں" (ان الابرار لفی نعیم)۔ "اور بدکار یقیناً جہنم میں ہیں" (وان الفجار لفی جحیم)۔

"ابرار" "بار" اور "بر" (بروزن حق) کی جمع ہے جس کے معنی نیکوکار شخص کے ہیں۔ اور "بر" (ب کے زیر کے ساتھ) ہر قسم کی نیکی کے معنی میں ہے۔ یہاں اچھے عقائد بھی مراد ہیں اور اچھی نیتیں اور اچھے اعمال بھی۔

"نعیم" مفرد ہے اور نعمت کے معنی میں ہے اور یہاں بہشت جاودانی کے معنی میں ہے اور نکرہ کی صورت میں جو آیا ہے اس نعمت کی اہمیت، وسعت اور عظمت کے بیان کے لیے ہے۔ خدا کے علاوہ کوئی اور اس کی وسعت وعظمت سے واقف نہیں ہے۔

"نعیم" جو یہاں صفت مشبہ ہے یہاں اس نعمت کی بقا اور اس کے استمرار کی تاکید کے لیے ہے۔ یہ مفہوم عام طور پر صفت مشبہ میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔

"فجار" فاجر کی جمع ہے۔ اصل میں فجر کے معنی وسیع طور پر شگاف کرنے کے ہیں اور طلوع صبح کو اس لیے فجر کہتے ہیں کہ گویا رات کا سیاہ پردہ سپیدۂ سحری کے ہاتھوں کلی طور پر شگافتہ ہو جاتا ہے۔ اس بنا پر فجور کا لفظ ان لوگوں کے اعمال کے بارے میں دستیاب ہوتا ہے جو پاکدامنی اور تقویٰ کا پردہ چاک کرتے ہیں اور گناہ کے راستے میں قدم رکھتے ہیں۔

"جحیم" "جحم" (بروزن فہم) کے مادہ سے آگ بھڑکانے کے معنی میں ہے۔ اسی وجہ سے جحیم بھڑکتی ہوئی آگ کو کہتے ہیں۔ قرآنی تعبیر میں یہ لفظ عام طور پر دوزخ کے معنی میں آیا ہے اور یہ جو فرماتا ہے:

"نیکوکار جنت میں اور بدکار دوزخ میں ہیں ممکن ہے اس معنی میں ہو کہ وہ ابھی سے جنت اور دوزخ میں وارد ہو گئے ہیں اور اس دنیا ہی میں جنت کی نعمتوں اور جہنم کے عذاب نے انہیں گھیر رکھا ہے جیسا کہ سورہ عنکبوت کی آیت ۵۴ میں ہم پڑھتے ہیں: (وان جهنم لمحيطة بالكافرين)۔ "دوزخ نے کافروں کا احاطہ کر رکھا ہے"

لیکن ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس قسم کی تعبیر بس حتمی اور یقینی طور پر مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس لیے کہ ادب عربی میں حتمی اور یقینی مستقبل اور متحقق الوقوع مضارع کو حال کی شکل میں اور کبھی ماضی کی شکل میں بیان کرتے ہیں۔

(آیت کے پہلے معنی ظاہر کے ساتھ ساز گار ہیں لیکن مناسب دوسرے معنی ہیں)۔

بعد کی آیت میں فاجروں کی سرنوشت کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "وہ روزِ جزا دوزخ میں داخل ہوں گے اور اس کی آگ میں جلیں گے": (یصلونھا یوم الدین)۔

جب گزشتہ آیت کے معنی ایسے ہوں کہ وہ ابھی سے دوزخ میں داخل ہیں تو پھر یہ آیت بتاتی ہے کہ روزِ قیامت اس جلانے والی آگ میں ان کا داخلہ اور شدید ہوگا اور آگ کے اثر کو وہ اچھی طرح محسوس کریں گے۔

"یصلون"، "صلی" (بروزن سعی) کے مادہ سے آگ میں داخل ہونے، جلنے، بھن جانے اور اس کے درد و تکلیف کو برداشت کرنے کے معنی میں ہے اور اس بنا پر، کہ فعل مضارع ہے، استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے:

"وہ اس آگ سے کبھی دور اور مفقود نہیں ہیں" (وما ھو عنھا بغائبین)۔ بہت سے مفسرین نے اس جملہ کو فجار پر جو عذاب ہوگا اس کے جاوداں ہونے کی دلیل کے طور پر لیا ہے اور اس طرح نتیجہ نکالا ہے کہ فجار سے مراد ان آیات میں کفار ہیں، اس لیے کہ خلود اور ہمیشگی ان کے مورد کے علاوہ وجود نہیں رکھتی۔

اس آیت کی تعبیر زمانہ حال کی شکل میں اس چیز کی مزید تاکید ہے جس کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے کہ اس قسم کے افراد دنیا میں بھی کلی طور پر جہنم سے دور نہیں ہیں۔ ان کی زندگی بجائے خود دوزخ ہے۔ اور مشہور حدیث کے مطابق ان کی قبر جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے اور اس طرح دنیا کی دوزخ اور برزخ کی دوزخ اور قیامت کی دوزخ تینوں ان کے لیے موجود ہیں۔

مندرجہ بالا آیت ضمنی طور پر اس حقیقت کو بھی بیان کرتی ہے کہ دوزخیوں کے عذاب میں کسی قسم کا وقفہ نہیں ہے یہاں تک کہ ایک لمحے کا وقفہ بھی نہیں ہوگا۔

اس کے بعد اس عظیم دن کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے کہتا ہے: "تو کیا جانے کہ روزِ جزا کیا ہے" (وما ادراک مایوم الدین)۔ "پھر تو کیا جانے کہ روزِ جزا کیا ہے؟" (ثم ما ادراک مایوم الدین)۔

جب پیغمبرِ اسلامؐ قیامت کے بارے اس وسیع آگاہی اور علم کے باوجود اس پر حکومت کرنے والے حوادث، اضطراب اور عظیم وحشت کو اچھی طرح نہیں جانتے تو باقی کا معاملہ واضح ہے۔

یہ گفتگو اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ قیامت کے ہولناک حوادث اس قدر وسیع و عظیم ہیں جو قالبِ

بیان میں نہیں سما سکتے اور جس طرح ہم عالم خاک کے اسیر جنت کی بے پایاں نعمتوں سے اچھی طرح آگاہ نہیں ہیں جہنم کے عذاب اور اس کے حوادث سے کس طرح آگاہ ہو سکتے ہیں۔

اس کے بعد ایک مختصر اور پُرمعنی جملہ میں اس دن کی ایک اور خصوصیت جس میں درحقیقت تمام چیزیں چھپی ہوئی ہیں پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"وہی دن جس دن کوئی شخص کسی دوسرے کے حق میں کوئی کام انجام نہیں دے سکے گا اور اس دن تمام امور خدا سے مختص ہیں" (یوم لا تملك نفس لنفس شيئًا والامر يومئذ لله)۔

کام تو اس جہان میں بھی سب اسی کے دستِ قدرت میں ہیں اور سب لوگ اسی کے نیازمند ہیں لیکن پھر بھی یہاں کبھی کبھی بہرحال مجازی مالک و حاکم اور فرماں روا موجود ہیں جنہیں سطحی نگاہ رکھنے والے افراد مستقل مبدا۔ قدرت خیال کرتے ہیں لیکن اس دن یہ مجازی مالکیت و حاکمیت بھی ختم ہو جائے گی اور خدا کی حاکمیتِ مطلقہ ہر زمانہ کی بہ نسبت زیادہ واضح ہوگی۔

یہ چیز قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی آئی ہے (لمن الملك اليوم لله الواحد القهار) "آج کے دن حکومت کس کے لیے ہے غالب و یکتا خدا کے لیے ہے" (مومن - ۱۶)۔

اصولی طور پر اس دن ہر شخص اس قدر اپنے آپ میں گرفتار ہوگا کہ اگر بالفرض اس میں قوت ہوتی بھی تب بھی دوسروں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ (لكل امرئ منهم يومئذ شأن يغنيه)۔ اس دن ان میں سے ہر ایک اس طرح مبتلا ہوگا جو اس کے لیے کافی ہوگا۔ (عبس - ۳۷)۔

ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے مروی ہے:

(ان الامر يومئذ واليوم كله لله ... اذا كان يوم القيامة بادت الحكام فلم يبق حاكم الا الله)

"اور آج اور اس دن تمام کام اللہ کے اختیار میں ہیں لیکن جب قیامت کا دن ہوگا تو تمام حاکم تباہ و برباد ہو جائیں گے اور خدا کی حکومت کے علاوہ کوئی حکومت باقی نہیں رہے گی"[1]

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ کیا یہ تعبیر انبیاء، اولیاء اور فرشتوں کی شفاعت کے سلسلہ سے متصادم نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب ان مباحث سے جو ہم مسئلہ شفاعت کے سلسلہ میں پہلے تحریر کر چکے ہیں واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن مجید متعدد آیات میں تصریح کر چکا ہے کہ شفاعت خدا کے اذن اور اجازت سے ہوگی اور روزِ جزا کے شفیع اس کی رضا کے بغیر کسی کی شفاعت نہیں کریں گے۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۵۰ ۴۔

(ولا یشفعون الّا لمن ارتضی) (انبیاء - ۲۸)۔

خداوندا! اس ہولناک دن کے بارے میں سب کی نظریں تیری طرف لگی ہوئی ہیں۔ ہم ابھی سے تیری طرف نظریں لگائے ہوتے ہیں۔

پروردگارا! ہمیں اس جہان میں اور اُس جہان میں اپنے بے پایاں لطف و کرم سے محروم نہ کیجیو۔

بارالٰہا! ہر حالت میں حاکم مطلق تُو ہے ہمیں وادیِ شرک میں محصور ہونے سے بچا اور دوسروں کی پناہ لینے سے محفوظ رکھ۔

آمین یارب العالمین

سورۂ انفطار کا اختتام

سورۃ

مطففین

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا

اس میں ۳۶ آیتیں ہیں

سورۂ مطففین کے مضامین کا دائرہ کار

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا یا مدینہ میں اس کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ شانِ نزول بتاتی ہے کہ اس سورہ کی ابتدائی آیات جن کا موضوع کم تولنا ہے ان لوگوں سے متعلق ہیں جو مدینہ میں اس قبیح کام میں مشغول تھے۔

لیکن دوسری آیات کا لب و لہجہ مکی سورتوں کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتا ہے جس میں مختصر اور پُرجلال آیات میں پروردگار عالم قیامت اور حوادثِ قیامت کی خبر دیتا ہے خصوصاً اس سورہ کی آیات جو مسلمانوں کا مذاق اڑانے کے بارے میں کفار کو موضوع گفتگو بناتی ہیں۔

یہ آیتیں مکہ کے ماحول کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہیں۔ وہاں مومنین اقلیت میں تھے اور کافروں کی قطعی اکثریت تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین سورہ کے ایک حصّہ کو مکی اور ایک حصّہ کو مدنی سمجھتے ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ سورۃ مکی سورتوں سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ بہرحال اس سورہ کے مباحث پانچ محوروں کے گرد گھومتے ہیں۔

۱۔ کم تولنے والوں کے بارے میں شدید تنبیہ و تہدید۔

۲۔ اس مفہوم کی طرف اشارہ کہ بڑے بڑے گناہوں کا سرچشمہ قیامت کے بارے میں پختہ یقین کا نہ ہونا ہے۔

۳۔ اس عظیم دن فجار کی سرنوشت کا ایک حصّہ۔

۴۔ جنت میں نیکوکاروں کو ملنے والی عظیم اور روح پرور نعمتوں کا ایک حصّہ۔

۵۔ کفار کا مومنین سے جاہلانہ مذاق اور اس کے برعکس قیامت کے ہونے کا بیان۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلامؐ سے منقول ہے کہ (من قرأ سورة المطففین سقاه الله من الرحیق المختوم یوم القیامة) جو شخص سورہ مطففین پڑھے خدا اسے خالص شراب سے جو کسی کو میسر نہیں ہوئی قیامت میں سیراب کرے گا۔[1]

ایک دوسری حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے: من قرأ فی فرائضه "ویل للمطففین" اعطاه الله من یوم القیامة من النار ولم تره ولم یرها۔ جو شخص اپنی فریضہ نمازوں میں سورہ مطففین پڑھے خدا قیامت میں اسے عذابِ جہنم سے محفوظ رکھے گا نہ جہنم کی آگ اسے دیکھے گی، نہ وہ جہنم کی آگ کو دیکھے گا۔[2]

یہ سب ثواب فضیلت اور برکت اس شخص کے لیے ہے جو اس کے پڑھنے کو عمل کی تمہید اور مقدمہ قرار دے۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۵۱۔

[2] ثواب الاعمال مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۵۲۷۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ ۙ

(۲) الَّذِیۡنَ اِذَا اکۡتَالُوۡا عَلَی النَّاسِ یَسۡتَوۡفُوۡنَ ۫ۖ

(۳) وَ اِذَا کَالُوۡہُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡہُمۡ یُخۡسِرُوۡنَ ؕ

(۴) اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّہُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ ۙ

(۵) لِیَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ۙ

(۶) یَّوۡمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ؕ

ترجمہ

(۱) وائے ہے کم تولنے والوں پر۔

(۲) وہ جب خود لیتے ہیں تو اپنا حق پورا لیتے ہیں۔

(۳) لیکن جب چاہتے ہیں کہ دوسروں کے لیے تولیں تو کم تولتے ہیں۔

(۴) کیا وہ باور نہیں کرتے کہ وہ اٹھائے جائیں گے۔

(۵) عظیم دن

(۶) جس روز لوگ رب العالمین کی بارگاہ میں کھڑے ہوں گے۔

شانِ نزول

ابنِ عباس کہتے ہیں جس وقت پیغمبر اکرمؐ مدینہ میں داخل ہوئے تو بہت سے لوگ کم تولنے کے مرض میں مبتلا تھے تو خدا نے ان آیتوں کو نازل کیا اور انہوں نے قبول کیا اور کم تولنا ختم کر دیا۔

دوسری حدیث میں آیا ہے کہ بہت سے اہلِ مدینہ تاجر تھے اور وہ کم تولنے کے عادی تھے اور وہ بہت سے حرام کام کرتے تھے، تو ایسی صورت میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ آیتیں اہلِ مدینہ کو سنائیں۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

(خمس بخمس)۔ پانچ چیزیں پانچ چیزوں کے مقابلہ میں ہیں۔ انہوں نے عرض کیا "اے خدا کے رسول! کونسی پانچ چیزیں پانچ چیزوں کے مقابلہ میں ہیں"؟ تو آپؐ نے فرمایا:

(ما نقض قوم العهد الّا سلط الله عليهم عدوهم وما حكموا بغير ما انزل الله الّا فشا فيهم الفقر وماظهرت فيهم الفاحشة الّا فشا فيهم الموت ولا طففوا الكيل الّا منعوا النبات واخذوا بالسنين ولا منعوا الزكاة الّا حبس عنهم المطر)

کسی قوم نے عہد شکنی نہیں کی مگر یہ کہ خدا نے اس کے دشمنوں کو اس پر مسلط کر دیا اور کسی جمعیت نے حکمِ خدا کے خلاف حکم نہیں دیا مگر یہ کہ ان میں فقر و فاقہ زیادہ ہوگیا۔ کسی ملت کے درمیان فحاشی اور برائیاں ظاہر نہیں ہوئیں مگر یہ کہ موت کا وقوع ان میں زیادہ ہوگیا۔ کسی قوم نے کم نہیں تولا مگر یہ کہ ان کی زراعت ختم ہوگئی اور قحط سالی نے انہیں گھیر لیا اور کسی قوم نے زکوٰۃ نہیں روکی مگر یہ کہ بارش سے محروم ہوگئے[1]

مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں ان آیتوں کی شانِ نزول کے سلسلہ میں نقل کیا ہے کہ مدینہ میں ایک شخص تھا جس کا نام ابو جہنہ تھا جس کے پاس دو چھوٹے بڑے پیمانے تھے۔ خریدتے وقت بڑا پیمانہ استعمال کر کے فائدہ اٹھاتا اور بیچتے وقت چھوٹے پیمانے سے دیتا۔ (تو یہ سورہ نازل ہوا اور اسے خبردار کیا)[2]

تفسیر

کم تولنے والوں پر وائے ہے

ان آیات میں ہر چیز سے پہلے کم تولنے والوں کو شدید عذاب کا مستحق ٹھہرا کر فرماتا ہے: "وائے ہے کم تولنے والوں پر" (ويل للمطففين)۔ یہ حقیقت میں خدا کی جانب سے ان ظالم، ستمگر اور گندے لوگوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہے جو بزدلوں کی طرح لوگوں کا حق پامال کرتے ہیں۔

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۳۱ ص ۸۸۔

[2] مضمون کو ابوالفتوح اور مراغی نے اپنی اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ (۲) مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۵۲۔

"مطففین" "تطفیف" کے مادہ سے اصل میں "طفت" سے لیا گیا ہے جو کسی چیز کے کناروں کے معنی میں ہے اور یہ جو سرزمین کربلا کو وادیِ طف کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فرات کے کنارے پر واقع ہے۔

اس کے بعد ہر کم چیز پر طفیف کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ پیمانہ جو لبریز نہ ہو، وہاں بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ لفظ کم تولنے کے لیے استعمال ہوا ہے خواہ وہ کسی شکل وصورت کا ہو۔

"ویل" یہاں شر، غم واندوہ، ہلاکت یا دردناک عذاب یا جہنم کی سخت جلانے والی وادی کے معنوں میں ہے۔ عام طور پر یہ لفظ نفرین کرنے اور کسی چیز کی قباحت کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے یا یہ کہ ایک مختصر سی تعبیر ہے جو بہت سے مفاہیم کو چاہتی ہے۔

قابلِ توجہ یہ ہے کہ ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ خدا نے لفظ ویل قرآن میں کسی شخص کے لیے استعمال نہیں کیا مگر یہ کہ اس کو کافر کہا ہے (فویل للذین کفروا من مشھد یوم عظیم) "وائے ہے کافروں پر عظیم دن کے مشاہدہ سے"[۱] (مریم - ۳۷)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کم تولنے سے کفر کی بُو آتی ہے۔ اس کے بعد مطففین یعنی کم تولنے والوں کے کام کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے لیے تولتے ہیں تو اپنا حق مکمل طور پر وصول کرتے ہیں" (الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون)[۲]

لیکن جب وہ چاہتے ہیں کہ دوسروں کے لیے تولیں تو کم تولتے ہیں (واذا کالوھم اووزنوھم یخسرون)۔

مفسرین کی ایک جماعت نے مندرجہ بالا آیات سے اس طرح استفادہ کیا ہے کہ مطفف سے مراد وہ شخص ہے جو خریدتے وقت اپنا حق زیادہ لیتا ہے اور بیچتے وقت مقابل کو اس کے حق سے کم دیتا ہے۔ اسی لیے خدا نے دونوں پہلوؤں کے پیشِ نظر ان پر ویل رکھی ہے۔

لیکن یہ ایک اشتباہ ہے اور غلط ہے کیونکہ "یستوفون" کا مفہوم یہ ہے کہ اپنا حق مکمل طور پر وصول کرتے ہیں اور ایسا پہلو جس میں اپنے حق سے زیادہ لینے کی بات ہو اس عبارت میں موجود نہیں ہے اور یہ جو ہم دیکھ رہے ہیں کہ خدا نے ان کی مذمت کی ہے ان دونوں حالتوں کے ایک دوسرے سے تقابل

---

[۱] اصول کافی مطابق نقل نورالثقلین، جلد ۵ ص ۵۲۷۔

[۲] یہاں علی الناس کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ لوگوں پر وہ کوئی حق رکھتے ہیں اور تقدیر اذا کالواعلی الناس بھی اور اصولاً کال علیہ وہاں کہا جاتا ہے جہاں کیل کا مقصد حق لینا ہوتا ہے باقی رہا کالہ اور کال لہٗ اس جگہ سے مربوط ہے جہاں کیل سے مراد دوسرے کا حق دینا ہے۔ (غور کیجئے)۔

کی شکل میں ہے کہ خریدتے وقت پورا پورا حق لیتے ہیں اور بیچتے وقت کمی کرتے ہیں۔
یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح ہم کسی کی مذمت میں کہتے ہیں ،، جب کسی سے اس کو کوئی چیز لینی ہوتی ہے تو وعدہ کے مطابق (جو وقت مقرر ہو عین اسی وقت) لیتا ہے لیکن کسی کو کچھ دینا ہو تو مہینوں تاخیر کرتا ہے ،، حالانکہ اپنی طلب کا وعدہ کے مطابق لینا کوئی بُری بات نہیں ہے لیکن ان دونوں کے تقابل کا جائزہ لینے کے نتیجے میں بُری بات ہے۔
قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ حق لینے کے معاملہ میں گفتگو کیل کے بارے میں ہے لیکن دینے کے معاملہ میں گفتگو کیل و وزن دونوں کے حوالے سے ہے۔ تعبیر کا یہ فرق، ہو سکتا ہے کہ، ذیل کی دو وجوہ میں سے کسی ایک کی بنا پر ہو:۔
پہلی وجہ یہ کہ خریدار عام طور پر پہلے زمانے میں کیل سے استفادہ کرتے تھے اس لیے کہ بڑی ترازو جو زیادہ وزن تول سکے اس زمانے میں موجود نہیں تھی لیکن بڑے پیمانے آسانی سے مل سکتے تھے ("کر" کے بارے میں بھی علماء نے کہا ہے کہ یہ لفظ اصل میں ایک بڑے پیمانے کا نام ہے) بیچتے وقت وہ تھوک کا کاروبار کیل سے کرتے تھے اور وزن کے ذریعہ خوردہ فروشی کرتے تھے۔
دوسرے یہ کہ حق لینے کے وقت پیمانے سے استفادہ زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس میں دھوکے کا امکان بہت کم ہے لیکن کم تولنے کے لیے وزن کا ذریعہ زیادہ مفید ہوتا ہے اس لیے کہ اس میں دھوکہ دینے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔
یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات اگرچہ صرف کیل و وزن کے حوالے سے کم تولنے کی بات کرتی ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ آیت کا مفہوم وسیع ہے اور اس کا اطلاق کم تولنے کے سلسلہ میں ان چیزوں پر بھی ہے جن کا لین دین گن کر ہوتا ہے۔ بلکہ یہ بھی بعید نہیں کہ آیت اپنے مفہوم کی گہرائی کے اعتبار سے موعودہ خدمت میں کمی کرنے کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لے۔
مثال کے طور پر کوئی کاریگر یا مزدور اپنا کام صحیح طور پر مکمل نہیں کرتا تو وہ بھی مطففین کا مصداق ہے یعنی کم تولنے والوں کی صف میں ہے جن کی یہ آیتیں سختی سے مذمت کر رہی ہیں۔
بعض مفسرین اس آیت کو اور زیادہ وسیع معانی کا حامل سمجھتے ہیں اور حدودِ خداوندی سے ہر قسم کا تجاوز اور اجتماعی و اخلاقی روابط میں کمی کو بھی اس کے مفہوم میں شامل سمجھتے ہیں۔ اگرچہ اس آیت کے الفاظ سے ان معانی کا استفادہ واضح نہیں ہے لیکن غیر مناسب بھی نہیں ہے۔
اسی لیے مشہور صحابیٔ رسول عبداللہ بن مسعود سے منقول ہے کہ نماز میں ایک معقول پیمانہ ہے جو شخص اس کا کیل مکمل طور پر ادا کرے تو خدا اس کو اس کا اجر مکمل دے گا اور جو شخص اس میں کمی کرے تو اس کے بارے میں وہی کچھ جاری ہو گا جو خدا نے مطففین یعنی کم تولنے والوں کے

بارے میں فرمایا ہے [1]

اس کے بعد پروردگارِ عالم ایسے لوگوں کو تنبیہ یعنی استفہامِ توبیخی کے ذریعے متنبہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"کیا وہ باور نہیں کرتے کہ قبروں سے اٹھائے جائیں گے" (الا یظن اولئک انھم مبعوثون)۔

"عظیم دن" (لیوم عظیم)۔ وہ دن جس کا حساب عذاب اور اس کی ہولناکی اور سب عظیم ہیں۔ "وہ دن جب لوگ قبروں سے اٹھیں گے اور رب العالمین کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے" (یوم یقوم الناس لرب العالمین)۔

یعنی وہ اگر قیامت کو باور کرتے اور جانتے کہ حساب کتاب ہونا ہے اور تمام اعمال ایک عظیم عدالت میں محاکمہ کے لیے پیش ہوں گے اور جس شخص نے سوئی کی نوک کے برابر بھی اچھا یا بُرا کام کیا ہے اس کا نتیجہ وہ اس عظیم دن دیکھے گا، پھر وہ کبھی اس قسم کا ظلم وستم نہ کرتے اور لوگوں کے حقوق پامال نہ کرتے۔

بہت سے مفسرین "لظن" کو جو ظن کے مادہ سے ہے یہاں یقین کے معنی میں سمجھتے ہیں۔ اس تعبیر کی نظیر قرآن مجید میں موجود ہے مثلاً سورہ بقرہ کی آیت ۲۴۹ (قال الذین یظنون انھم ملاقوا اللّٰہ کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃً باذن اللّٰہ) جو مانتے تھے کہ خدا سے ملاقات کریں گے (اور وہ قیامت کے دن پر ایمان رکھتے تھے) "انہوں نے کہا کہ کئی چھوٹے گروہ تھے جو حکمِ خدا سے بڑے گروہ کے مقابلے میں کامیاب ہوئے" (توجہ رکھیں کہ یہ آیت بنی اسرائیل کے ایک گروہ کے بارے میں ہے جس نے ایمان واستقامت کا مختلف مراحل میں مظاہرہ کیا تھا)۔

اس بات کی شاہد و ناطق وہ حدیث ہے جو امیرالمومنین حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ آپ نے آیہ (الا یظن اولئك انھم مبعوثون لیوم عظیم) کی تفسیر میں فرمایا کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ (الیس یوقنون انھم مبعوثون)؟ کیا انہیں یقین نہیں ہے کہ وہ قبروں سے اٹھیں گے [2]

انہی حضرت سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا کہ ظن کی دو قسمیں ہیں، ظنِ تردید اور ظنِ یقین۔ جو قرآن میں معاد و قیامتؐ کے بارے میں آیا ہے وہ ظنِ یقین ہے اور جو کچھ دنیا کے بارے میں آیا ہے وہ ظنِ شک ہے [3]

ایک جماعت کی طرف سے یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ ظن سے یہاں مراد موجودہ دَور کے مشہور

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۵۲۔

[2] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۴۳۸۔

[3] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۲۸۔

معانی گمان ہیں جو اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کی جان اور روح میں قیامت کی طرف توجہ کرنا اس طرح اثر کرتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس کا گمان بھی کرتا ہو اور اس کو اس دن کا احتمال بھی ہو تو وہ بُرے کاموں سے اجتناب کرے چہ جائیکہ اس کا یقین رکھتا ہو۔ یہ وہی چیز ہے جو علماً کے درمیان دفع ضرر مظنون یا دفع ضرر محتمل کے عنوان سے مشہور ہے۔

اب اس بات کا مفہوم یہ ہوگا کہ یہ بے پرواہ اور بے باک گنہگار نہ صرف یہ کہ قیامت کا یقین نہیں رکھتے بلکہ اس کا گمان بھی نہیں رکھتے لیکن پہلی تفسیر، اُن وجوہ کی بنا پر، جو بیان کی گئی ہیں مقدم ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ لفظ ظن راغب کے مفردات کی رو سے اصل میں اس حالت کا نام ہے جو چند قرائن کے ہونے کی وجہ سے فکرِ انسانی کو حاصل ہوتی ہے اگر نشانیاں قوی ہوں تو علم و یقین لے آتی ہے اور اگر نشانیاں کمزور ہوں تو پھر وہ گمان کی حد سے آگے نہیں بڑھتی[1]

اس بنا پر مذکورہ لفظ، اس کے برخلاف جو ہمارے زمانہ میں مشہور ہے، وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں علم اور گمان دونوں شامل ہیں اور دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ایک نکتہ

کم تولنا فساد فی الارض کا ایک سبب ہے

قرآن مجید کی آیات میں کئی مرتبہ کم تولنے کی مذمت کی گئی ہے۔ کبھی حضرت شعیبؑ کے واقعہ میں جہاں وہ قوم کو خطاب کرکے کہتے ہیں (اوفوا الکیل ولا تکونوا من المخسرین وزنوا بالقسطاس المستقیم ولا تبخسوا الناس اشیاءھم ولا تعثوا فی الارض مفسدین) "پیمانے کے حق کو ادا کرو اور دوسروں کو نقصان نہ پہنچاؤ، وزن صحیح ترازو میں کرو اور لوگوں کے حق میں کمی نہ کرو اور زمین میں فساد برپا نہ کرو" (شعراء ۱۸۱ تا ۱۸۳)۔

اس طرح وزن کرتے وقت اور چیز کو پیمانے سے ناپتے وقت تولنے کو اور انصاف کو نظر انداز کرنے کو فساد فی الارض بتایا گیا ہے اور یہ کام اجتماعی مفاسد میں سے ایک ہے۔

سورہ رحمٰن کی آیت ۷، ۸ میں وزن کرتے وقت انصاف سے کام لینے کو عالمِ ہستی کے نظامِ تخلیق میں جو عدالت کار فرما ہے، اس کے برابر قرار دیا گیا ہے فرماتا ہے:

(والسماء رفعھا ووضع المیزان الّا تطغوا فی المیزان) "خدا نے آسمان کو بلند کیا اور ہر چیز میں میزان و حساب رکھا تاکہ تم وزن و حساب میں طغیان و سرکشی سے کام نہ لو"

---

[1] مفردات، مادہ ظن۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ناپ تول میں عدل کی رعایت کا مسئلہ کم اہم نہیں ہے بلکہ حقیقت میں اصل عدالت ہے اور سارے نظامِ ہستی پر حاکم نظم کلی کا ایک جز ہے۔

اسی بنا پر عظیم آئمہ اسلام نے اس مسئلہ کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے یہاں تک کہ اصبغ بن نباتہ کی مشہور روایت میں آیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؑ سے سنا کہ آپ منبر پر فرما رہے تھے:

(یامعشر التجار! الفقه ثم المتجر) "اے گروہ تجار پہلے فقہ کی تعلیم حاصل کرو اس کے بعد تجارت کرو" اس بات کی امام نے تین بار تکرار کی اور اس کلام کے آخر میں فرمایا:

(التاجر فاجر والفاجر فی النار الا من اخذ الحق واعطی الحق) "تجارت کرنے والا فاجر ہے اور فاجر دوزخی ہے سوائے اس کے کہ جو صرف اپنا حق لوگوں سے لے اور لوگوں کا حق ادا کرے"[1]

ایک اور حدیث میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ جس وقت امیرالمومنین علیؑ کوفہ میں تھے تو آپ ہر روز صبح کے وقت کوفے کے بازاروں میں آتے اور ایک ایک بازار میں گشت کرتے اور تازیانہ آپ کے کاندھے پر ہوتا ہر بازار کے وسط میں کھڑے ہو جاتے اور بلند آواز سے کہتے اے گروہ تجار! خدا سے ڈرو۔

جس وقت حضرت علیؑ کی پکار کو سنتے تو جو کچھ تاجروں کے ہاتھ میں ہوتا رکھ دیتے اور پورے خلوص کے ساتھ آپ کی باتوں کو سنتے۔ اس کے بعد آپ فرماتے:

(قدموا الاستخارة وتبرکوا بالسهولة واقتربوا من المبتاعین وتزینوا بالحلم وتناهوا عن الیمین وجانبوا الکذب وتجافوا عن الظلم وانصفوا المظلومین ولا تقربوا الربوا واوفوا الکیل والمیزان ولا تبخسوا الناس اشیاءهم ولا تعثوا فی الارض مفسدین)

"خدا سے خیر طلب کرو اور لوگوں کے ساتھ معاملہ آسان کرکے برکت چاہو اور خریداروں کے پاس جاؤ، حلم و بردباری کو اپنی زینت قرار دو، قسم کھانے سے پرہیز کرو، جھوٹ بولنے سے اجتناب کرو، ظلم سے بچو اور مظلوموں کا حق ظالموں سے لے کر دو، سود کے قریب نہ جاؤ، پیمانے اور وزن کے معاملہ میں پورے پورے انصاف سے کام لو، لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو اور زمین میں باعث فساد نہ بنو"

اس طرح آپ کوفہ کے بازاروں میں گردش کرتے، اس کے بعد دارالامارۃ کی طرف پلٹ آتے اور لوگوں کی دادخواہی اور ان کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھ جاتے[2]

اور جیسا کہ ان آیات کی شانِ نزول میں بھی آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں: "جو گروہ کم تولے گا خدا

---

[1] کافی جلد ۵ باب آداب التجارة حدیث ۱۔

[2] کافی باب آداب التجارة حدیث ۳ (تھوڑے سے اختصار کے ساتھ)۔

اسس کی زراعت اس سے چھین لے گا اور اسے قحط سالی میں مبتلا کر دے گا۔ جو کچھ اوپر کہا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض گزشتہ اقوام کی بربادی اور ان پر عذاب نازل ہونے کے عوامل میں سے ایک عامل یہ ہے کہ وہ کم تولتے تھے۔ ان کا یہ اقدام ان کی اقتصادی بدحالی اور نزولِ عذابِ خدا کا سبب بنا۔

یہاں تک اسلامی روایات میں آدابِ تجارت کے سلسلہ میں آیا ہے کہ مومنین کے لیے بہتر ہے کہ پیمانہ بھرتے اور وزن کرتے وقت کچھ زیادہ دیں اور لیتے وقت اپنا حق کچھ کم لیں (ان لوگوں کے کام کے بالکل برعکس جن کی طرف مندرجہ بالا آیات میں اشارہ ہوا ہے کہ وہ اپنا حق تو پورا پورا وصول کرتے تھے لیکن دوسروں کا حق کم دیتے تھے) [1]

دوسرے، جیسا کہ ہم نے اوپر والی آیت کی تفسیر میں اشارہ کیا ہے، کم تولنے کا مسئلہ بعض مفسرین کے نظریہ کے مطابق وسیع معانی کا حامل ہے، جو ہر قسم کی اجتماعی و انفرادی اور خدا سے تعلق رکھنے والی ذمہ داریوں کے انجام دینے کے سلسلہ میں کمی ہو سکتی ہے اس کو بھی اپنے دامن میں لیے ہوتے ہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ ابواب التجارہ باب، ص ۲۹۰ سے رجوع فرمایئے۔

۷ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝

۸ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝

۹ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝

۱۰ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝

ترجمہ

۷ اس طرح نہیں ہے (جیسا وہ قیامت کے بارے میں خیال کرتے ہیں)، یقیناً فاجروں کا نامہ اعمال سجّین میں ہے۔

۸ تو کیا جانے کہ سجّین کیا ہے؟

۹ رقم زدہ نامہ اور سرنوشت ہے۔

۱۰ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں پر۔

تفسیر

تو کیا جانے کہ سجّین کیا ہے؟

اس بحث کے بعد، جو گزشتہ آیات میں کم تولنے والوں کے بارے میں اور قیامت کے دن کے بارے میں گناہ اور ایمان راسخ نہ ہونے کے رابطہ کے سلسلہ میں آئی تھی، ان آیتوں میں اس روز بدکاروں اور فاجروں کا جو حال ہوگا اس کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتا ہے پہلے فرماتا ہے:

"اس طرح نہیں ہے جیسا وہ قیامت کے بارے میں خیال کرتے ہیں کہ حساب و کتاب نہیں ہوگا بلکہ فاجروں کا نامہ اعمال سجّین میں ہے" (کلّا انّ کتاب الفجار لفی سجین)۔ "تو کیا جانے سجین کیا ہے" (وما ادراك ما سجين)۔ "ایک مُہر زدہ تحریر اور نامہ ہے" (کتاب مرقوم)۔

ان آیات کی تفسیر کے سلسلہ میں دو عمدہ نظریے ہیں:

۱۔ کتاب سے مراد انسان کا وہی نامہ اعمال ہے۔ کوئی چھوٹا یا بڑا ایسا کام نہیں ہے جس کا اس میں شمار

نہ کیا گیا ہو۔ تمام باتیں بے کم و کاست اس میں درج ہیں۔

اور سجین سے مراد ایک جامع کتاب ہے جس میں تمام انسانوں کے نامہ ہائے اعمال جمع کیے گئے ہیں۔ سادہ اور عام تعبیر میں وہ ایک ایسے مکمل رجسٹر کے مانند ہے جس میں ہر ایک قرض خواہ اور مقروض کا حساب علیحدہ اور مستقل صفحہ پر تحریر ہے۔

البتہ ان آیات اور بعد کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام بدکاروں کے اعمال سجین نامی کتاب میں ہیں اور تمام نیک افراد کے اعمال ایک دوسری کتاب میں درج ہیں جس کا نام علیین ہے۔

"سجین" سجن کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی زندان کے ہیں۔ اس کے مختلف معانی ہیں۔ سخت و شدید زندان، محکم موجود، قعر جہنم میں ایک بہت ہی ہولناک وادی، وہ جگہ جہاں بدکاروں کے اعمال نامے رکھے جاتے ہیں، اور جہنم کی آگ [1]

طریحی مجمع البحرین میں سجن کے مادہ کے بارے میں کہتا ہے: (و فی التفسیر هو کتاب جامع دیوان الشر دوّن الله فیه اعمال الکفرة والفسقة من الجن والانس) تفسیر میں آیا ہے کہ سجین ایک کتاب ہے جو برائیوں کے دیوان کا جامع ہے جس میں خدا نے جن و انس میں سے کافروں اور فاسقوں کے اعمال کو مدون کیا ہے۔ طریحی نے واضح نہیں کیا کہ اس تفسیر سے مراد کونسی تفسیر ہے، آیا وہ معصوم سے منقول ہے یا کسی غیر سے۔

جو قرائن ان معانی کی تائید کرتے ہیں وہ درج ذیل سے عبارت ہیں

۱۔ قرآن مجید میں اس قسم کے مواقع پر کتاب کی تعبیر عام طور پر نامۂ اعمال کے معنوں میں ہے۔

۲۔ آخری آیت جو سجین کی تفسیر کی شکل میں بیان ہوئی ہے کہتی ہے، "وہ کتاب ہے مہر زدہ" اور یہ جو بعض نے آیت کو سجین کی تفسیر کے طور پر قبول نہیں کیا یقیناً ظاہر کے برخلاف ہے۔

۳۔ بعض نے کہا ہے سجین و سجیل کے ایک ہی معنی ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ سجّل (سین اور جیم کے زیر اور لام پر تشدید کے ساتھ) بہت بڑی کتاب کے معنی میں ہے [2]

۴۔ قرآن کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اعمال چند کتابوں میں منضبط ہوتے ہیں، تاکہ حساب کے وقت کسی قسم کا عذر یا بہانہ کسی شخص کے لیے باقی نہ رہے۔

ایک تو شخصی اعمال نامہ ہیں جو قیامت میں متعلقہ افراد کے ہاتھوں میں دیئے جائیں گے۔ نیکو کاروں کو

---

[1] لسان العرب، مادہ سجن۔

[2] روح المعانی جلد ۳۰ ص ۷۰ اور مجمع البحرین مادہ سجل۔

دائیں ہاتھ میں اور بدکاروں کو ان کے بائیں ہاتھ میں۔ آیاتِ قرآنی میں اس کی طرف بہت اشارہ ہوا ہے۔

دوسری کتاب وہ ہے جسے امتوں کے نامہ اعمال کا نام دیا جا سکتا ہے جس کی طرف سورہ جاثیہ کی آیت ۲۸ میں اشارہ ہوا ہے۔ (کل امة تدعٰی الی کتابها) " قیامت کے دن ہر امت کو اس کے نامۂ اعمال کی طرف پکارا جائے گا۔

تیسرا نامہ اعمال عمومی ہے وہ تمام نیکوکاروں اور بدکاروں کا نامہ اعمال ہے، جس کا زیرِ بحث آیات اور آنے والی آیات میں سجین اور علیین کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس تفسیر کے مطابق سجین وہی دیوانِ کل ہے جس میں تمام بدکاروں کے نامہ اعمال جمع ہوں گے۔ اس کو سجین اس لیے کہا گیا ہے کہ اس دیوان کے مشتملات ان کے جہنم میں زندانی اور مقید ہونے کا سبب ہوں گے نیکوکاروں کی کتاب کے برعکس جو اعلیٰ علیین بہشت میں ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ سجین اسی مشہور و معروف معنی یعنی دوزخ کے لیے استعمال ہوا ہے جو تمام بدکاروں کے لیے بہت بڑا زندان ہے یا دوزخ میں ایک سخت جگہ ہے۔

اور کتابِ فجار سے مراد وہی سرنوشت ہے جو ان کے لیے تحریر ہوئی ہے اس بنا پر اس آیت کے یہ معنی ہوں گے "مقرر و مسلّم سرنوشت بدکاروں کی جہنم میں ہے۔"

اور لفظ کتاب کے استعمال قرآن میں اسی معنی میں بہت مقامات پر ہیں، مثلاً سورہ نساء کی آیت ۲۴، بعد اس کے کہ فرماتا ہے؛

"شوہردار عورتیں تم پر حرام ہیں" مزید کہتا ہے:

(کتاب اللّٰہ علیکم) یہ حکم (اور اس سے پہلے کے احکام) ایسے ہیں جو خدا نے تمہارے لیے مقرر کر دیتے ہیں۔"

اور سورہ انفال کی آیت ۷۵، میں ہم پڑھتے ہیں:

(واولوا الارحام بعضهم اولٰی ببعض فی کتاب اللّٰہ) "رشتہ دار ایک دوسرے کی بہ نسبت ان احکام میں جو خدا نے مقرر کیے ہیں، (دوسروں سے) زیادہ سزاوار اور حقدار ہیں۔"

وہ مطلب جو اس تفسیر کی تائید کرتا ہے یہ ہے کہ سجین اپنے اسی مشہور معنی میں ہیں جو اخبار و آثارِ اسلامی میں بیان ہوا ہے یعنی اس کی تفسیر جہنم کی گئی ہے۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں آیا ہے کہ "ان کتاب الفجار لفی سجین" کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ ان کے لیے عذاب مقرر کیا گیا ہے وہ سجین (دوزخ) میں ہے۔

ایک حدیث امام محمد باقرؑ سے بھی منقول ہے کہ (السجین الارض السابعة وعلیون السماء

السابعة) سجین ساتویں زمین اور علیین ساتواں آسمان ہے (سب سے نچلی اور سب سے اوپر والی جگہ کی طرف اشارہ ہے)۔[1]

متعدد روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اعمال جو قربِ خدا کے لائق نہیں ہیں ساقط ہو جائیں گے اور سجین میں قرار پائیں گے جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلامؐ سے منقول ہے:

ان الملک لیصعد بعمل العبد مبتہجًا فاذا صعد بحسناتہ یقول الله عزوجل اجعلوھا فی سجین انہ لیس ایای اراد فیھا۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فرشتہ بندہ کے عمل کو خوشی خوشی آسمان کی طرف لے جاتا ہے تو خداوند عزوجل فرماتا ہے اسے سجین میں قرار دو اس لیے کہ اس کا مقصد میری رضا نہیں تھا۔[2]

ان تمام روایات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سجین جہنم میں ایک بہت ہی پست جگہ ہے جس میں بدکاروں کے اعمال یا نامۂ اعمال رکھے جائیں گے۔

یا ان کی سرنوشت یہ ہے کہ وہ اس زندان میں گرفتار رہیں گے۔ اس تفسیر کے مطابق (کتاب مرقوم) کا جملہ تاکید ہے "ان کتاب الفجار لفی سجین" کے جملے کی (نہ یہ کہ سجین کی تفسیر ہے) یعنی یہ ان کے لیے لکھی ہوئی حتمی اور قطعی سزا ہے۔

"مرقوم" "رقم" (بروزن زخم) واضح خط (تحریر) کے معنی میں ہے اور چونکہ خطوط یا تحریریں ابہام سے خالی ہوتی ہیں لہٰذا ممکن ہے کہ یہ تعبیر ابہام سے پاک ہونے کی طرف اشارہ ہو وہ چیز جو نہ کبھی محو ہوتی ہے نہ فراموش ہوگی۔

یہ دونوں تفسیریں بھی صحیح ہوسکتی ہیں اس لیے کہ پہلی تفسیر میں سجین بدکاروں کے کل اعمال کے دیوان کے معنی میں ہے اور دوسری تفسیر میں دوزخ کی گہرائی اور گڑھے کے معنوں میں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی علت و معلول ہیں۔

یعنی جس وقت انسان کا نامۂ اعمال بدکاروں کے کل اعمال کا دیوان قرار دیا گیا تو یہی سبب بنے گا کہ اسے پست ترین مقام یعنی دوزخ کے گڑھے میں کھینچ کر لے جائیں۔

آخری اور زیرِ بحث آیت میں ایک دل ہلا دینے والے جملے سے منکرینِ معاد و قیامت کی منحوس عاقبت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

---

[1] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۳۰ حدیث ۱۵۔

[2] ایضاً " " " " حدیث ۱۹۔

"وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں پر" (ویل یومئذ للمکذبین)۔

وہ تکذیب جو انواع واقسام کے گناہوں کا سرچشمہ ہے جن میں سے ایک کم تولنا ہے۔

پہلی آیت میں فرماتا ہے:

(ویل للمطففین) اور یہاں فرماتا ہے: (ویل یومئذ للمکذبین)، وہ تعبیر جو مختصر ہونے کے باوجود انواع واقسام کے دردناک عذابوں اور ہولناک مصائب کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

قابلِ توجہ یہ کہ پہلی آیت میں گفتگو کم تولنے والوں کے بارے میں ہے۔ اس کے بعد بدکاروں کی بات ہے، اور آخری آیت میں منکرین قیامت کا ذکر ہے اور اچھی طرح بتاتا ہے کہ اس اعتقاد اور ان اعمال کے درمیان قریبی رابطہ ہے جو آنے والی آیات میں زیادہ واضح طور پر منعکس ہوا ہے۔

(۱۱) الَّذِیۡنَ یُکَذِّبُوۡنَ بِیَوۡمِ الدِّیۡنِ ؕ

(۱۲) وَمَا یُکَذِّبُ بِہٖۤ اِلَّا کُلُّ مُعۡتَدٍ اَثِیۡمٍ ۙ

(۱۳) اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ؕ

(۱۴) کَلَّا بَلۡ ٜ رَانَ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ مَّا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ○

(۱۵) کَلَّاۤ اِنَّہُمۡ عَنۡ رَّبِّہِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ ؕ

(۱۶) ثُمَّ اِنَّہُمۡ لَصَالُوا الۡجَحِیۡمِ ؕ

(۱۷) ثُمَّ یُقَالُ ہٰذَا الَّذِیۡ کُنۡتُمۡ بِہٖ تُکَذِّبُوۡنَ ؕ

ترجمہ

(۱۱) وہی جو قیامت کے دن کا انکار کرتے ہیں۔

(۱۲) صرف وہی لوگ اس کا انکار کرتے ہیں جو گنہگار اور تجاوز کرنے والے ہیں۔

(۱۳) وہی شخص کہ جب اسے ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ گزشتہ لوگوں کے افسانے ہیں۔

(۱۴) اس طرح نہیں جیسا کہ وہ خیال کرتے ہیں بلکہ ان کے اعمال ان کے دلوں پر زنگ کی طرح ہیں۔

(۱۵) ایسا نہیں ہے جیسا وہ خیال کرتے ہیں بلکہ وہ اس دن اپنے پروردگار سے محجوب ہوں گے۔

(۱۶) اس کے بعد وہ یقیناً جہنم میں وارد ہوں گے۔

(۱۷) پھر ان سے کہا جائے گا یہ وہی چیز ہے جس کی تم تکذیب کرتے تھے۔

تفسیر

گناہ دلوں کا زنگ ہیں

گزشتہ آیات کی آخری آیت میں مکذبین اور جھٹلانے والوں کی منحوس سرنوشت کی طرف واضح اشارہ تھا۔ زیرِ بحث آیات پہلے ان افراد کا تعارف کراتی ہیں اور کہتی ہیں وہ ایسے لوگ ہیں جو روزِ جزا کا انکار کرتے ہیں (الذین یکذبون بیوم الدین)۔ اور اس کے بعد مزید کہتا ہے:

"صرف وہ لوگ روزِ جزا کی تکذیب کرتے ہیں جو متجاوز اور گنہگار ہیں" (وما یکذب بہ الا کل معتد اثیم)۔ یعنی انکارِ قیامت کا اصلی سبب منطق، استدلال اور تفکر نہیں ہے، بلکہ جو افراد چاہتے ہیں کہ زیادتیاں کرتے رہیں اور گناہ کرتے رہیں وہ قیامت کا انکار کر دیتے ہیں (توجہ فرمائیں کہ اثیم صفت مشبہ ہے جو استمرار اور گناہ کو جاری رکھنے پر دلالت کرتی ہے)۔

وہ چاہتے ہیں کہ کسی قسم کے احساسِ ذمہ داری کے بغیر اپنے گمان کے مطابق انتہائی آزادی کے ساتھ اور ہر قسم کے دباؤ اور ذہنی پریشانی کے بغیر اپنی برائیوں اور قباحتوں کو جاری رکھیں اور کسی قانون کو قانون نہ سمجھیں۔

یہ چیز اس چیز کے مانند ہے جو سورہ قیامت کی آیت ۵ میں آئی ہے (بل یرید الانسان لیفجر امامہ) "بلکہ انسان چاہتا ہے کہ اپنی آئندہ عمر میں مسلسل فسق و فجور کی راہ اختیار کیے رہے"، اس لیے وہ قیامت کی تکذیب کرتا ہے۔

جس طرح عقیدہ عمل پر اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح غلط اعمال عقائد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ معانی بعد والی آیات کی تفسیر میں زیادہ واضح ہوں گے۔

بعد والی آیات میں قیامت کا انکار کرنے والوں کی تیسری صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے:

"جب ہماری آیتیں ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں: "یہ گزشتہ لوگوں کے بے بنیاد مطالب اور افسانے ہیں"۔ (اذا تتلیٰ علیہ اٰیاتنا قال اساطیر الاولین)۔

یہ لوگ علاوہ اس کے کہ تجاوز کرنے والے (معتد) اور گناہ گار ہیں، آیاتِ الٰہی کا مذاق اڑاتے ہیں، انہیں کہانیاں اور موہوم قصے بتاتے ہیں، ایسے قصے جو انسان کے نادانی کے

زمانے کی یادگار ہیں [1]

اور اس بہانے سے چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو ان آیات کی سماعت سے جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس سے بچا لیں۔ نہ صرف اس سورہ میں بلکہ قرآن مجید کی دوسری آیات میں بھی ہم پڑھتے ہیں کہ جسارت کرنے والے مجرم دعوتِ خداوندی سے منحرف ہونے کا یہی بہانہ کرتے تھے۔

قرآن مجید کی نو آیتوں میں یہی مضمون واضح کیا گیا ہے کہ مشرکین قرآنِ مجید کی آیتوں کے مقابلہ میں اسی بہانہ سے کام لیتے تھے (وقالوا اساطیر الاولین اکتتبها فهی تملیٰ علیه بکرة واصیلاً) "انہوں نے کہا یہ قرآن گزشتہ لوگوں کے افسانوں اور قصے کہانیوں کا مجموعہ ہے جسے اس نے لکھا ہے اور صبح و شام اسے لکھایا جاتا ہے۔" (فرقان - ۵)۔

سورہ احقاف کی آیت ۱۷ میں ایک سرکش جوان کی زبانی جو اپنے مہربان اور مومن ماں باپ کے مقابلہ پر کھڑا ہو جاتا ہے ہم اس طرح سنتے ہیں کہ اپنے ماں باپ کی تمام نصیحتوں کا یہ کہہ کر مذاق اڑاتا ہے کہ (ما هٰذا الا اساطیر الاولین) یہ باتیں جو تم کرتے ہو گزشتہ لوگوں کی بے بنیاد باتوں اور افسانوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ زیر بحث آیت نضر بن حارث بن کلدہ، پیغمبر اسلامؐ کی خالہ کے بیٹے کے بارے میں جو کفر و ضلالت کے سرغنوں میں سے تھا، نازل ہوئی ہے۔

لیکن واضح رہے کہ آیت کا نزول کسی خاص مورد میں اس سے مانع نہیں ہے کہ دوسروں کے بارے میں صادق آئے، بہر حال سرکش لوگ وجدان کی تنبیہ سے نجات حاصل کرنے کے لیے اور حق پسند لوگوں کے اعتراضات سے بچنے کے لیے ہمیشہ فضول قسم کے بہانے بناتے رہتے ہیں تاکہ خود اس طرح سکون حاصل کریں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ عام طور پر ایک ہی انداز سے بات کرتے تھے گویا تاریخ کے طویل دَور میں ایک دوسرے کے کان میں کہہ جاتے تھے سحر، کہانت، جنون اور افسانہ وغیرہ۔ لیکن قرآن اس کے بعد آنے والی آیت میں ایک مرتبہ پھر ان کی سرکشی کے اصل سبب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے:

ایسا نہیں ہے جیسا وہ خیال کرتے ہیں بلکہ ان کے بُرے اعمال ان کے دل پر زنگ بن کر لگے ہوئے ہیں اور وہ حقیقت کے ادراک سے محروم ہو گئے ہیں (کلا بل ران علیٰ قلوبهم ما کانوا یکسبون)۔ عجیب دل ہلا دینے والی تعبیر ہے ان کے اعمال نے ان کے دلوں پر زنگ لگا دیا ہے

---

[1] "اساطیر" "اسطورہ" کی جمع "سطر" کے مادہ سے عام طور پر موہوم قصوں اور جھوٹی باتوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اور وہ نور جو خدا داد فطرت کی بنا پر تھا سلب کر لیا ہے۔ اس وجہ سے حقیقت کا چہرہ جو آفتاب عالمتاب کی طرح درخشاں ہے ان کے دلوں پر ہرگز روشنی نہیں ڈالتا اور انوارِ وحی کا پرتو منعکس نہیں ہوتا۔

"ران" "رین" (بروزن عین) کے مادہ سے جیسا کہ راغب نے کہا ہے وہی زنگ ہے جو قیمتی چیزوں کو لگ جاتا ہے۔ اور بعض دوسرے اربابِ لغت کے بقول سرخ زنگ کا چھلکا ہے جو ہوا کی رطوبت کے زیرِ اثر لوہے اور دوسری اسی قسم کی چیزوں پر چپک جاتا ہے جسے فارسی میں زنگ یا زنگار کہتے ہیں اور عام طور پر وہ اسی دھات کے پرانے اور بوسیدہ ہونے کی نشانی ہے اور طبعی طور پر اس کی شفافیت اور درخشندگی کے ختم ہونے کی علامت ہے۔

کبھی اس لفظ کی ایک چیز سے دوسری چیز پر غلبہ حاصل کرنے یا کسی چیز میں اس طرح گرنے سے جس سے بچا نہ جا سکے تفسیر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ سب چیزیں ان اصلی معانی کا لازمہ ہیں[1]

دل کی نورانیت کو ختم کرنے کے سلسلہ میں گناہ کے تباہ کن اثرات پر ہم بحث کریں گے جسے نکات کے عنوان کے ماتحت ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

اس سے اگلی آیت میں فرماتا ہے: "ایسا نہیں ہے جیسا وہ خیال کرتے ہیں بلکہ اس دن وہ اپنے پروردگار سے محجوب ہوں گے" (کلا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون)۔ اور یہ کہ ان کی زیادہ دردناک سزا ہے۔ یہ اس بالاتر اور زیادہ لذت بخش نعمت کا بالکل تضاد ہے جو نیک لوگوں کو پروردگارِ عالم کی معنوی ملاقات اور اس کی بارگاہِ قرب میں حضور سے حاصل ہوگا۔

کلا عام طور پر اس بات کی نفی کے لیے آتا ہے جو پہلے سے بیان شدہ ہو اور یہاں مفسرین نے کئی احتمال تجویز کیے ہیں۔ پہلا یہ کہ کلا اس کی تاکید ہے جو گزشتہ آیت میں آیا ہے یعنی اس طرح نہیں ہے کہ جس طرح انہوں نے قیامت کے دن کا افسانے اور کہانی کے طور پر تعارف کرایا ہے۔

یا یہ کہ اس طرح نہیں ہے کہ وہ زنگ جو ان کے دلوں پر لگ چکا ہے وہ اتر جائے۔ وہ اس جہان میں بھی جمالِ حق کے مشاہدہ سے محروم ہیں اور دوسرے جہان میں بھی۔

یا یہ کہ جس طرح قرآن کی دوسری آیات میں آیا ہے کہ وہ مدعی تھے کہ اگر بالفرض قیامت ہو بھی تب بھی وہ خدا کی انواع و اقسام کی نعمتوں سے بہرہ مند ہوں گے[2]

---

[1] تفسیر فخر رازی در ذیل آیہ زیرِ بحث اور المنجد مادہ رین کی طرف رجوع فرمائیں۔

[2] سورہ کہف کی آیہ ۳۶ میں آیا ہے (وما اظن الساعۃ قائمۃ ولئن رددت الی ربی لاجدن خیرا منھا منقلبا) میں بالکل باور نہیں کرتا کہ قیامت برپا ہوگی اور اگر میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹوں بھی اور قیامت ہو بھی پھر بھی اس جگہ سے بہتر جگہ وہاں پاؤں گا (ان معانی کی نظیر سورہ فصلت کی آیت ۵۰ میں بھی آئی ہے)۔

اس طرح نہیں ہے جس طرح وہ خیال کرتے ہیں بلکہ وہ قیامت میں شدید ترین عذابوں اور سخت ترین شکنجوں میں گرفتار ہوں گے۔

جی ہاں! آخرت انسان کے اس دنیا کے اعمال کا عکس اور عظیم تجسّم ہے۔ وہ لوگ جو یہاں مشاہدۂ حق سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور ان کے اعمال زنگ بن کر ان کے دلوں پر لگے ہوئے ہیں، وہاں بھی پروردگار سے محجوب ہوں گے اور جمالِ حق کے مشاہدہ کی طاقت ان میں نہیں ہوگی اور وہ محبوبِ حقیقی کے لقائے معنوی سے محروم رہیں گے۔

اس کے بعد وہ یقیناً جہنم کی آگ میں داخل ہوں گے (ثم انهم لصالوا الجحيم)۔ یہ جہنم میں ورود پروردگار سے محجوب ہونے کا نتیجہ ہے اور ایک ایسا اثر ہے جو اس سے جدا نہیں ہے اور بحیثیتِ مسلّم دیدارِ حق سے محرومیت کی آگ جہنم کی آگ سے بھی زیادہ جلانے والی ہے۔ اور آخری آیت میں فرماتا ہے:

"پھر ان سے کہا جائے گا یہ وہی چیز ہے جس کی تم تکذیب کرتے تھے" (ثم يقال هٰذا الذی کنتم به تکذبون)۔ یہ بات ان سے بطور توبیخ و ملامت و سرزنش کہی جائے گی اور یہ اس بیوقوف اور ہٹ دھرم گروہ کے لیے ایک روحانی عذاب ہے۔

چند نکات

۱۔ دل کے لیے گناہ کیوں زنگ ہے

نہ صرف اس سورہ کی آیات میں دل کو تاریک کرنے پر گناہ کی تاثیر کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے بلکہ قرآن مجید کی بہت سی دوسری آیتوں میں بھی ان معانی کی کئی مرتبہ تکرار کی گئی ہے اور بڑی صراحت کے ساتھ انہیں قابلِ توجہ قرار دیا گیا ہے۔ ایک جگہ فرماتا ہے:

(کذالك يطبع الله على كل قلب متكبر جبار) "اسی طرح خدا ہر متکبر جبار اور سرکش کے دل پر مُہر لگا دیتا ہے" (مومن - ۳۵)۔ ایک دوسری جگہ ہٹ دھرم اور عناد رکھنے والے گناہ گاروں کے گروہ کے بارے میں فرماتا ہے:

(ختم الله على قلوبهم وعلى سمعهم وعلىٰ ابصارهم غشاوة ولهم عذاب عظيم) "خدا نے ان کے دلوں پر مُہر لگا دی ہے اور اسی طرح ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے" (بقرہ - ۷)۔ اور سورہ حج کی آیت ۴۶ میں ہم پڑھتے ہیں: (فانها لا تعمى الابصار ولكن تعمى القلوب التي في الصدور) ظاہری آنکھیں نابینا نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل ہیں جو سینوں میں اندھے اور نابینا ہو جاتے ہیں۔

جی ہاں! گناہ اور اس کو جاری رکھنے کا بدترین اثر دل کا تاریک ہو جانا ہے اور نورِ علم اور حِسّ کا

ختم ہو جاتا ہے۔ گناہ اعضاء و جوارح سے سرزد ہوتے ہیں لیکن دل کو متاثر کرتے ہیں اور اُسے غلیظ و متعفن کیچڑ میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

یہ وہ مقام ہے جہاں انسان راہ اور چاہ کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتا اور عجیب و غریب شبہات کا شکار اور غلطیوں کا مرتکب ہوتا ہے جن سے ہر شخص حیران ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مارتا ہے اور اپنی خوش بختی کا سرمایہ برباد کر دیتا ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلام سے منقول ہے (کثرة الذنوب مفسدة للقلب) گناہوں کی فراوانی انسان کے دل کو تباہ کر دیتی ہے[1]

پیغمبرِ اسلامؐ کی ایک اور حدیث ہے (ان العبد اذا اذنب ذنبا نکتت فی قلبه نکتة سوداء فان تاب ونزع واستغفر صقل قلبه وان عاد زادت حتی تعلو قلبه فذالك الرین الذی ذکر الله فی القرآن (کلا بل ران علی قلوبهم ما کانوا یکسبون) جس وقت بندہ گناہ کرے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نکتہ پیدا ہو جاتا ہے اگر توبہ کرے اور گناہ سے دستبردار ہو جائے اور استغفار کرے تو اس کا دل صیقل ہو جاتا ہے اور اگر دوبارہ گناہ کی طرف پلٹے تو سیاہی بڑھ جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کے پورے دل کو گھیر لیتی ہے اور یہ وہی زنگ ہے جس کی طرف اس آیت (کلا بل ران علی قلوبهم ما کانوا یکسبون) میں اشارہ ہوا ہے[2]

یہی مفہوم امام محمد باقرؑ سے بھی اصول کافی میں مختصر سے فرق کے ساتھ منقول ہے[3]

نیز اسی اصول کافی میں رسولِ خداؐ سے منقول ہے کہ (تذاکروا وتلاقوا وتحدثوا فان الحدیث جلاء للقلوب ان القلوب لترین کما یرین السیف وجلائه الحدیث) مذاکرہ کرو اور ایک دوسرے سے ملاقات کرو اور (دین کے پیشواؤں کی) احادیث نقل کرو اس لیے کہ حدیث دلوں کی جِلا کا سبب ہے۔ دل بھی زنگ آلود ہو جاتے ہیں جس طرح تلوار کو زنگ لگ جاتا ہے اور قلوب کا صیقل حدیث ہے[4]

اصول نفسیات کی رُو سے بھی یہ مفہوم ثابت ہو چکا ہے کہ انسان کے اعمال کا ہمیشہ اس کی روح پر اثر ہوتا ہے اور وہ اعمال رُوح کو آہستہ آہستہ اپنی صورت پر لے آتے ہیں، یہاں تک کہ انسان کے

---

[1] درالمنثور، جلد ۶ ص ۳۲۶۔

[2] درالمنثور، جلد ۶ ص ۳۲۵۔

[3] نورالثقلین، جلد ۵ ص ۵۳۱ حدیث ۲۲، ۲۳۔

[4] ایضاً " " " " " " " ۔

سوچنے کے طریقہ اور فیصلہ کرنے کے انداز پر بھی اپنا اثر ڈالتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ انسان گناہ کو جاری رکھنے کے نتیجے میں رفتہ رفتہ روح کی تاریکی میں ڈوبتا چلا جاتا ہے اور ایسی منزل پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کو اپنے گناہ حسنات نظر آتے ہیں یعنی وہ اپنی برائیوں ہی کو اچھائیاں سمجھنے لگتا ہے۔ وہ بعض اوقات اپنے گناہ پر فخر کرتا ہے ایسی منزل پر پہنچ کر اس کے لیے واپسی کا کوئی امکان نہیں رہتا یہ ایک خطرناک ترین حالت ہے جو ایک انسان کو پیش آتی ہے۔

۲۔ روح و جان کے چہرہ پر عذاب

اگرچہ بہت سے مفسرین نے کوشش کی ہے کہ آیت (کلّا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون) میں کسی چیز کو مقدر قرار دیں اور کہیں کہ یہ گناہ گار خدا کی رحمت سے محجوب ہوں گے، یا اس کے احسان، کرامت اور ثواب سے محجوب ہوں گے لیکن بظاہر آیت کسی تقدیر کی محتاج نہیں ہے۔

وہ واقعتاً پروردگار سے محجوب ہوں گے جبکہ نیک اور پاک افراد قربِ خداوندی کی منزل پر فائز ہوں گے اور دیدارِ محبوب اور اس کے شہودِ باطنی سے بہرہ مند ہوں گے۔

یہ بے ایمان اور گنہگار دوزخی ہیں جو اس فیضِ عظیم اور نعمتِ بے نظیر سے محروم ہیں۔ بعض پاک دل مومن اس جہان میں بھی اس دیدار سے فیضیاب ہوتے ہیں جبکہ کور دل مجرم اُس جہان میں بھی اس فیض سے محروم ہوں گے۔ پاک دل ہمیشہ حضورِ خداوندی میں ہیں اور یہ بے بصیر تاریک دل اس سے دور ہیں۔

وہ اس کی مناجات سے اس قدر لذت حاصل کرتے ہیں جو کسی بیان کی محتاج نہیں ہے جبکہ یہ گنہگار اپنے گناہوں کی نحوست میں اس قدر غرق ہیں کہ ان کے لیے کوئی راہ نجات نہیں ہے۔

تو کز سرائے طبیعت نمی روی بیرون   کجا بکوئے حقیقت گزر توانی کرد

جمالِ یار ندارد حجاب پردہ و لے   غبارِ راہ نشاں تا نظر توانی کرد

تُو مادہ کے گھر سے باہر نہیں نکلتا تو پھر حقیقت کے کوچہ میں تیرا گزر کیسے ہو سکتا ہے، محبوب کے جمال پر کوئی پردہ نہیں ہے لیکن غبارِ راہ کو بٹھا تاکہ تُو دیکھ سکے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ مشہور دعائے کمیل میں فرماتے ہیں: (ھبنی صبرت علی عذابك فکیف اصبر علی فراقك) بالفرض اگر میں تیرے دردناک عذاب پر صبر کر بھی لوں تو تیرے فراق پر کیسے صبر کروں گا۔

(۱۸) كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِیْ عِلِّیِّیْنَ ۟

(۱۹) وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّیُّوْنَ ۟

(۲۰) كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۟

(۲۱) یَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۟

(۲۲) اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۟

(۲۳) عَلَى الْاَرَآىِٕكِ یَنْظُرُوْنَ ۟

(۲۴) تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ ۟

(۲۵) یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۟

(۲۶) خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۟

(۲۷) وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِیْمٍ ۟

(۲۸) عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ۟

ترجمہ

(۱۸) ایسا نہیں ہے جیسا وہ (قیامت کے بارے میں) خیال کرتے ہیں بلکہ نیک لوگوں کا نامہ اعمال علیین میں ہے۔

(۱۹) اور تو کیا جانے علیین کیا ہے ؟

(۲۰) تحریر ہے لکھی ہوئی اور سرنوشت ہے قطعی۔

(۲۱) جس کے شاہد مقربین ہیں۔

(۲۲) یقیناً نیک لوگ انواع و اقسام کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔

(۲۳) جنت کے خوبصورت پلنگوں اور تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے اور جنت کی خوبصورتی کو دیکھ رہے ہوں گے۔

(۲۴) ان کے چہروں پر تو نعمت کی طراوت اور نشاط دیکھے گا۔

(۲۵) وہ شراب زلال دست نخوردہ و سربستہ سے سیراب ہوں گے۔

(۲۶) اس پر جو مُہر لگائی گئی ہوگی وہ مشک و کستوری سے ہوگی اور ان جنت کی نعمتوں میں رغبت رکھنے والوں کو ایک دوسرے سے سبقت لے جانی چاہیئے۔

(۲۷) یہ شراب (طہور) تسنیم سے مخلوط ہوگی۔

(۲۸) وہی چشمہ جس سے مقربین پئیں گے۔

تفسیر

علیین ابرار کے انتظار میں ہے

اس توصیف کے بعد جو گزشتہ آیات میں فاجر لوگوں کے اعمال اور سرنوشت کے بارے میں آئی ہے ان آیات میں اس گروہ کے بارے میں گفتگو ہے جو ان کا مدّمقابل ہے یعنی ابرار اور نیکوکار لوگ جن کا امتیاز، افتخار اور اعزاز فاجروں کے مقابلہ میں ملاحظہ کرنے سے دونوں کی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔ پہلے فرماتا ہے:

"ایسا نہیں ہے جیسا وہ قیامت کے بارے میں خیال کرتے ہیں بلکہ نیک لوگوں کے نامہ ہائے اعمال علیین میں ہوں گے" (کلا ان کتاب الابرار لفی علیین)۔

"علیین" "علی" (بروزن ملی) کی جمع ہے بلند جگہ اور اس پر بیٹھنے والوں کے معنوں میں ہے۔ پہاڑوں کے بلند ترین حصّوں پر رہنے والوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہاں مفسرین کی ایک جماعت نے آسمان کی افضل ترین جگہ یا جنت کی بہترین جگہ کے معنی میں اس کی تفسیر کی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا ذکر صیغہ جمع کے ساتھ جو ہے وہ تاکید کے لیے ہے اور علو فی علو بلندی در بلندی کے معنوں میں ہے۔

بہرحال وہ دو تفسیریں جو گزشتہ آیات میں سجین کے بارے میں ہم کر چکے ہیں انہی سے مشابہ یہ تفسیریں ہیں۔

پہلی یہ کہ کتاب الابرار سے مراد نیک، پاک اور مومنین کا نامہ اعمال ہے اور مقصود کلام یہ ہے کہ ان کا نامہ اعمال ایک ایسے دیوانِ کل میں موجود ہے جو تمام مومنین کے اعمال کو بیان کرتا ہے۔ وہ دیوان بہت ہی بلند منزلت رکھتا ہے۔ یا یہ کہ ان کا نامہ اعمال بلند ترین مکان یا جنت کے فراز پر ہے۔ اور یہ سب معانی بتاتے ہیں کہ خود ان کا مقام بہت ہی بلند و بالا ہے۔

ایک حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ علیین سے مراد ساتواں آسمان اور عرشِ خدا کا نچلا حصّہ ہے[1]

اور یہ نقطہ فجار کا عین نقطۂ مقابل ہے جو دوزخ کے طبقوں میں پست ترین جگہ قرار پائی ہے دوسری تفسیر یہ ہے کہ کتاب سے مراد سرنوشت اور حکمِ قطعی ہے جو نیک لوگوں کو بہشت کے اعلیٰ درجوں میں مقرر کیے ہوتے ہیں۔

ان دونوں تفسیروں میں کوئی تضاد نہیں ہے کہ ان کا نامۂ اعمال ایک دیوان کل میں برقرار ہے اور اس دیوان کا مجموعہ آسمانوں کی بلندی پر ہے اور فرمانِ الٰہی بھی یہی قرار پایا ہے کہ وہ خود جنت کے بلند ترین مقامات میں ہوں۔

اس کے بعد علیین کی اہمیت وعظمت کو بیان کرنے کے لیے مزید کہتا ہے: "تو کیا جانے کہ علیین کیا ہے" (وما ادراک ما علیون)۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ایسا مقام ہے جو خیال و قیاس اور وہم و گمان سے بھی برتر ہے، جسے کوئی بھی حتیٰ کہ پیغمبرِ اسلامؐ بھی اس کی عظمت اور حدودِ اربعہ کا ادراک نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد خود قرآن وضاحت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "علیین ایک لکھی ہوئی کتاب ہے" (کتاب مرقوم)۔ یہ اس تفسیر کی بنا پر ہے جو علیین کو ابرار کے نامہ اعمال کے دیوانِ کل کے معنی میں پیش کرتی ہے۔

باقی رہی دوسری تفسیر تو پھر آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ حتمی سرنوشت ہے جس کے بارے میں خدا نے تحریر کیا ہے۔ ان کی جگہ جنت کے افضل ترین درجات میں ہوگی۔ اس بنا پر کتابِ مرقوم کتاب الابرار کی تفسیر ہے نہ کہ علیین کی۔ (غور کیجئے)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "یہ ایسی کتاب ہے جس کا مقربین مشاہدہ کریں گے یا اس کی گواہی دیں گے" (یشھدہ المقربون)۔

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰ ص ۷۰۵۲، و مجمع البحرین مادہ "علو"۔

اگرچہ مفسرین کی ایک جماعت اس آیت میں مقربون سے مراد وہ فرشتے لیتی ہے جو بارگاہِ الٰہی میں مقرب ہیں، وہ فرشتے جو نیک لوگوں کے اعمال کے یا یقینی سرنوشت کے ناظر ہیں، لیکن بعد کی آیت اچھی طرح بتاتی ہے کہ مقربون خاصانِ خدا اور برگزیدہ مومنین کا ایک گروہ ہے جس کا مقام بہت اونچا ہے اور وہ دوسرے نیک افراد کے اعمال پر شاہد ہے جیسا کہ سورہ واقعہ کی آیت ۱۰، ۱۱ میں اصحاب المیمنہ اور اصحاب المشئمہ کے ذکر کے بعد فرماتا ہے:

(والسابقون السابقون اولٰئک المقربون) اور سبقت کرنے والوں میں سے سبقت کرنے والے ہی مقربین ہیں۔ اور سورہ نحل کی آیت ۸۹ میں ہم پڑھتے ہیں (ویوم نبعث فی کل امۃ شھیدًا علیھم من انفسھم وجئنا بک شھیدًا علیٰ ھٰؤلاء) "اور یاد کرو اس دن کو جب ہر امت میں سے ایک گواہ اس پر مقرر کریں گے اور تجھے ان پر گواہ قرار دیں گے"۔ اس کے بعد نیک لوگوں کے عظیم ثواب کے ایک حصّہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"یقیناً ابرار انواع واقسام کی نعمتوں سے بہرہ یاب ہیں" (ان الابرار لفی نعیم)۔

"نعیم" کا اصلی مفہوم، جو راغب کے بقول بہت زیادہ نعمت کے معنی میں ہے اور نکرہ کی شکل میں اپنے ذکر کے اضافہ کے ساتھ یہاں عظمت واہمیت کی دلیل ہے، یہ بتاتا ہے کہ ابرار اس قسم کی برکتوں اور نعمتوں کے حامل ہیں جو حدود توصیف وتعریف سے باہر ہیں اور یہ جنت کی تمام مادی ومعنوی نعمتوں اور برکتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ایک جامع تعبیر ہے۔ اس کے بعد ان میں سے بعض کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"وہ جنت کے خوبصورت پلنگوں اور تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے ان تمام نعمتوں اور مناظر کو دیکھ رہے ہوں گے اور لذت اٹھا رہے ہوں گے" (علی الارائک ینظرون)[1]

"ارائک" "اریکہ" کی جمع ہے اور خوبصورت تخت کے معنی میں ہے، یا پُر زینت پلنگ جو حجلہ عروسی میں رکھتے ہیں۔ یہاں جنت کے بہت ہی خوبصورت تختوں اور پلنگوں کی طرف اشارہ ہے جن پر نیک اور صالح افراد متمکن ہوں گے۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس لفظ کی اصل فارسی ہے اور یہ "ارگ" سے لیا گیا ہے جس کے معنی قصرِ سلطنت کے ہیں۔ (یہ لفظ اس قلعہ کے معنی میں بھی آیا ہے جو شہر کے اندر ہو اور چونکہ شہر کے اندر والا قلعہ عام طور پر بادشاہوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے لہٰذا اس پر اطلاق ہوتا ہے)۔

---

[1] اس جملہ میں مبتدا محذوف ہے اور تقدیر میں (ھم علی الارائک ینظرون) ہے اس جملہ میں ینظرون حال ہے یا یہ کہ علی الارائک گزشتہ آیت کے لفظ "ان" کی خبر کے بعد خبر ہے۔

بعض دوسرے مفسرین ارائک کو معرب اور فارسی لفظ "اداک" یا "اداپک" سے ماخوذ جانتے ہیں جس کے معنی شاہی تخت کے ہیں اور پایۂ تخت اور اس صوبہ کے معنی میں ہیں جس میں پایۂ تخت ہو اور عراق کو اراک کا معرب سمجھتے ہیں جو اسی قسم کے صوبہ کے معنی میں ہے اور کہتے ہیں کہ لفظ ارائک اوستا (زرتشت کی مقدس کتاب) میں بھی بارگاہ اور تخت سلطنت کے معنی میں آیا ہے۔

لغت عرب کے بعض علماء اس کی اصل عربی کو سمجھتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ یہ لفظ اراک سے لیا گیا ہے جو مشہور درخت کا نام ہے جس سے تخت اور سائبان بنائے جاتے ہیں[1]

لیکن قرآن مجید میں اس کے موارد استعمال سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اس زیبا خوبصورت اور مزین تخت کے معنوں میں ہے جس سے صاحبانِ قدرت و نعمت استفادہ کرتے ہیں۔

(ینظرون) دیکھیں گے کی تعبیر جو سربستہ شکل میں استعمال ہوئی ہے اس میں یہ نہیں فرمایا کہ کس چیز کی طرف دیکھیں گے تاکہ اس کے مفہوم میں وسعت رہے۔ وہ لطفِ خدا کی طرف دیکھیں گے۔ اس کے بے مثال جمال کی طرف، جنت کی انواع و اقسام کی نعمتوں کی طرف اور نگاہوں کو خیرہ کرنے والی خوبصورتیوں کی طرف دیکھیں گے جو بہشت بریں میں ہوں گے، اس لیے کہ انسانی لذتوں میں سے اہم ترین لذت دیکھنے کی لذت ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"جب تو ان کے چہروں کی طرف دیکھے تو نعمت کی طراوت خوشی اور نشاط ان میں دیکھے گا"۔ (تعرف فی وجوھھم نضرۃ النعیم)۔ جو اس طرف اشارہ ہے کہ نشاط، سرور اور خوشی ان کے چہروں پر جھلک رہی ہوگی اور ان سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس اگر دوزخیوں کے چہرہ پہ نظر کرے تو ان سے غم و رنج اور اندوہ و بدبختی اور بے چارگی نمایاں ہوگی۔

"نضرۃ" جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں، ترو تازگی اور نشاط کے معنی میں ہے جو اچھی زندگی گزارنے والوں کے چہرے سے عیاں ہوتی ہے۔ تخت، نظارہ، آرام و سکون و نشاط کی نعمتوں کے بعد ایک اور نعمت یعنی بہشتیوں کی شراب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے:

"انہیں ایسی پاک و پاکیزہ شراب پلائیں گے جس کو کسی کا ہاتھ نہیں لگا ہوگا" (یسقون من رحیق مختوم)۔ وہ شراب طہور جو دنیا کی شرابوں کی طرح گناہ پر آمادہ کرنے والی، جنون پیدا کرنے والی شیطانی شراب کی طرح نہیں ہے بلکہ وہ ہوش و عقل اور نشاط و عشق و صفا پیدا کرتی ہے۔

زیادہ مفسرین نے رحیق کو خالص شراب کے معنی میں لیا ہے، ایسی شراب جس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں ہوگی۔

---

[1] "لغت نامہ" "دھخدا"، کتاب "دیوان دین"، "مفردات راغب" اور برہان قاطع کی طرف رجوع کیا جائے۔

"مختوم" کے معنی مہر لگی ہوئی۔ اس سے بھی اس کے خالص اور پاک وصاف ہونے کا اظہار ہے۔ اس کے علاوہ اس قسم کے برتنوں کا استعمال مہمان کے خاص احترام کی علامت ہے۔ ایسا ظرف جس کا منہ بند ہے اس پر مہر لگی ہوئی ہے اور اس کی مُہر صرف مہمان کی خاطر توڑی جاتی ہے[1]

اس کے بعد فرماتا ہے: "اس کی مُہر مشک اور کستوری سے لگائی گئی ہے" (ختامہ مسک)۔ دنیا کے منہ بند برتنوں کی طرح نہیں جن کی مُہر مٹی سے لگائی جاتی ہے تو مشک اور عطر کی خوشبو فضا میں پھیل جاتی ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ آخر میں یعنی اس شرابِ طہور کے پینے کے اختتام پر انسان کے منہ سے مشک وعنبر کی خوشبو آئے گی، دنیا کی نجس شرابوں کے برخلاف جن کے پینے کے بعد منہ تلخ اور بدبودار ہو جاتا ہے لیکن اس تعبیر کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو گزشتہ آیت میں آئی ہے یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے۔ آیت کے آخر میں جنت کی شرابِ طہور کے اوصاف بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے:

"ان بہشتی نعمتوں میں اور خصوصیت کے ساتھ اس شرابِ طہور کی طرف رغبت کرنے والوں کو ایک دوسرے پر سبقت لے جانی چاہیئے" (و فی ذالك فلیتنافس المتنافسون)۔ مفسر عظیم "طبرسی" "مجمع البیان" میں کہتے ہیں:

"تنافس" کے معنی دو انسانوں کے ایک چیز کے لیے کوشش کرنے کے ہیں جن میں سے دونوں یہ چاہیں کہ یہ نفیس چیز میرے پاس ہو۔

مجمع البحرین میں ہے کہ تنافس کے معنی عظمت وعزت کے ساتھ ایک دوسرے پر سبقت لے جانا ہے۔ راغب مفردات میں کہتا ہے "منافسہ" کے معنی یہ ہیں کہ معزز افراد سے مشابہت پیدا کرنے کے لیے ان سے ملحق ہو جانے کی اس طرح کوشش کرنا کہ دوسرے کو نقصان نہ پہنچے۔

حقیقت میں اس آیت کا مضمون اُس آیت کے مشابہ ہے جو سورۂ حدید کی آیت ۲۱ میں آئی ہے (سابقوا الی مغفرة من ربکم و جنة عرضها کعرض السماء والارض) "اپنے پروردگار کی مغفرت تک پہنچنے کے لیے اور اس جنت تک پہنچنے کے لیے جس کی وسعت آسمان وزمین جتنی ہے ایک دوسرے پر سبقت لے جاؤ۔"

---

[1] گزشتہ زمانے میں معمول تھا اور موجودہ زمانے میں بھی معمول ہے کہ یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ اس چیز کو کسی کا ہاتھ نہیں لگا اسکو کسی برتن میں رکھتے اور اس کا منہ بند کرنے کے بعد کسی رسی یا بٹے ہوئے تار سے اس پر گرہ لگا دیتے تھے اور اس گرہ پر سخت مٹی یا لاکھ کو پگھلا کر رکھ دیتے اور اس پر اس طرح سے مہر لگا دیتے کہ برتن کے اندر مہر توڑے بغیر رسائی ممکن نہ ہوتی۔ عرب اس کو مختوم کہتے ہیں۔

یا جو کچھ سورہ آل عمران کی آیت ۱۳۳ میں آیا ہے: (وسارعوا الیٰ مغفرة من ربکم و جنة عرضها السماوات والارض)۔ بہرحال اس آیت میں جو تعبیر آئی ہے وہ بہت ہی خوبصورت ہے اور جو ایمان و عملِ صالح کے ذریعہ ان بے نظیر نعمتوں تک پہنچنے کے سلسلہ میں انسانوں کو شوق دلانے کا سبب سمجھی جاتی ہے اور قرآن کی فصاحت و بلاغت کو عمدہ انداز میں ظاہر کرتی ہے [1]۔[2]

اس کے بعد آخری نعمت جو اس سلسلۂ آیات میں آئی ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"یہ شرابِ طہور تسنیم میں ملی ہوئی ہے" (ومزاجه من تسنیم)۔ "وہی چشمہ جس سے مقربین پیتے ہیں" (عیناً یشرب بها المقربون) [3]

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تسنیم جنت کی افضل ترین شرابِ طہور ہے جسے خاص طور پر مقربین پیتے ہیں لیکن عام نیک لوگ اس میں سے ایک مقدار رحیقِ مختوم ملا کر پیتے ہیں جو جنت کی شرابِ طہور کی ایک اور قسم ہے۔

یہ کہ یہ شراب یا یہ چشمہ تسنیم کے نام سے کیوں موسوم ہے (اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ تسنیم لغت کے اعتبار سے چشموں کے معنوں میں ہے جو اوپر سے نیچے کی طرف گر رہا ہو) بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ وہ شراب ہے جو بہشت کے آسمانوں سے گر رہی ہے۔ حقیقت میں جنت کی شراب کئی قسم کی ہے۔ بعض تو نہروں کی صورت میں بہہ رہی ہے جن کی طرف قرآن کی متعدد آیات میں اشارہ ہوا ہے [4]

---

[1] جو کچھ آیت کی تفسیر میں کہا گیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ذالک کا اشارہ جنت کی سات نعمتوں کی طرف ہے خصوصاً مخصوص شرابِ طہور جس کے پرکشش اوصاف آیت میں آتے ہیں۔

[2] چونکہ "واو" اور "فاء" (وفی ذالك فلیتنافس المتنافسون) کے جملہ میں دونوں عطف کے لیے ہیں تو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دو حروف عطف یکے بعد دیگرے کیوں آئے ہیں۔ زیادہ مناسب جواب یہ ہے کہ یہاں حرفِ شرط محذوف ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے (وان ارید تنافس فی شئی فلیتنافس فی ذالك المتنافسون)۔ اگر کسی چیز میں رغبت ہے تو رغبت کرنے والے اس میں رغبت محسوس کریں۔ اس طرح حرفِ شرط اور جملہ شرطیہ دونوں محذوف ہیں اور ذالک بھی مقدم رکھا گیا ہے۔ (غور فرمائیے)

[3] یہ کہ عیناً کیوں منصوب ہے اس کے لیے بہت سی وجوہ بیان ہوئی ہیں۔ منجملہ ان کے یہ کہ تسنیم کے لیے حال یا اس کی تمیز ہے یا مدح و اختصاص کے عنوان کے ماتحت ہے اور تقدیر اعنی (میری مراد ہے) اور "بھا" کی با یا تو زائدہ ہے یا "من" کے معنی میں ہے اور دوسرے معنی زیادہ مناسب ہیں۔

[4] سورہ محمد، آیت ۱۵۔

ان میں سے بعض منہ بند برتنوں میں مُہر زدہ صورت میں ہیں جیسا کہ مندرجہ بالا آیت میں آیا ہے۔
سب سے زیادہ اہم وہ شراب ہے جو بہشت کے آسمان یا اوپر والے طبقوں سے گرتی ہے اور یہ وہی شراب تسنیم ہے کہ جنت کا کوئی مشروب اس کا ہم پلہ نہیں ہے اور جنتیوں کے جسم و جان میں جو تاثیر فطری طور پر وہ کرتی ہے وہ سب سے بہتر کشش اور عمیق ہے۔ اس کے پینے سے جو نشہ حاصل ہوتا ہے وہ تعریف و توصیف سے بالا ہے۔

البتہ اس حقیقت کو ہمیں دوبارہ بیان کرنا چاہیئے کہ یہ سب دھندلے نقوش ہیں جو دُور سے نظر آتے ہیں ورنہ جنت کی گراں قدر اور بے نظیر نعمتوں کی تعریف و توصیف زبان و قلم کے ذریعہ ممکن نہیں ہے۔ حتیٰ کہ خود قرآن کے بقول اس کی طرف کسی شخص کی فکر اور اس کے ذہن میں نہیں آسکتی۔ (فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین) (الم سجدہ - ۱۷)۔ کوئی نفس نہیں جانتا کہ آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والی کونسی چیزیں ان کے لیے رکھی گئی ہیں۔

چند نکات

ابرار اور مقربین کون لوگ ہیں؟

قرآن مجید کی آیات میں ابرار، مقربین اور ان کے عظیم اجر و ثواب کے بارے میں بارہا گفتگو ہوئی ہے یہاں تک کہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۹۳ کے مطابق اولوالالباب (قوی عقل و فکر والے) تقاضا کرتے ہیں کہ ان کی زندگی کا اختتام ابرار کے ساتھ ہو۔ (و توفنا مع الابرار) اور سورہ دہر کی آیات میں بھی ان کے لیے بہت اجر و ثواب بیان ہوئے ہیں، (دھر آیت ۵ تا ۲۲) اور سورۂ انفطار کی آیت ۱۳ اور سورہ مطففین کی زیرِ بحث آیت بھی ان کے بارے میں بار بار خدا کی مہربانیوں کو بیان کرتی ہے۔

ابرار، جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں "بر" کی جمع ہے یہ وہی لوگ ہیں جو وسیع روح، بلند ہمت، اچھے اعتقاد اور نیک عمل کے حامل ہیں اور مقربین وہ ہیں جو بارگاہِ خدا میں قربِ مقام کے حامل ہیں۔
ان دونوں کے درمیان ظاہری طور پر عام و خاص مطلق کی نسبت ہے یعنی سب مقرب افراد ابرار ہیں، لیکن سب ابرار مقرب نہیں ہیں۔

ایک حدیث امام حسنؑ مجتبیٰ سے منقول ہے کہ (کلما فی کتاب اللہ عزوجل من قولہ ان الابرار فواللہ ما اراد بہ الا علی بن ابی طالب و فاطمۃ و انا والحسین) جہاں کہیں قرآن میں ان الابرار آیا ہے خدا کی قسم اس سے پروردگار کی مراد علیؑ ابن ابی طالب، فاطمہؑ زہرا، میں اور حسینؑ ہیں[1]

---

[1] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۴۳ حدیث ۲۳۔

اس میں شک نہیں کہ خمسہ نجباء پانچ مقدس نورِ ابرار و مقربین کے سب سے زیادہ مصداق ہیں اور جیسا کہ ہم نے سورہ دھر میں کہا ہے کہ یہ عظیم سورہ امیر المومنین حضرت علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس کی اٹھارہ آیات ان کے فضائل کی بحث میں ہیں اگرچہ ان کے بارے میں آیات کا نزول آیات کے مفہوم کی وسعت کی راہ میں مانع نہیں ہے۔

۲۔ جنت کی شرابیں

قرآن کی مختلف آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں کئی قسم کی شراب ہائے طہور کئی ناموں اور کیفیتوں کے ساتھ موجود ہیں جو ہر لحاظ سے دنیا کی ناپاک شرابوں سے مختلف ہیں، دنیا کی شرابیں عقل کو ختم کرتی ہیں، جنون پیدا کرتی ہیں اور عداوت و خونریزی اور فتنہ و فساد کا سرچشمہ بنتی ہیں۔ بدبودار و بدذائقہ اور نجس و ناپاک ہوتی ہیں۔

لیکن جنت کی شرابیں عقل، نشاط اور عشق پیدا کرتی ہیں۔ خوشبودار معطر اور پاک ہیں اور جو لوگ انہیں پیتے ہیں وہ ناقابلِ بیان روحانی نشہ سے سرور حاصل کرتے ہیں جس کی دو قسمیں اس سورت میں آچکی ہیں۔ رحیق مختوم اور تسنیم اور اس کی دوسری اقسام سورۂ دھر اور قرآن کی دوسری آیات میں بیان ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک کی اس جگہ ہم نے تصریح کی ہے۔

قابلِ توجہ یہ ہے کہ متعدد روایات میں یہ جنت کی شراب ان لوگوں کا اجر قرار دی گئی ہے جو دنیا کی شراب کی طرف توجہ نہ کریں، پیاسوں کو سیراب کریں اور مومنین کے دلوں میں جو غم و اندوہ کی آگ جل رہی ہے اسے بجھا دیں۔

پیغمبرِ اسلامؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا: (یا علی من ترك الخمر لله سقاه الله من الرحیق المختوم) اے علیؑ! جو شخص خدا کی خاطر شراب کو ترک کرے تو خدا اُسے جنت کی منہ بند مُہر شدہ شرابِ زلال سے سیراب کرے گا[1]

زیادہ جاذب توجہ یہ بات ہے کہ ایک اور حدیث میں انہی جناب سے آیا ہے کہ اگر دنیا کی شراب، خدا نہیں بلکہ غیر خدا کی خاطر بھی ترک کرے تو بھی خدا اسے اس شراب سے سیراب کرے گا۔

حضرت علیؑ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا غیرِ خدا کے لیے؟

فرمایا ہاں! جو شخص اپنی جان کی حفاظت کے لیے بھی دنیا کی شراب کو چھوڑے تو خدا اسے رحیق مختوم سے سیراب کرے گا[2]

---

[1] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۳۴ حدیث ۳۷، ۴۰۔

[2] ایضاً " " " " " "

جی ہاں وہ افراد جو شراب کو اپنی سلامتی کی حفاظت کی خاطر ترک کریں وہ حقیقت میں اولوالالباب ہیں اور جیسا کہ سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۹۳ سے معلوم ہوتا ہے ۔ اولوالالباب بھی ابرار کے زمرہ میں ہیں جو جنت کی شراب ہائے طہور سے بہرہ مند ہوں گے ۔

ایک اور حدیث میں علیؑ بن حسینؑ سے منقول ہے (من سقی مؤمناً من ظمأ سقاہ اللہ من الرحیق المختوم) جو شخص کسی پیاسے مومن کو سیراب کرے خدا اسے رحیق مختوم سے سیراب کرے گا[1]

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے : (من صام للہ فی یوم صائف سقاہ اللہ من الظمأ من الرحیق المختوم) جو شخص موسم گرما کے دنوں میں روزہ رکھے تو خدا اسے قیامت کی تشنگی کی حالت میں رحیق مختوم سے سیراب کرے گا[2]

---

[1] نور الثقلین ، جلد ۵ ص ۵۳۴ (حدیث ۳۵) ۔

[2] مجمع البیان در ذیل آیات زیر بحث (جلد ۱۰ ص ۴۵۶) ۔

(۲۹) اِنَّ الَّذِیۡنَ اَجۡرَمُوۡا کَانُوۡا مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یَضۡحَکُوۡنَ ۫ۖ

(۳۰) وَ اِذَا مَرُّوۡا بِہِمۡ یَتَغَامَزُوۡنَ ۫ۖ

(۳۱) وَ اِذَا انۡقَلَبُوۡۤا اِلٰۤی اَہۡلِہِمُ انۡقَلَبُوۡا فَکِہِیۡنَ ۫ۖ

(۳۲) وَ اِذَا رَاَوۡہُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّ ہٰۤؤُلَآءِ لَضَآلُّوۡنَ ۙ

(۳۳) وَ مَاۤ اُرۡسِلُوۡا عَلَیۡہِمۡ حٰفِظِیۡنَ ؕ

(۳۴) فَالۡیَوۡمَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنَ الۡکُفَّارِ یَضۡحَکُوۡنَ ۙ

(۳۵) عَلَی الۡاَرَآئِکِ ۙ یَنۡظُرُوۡنَ ؕ

(۳۶) ہَلۡ ثُوِّبَ الۡکُفَّارُ مَا کَانُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿ع﴾

ترجمہ

(۲۹) بدکار دنیا میں ہمیشہ مومنین پر ہنستے تھے۔

(۳۰) اور جب مومنین کے پاس سے گزرتے تو اشاروں سے ان کا مذاق اڑاتے۔

(۳۱) اور جب اپنے خاندان کی طرف پلٹتے تو مسرور پلٹتے۔

(۳۲) اور جس وقت مومنین کو دیکھتے تو کہتے یہ گمراہ ہیں۔

(۳۳) حالانکہ وہ مومنین کی نگرانی پر کبھی مامور نہیں رہے اور نہ ان کے متکفّل تھے۔

(۳۴) لیکن آج مومنین کفار پر ہنستے ہیں۔

(۳۵) جبکہ جنت کے مزیّن تختوں (اور پلنگوں) پر بیٹھے ہیں اور دیکھ رہے ہیں۔

(۳۶) کیا کفار نے اپنے اعمال کا اجر لے لیا ہے؟

شانِ نزول

مفسرین نے ان آیات کے لیے دو شان ہائے نزول نقل کی ہیں۔ پہلی یہ کہ ایک دن حضرت علیؑ اور مومنین کی ایک جماعت کفارِ مکہ کے قریب سے گزری تو وہ حضرت علیؑ اور ان مومنین پر ہنسنے لگے اور ان کا مذاق اڑایا، تو مندرجہ بالا آیتیں نازل ہوئیں اور ان مذاق اڑانے والے کافروں کی جو قیامت میں حالت ہو گی اس کو واضح کیا۔

" حاکم ابو القاسم حسکانی شواہد التنزیل میں ابن عباس سے اس طرح نقل کرتے ہیں کہ " ان الذین اجرموا " سے مراد قریش کے منافقین ہیں اور " الذین اٰمنوا " سے مراد علی بن ابی طالبؑ اور ان کے یار و انصار ہیں[1]

دوسری شانِ نزول یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات عمار، صہیب، جناب بلال اور اسی قسم کے دوسرے غریب مومنین کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو ابوجہل، ولید بن مغیرہ اور عاص بن وائل جیسے مشرکین قریش کے تمسخر کا نشانہ بنے تھے۔

تفسیر

اس دن وہ مومنین کا مذاق اڑاتے تھے لیکن آج ....

گزشتہ آیات کے بعد، جو نیک لوگوں کو ملنے والی نعمتوں اور ثواب کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں، زیرِ بحث آیات میں ان مصائب اور زحمتوں کے ایک گوشہ کی طرف، جس سے اس جہان میں ایمان و تقویٰ کی بنا پر ان کا واسطہ پڑا تھا، اشارہ کرتا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ وہ عظیم اجر و ثواب حساب کتاب کے بغیر نہیں ہے۔

ان آیات میں کفار کی قبیح اور دل دکھانے والی تنقید اور ان سے آمنا سامنا ہونے کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور کفار کے چار قسم کے ردِ عمل کو بیان کرتا ہے پہلے فرماتا ہے:

" بدکار اور کفار ہمیشہ مومنین پر ہنستے تھے " (ان الذین اجرموا کانوا من الذین اٰمنوا یضحکون)۔ تمسخر آمیز اور مبنی بر حقارت ہنسی، ایسی ہنسی جو سرکشی و تکبر اور غرور و غفلت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور ہمیشہ چھوٹے دماغ کے مغرور افراد متقی مومنین کے مقابلہ میں اس قسم کی بے وقوفانہ ہنسی سے کام لیتے ہیں۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۵۷۔ حضرت علیؑ اور مشرکین مکہ کے بارے میں ان آیات کا نازل ہونا بہت سی کتب تفسیر مثلاً قرطبی، روح المعانی، کشاف اور تفسیر فخر رازی میں آیا ہے۔

ضمنی طور پر "کفروا" کی بجائے "اجرموا" کی تعبیر یہ بتاتی ہے کہ کافر و بے ایمان افراد اپنے گناہ آلود اعمال سے پہچانے جاتے ہیں اس لیے کہ کفر ہمیشہ سے عصیان و جرم کا سرچشمہ ہے۔

بعد والی آیت میں ان کے قبیح طرزِ عمل کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"جس وقت کفار مومنین کی جماعت کے قریب ہوں تو اشاروں سے ان کا مذاق اڑاتے ہیں"

(واذا مرّوا بھم یتغامزون)، اور اشاروں اشاروں میں کہتے ہیں کہ ان بے سروپا افراد کو دیکھتے ہو کہ یہ مقربین بارگاہِ خدا ہو گئے ہیں۔ان ننگے پاؤں اور بُرے حال لوگوں کو دیکھو کہ یہ اپنے اوپر وحی کے نزول کے مدعی ہیں اور نادان لوگوں کو دیکھو کہ یہ کہتے ہیں کہ بوسیدہ اور خاک شدہ ہڈیاں دوبارہ زندگی کی طرف پلٹ آئیں گی اور یوں وہ اسی قسم کی دوسری کھوکھلی باتیں کرتے ہیں۔

ایسا نظر آتا ہے کہ مشرکین واضح طور پر اس وقت ہنسی اڑاتے تھے جب مومنین کی کوئی جماعت ان کے پاس سے گزرتی تھی اور ان کے تمسخر آمیز اشارے اس وقت ہوتے جب وہ مومنین کی جماعت کے نزدیک سے گزرتے اور چونکہ مومنین کی جماعت کے قریب رہ کر آسانی سے ان کا مذاق نہیں اڑا سکتے تھے، لہٰذا آنکھوں کے اشاروں سے کام لیتے تھے لیکن جہاں خود ان کا جمگھٹا ہوتا اور مومنین ان کے پاس سے گزرتے وہاں وہ زیادہ آزادی اور جسارت سے کام لیتے [1]

"یتغامزون"، "غمز" (بروزن طنز) کے مادہ سے آنکھ اور ہاتھ سے ایسی چیز کی طرف اشارہ کرنے کے معنی میں ہے جس سے عیب جوئی کا پہلو نکلتا ہو اور بعض اوقات یہ لفظ ہر قسم کی عیب جوئی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، خواہ زبان ہی سے کیوں نہ ہو۔

اور تغامز (باب تفاعل سے) کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ وہ سب کے سب ایک دوسرے کے ساتھ مل کر یہ حرکت کرتے تھے اور ہر کوئی اشارہ کر کے دوسرے کو کچھ بتاتا، جس میں مذاق کا پہلو ہوتا۔ یہ تو مومنین سے آمنا سامنا ہونے پر ہوتا تھا۔ خصوصی جلسوں میں بھی یہی طریقِ کار اختیار کیے رکھتے اور علیحدگی میں بھی اس سلسلہ کو جاری رکھتے، جیسا کہ بعد والی آیت کہتی ہے:

"جس وقت وہ اپنے گھروں کی طرف پلٹ جاتے تو خوش ہوتے اور جو کچھ انجام دیا ہوتا اس پر پھولے نہ سماتے": (واذا انقلبوا الی اھلھم انقلبوا فکھین)۔ گویا انہیں فتح و کامیابی نصیب ہوئی ہے جس کی وجہ سے فخر و مباہات کر رہے ہیں اور پھر مومنین سے علیحدگی کی صورت میں بھی اس مذاق

---

[1] "مرّوا" اور "بھم" کی ضمیروں کے مرجع کے بارے میں مفسرین نے دو احتمال تجویز کیے ہیں بعض نے پہلی ضمیر پر مشرکین کی طرف اور دوسری مومنین کی طرف پلٹائی ہے اور بعض نے اس کے برعکس کہا ہے لیکن ہم نے جو کچھ اوپر کہا ہے اس کے مطابق پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

توجاری رکھتے۔

"فکھین" جمع ہے "فکہ" کی، یہ صفت ہے مشبہ (اور بروزن خشن ہے) "فکاھہ" (بروزن قبالہ) مذاق اڑانے کے معنی میں ہے اور اصل میں فاکھہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی پھل کے ہیں۔ گویا یہ شوخیاں پھلوں کے مانند ہیں جن سے وہ لذت حاصل کرتے ہیں اور شیریں اور دوستانہ گفتگو کو فکاھہ کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اہل کا لفظ عام طور پر خاندان اور قریبی رشتہ داروں کے معنی میں ہے لیکن ممکن ہے کہ یہاں زیادہ وسیع معنی رکھتا ہو اور قریبی دوستوں کا بھی احاطہ کرے۔

مومنین کے مقابلہ میں ان کا چوتھا شرارت آمیز طرزِ عمل یہ تھا کہ وہ جب انہیں دیکھتے تو کہتے یہ گمراہ ہیں (واذا رأوھم قالوا ان ھٰؤلاء لضالّون)، اس لیے کہ وہ بت پرستی اور خرافات، جو کفار میں رائج تھیں، انہیں یہ گمراہ راہِ ہدایت خیال کرتے تھے جبکہ مومنین نے انہیں چھوڑ دیا تھا اور توحید کی طرف پلٹ آئے تھے اور کفار کے گمان میں نقدِ دنیا کی لذت کو مومنین نے آخرت کی خاطر ادھار بیچ دیا تھا۔

ہوسکتا ہے کہ یہ تعبیر ان مراحل میں ہو جہاں بات مذاق سے آگے بڑھ چکی ہو اور کفار اپنے آپ کو ناچار و مجبور دیکھتے ہوں کہ زیادہ سے زیادہ شدتِ عمل دکھائیں اس لیے کہ ہمیشہ عظیم پیغمبروں اور نئے دین و آئین کے ظہور کے وقت دشمنوں اور مخالفوں کا یہی طرزِ عمل ہوتا ہے کہ وہ مذاق اڑاتے تھے۔ گویا وہ نئے دین کو اس قابل نہ سمجھتے تھے کہ سنجیدگی سے اس کا سامنا کریں۔ لیکن جب دینِ خدا آمادہ افراد کے دلوں میں نفوذ کر جاتا اور اس کے بہت سے پیروکار ہوجاتے تو کفار خطرہ محسوس کرکے اس پر سنجیدگی سے اپنا ردِ عمل ظاہر کرتے اور لڑائی پر شدت سے آمادہ رہتے اور مرحلہ بہ مرحلہ زیادہ شدت اختیار کرتے۔

مندرجہ بالا آیت ان کی انتہائی کوشش کا پہلا مرحلہ ہے جس کی بعد نوبت خوں ریز جنگوں تک پہنچ گئی۔ چونکہ مومنین عام طور پر ایسے افراد میں سے تھے جن کی کوئی اجتماعی حیثیت نہ تھی اور وہ دولت مند بھی نہیں تھے، اس بنا پر کفار انہیں چشمِ حقارت سے دیکھتے تھے اور ان کے ایمان کو بے قیمت شمار کرتے تھے اور ان کے دین کا مذاق اڑاتے تھے۔ بعد والی آیت میں قرآن کہتا ہے:

"یہ گروہِ کفار ان کی زندگی کا (مومنین کی) کبھی بھی محافظ و نگہبان اور متکفّل نہیں تھا" (وما ارسلوا علیھم حافظین)، تو پھر کس حق کی بنا پر اور کون سی منطق کی رُو سے ان پر تنقید اور اعتراض کرتے تھے؟

سورہ ہود کی آیت ۲۷ میں ہم پڑھتے ہیں کہ قومِ نوح کے دولتمندوں اور متکبر لوگوں نے آپ سے کہا (وما نراک اتبعک الّا الذین ھم اراذلنا بادی الرأی) "ہم ان لوگوں کو جنہوں نے تیرا اتباع کیا ہے ذلیل اور سادہ لوح ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھتے" تو آں جناب نے

کفار کے جواب میں کہا: (ولا اقول للذین تزدری اعینکم لن یؤتیھم اللہ خیرًا اللہ اعلم بما فی انفسھم) "میں بالکل نہیں کہتا کہ وہ لوگ جو تمہاری نظر میں ذلیل و خوار ہیں خدا انہیں خیر نہیں دے گا خدا ان کے دلوں سے زیادہ آگاہ ہے" (ہود - ۳۱)۔

یہ حقیقت میں ان خود پرست اور متکبر افراد کا جواب ہے اور انہیں بتایا جا رہا ہے کہ اس کام سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ مومنین کس گروہ سے وابستہ ہیں، تم اپنے طور پر روحِ دعوتِ دین اور پیغمبرِ اسلامؐ کے آئین اور ان کے مجموعۂ قوانین کو دیکھو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔

قیامت میں صورتِ حال بالکل برعکس ہو جاتے گی جیسا کہ بعد والی آیت میں فرماتا ہے:

"آج مومنین کفار پر ہنسیں گے"۔ (فالیوم الذین اٰمنوا من الکفار یضحکون)۔ چونکہ قیامت انسان کے دنیاوی اعمال کا ردِ عمل ہے اور وہاں عدالتِ الٰہی کا اجر ہونا ہے اور عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ وہاں پاک دل مومن ہٹ دھرم اور مذاق اڑانے والے کافروں پر ہنسیں۔ یہ ان مغرور لوگوں پر ایک قسم کا دردناک عذاب ہے۔

بعض روایات میں رسولؐ خدا سے منقول ہے کہ اس روز جنت کا ایک در کفار کے سامنے کھلے گا اور وہ اس خیال سے کہ جہنم سے آزادی اور جنت میں ورود کا حکم انہیں دے دیا گیا ہے اس دروازے کی طرف چل پڑیں گے۔ جس وقت اس کے قریب پہنچیں گے وہ دروازہ اچانک بند ہو جائے گا۔ اور یہ کئی مرتبہ ہوگا اور وہ مومنین جو جنت سے ان کا نظارہ کر رہے ہوں گے ان پر ہنسیں گے[1] لہٰذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے:

وہ مزین پلنگوں اور تختوں پر بیٹھے ہوتے ہوں گے اور ان مناظر کو دیکھیں گے (علی الارائک ینظرون)۔ وہ کن چیزوں کی طرف دیکھیں گے؟۔ خدا کی لامحدود نعمتوں کی طرف، جی ہاں! بے کراں الطاف و کرم کو دیکھیں گے، اس آرام و سکون و عظمت و احترام کو دیکھیں گے (جو انہیں حاصل ہوگا) اور ان دردناک عذابوں کی طرف دیکھیں گے جن میں مغرور و خود پرست کفار انتہائی ذلت اور زبوں حالی کے ساتھ گرفتار ہوں گے۔

اور پھر اس سورہ کی آخری آیت میں ایک استفہامیہ جملے کی شکل میں فرماتا ہے:

"کیا کفار نے اپنے اعمال کا اجر اور کاموں کا ثواب لے لیا ہے" (ھل ثوب الکفار ما کانوا یفعلون)[2]

---

[1] درالمنثور، جلد ۶ ص ۳۲۸ (مختصر سے فرق کے ساتھ)۔

[2] اس آیت میں استفہام تقریری ہے۔

یہ بات چاہے خدا کی جانب سے ہو یا فرشتوں کی طرف سے، یا مومنوں کی طرف سے، یہ ایک قسم کا طعن و استہزا ہے ان مغرور و متکبر افراد کے افکار اور دعووں پر جنہیں توقع تھی کہ اپنے بُرے اعمال کے بدلے میں خدا کی طرف سے انعام و اکرام انہیں ملے گا۔ اس غلط گمان اور خیالِ خام کے مقابلہ میں فرماتا ہے:

"کیا انہوں نے اپنے اعمال کا ثواب اور اجر لے لیا ہے" بہت سے مفسرین نے اس جملے کو ایک مستقل جملہ سمجھا ہے جبکہ بعض کا نظریہ ہے کہ یہ گزشتہ آیت کا حصہ ہے یعنی مومنین مزین تختوں پر بیٹھے ہوتے دیکھ رہے ہوں گے اور سوچ رہے ہوں گے کہ کیا کفار نے اپنے غلط اعمال کا اجر لے لیا ہے۔

جی ہاں! وہ اگر اجر لیں تو شیطان سے لیں، کیا وہ بے نوا گرفتار انہیں کوئی اجر دے سکتے ہیں۔

"ثوب" (بروزن جوف) ثوب کے مادہ سے اصل میں کسی چیز کا اپنی پچھلی حالت کی طرف پلٹنا ہے اور ثواب اس اجر کو کہا جاتا ہے جو انسان کو اس کے اعمال کے مقابلہ میں دیتے ہیں، اس لیے کہ اس کے اعمال کا نتیجہ اس کی طرف لوٹتا ہے۔ یہ لفظ اچھی یا بری جزا کے لیے استعمال ہوتا ہے اگرچہ عام طور پر موردِ خیر میں استعمال ہوتا ہے[1]

اس لیے اوپر والی آیت ایک قسم کا کفار پر طنز کرتی ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے اس لیے کہ وہ ہمیشہ مومنین اور آیاتِ خدا کا مذاق اڑاتے تھے لہٰذا ضروری ہے کہ اس دن اپنے مذاق کی سزا بھگتیں۔

ایک نکتہ

دشمنانِ حق کا مذاق اڑانے کا بزدلانہ حربہ

انبیاء کی طویل تاریخ میں ہم بار ہا دیکھتے ہیں کہ دشمنانِ خدا کا ایک حربہ مومنین کے مقابلہ میں تمسخر و استہزاء ہوتا ہے اور آیاتِ قرآنی نے اس موضوع کو بارہا پیش کیا ہے۔ اور چونکہ تمسخر و استہزاء عام طور پر ایسے لوگوں سے صادر ہوتا ہے جو مغرور ہوتے ہیں اور خود کو دوسروں سے بہتر و برتر سمجھتے ہیں اور دوسروں کو چشمِ حقارت سے دیکھتے ہیں اور کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ کافر، ظالم، ہٹ دھرم اور خود پرست اہلِ ایمان کے مقابلہ میں اس قسم کا حربہ استعمال کریں۔

---

[1] "مفردات" راغب مادہ "ثوب"

موجودہ زمانے میں بھی یہی صورت حال ہے۔ دنیا کے افسوس ناک گروہی معاملات میں کئی شکلوں میں طعن وطنز اور مذاق کی صورتِ حال کو جاری رکھا جاتا ہے۔ اب بھی کوشش کی جاتی ہے کہ حق کے طرفداروں کو اس قدیمی حربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میدان چھوڑنے پر مجبور کریں لیکن مومنین ان کے مقابلہ میں خدائی دعووں کی طرف توجہ کرکے، جن کا ایک نمونہ اوپر والی آیت میں آیا ہے، آرام وسکون محسوس کرتے ہیں اور تاریک دل مخالفوں کے مقابلہ میں مومنین کے دلوں میں روحِ مقاومت پیدا ہوتی ہے۔

اصولی طور پر استہزا، تمسخر، غمز "(اشارے) ضحک اور ہنسنا، حق کے مقابلہ میں، جس کی طرف مندرجہ بالا آیت میں اشارہ ہوا ہے، یہ سب گناہان کبیرہ میں سے ہیں اور جہالت وغرور کی علامت ہیں۔ ایک فہیم، عاقل اور ہشیار انسان بغرضِ محال کسی مکتب فکر سے متعلق نہ بھی ہو، کبھی اپنے آپ کو اجازت نہیں دیتا کہ اس قسم کے حربوں سے کام لے، وہ مقابل سے صرف منطقی حربوں سے مقابلہ کرتا ہے۔

خداوندا! ہم سب کو غرور وجہالت اور کبر ونخوت سے محفوظ فرما۔

پروردگارا! ہمیں حق طلبی، حق جوئی اور تواضع کی روح مرحمت فرما۔

بارالٰہا! ہمارا نامۂ اعمال علیین میں قرار دے اور سجینوں کے زمرہ سے خارج کردے۔

آمین یارب العالمین

سورہ مطففین کا اختتام

سورۂ انشقاق

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا

اس کی ۲۵ آیتیں ہیں

تاریخِ ابتدا ۳ شعبان المعظم ۱۴۰۷ھ بروز ولادت امام حسینؑ

سورۂ انشقاق کے مضامین اور اس کی تلاوت کی فضیلت

یہ سورہ قرآن مجید کے آخری پارے کی بہت سی دوسری سورتوں کے مانند معاد و قیامت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ شروع میں دنیا کے اختتام اور قیامت کے شروع ہونے کے ہولناک اور دل ہلا دینے والے حوادث کی طرف کچھ اشارے کرتا ہے اور بعد والے مرحلہ میں قیامت، نیکوکاروں اور بدکاروں کے اعمال کا حساب اور ان کی سرنوشت کے مسئلہ کو بیان کرتا ہے۔

تیسرے مرحلہ میں چند ایسے اعمال و عقائد جو موجب عذاب الٰہی ہیں، اُن کو پیش کرتا ہے اور چوتھے مرحلہ میں چند قسموں کے بعد انسان کی دنیاوی اور اخروی زندگی کے مرحلوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور آخرکار پانچویں مرحلہ میں دوبارہ نیک و بد اعمال اور ان کی سزا و جزا کے بارے میں بات کرتا ہے۔

اس سورہ کی تلاوۃ کی فضیلت کے سلسلہ میں ایک حدیث پیغمبر اسلام سے منقول ہے (من قرأ سورة انشقت اعاذه الله ان یؤتیه کتابه وراء ظهره)، جو شخص سورہ انشقاق کو پڑھے تو خدا قیامت میں اس شر سے اس کو امان میں رکھے گا کہ اس کا نامہ اعمال پس پشت سے دیا جائے[1]

کتاب ثواب الاعمال میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ جو شخص ان دونوں سورتوں (انفطار و انشقاق) کو پڑھے اور نماز فریضہ و نافلہ میں اپنا نصب العین بنالے تو خدا اس کو اس کی خواہشات تک پہنچائے گا، کوئی چیز اس کے اور خدا کے درمیان حائل نہیں ہوگی، وہ ہمیشہ لطف خدا پر نظر رکھے گا اور خدا اس پر نظر رکھے گا یہاں تک کہ لوگوں کے حساب سے فارغ ہوگا۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۵۸۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(۱) اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۙ

(۲) وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۙ

(۳) وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ

(۴) وَاَلْقَتْ مَا فِیْهَا وَتَخَلَّتْ ۙ

(۵) وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ؕ

(۶) یٰاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ ۚ

(۷) فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۙ

(۸) فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا ۙ

(۹) وَّیَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

(۱) جس وقت آسمان پھٹ جائے گا۔

(۲) اور اپنے پروردگار کے فرمان کو تسلیم کرے گا اور سزاوار ہے کہ ایسا ہی ہو۔

(۳) اور جب زمین میں وسعت پیدا ہو گی۔

(۴) اور جو کچھ اس کے اندر ہے اُسے باہر پھینک دے گی اور خالی ہو جائے گی۔

(۵) اور اپنے پروردگار کے حکم کو تسلیم کرے گی اور ایسا ہی ہونے کے لائق ہے۔

(۶) اے انسان تو رنج و تکلیف اور سعی و کوشش کے ساتھ اپنے پروردگار کے طرف جائے گا اور اس سے ملاقات کرے گا۔

(۷) لیکن وہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا ہے۔

(۸) عنقریب اس کے لیے آسان حساب ہوگا۔

(۹) اور وہ خوشحالی کے ساتھ اپنے گھر والوں کی طرف پلٹ جائے گا۔

تفسیر

کمالِ مطلق کی طرف رنج آمیز سعی وکوشش

جیسا کہ ہم نے اس سورہ کے مضامین کی تشریح میں کہا ہے اس سورہ کے آغاز میں ہی عظیم اور عجیب دنیا کے اختتام کے حوادث کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

"جب آسمان میں شگاف پڑ جائیں گے اور آسمانی اجرام پراگندہ ہو جائیں گے اور نظام کواکب درہم و برہم ہو جائے گا" (اذا السماء انشقت) [1]

اس کی نظیر جو سورۂ انفطار میں آئی ہے اس میں فرماتا ہے: (اذا السماء انفطرت واذا الکواکب انتثرت)۔ جس وقت آسمان میں شگاف پڑ جائیں گے اور ستارے پراگندہ ہو جائیں گے اور بجھ جائیں گے" (انفطار۔ ۱، ۲)۔ اور یہ اختتامِ دنیا اور اس کی خرابی و فنا کا اعلان ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"اور اس کے پروردگار کا حکم تسلیم کیا جائے گا اور حقیقت میں ایسا ہی ہونا چاہیئے" (واذنت لربها وحقت)، مبادا یہ تصور ہو کہ انسان اس عظمت کے باوجود حکمِ الٰہی کا معمولی سا مقابلہ بھی کرے، وہ مطیع و فرمانبردار بندے کی طرح ہے جس کا اس کے حکم کے سامنے مکمل طور پر سرِ تسلیم خم ہے۔

"اذنت" اصل میں "اذن" (بروزن افق) سے جو کان کے معنی میں ہے لیا گیا ہے اور اس کے

---

[1] اذا حرف شرط ہے اور اس کی جزا محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے: اذا السماء انشقت .... لاقی الانسان ربه فحاسبه وجازاه۔

معنی کان لگا کر سننا ہیں اور یہاں اطاعتِ فرمان کا کنایہ ہے۔ "حقت" حق کے مادہ سے شائستہ لائق اور سزاوار کے معنی میں ہے۔ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ سرِ تسلیم خم نہ کرے جبکہ لحہ بہ لحہ وجودِ خدا ہی سے اس کو فیض پہنچ رہا ہو۔ اگر ایک لمحے کے لیے بھی یہ رابطہ منقطع ہو جائے تو یہیں ختم ہو کر رہ جائے۔

جی ہاں! آسمان و زمین نہ صرف آغازِ خلقت میں، سورہ حٰم سجدہ کی آیت ۱۱ (قالتا اتینا طائعین) کے مطابق، حق تعالیٰ کے فرمان کے مطیع تھے بلکہ عمر کے اختتام میں بھی ایسے ہی ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ "حقت" کے جملے سے مراد یہ ہے کہ قیامت کی وحشت اور اس کا خوف ایسا ہے کہ سزاوار ہے کہ آسمان پھٹ جائیں اور شگافتہ ہو جائیں لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے اور بعد والے مرحلہ میں زمین کی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اور جس وقت زمین کھینچی جائے گی اور وسیع کی جائے گی" (واذا الارض مدت)۔ پہاڑ قرآن کی بہت سی آیات کی شہادت کے مطابق مکمل طور پر پراگندہ ہو جائیں گے اور تمام بلندیاں اور پستیاں ختم ہو جائیں گی، زمین صاف و شفاف، وسیع و عریض اور اپنے صحن میں تمام بندوں کے حضور کے لیے آمادہ ہو جائے گی۔

جیسا کہ سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۰۵ تا ۱۰۷ میں فرماتا ہے: (ویسئلونک عن الجبال فقل ینسفھا ربی نسفًا فیذرھا قاعًا صفصفًا لا تری فیھا عوجًا ولا امتًا)۔ تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہہ دے میرا پروردگار انہیں ہوا میں اڑائے گا اور برباد کر دے گا پھر زمین کو ہموار اور صاف کرے گا اس طرح کہ تو اس میں کوئی بلندی و پستی نہیں دیکھے گا اور اس قسم کی دادگاہ و عدالت جس میں اولین و آخرین جمع ہوں اس کے لیے ایسے میدان کی ضرورت ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ خدا اسی زمین کو قیامت میں اس سے کہیں زیادہ وسیع کر دے گا کہ جس حالت میں اب ہے، تاکہ مخلوق کے حشر کے لیے اس میں زیادہ سے زیادہ آمادگی ہو۔[1]

تیسرے مرحلہ میں مزید کہتا ہے: "زمین اس چیز کو جو اس کے اندر ہے، باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی" (والقت ما فیھا وتخلت)۔ مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تمام وہ مردے جو مٹی اور قبروں میں آرام کر رہے ہیں، اچانک باہر پھینک دیئے جائیں گے اور وہ لباسِ زندگی زیبِ تن کریں گے۔

یہ اس کے مشابہ ہے جو سورہ زلزال میں آیا ہے (واخرجت الارض اثقالھا)۔ زمین اپنے

---

[1] تفسیر فخر رازی در ذیل آیات زیرِ بحث۔

وزنی بوجھ باہر نکالے گی۔ یا جو کچھ سورہ نازعات کی آیہ ۱۳، ۱۴ میں آیا ہے (فانما ھی زجرۃ واحدۃ فاذا ھم بالساھرۃ)۔ صرف ایک صیحہ ہوگا اور اس کے بعد سب کے سب صفحۂ زمین پر ظاہر ہو جائیں گے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ انسانوں کے علاوہ معدنیات اور خزانے جو زمین میں پوشیدہ ہیں، سب کے سب زمین سے باہر آجائیں گے۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ زمین کے اندر پگھلا ہوا مواد ہولناک اور وحشت ناک زلزلوں کی وجہ سے کلی طور پر باہر آکر گرے گا اور وہ تمام پستیوں کو پُر کر دے گا اس کے بعد زمین کے اندر کا حصہ بالکل خالی اور ساکن ہو جائے گا۔

ان معانی کے درمیان جمع میں بھی کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے:

"اس کے بعد زمین اپنے پروردگار کے فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے گی اور شائستہ و لائق ہے کہ سرِ تسلیم خم کرے" (واذنت لربھا وحقت)۔ یہ عظیم حوادث جو تمام موجودات کے سرِ تسلیم خم کرنے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں، ایک طرف تو اس دنیا کے فنا ہونے کو بیان کرتے ہیں، زمین و آسمان، انسانوں، خزانوں اور گنجینوں کی فنا، اور دوسری طرف عالمِ آفرینش میں نئے عالمِ ہستی کے ایجاد کی دلیل ہیں۔ اور تیسرے خداوندِ عظیم و بزرگ کی ہر چیز پر خصوصاً معاد و قیامت پر قدرت کی نشانی ہیں۔

جی ہاں! جب یہ حوادث واقع ہوں تو انسان اپنے نیک و بد اعمال کا نتیجہ دیکھ لیتا ہے۔ (یہ ایسا جملہ ہے جو تقدیر میں ہے)۔ اس کے بعد انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اور اس راہ میں جو ان کی سرنوشت ہے، ان کے لیے واضح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اے انسان تو سعی و کوشش اور رنج و تکلیف کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف بڑھ رہا ہے اور آخرکار اس سے ملاقات کرے گا" (یا ایھا الانسان انک کادح الیٰ ربک کدحًا فملاقیہ)۔

"کدح" (بروزن مدح) سعی و کوشش کے معنی میں ہے جو رنج و تعب کے ہمراہ ہو اور جسم و جان پر اثر انداز ہو۔ اسی لیے سخت محنت کرنے والے بیل کو جس میں کام کرنے کے آثار ظاہر ہوں، "ثور فیہ کدوح" کہتے ہیں۔

تفسیر کشاف، فخر رازی اور روح المعانی میں آیا ہے کہ یہ لفظ اصل میں اس خراش کے معنی میں ہے جو کھال پر لگ جاتی ہے۔ اسی مناسبت سے ان کوششوں پر جو روحِ انسانی پر اثر انداز ہوں، اس کا اطلاق ہوا ہے۔

یہ آیت ایک بنیادی اصل کی طرف اشارہ ہے جو تمام انسانوں کی حیات میں موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ زندگی ہمیشہ زحمت اور رنج و تعب اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ اگر مقصود صرف متاعِ دنیا تک

پہنچنا ہی ہو تب بھی، چہ جائیکہ مقصود آخرت، سعادتِ جاوداں اور قربِ پروردگار ہو۔

دنیاوی زندگی کی یہ طبیعت اور اس کا یہ مزاج ہے۔ یہاں تک کہ وہ افراد جو انتہائی خوش حالی سے عمر گزارتے ہیں وہ بھی رنج و زحمت اور درد و تکلیف سے بچے ہوتے نہیں۔

پروردگار کی ملاقات کی تعبیر سے یہاں مراد چاہے قیامت کے منظر کا دیکھنا ہو، جو اس کی حاکمیتِ مطلقہ کا مظہر ہے یا اس کی جزا و سزا کا آمنا سامنا ہو، یا شہودِ باطن کے طریقہ سے خود اس کی ملاقات ہو۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ رنج و تعب اس دن تک جاری رہے گا اور اس وقت ختم ہوگا جب اس دنیا کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور انسان پاکیزہ عمل کے ساتھ اپنے خدا سے ملاقات کرے گا۔

جی ہاں! رنج و تعب کے بغیر راحت و آرام صرف وہم ہے۔ "انسان" کے لفظ سے خطاب، جو ساری نوعِ انسانی پر حاوی ہے، (انسان کی انسانیت پر انحصار کی طرف توجہ کرتے ہوئے) اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ خدا نے ضروری یہ توانائیاں اس اشرف المخلوقات میں پیدا کی ہیں اور عنوانِ رب پر انحصار اس طرف اشارہ ہے کہ یہ سعی و کوشش انسانیت کے تکامل و تربیت کے نظام الاوقات کا ایک جزء ہے۔

جی ہاں! ہم سب مسافر ہیں جنہوں نے سرحدِ عدم سے رختِ سفر باندھا ہے اور اقلیمِ وجود میں قدم رکھا ہے۔ ہم سب اس کی راہِ عشق کے راہ رو ہیں اور دوست کے رُخِ انور کی مقناطیسی کشش کی بنا پر آئے ہیں۔

اس تعبیر کی نظیر قرآن کی دوسری آیات میں بھی آئی ہے، مثلاً (وان الیٰ ربک المنتھیٰ) اور یہ کہ تمام امور تیرے پروردگار کی طرف لوٹتے ہیں اور تمام خطوط اسی پر منتہی ہوتے ہیں (نجم - ۴۲)

نیز فرماتا ہے:

(والی اللہ المصیر) "سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے" (فاطر - ۱۸)۔ اور دوسری آیات سب یہ بتاتی ہیں کہ موجودات کے تکامل کا یہ راستہ خداوند متعال کی طرف جاتا ہے لیکن یہاں تمام انسان دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں جیسا کہ فرماتا ہے:

"لیکن یہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا، عنقریب اس کا آسان حساب کتاب ہوگا" (فاما من اوتی کتابہ بیمینہ فسوف یحاسب حسابًا یسیرًا)۔ اور وہ مسرور ہو کر اپنے اہلِ خانہ کی طرف پلٹ جائے گا (وینقلب الیٰ اھلہ مسرورًا)۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو آفرینش کے مدارِ اصلی میں، وہی مدار جو خدا نے اس انسان کے لیے اس کے سرمایوں، طاقتوں اور توانائیوں کے لیے معین کیا ہے، حرکت کرتے ہیں اور ان کی سعی و کوشش ہمیشہ خدا کے لیے ہے اور ان کی حرکت خدا کی طرف ہے۔

وہاں ان کا نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیں گے۔ ان کے اعمال کی پاکیزگی، ایمان کی صحت اور قیامت میں نجات کی علامت ہے اور اہلِ محشر کے مقابلہ میں سرفرازی و سربلندی کا سبب ہے۔

جس وقت میزانِ عدل کے نیچے کھڑے ہوں گے، وہ میزان جو کم سے کم میزان کو تولتی ہے، تو خدا ان کا حساب کتاب آسان کر دے گا، ان کی لغزشوں سے درگزر کرے گا اور ایمان و عملِ صالح کی وجہ سے ان کی سیئات کو حسنات میں تبدیل کر دے گا۔

یہ کہ حسابِ یسیر سے کیا مراد ہے، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد سہل و آسان حساب ہے جس میں سخت گیری و دقت نہ ہو، برائیوں سے درگزر اور حسنات کا اجر ہو۔

ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلامؐ سے منقول ہے: (ثلاث من کن فیه حاسبه الله حسابًا یسیرًا و ادخله الجنة برحمته قالوا وما هی یا رسول الله؟ قال تعطی من حرمك و تصل من قطعك و تعفو عمن ظلمك) تین چیزیں جس شخص میں موجود ہوں خدا اس کے حساب کو آسان کر دے گا اور اس کو اپنی رحمت سے جنت میں داخل کرے گا۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ وہ کونسی چیزیں ہیں؟ آپؐ نے فرمایا تو اس کو عطا کرے جو تجھے محروم کرے، اس سے صلۂ رحم کرے جو تجھ سے قطعِ رحم کرے اور اس کو معاف کرے جو تجھ پر ظلم کرے[1]

یہ مفہوم روایات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت میں حساب و کتاب میں دقت و سخت گیری انسانوں کی عقل و دانش کی میزان سے تعلق رکھتی ہے جیسا کہ امام محمد باقرؑ ارشاد فرماتے ہیں (انما یداق الله العباد فی الحساب یوم القیامة علی ما اٰتاهم من العقول فی الدنیا) خدا قیامت میں بندوں کے حساب کتاب میں اس عقل کی مقدار کے مطابق جو دنیا میں بندہ کو دی گئی ہے، سخت گیری کرے گا[2]

لفظ اہل کے لیے مندرجہ بالا آیات میں مختلف تفسیریں بیان ہوئی ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد اس کی بیوی اور ایمان دار اولاد ہے۔ مومنین جنت میں ان کے پاس پہنچیں گے اور یہ خود ایک بہت بڑی نعمت ہے کہ انسان جن سے محبت رکھتا ہے انہیں جنت میں دیکھے اور ان سے قریب رہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے اہل کو جنت کی حوروں کے معنی میں لیا ہے جو مومنین کے لیے معین

---

[1] مجمع البیان، زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۳۷۔

ہوئی ہیں بعض نے اسے صاحبانِ ایمان افراد کے معنی میں لیا ہے جن سے وہ دنیا میں محبت کرتا تھا۔
ان تمام معانی کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

چند نکات

۱۔ ایک ایسی حدیث جس میں اعجاز ہے

ایک حدیث میں اذا السماء انشقت کی تفسیر کے سلسلے میں حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا (انها تنشق من المجرة) (ستارے) کہکشاؤں سے الگ ہو جائیں گے۔[1]

یہ حدیث پرمعنی اور قابلِ وقعت ہے اور علمی معجزات میں شمار ہوتی ہے اور ایسی حقیقت پر سے پردہ اٹھاتی ہے کہ اس زمانہ کے ماہرین وعلماء میں سے کوئی اس تک نہیں پہنچا تھا۔ وہ یہ کہ موجودہ زمانے کے ماہرین فلکیات نے اپنے نجوم سے متعلق مشاہدات اور دوربینوں کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ عالم کہکشاؤں کا مجموعہ ہے اور ہر کہکشاں شمسی نظاموں اور ستاروں کا مجموعہ ہے اسی بنا پر انہیں ستاروں کے شہر کا نام دیتے ہیں۔

کہکشاں مشہور شہر کا راستہ ہے جو آنکھ سے نظر آسکتا ہے اور نظام ہائے شمسی اور ستاروں کے عظیم مجموعہ اور دائرہ کی مانند ہے۔ اس کی ایک سمت ہم سے اس قدر دور ہے کہ اس کے ستارے ہم کو سفید بادل کی شکل میں نظر آتے ہیں لیکن وہ درحقیقت ایک دوسرے سے نزدیک نورانی نقطوں کا مجموعہ ہیں۔

وہ سمت جو ہم سے نزدیک ہے اس کے ستارے قابلِ رویت ہیں۔ یہ وہی ستارے ہیں جو رات کے وقت ہم آسمان پر دیکھتے ہیں اور اس طرح ہمارا نظامِ شمسی سوائے اس کہکشاں کے اور کچھ نہیں ہے۔

مندرجہ بالا روایت کے مطابق حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ قیامت کے برپا ہونے کے وقت یہ ستارے، جنہیں تم دیکھتے ہو کہکشاں سے جدا ہو جائیں گے اور سب کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

اس زمانے میں کون جانتا تھا کہ یہ ستارے جنہیں ہم دیکھ رہے ہیں واقعی اس کہکشاں کا جز ہیں سوائے اس شخص کے جس کا دل عالمِ غیب سے مربوط ہو اور علمِ خدا کے سرچشمے سے سیراب ہوا ہو۔

۲۔ دنیا رنج وتکلیف اور دکھ درد کا گھر ہے

"کادح" کی تعبیر جو مندرجہ بالا آیت میں آئی ہے اور اس سعی وکوشش کی طرف اشارہ ہے جس

---

[1] روح المعانی، جلد ۳۰ ص ۸۰ و درالمنثور، جلد ۶ ص ۳۲۹۔

"باقی رہا وہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کی پشت کی طرف سے دیا جائے گا" (واما من اوتی کتابہ وراء ظھرہ)۔ عنقریب وہ فریاد کرے گا کہ وائے ہو مجھ پر کہ میں ہلاک ہوگیا (فسوف یدعوا ثبورًا)۔ "اور آگ کے جلانے والے شعلوں میں جلے گا" (ویصلیٰ سعیرًا)۔

یہ کہ ان کے نامہ اعمال کس طرح ان کے پس پشت سے دیں گے اور کس طرح یہ آیت اور وہ آیات جو کہتی ہیں کہ ان کے بائیں ہاتھ میں دیں گے، ایک جگہ جمع ہوں گی، اس سلسلہ میں مفسرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں بعض نے کہا ہے کہ ان کے دائیں ہاتھ گردن کے ساتھ زنجیر سے بندھے ہوں گے اور ان کے نامہ ہائے اعمال بائیں ہاتھ اور پشت کے پیچھے سے ملیں گے جو ذلت وخواریٔ سر نیچے رکھنے اور شرمساری کی علامت ہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ ان کے دونوں ہاتھ قیدیوں کی طرح پیچھے باندھ دیئے جائیں گے بعض دوسروں نے کہا ہے کہ سورہ نساء کی آیت ۴۷ کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو کہتی ہے: (من قبل ان نطمس وجوھًا فنردھا علیٰ ادبارھا)۔ "اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو مٹا دیں اور پشت کی طرف پھیر دیں"، اس طرح گروہ مجرمین کے منہ عقب کی جانب مڑ جائیں گے اور ضروری ہے کہ وہ اپنے نامہ ہائے اعمال خود پڑھیں۔ لہٰذا وہ ان کے بائیں ہاتھ میں پشت کی جانب انہیں دیں گے۔

لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ کہا جائے کہ اصحاب الیمین سرفرازی اور فخر و مباہات کے ساتھ اپنا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں لیے ہوئے پکار کر کہیں گے (ھاؤم اقرء واکتابیہ) "اے اہل محشر آؤ اور میرا نامہ اعمال لے کر پڑھو" (حاقہ - ۱۹)۔ لیکن جب گنہگاروں کو ان کا نامہ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیں گے تو وہ شرمساری اور ذلت سے اپنا ہاتھ پشت کے پیچھے کر لیں گے تاکہ جرم کی سند کم تر دیکھی جاتے۔

لیکن فائدہ کچھ نہیں ہوگا اس لیے کہ وہاں کوئی چیز پوشیدہ رہنے والی نہیں ہے (یدعوا ثبورًا)، اس تعبیر کی طرف اشارہ ہے جو عرب کسی خطرناک حادثہ کے موقعہ پر کرتے ہیں اور فریاد بلند کرتے ہیں (واثبورا)، یعنی اے وائے کہ میں ہلاک ہوگیا۔

توجہ فرمائیں کہ "ثبور" ہلاکت کے معنی میں ہے۔ لیکن یہ آہ و نالہ و فریاد کسی کے کان تک نہیں پہنچے گی۔ اس کے بعد (ویصلیٰ سعیرًا) ہے یعنی وہ جہنم کی جلانے والی آگ میں داخل ہوگا۔ اس کے بعد اس منحوس سرنوشت کی علت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"یہ اس بنا پر ہے کہ وہ اپنے گھر والوں میں ہمیشہ اپنے (کفر و گناہ کی وجہ سے) خوش رہتا تھا (انہ کان فی اھلہ مسرورًا)، ایسا سرور جس میں غرور کی آمیزش تھی اور ایسا غرور جو غفلت اور خدا سے بے خبری کو اپنے ساتھ لیے ہوئے تھا، ایسا غرور جو دنیا کے ساتھ شدید دلبستگی اور موت کے

ہوتی ہیں بعض نے اسے صاحبانِ ایمان افراد کے معنی میں لیا ہے جن سے وہ دنیا میں محبت کرتا تھا۔
ان تمام معانی کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

چند نکات

۱۔ ایک ایسی حدیث جس میں اعجاز ہے

ایک حدیث میں اذا السماء انشقت کی تفسیر کے سلسلے میں حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا (انها تنشق من المجرة) (ستارے) کہکشاؤں سے الگ ہو جائیں گے[1]

یہ حدیث پر معنی اور قابلِ وقعت ہے اور علمی معجزات میں شمار ہوتی ہے اور ایسی حقیقت پر سے پردہ اٹھاتی ہے کہ اس زمانہ کے ماہرین وعلماء میں سے کوئی اس تک نہیں پہنچا تھا۔ وہ یہ کہ موجودہ زمانے کے ماہرین فلکیات نے اپنے نجوم سے متعلق مشاہدات اور دوربینوں کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ عالم کہکشاؤں کا مجموعہ ہے اور ہر کہکشاں شمسی نظاموں اور ستاروں کا مجموعہ ہے۔ اسی بنا پر انہیں ستاروں کے شہر کا نام دیتے ہیں۔

کہکشاں مشہور شہر کا راستہ ہے جو آنکھ سے نظر آسکتا ہے اور نظام ہائے شمسی اور ستاروں کے عظیم مجموعہ اور دائرہ کی مانند ہے۔ اس کی ایک سمت ہم سے اس قدر دور ہے کہ اس کے ستارے ہم کو سفید بادل کی شکل میں نظر آتے ہیں لیکن وہ درحقیقت ایک دوسرے سے نزدیک نورانی نقطوں کا مجموعہ ہیں۔

وہ سمت جو ہم سے نزدیک ہے اس کے ستارے قابلِ رویت ہیں۔ یہ وہی ستارے ہیں جو رات کے وقت ہم آسمان پر دیکھتے ہیں اور اسی طرح ہمارا نظام شمسی سوائے اس کہکشاں کے اور کچھ نہیں ہے۔

مندرجہ بالا روایت کے مطابق حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ قیامت کے برپا ہونے کے وقت یہ ستارے، جنہیں تم دیکھتے ہو کہکشاں سے جدا ہو جائیں گے اور سب کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

اس زمانے میں کون جانتا تھا کہ یہ ستارے جنہیں ہم دیکھ رہے ہیں، واقعی اس کہکشاں کا جز ہیں سوائے اس شخص کے جس کا دل عالمِ غیب سے مربوط ہو اور علمِ خدا کے سرچشمے سے سیراب ہوا ہو۔

۲۔ دنیا رنج و تکلیف اور دکھ درد کا گھر ہے

«کادح» کی تعبیر جو مندرجہ بالا آیت میں آئی ہے اور اس سعی و کوشش کی طرف اشارہ ہے جس

---

[1] روح المعانی، جلد ۳۰ ص ۷۸ و در المنثور، جلد ۶ ص ۳۲۹۔

میں رنج و زحمت کی آمیزش ہو، اس طرف توجہ رکھتے ہوئے کہ اس کے مخاطب تمام انسان ہیں، اس واقعیت کو پیش کرتی ہے کہ اس جہان کی زندگی کی طبیعت کسی مرحلہ میں بھی مشکلات، تکالیف اور رنج و مشقت سے خالی نہیں ہے۔

چاہے یہ مشکلات و تکالیف جسمانی ہوں چاہے روحانی اور فکری یا دونوں کسی فرد کو اس سے مفر نہیں ہے حضرت علیؑ ابن الحسینؑ کی ایک بہت ہی پُر معنی حدیث ہے: (الراحۃ لم تخلق فی الدنیا ولا لاھل الدنیا انما خلقت الراحۃ فی الجنۃ ولاھل الجنۃ والتعب والنصب خلقا فی الدنیا ولاھل الدنیا وما اعطی احد منها جفنۃ الا اعطی من الحرص مثلیھا ومن اصاب من الدنیا اکثر کان فیھا اشد فقرًا لانہ یفتقر الی الناس فی حفظ اموالہ و تفتقر الی کل اٰلۃ من اٰلات الدنیا فلیس فی غنی الدنیا الراحۃ) راحت و آرام دنیا میں اہل دنیا کے لیے نہیں ہے راحت و آسائش صرف جنت میں ہے اور اہل جنت کے لیے ہے۔ رنج و تعب دنیا میں ہیں اور اہلِ دنیا کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اسی وجہ سے جو ایک پیمانہ اس میں سے حاصل کر لیتا ہے تو دُگنا لالچ اس کے نصیب میں شامل ہو جاتا ہے اور جس کے پاس مالِ دنیا کافی ہے وہ زیادہ فقیر ہے کیونکہ وہ اپنے مال کی حفاظت کے سلسلہ میں دوسروں کا محتاج ہے اور زیادہ وسائلِ حفاظت کا محتاج ہے لہٰذا دنیا کے مال و دولت میں کوئی راحت و آرام نہیں ہے۔

اس کے بعد امامؑ نے اس حدیث کے ذیل میں فرمایا: (کلا ما تعب اولیاء اللہ فی الدنیا للدنیا بل تعبوا فی الدنیا للاٰخرۃ) اولیائے خدا دنیا میں دنیا کی خاطر رنج و تعب میں نہیں مبتلا ہوتے بلکہ دنیا میں ان کا رنج و تعب آخرت کے لیے ہے[1]

---

[1] خصال صدوق جلد ۱ باب الدنیا والاخرۃ کلفق المیزان، حدیث ۹۵۔

(۱۰) وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۙ

(۱۱) فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۙ

(۱۲) وَّ یَصْلٰى سَعِیْرًا ؕ

(۱۳) اِنَّهٗ كَانَ فِیْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ

(۱۴) اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ ۚۛ

(۱۵) بَلٰۤى ۚۛ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِیْرًا ؕ

ترجمہ

(۱۰) اور رہا وہ شخص جس کو اس کا نامۂ اعمال اس کے پیچھے کی طرف سے دیا گیا۔

(۱۱) تو عنقریب اس کی فریاد بلند ہوگی کہ وائے ہو مجھ پر میں ہلاک ہو گیا۔

(۱۲) اور وہ جہنم کی آگ کے جلانے والے شعلوں میں جلے گا۔

(۱۳) وہ اپنے گھر والوں کے درمیان (کفر و گناہ کے سبب) مسرور تھا۔

(۱۴) وہ گمان کرتا تھا کہ کبھی پلٹ کر نہیں آئے گا۔

(۱۵) جی ہاں! اس کا پروردگار اس کے مقابلہ میں بینا تھا۔

تفسیر

وہ جو شرم و حیا کے باعث اپنا نامۂ اعمال پشت کی طرف سے لیں گے

اس بحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں اصحاب الیمین (وہ مومنین جن کا نامہ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا) کے بارے میں گزر چکی ہے، ان آیات میں کفار مجرمین اور ان کے نامۂ اعمال کی کیفیت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"باقی رہا وہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کی پشت کی طرف سے دیا جائے گا" (و اما من اوتی کتابہ وراء ظھرہ)۔ عنقریب وہ فریاد کرے گا کہ وائے ہو مجھ پر کہ میں ہلاک ہو گیا (فسوف یدعوا ثبورًا)۔ "اور آگ کے جلانے والے شعلوں میں جلے گا" (و یصلی سعیرًا)۔

یہ کہ ان کے نامہ اعمال کس طرح ان کے پس پشت سے دیں گے اور کس طرح یہ آیت اور وہ آیات جو کہتی ہیں کہ ان کے بائیں ہاتھ میں دیں گے، ایک جگہ جمع ہوں گی؛ اس سلسلہ میں مفسرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں بعض نے کہا ہے کہ ان کے دائیں ہاتھ گردن کے ساتھ زنجیر سے بندھے ہوں گے اور ان کے نامہ ہائے اعمال بائیں ہاتھ اور پشت کے پیچھے سے ملیں گے جو ذلت و خواری سر نیچے رکھنے اور شرمساری کی علامت ہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ ان کے دونوں ہاتھ قیدیوں کی طرح پیچھے باندھ دیئے جائیں گے بعض دوسروں نے کہا ہے کہ سورہ نساء کی آیت ۴۷ کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو کہتی ہے: (من قبل ان نطمس وجوھًا فنردھا علیٰ ادبارھا)۔ "اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو مٹا دیں اور پشت کی طرف پھیر دیں"؛ اس طرح گروہ مجرمین کے منہ عقب کی جانب مڑ جائیں گے اور ضروری ہے کہ وہ اپنے نامہ ہائے اعمال خود پڑھیں۔ لہٰذا وہ ان کے بائیں ہاتھ میں پشت کی جانب انہیں دیں گے۔

لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ کہا جائے کہ اصحاب الیمین سرفرازی اور فخر و مباہات کے ساتھ اپنا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں لیے ہوئے پکار کر کہیں گے (ھاؤم اقرءوا کتابیہ) "اے اہل محشر آؤ اور میرا نامہ اعمال لے کر پڑھو" (حاقہ ۔ ۱۹)۔ لیکن جب گنہگاروں کو ان کا نامہ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیں گے تو وہ شرمساری اور ذلت سے اپنا ہاتھ پشت کے پیچھے کر لیں گے تاکہ جرم کی سند کم تر دیکھی جائے۔

لیکن فائدہ کچھ نہیں ہوگا اس لیے کہ وہاں کوئی چیز پوشیدہ رہنے والی نہیں ہے۔ (یدعوا ثبورًا)، اس تعبیر کی طرف اشارہ ہے جو عرب کسی خطرناک حادثہ کے موقعہ پر کرتے ہیں اور فریاد بلند کرتے ہیں (وا ثبورا)، یعنی اے وائے کہ میں ہلاک ہو گیا۔

توجہ فرمائیں کہ "ثبور" ہلاکت کے معنی میں ہے۔ لیکن یہ آہ و نالہ و فریاد کسی کے کان تک نہیں پہنچے گی۔ اس کے بعد (و یصلی سعیرًا) ہے یعنی وہ جہنم کی جلانے والی آگ میں داخل ہوگا۔ اس کے بعد اس منحوس سرنوشت کی علت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"یہ اس بنا پر ہے کہ وہ اپنے گھر والوں میں ہمیشہ اپنے (کفر و گناہ کی وجہ سے) خوش رہتا تھا (انہ کان فی اھلہ مسرورًا)، ایسا سرور جس میں غرور کی آمیزش تھی اور ایسا غرور جو غفلت اور خدا سے بے خبری کو اپنے ساتھ لیے ہوئے تھا، ایسا غرور جو دنیا کے ساتھ شدید دلبستگی اور موت کے

بعد والے جہان سے بے پرواہی کی نشانی تھا۔

واضح رہے کہ ذاتی طور پر سرور وخوشحالی مذموم چیز نہیں ہے بلکہ مومن کو چاہیئے کہ لطفِ خدا سے مسرور ہو اور رہنے سہنے کے انداز میں ہشاش بشاش ہو۔ وہ سرور وخوشی مذموم ہے جو انسان کو یادِ خدا سے غافل کر دے اور خواہشات کا اسیر بنا کر رکھ دے۔

اس لیے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "یہ اس بنا پر ہے کہ وہ گمان کرتا تھا کہ کبھی واپس نہیں لوٹے گا اور معاد و قیامت کا کوئی امکان نہیں ہے" (انہ ظن ان لن یحور)۔ حقیقت میں اس کی بدبختی کا سبب اصلی اس کا اعتقادِ فاسد اور گمانِ باطل تھا، جس کا دارو مدار انکارِ قیامت پر تھا۔ یہی اعتقاد اس کے غرور و سرور کا باعث ہوا۔ اس نے اس کو خدا سے دور کیا اور خواہشات کا اسیر بنا کر رکھ دیا۔ یہاں تک کہ وہ انبیاء کی دعوتِ فکر کا مذاق اڑاتا اور جب اپنے گھر والوں کے پاس آتا تو اس مذاق سے خوش ہوتا۔

یہی مفہوم سورہ مطففین کی آیت ۳۱ (واذا انقلبوا الیٰ اھلھم انقلبوا فکھین) میں بھی آیا ہے۔ اسی طرح قارون، اس مغرور دولت مند اور خدا سے بے خبر انسان کی داستان میں بیان ہوا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے باخبر افراد اس سے کہتے تھے (لا تفرح ان اللہ لا یحب الفرحین) اس قدر متکبرانہ طور پر خوش نہ ہو کیونکہ خدا خوش ہونے والے مغروروں کو دوست نہیں رکھتا (قصص-۷۶)

"لن یحور" کبھی واپس نہیں لوٹے گا۔ "یحور" "حور" (بروزن غور) کے مادہ سے تردد اور آمد و رفت کے معنی میں ہے، خواہ یہ آمد و رفت عمل میں ہو یا فکر و نظر میں۔ اسی لیے پانی کے حوض اور تالاب میں گردش کرنے کے سلسلہ میں اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے اور محور اس لٹھ کو کہتے ہیں جس کے گرد چرخہ گھومتا ہے۔ محاورہ بحث کی آمد و رفت اور ردّ و بدل کے معنی سے ہے اور "حوار" بھی انہی معانی میں ہے اور کبھی اس واد کے معنی میں بھی آتا ہے جو بحث کے دوران بلند ہوتی ہے اور تحیر بھی کسی مسئلہ میں فکر کی آمد و رفت کا نتیجہ ہے جس کا لازمہ عمل میں سرگردانی ہے۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس لفظ کی اصل حبشی ہے۔ اور ابن عباس سے نقل ہوا ہے کہ میں قرآن کے اس جملے کے معنی نہیں جانتا تھا، یہاں تک کہ ایک بیابانی عرب سے میں نے سنا کہ وہ اپنی لڑکی سے کہہ رہا تھا، حوری، یعنی واپس آجا۔[1]

حواری کی تعبیر حضرت عیسیٰؑ کے نزدیک رہنے والوں کے بارے میں ہے، یا ہر شخص کے قریب بیٹھنے والوں کے متعلق بھی شاید اسی مناسب سے ہے کہ وہ اس کے پاس آمد و رفت رکھتے ہیں۔ بعض نے

---

[1] مفردات راغب، تفسیر فخر رازی، ابوالفتوح اور دوسری کتب۔

اسے "حور" کے مادہ سے دھونے اور سفید کرنے کے معنی میں سمجھا ہے کیونکہ وہ لوگوں کے دلوں کو شرک و گناہ کے زنگ سے پاک و صاف کرتے تھے اور جنت کی حوروں کو اسی لیے یہ نام دیا گیا ہے کہ ان کا رنگ سفید ہے، یا ان کی آنکھوں کی سفیدی بہت زیادہ ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ لفظ جنت کی حوروں کے لیے اس لیے بولا جاتا ہے کہ وہ اس قدر خوبصورت ہیں کہ آنکھ انہیں دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ لیکن بہرحال یہ لفظ زیرِ بحث آیت میں بازگشت اور معاد کے معنی میں ہے۔

یہ آیت ضمنی طور پر یہ بھی بتاتی ہے کہ قیامت پر ایمان نہ رکھنا، غفلت، غرور اور انواع و اقسام کے گناہوں میں آلودہ ہونے کا سرچشمہ ہے اور آخری زیرِ بحث آیت میں ان کے باطل عقائد کی نفی میں فرماتا ہے:

"جی ہاں! اس کا پروردگار اس کے بارے میں بینا تھا" (بلیٰ ان ربه کان به بصیرًا)۔ اس نے تمام اعمال کو لکھوایا اور روزِ حساب کے لیے ایک نامۂ اعمال میں انہیں محفوظ کیا۔ اس آیت کی تعبیر گزشتہ آیت (یا ایها الانسان انك كادح الٰى ربك كدحًا فملاقیه) کی مانند عقیدہ و معاد پر دلیل و حجت شمار ہو سکتی ہے۔

خصوصاً دونوں آیات میں رب یعنی پروردگار کے عنوان پر انحصار ہوا ہے، اس لیے کہ انسان کی سیرِ ارتقا یعنی پروردگار تک پہنچنے کا عمل موت کے آنے پر منقطع نہیں ہوتا اور دنیاوی زندگی ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ خود مقصودِ تکامل ہو نیز انسان کے اعمال کے بارے میں خدا کا بصیر ہونا اور ان اعمال کو تحریر کیا جانا حساب و سزا و جزا کی تمہید ہی بن سکتا ہے، ورنہ فضول ہے۔

(۱۶) فَلَآ اُقۡسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ

(۱۷) وَالَّيۡلِ وَمَا وَسَقَ ۙ

(۱۸) وَالۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۙ

(۱۹) لَتَرۡكَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ؕ

(۲۰) فَمَا لَهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ۙ

(۲۱) وَاِذَا قُرِئَ عَلَيۡهِمُ الۡقُرۡاٰنُ لَا يَسۡجُدُوۡنَ ۛؕ السجدۃ

(۲۲) بَلِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يُكَذِّبُوۡنَ ۖ

(۲۳) وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا يُوۡعُوۡنَ ۖ

(۲۴) فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ۙ

(۲۵) اِلَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ اَجۡرٌ غَيۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ۧ

ترجمہ

(۱۶) شفق کی قسم۔

(۱۷) اور رات کی قسم اور جسے وہ جمع کرتی ہے۔

(۱۸) اور قسم ہے چاند کی جبکہ وہ بدرِ کامل ہوتا ہے۔

(۱۹) تم سب ہمیشہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوتے ہو۔

(۲۰) پس وہ کیوں ایمان نہیں لاتے؟

(۲۱) اور جب قرآن ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے۔

(۲۲) بلکہ کفار ہمیشہ آیاتِ الٰہی کی تکذیب کرتے ہیں۔

(۲۳) خدا اس چیز کو جسے وہ دل میں چھپائے رکھتے ہیں، اچھی طرح جانتا ہے۔

(۲۴) پس انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے۔

(۲۵) مگر وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور انہوں نے اعمالِ صالح انجام دیئے ہیں تو ان کے لیے ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔

تفسیر

تم ہمیشہ دگرگوں ہوتے رہتے ہو

اس بحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں خدا کی طرف سے انسان کی سیرِ تکامل کے بارے میں آئی تھی ان آیات میں اس مفہوم کی تاکید اور مزید توضیح کے لیے فرماتا ہے:

"قسم ہے شفق کی" (فلا اقسم بالشفق)۔ اور قسم ہے ان پراگندہ امور کی جنہیں وہ اکٹھا کرتی ہے (واللیل وما وسق)۔ اور قسم ہے چاند کی جبکہ وہ کامل ہوتا ہے اور چودھویں کے چاند کی صورت اختیار کرلیتا ہے (والقمر اذا اتسق)، کہ تم سب ہمیشہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوتے ہو (لترکبن طبقًا عن طبق)۔

فلا اقسم کے جملے میں لا کا لفظ، جیسا کہ پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے، زائد ہے اور تاکید کے لیے ہے۔ اگرچہ بعض کا خیال ہے کہ نفی کے لیے ہو یعنی مَیں قسم نہیں کھاتا اس بنا پر کہ مفہوم عیاں ہے، قسم کی ضرورت نہیں ہے یا یہ کہ مطلب اس قدر اہم ہے کہ ان قسموں کی ضرورت نہیں ہے یا یہ کہ یہ امور جن کی قسم کھائی گئی ہے اس قدر اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ اس لائق نہیں ہیں کہ ان کی قسم کھائی جائے لیکن پہلے معنی (زائد اور تاکید کے لیے ہونا) زیادہ مناسب ہیں۔

"شفق" مفردات میں راغب کے بقول دن کی روشنی کا رات کی تاریکی سے آمیختہ ہونا ہے اس لیے لفظ اشفاق اس توجہ اور عنایت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس میں خوف کا عنصر پایا جاتا ہو۔ مثلاً اگر کوئی فرد کسی شخص کے لیے محبت کے جذبات رکھتا ہو اور اس کے بارے میں کچھ حوادث سے ڈرتا ہو تو اس حالت کو اشفاق اور ایسے شخص کو مشفق کہتے ہیں۔

لیکن فخر رازی کا نظریہ ہے کہ شفق کا لفظ اصل میں رقت اور نازک ہونے کے معنی میں ہے، رقت

کے معنی پتلا ہونا ہے اسی لیے بہت ہی نازک اور پتلے لباس کو شفق کہتے ہیں اور شفقت کا لفظ رقتِ قلب کی حالت کے لیے بولا جاتا ہے (لیکن راغب کا قول زیادہ صحیح نظر آتا ہے)۔

بہر حال شفق سے مراد وہی روشنی ہے جو آغازِ شب کی تاریکی کی آمیزش رکھتی ہو اور چونکہ ابتدائے شب میں ایک کم رنگ کی سرخی افقِ مغرب پر پیدا ہوتی ہے اور پھر اس کی جگہ سفیدی لے لیتی ہے تو اس میں اختلاف ہے کہ شفق کا اطلاق اس سرخی پر ہے یا سفیدی پر۔

علماء مفسرین کے درمیان مشہور و معروف وہ پہلے ہی معنی ہیں اور اشعارِ عرب میں بھی اسی پر انحصار کیا گیا ہے اور شفق کو شہیدوں کے خون سے تشبیہ دیتے ہیں اور (دماء الشھداء) کہتے ہیں۔

لیکن بعض مفسرین نے دوسرے معنی کو منتخب کیا ہے جو بہت ضعیف نظر آتے ہیں خصوصاً یہ کہ اگر اس کی لغوی اصل کے معنی ہم رقت سمجھیں تو پھر اس کم رنگ کی سرخی سے مناسبت رکھتے ہیں جو سورج کی رقیق اور پتلی روشنی اور نور ہے۔

بہر حال چونکہ شفق کا ظہور دنیا میں ایک گہری تبدیلی اور دگر گونی کی حالت کی خبر دیتا ہے اور دن کے اختتام اور رات کے آغاز کا اعلان کرتا ہے، اس کے علاوہ اس میں ایک خاص قسم کا جلوۂ زیبائی اور خوبصورتی ہے، اور ان سب سے قطع نظر نمازِ مغرب کا وقت ہے لہٰذا خدا نے نمازِ مغرب کے وقت کی قسم کھائی ہے تاکہ سب لوگوں کو خبردار اور آمادہ کرے کہ وہ اس خوبصورت آسمانی وجود کے بارے میں غور و فکر کریں۔

باقی رہا رات کی قسم کھانا تو وہ ان بہت سے آثار و اسرار کی بنا پر ہے جو اس میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس پر ہم پہلے مفصّل گفتگو کر چکے ہیں [1]

"ما وسق" کی تعبیر [2] اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "وسق" بکھری ہوئی چیزوں کے جمع کرنے کے معنی میں ہے [3] اور مختلف قسم کے جانوروں، پرندوں یہاں تک کہ انسانوں کے اپنے گھروں، آشیانوں اور گھونسلوں کی طرف رات کے وقت لوٹنے کی طرف اشارہ ہے جس کا نتیجہ جانوروں کا عمومی آرام و سکون اور آسائش ہے اور یہ رات کے اہم آثار و اسرار میں سے ایک شمار ہوتا ہے جیسا کہ سورۂ مؤمن کی

---

[1] تفسیر نمونہ، جلد ۹ ص ۱۴۳ سورہ قصص کی آیت ۱۷ تا ۷۳، سے رجوع فرمائیں۔

[2] "ما وسق" میں ما موصولہ ہے اور اس کے مصدریہ ہونے کا احتمال ضعیف ہے اور اس کی طرف لوٹنے والی ضمیر بھی محذوف ہے اور تقدیر میں "وما وسقه" ہے۔

[3] "وسق" (بروزن غضب) اونٹ کے ایک بار یا ساٹھ صاع جس کا ہر صاع تقریباً تین کلو ہے کے معنی میں آیا ہے اور وہ بھی ان سب کے مجتمع ہونے کے معنی میں ہے۔

آیت ۶۱ میں ہم پڑھتے ہیں (اللہ الذی جعل لکم اللیل لتسکنوا فیہ) ، خدا وہ ہے جس نے رات کو تمہارے لیے خلق کیا ہے تاکہ تم اس میں آرام و سکون حاصل کرو۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اذا اتسق کی تعبیر اسی مادہ سے ہے اور مختلف وجودوں کے جمع ہونے کے معنی میں ہے اور یہاں چودھویں رات کے چاند کی روشنی کے کمال کے معنی میں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ چاند اس حالت میں بہت ہی خوبصورت لگتا ہے اور ہر دیکھنے والی آنکھ کو دل کش نظر آتا ہے۔ اس کا نور صفحۂ زمین کو روشن کرتا ہے۔ اس کے ہلکے رنگ کی روشنی جو رات کے آرام و سکون کو خراب نہیں کرتی ، رات کے مسافروں کو راستہ دکھاتی ہے اسی لیے وہ خدا کی عظیم آیات میں سے ایک آیت ہے۔ اسی بنا پر اس کی قسم کھائی گئی ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ چاروں موضوعات جن کی ان آیات میں قسم کھائی گئی ہے (شفق، رات اور وہ موجودات جنہیں رات جمع کرتی ہے اور چودھویں رات کا چاند)۔

یہ سب ایسے ہیں جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور ایک ایسے خوبصورت مجموعہ کو تشکیل دیتے ہیں جو انسانی فکر میں تحریک پیدا کرتا ہے تاکہ وہ تخلیق کی عظیم قوت پر غور و فکر کرے اور ان تیز تبدیلیوں سے وقوعِ قیامت اور قدرتِ خدا کے بارے میں آشنائی حاصل کرے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مختلف امور کا یہ حصہ ایسے حالات اور تبدیلیوں کی طرف اشارہ ہے جو عالمِ آفرینش میں ایک دوسرے کے ساتھ رونما ہوتی ہیں۔

سورج چہرہ پر نقاب ڈالتا ہے تو شفق ظاہر ہو جاتی ہے جو اس کے نور کا بقیہ ہے۔ انسان، پرند، چرند بڑی تیزی سے اپنے ٹھکانوں اور آشیانوں کی طرف لوٹتے ہیں اور چاند بدرِ کامل کی شکل میں بلند ہوتا ہے۔

توجہ فرمائیں کہ چودھویں کا چاند رات کے اسی ابتدائی حصے میں طلوع ہوتا ہے اور ان قسموں کو "لترکبن طبقًا عن طبق" کے اس جملے کی تمہید قرار دیتا ہے جو مختلف ایسے حالات کو بیان کرتا ہے جو انسان اپنی راہ حیات میں یکے بعد دیگرے پیدا کرتا ہے۔ اس جملے کے لیے مفسرین نے مختلف تعبیریں بیان کی ہیں جن میں ایک یہ بھی ہے۔

۱۔ مراد وہ گوناں گوں حالات ہیں جو انسان، خدا اور کمالِ مطلق کی جانب سفر کرنے کے پُر مشقت راستے میں پیدا کرتا ہے۔ پہلے عالمِ دنیا ہے پھر عالمِ برزخ ہے اور پھر قیامت اور اس کے مختلف حالات ہیں۔ (توجہ فرمائیں کہ "طبق" "مطابقہ" کے مادہ سے ایک چیز کو دوسری چیز کے اوپر قرار دینے کے معنی میں ہے اور ان منزلوں کے معنی میں ہے جنہیں انسان اپنی سیرِ صعودی میں طے کرتا ہے)۔

۲۔ مراد وہ حالات ہیں جنہیں انسان کو نطفہ سے لے کر موت تک کے سفر میں سامنا کرنا ہوتا ہے۔

بعض محققین نے ایسی ۳۰ حالتیں شمار کی ہیں۔

۳۔ مراد وہ مختلف حالات و شدائد ہیں جن سے انسان دنیاوی زندگی میں صحت و بیماری غم واندوہ سرور و مسرت، سختی و آرام اور صلح و جنگ کی صورت میں دوچار ہوتا ہے۔

۴۔ مراد وہ مختلف حالات و شدائد ہیں جن سے انسان قیامت میں دوچار ہوگا یہاں تک کہ حساب سے فارغ ہو کر ہر شخص اپنے اعمال کے نتیجے میں دوزخ اور جنت کی طرف جائے گا۔

۵۔ مراد وہ حالات ہیں جو گزشتہ قوموں کو پیش آئے یعنی وہی تلخ و شیریں حوادث اور انواع و اقسام کی تردیدیں اور مخالفین کے انکار اس امت میں بھی واقع ہوں گے۔ یہ مضامین ایک روایت میں امام جعفر صادقؑ سے بھی نقل ہوتے ہیں۔

ان تفسیروں کا جمع ہونا بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہوسکتا ہے کہ آیت ان تمام تبدیلیوں، تغیّرات اور مراحل کی طرف اشارہ کر رہی ہو جنہیں انسان اپنی زندگی میں دیکھتا ہے۔ بعض مفسرین یہاں مخاطب خود پیغمبرؐ کو سمجھتے ہیں اور آیت کو ان آسمانوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جن سے پیغمبر اسلامؐ معراج کی شب گزرے ہیں۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "لترکبن" میں جو "ب" ہے اس پر پیش ہے اور جمع کے معنی دیتا ہے اس لیے یہ تفسیر مناسب ہے خصوصاً یہ کہ گزشتہ آیات میں بھی مخاطب کُل انسان تھے۔

بہرحال ان حالات کا حدوث اور آدمی کا ایک حالت پر قیام نہ کرنا، ایک تو اس کے مخلوق ہونے اور محتاجِ خالق ہونے کی دلیل ہے اس لیے کہ ہر متغیر حادث ہے اور ہر حادث کو خالق کی ضرورت ہے، دوسرے اس جہان کے ناپائیدار ہونے کی دلیل ہے۔

تیسرے انسان کی پروردگارِ عالم کی طرف حرکتِ مستمر مسئلہ معاد و قیامت کی نشانی ہے جیسا کہ گزشتہ آیات میں آیا تھا (یا ایھا الانسان انک کادح الی ربک کدحاً فملاقیہ)

اس کے بعد گزشتہ مباحث سے ایک نتیجۂ کلی اخذ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ ایمان کیوں نہیں لاتے" (فما لھم لا یؤمنون)، اس کے باوجود کہ حق کے دلائل واضح و آشکار ہیں، توحید و خداشناسی کے بھی اور معاد و قیامت کے بھی۔

آیاتِ آفاقی بھی جو رات دن کی خلقت اور چاند سورج، نور و ظلمت، طلوع و غروب آفتاب، شفق، رات کی روشنی اور رات کی روشنی کے تکامل میں چھپے ہوئے ہیں۔ اور آیات انفسی بھی ۔۔ اس لمحے سے لے کر جب انسان کا نطفہ رحم میں قرار پاتا ہے اور یکے بعد دیگرے مختلف مراحل طے کرتا ہے یہاں تک کہ عالمِ جنین میں اپنے اوجِ کمال کو پہنچتا ہے اس کے بعد ولادت کے لمحے سے لے کر موت تک دوسرے مراحل طے کرتا ہے تو ان واضح نشانیوں کے باوجود نوعِ بشر ایمان کیوں نہیں لاتی۔

اس کے بعد کتابِ تکوین سے کتابِ حق کی طرف رُخ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو یہ خضوع اختیار کیوں نہیں کرتے"۔ (واذا قرئ علیھم القراٰن لا یسجدون)۔

قرآن جو آفتاب کے مانند اپنی دلیل آپ ہے، نورِ اعجاز اس کے مختلف پہلوؤں سے عیاں ہے، پھر اس کے مضامین و مشمولات یہ سب اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اسے وحی کے سرچشمہ سے لیا گیا ہے۔

قرآن کے بارے میں ہر غیر جانبدار یہ جانتا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ قرآن کسی انسان کے دماغ کی تخلیق ہو۔ پھر انسان بھی ایسا جس نے کبھی کوئی سبق نہ پڑھا ہو اور ایک ایسے ماحول میں اس نے زندگی بسر کی ہو جو خرافات و ظلمات سے پُر ہو۔ یہاں سجدہ سے مراد خضوع تسلیم اور اطاعت ہے[1]

اور وہ مشہور سجدہ جس میں پیشانی کو زمین پر رکھتے ہیں اس مفہوم کلی کا ایک مصداق ہے۔ اور شاید اسی بنا پر بعض روایات میں آیا ہے کہ جب پیغمبرؐ نے ان آیات کی تلاوت فرمائی تو سجدہ کیا۔

البتہ فقہائے اہلبیت کے مشہور فتوے کے مطابق یہ سجدہ قرآن کے مستحب سجدوں میں سے ہے اور اہل تسنن کے چاروں مذاہب اس آیت کی تلاوت کے وقت سجدہ کرنا واجب سمجھتے ہیں سوائے امام مالک کے جن کا نظریہ ہے کہ سورہ کے ختم ہونے کے بعد سجدہ کرنا چاہیئے[2]

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "بلکہ کفار ہمیشہ آیاتِ الٰہی اور معاد و قیامت کی تکذیب کرتے ہیں" (بل الذین کفروا یکذبون)۔ یہاں فعل مضارع کا استعمال جو عام طور پر استمرار کے لیے ہوتا ہے، ان معانی کا گواہ ہے کہ وہ اپنی تکذیب پر مُصر تھے اور یہ ایسا اصرار تھا جو محض ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے تھا ان کی تکذیب ایسی نہیں تھی کہ انہیں اس کے لیے دلیلیں نہیں مل سکی تھیں، بلکہ تعصب، اندھی تقلید، مادی منفعتوں کی حفاظت اور شیطانی خواہشات کی تسکین کے لیے تھی۔

اس کے بعد تہدید آمیز لہجے میں فرماتا ہے: "خدا اسے اچھی طرح جانتا ہے جسے وہ اپنے دل کے اندر پنہاں رکھتے ہیں" (واللہ اعلم بما یوعون)۔ خدا ان کی نیتوں، مقاصد اور ایسی ترغیبات سے، جو مسلسل تکذیبوں کا سبب بنتی ہیں، باخبر ہے۔ وہ چاہے کتنی ہی پردہ پوشی کیوں نہ کریں، انجام کار انہیں

---

[1] ان معانی کے شواہد میں سے گزشتہ اور آئندہ آیات کی شہادت کے علاوہ ایک یہ ہے کہ سجدہ جس کے معنی تلاوتِ قرآن کے وقت زمین پر پیشانی رکھنا ہے سوائے چند آیات کے نہ واجب ہے نہ مستحب، اس لیے یہ جو کہہ رہا ہے کہ قرأتِ قرآن کے وقت وہ سجدہ کیوں نہیں کرتے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سجدہ سے مراد سارے قرآن کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔

[2] روح البیان، جلد ۱ ص ۱۳۸۲۔

اس کی سزا ملے گی۔

"یوعون" "وعاء" کے مادہ سے ظرف اور برتن کے معنی میں ہے، جیساکہ حضرت علیؑ کی مشہور عبارت سے نہج البلاغہ میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

(ان ھذہ القلوب اوعیۃ فخیرھا اوعاھا) یہ دل ظروف ہیں اور ان میں سے بہترین دل وہی ہے جس کی حفاظت اور ظرفیت زیادہ ہو۔

بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "پس انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے"۔ (فبشرھم بعذاب الیم)۔ بشارت کی تعبیر جو عام طور پر خوشخبری کے لیے استعمال ہوتی ہے یہاں ایک قسم کے طعن اور سرزنش کے طور پر ہے۔

درحقیقت وہ اس طرح مومنین کو جنت کی وسیع نعمتوں کی بشارت دیتا ہے تاکہ تکذیب کرنے والے دوزخی حسرت واندوہ میں ڈوب جائیں۔ اس سورہ کی آخری آیت میں ایک استثناء کی شکل میں ایک مرتبہ پھر نیک عمل مومنین کی سرنوشت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمالِ صالح انجام دیئے، ان کے لیے اجر وثواب ہے، ایسا اجر جو ثابت شدہ اور منقطع نہ ہونے والا اور ہر قسم کے نقصان سے محفوظ ہے"۔ (الا الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات لھم اجر غیر ممنون)۔

"ممنون" "من" کے مادہ سے نقصان وانقطاع کے معنی میں آیا ہے اور منت کے معنوں میں بھی۔ (لفظ منون جو موت کے معنوں میں ہے وہ بھی اسی مادہ سے ہے) اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سب معانی یہاں جمع ہوں، اس لیے کہ آخرت کی نعمتیں دنیاوی نعمتوں کے برعکس، جو ناپائیدار اور نقصان پذیر بھی ہیں اور عام طور پر غیر مطلوب عوارض کی آمیزش رکھتی ہیں، کسی قسم کی منت، نقصان، فنا اور غیر مطلوب عوارض نہیں رکھتیں۔ وہ جاودانی ہیں، نقصان ناپذیر ہیں اور ہر قسم کے نامناسب امور اور منت واحسان سے مبرا ہیں۔ یہ استثناء متصل ہے یا منقطع، مفسرین کے درمیان اس میں اختلاف ہے۔

بعض نے یہ احتمال تجویز کیا ہے کہ استثنائے منقطع ہے یعنی کفار کے حالات کی تشریح جو گزشتہ آیات میں تھی اس کو چھوڑ کر مومنین کے جاودانی اجر کی بات کرتا ہے لیکن زیادہ مناسب یہی ہے کہ استثناء متصل ہو اور مقصد یہ ہو کہ کفار کے سامنے بازگشت کی راہ کھولے اور انہیں یہ بتائے کہ جو لوگ توبہ کرکے ایمان لے آئیں اور اعمالِ صالح انجام دیں، ان سے عذابِ دائمی اٹھا لیا جائے گا اور انہیں ایسا اجر دیا جائے گا جو دائمی ہوگا اور جس میں نقصان کا کوئی پہلو نہ ہوگا۔

ایک نکتہ

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں اس سورہ کی آخری آیات سے پہلے تو اختیار اور ارادہ کی آزادی کی

اصل کا فائدہ اٹھاتے ہیں، اس لیے کہ مجبور افراد کے بارے میں ترکِ سجدہ اور ترکِ ایمان پر ملامت کرنا خداوند حکیم کے لیے ایک امر قبیح ہے اور وہ جو یہ فرماتا ہے: (فما لھم لا یؤمنون و اذا قرئ علیھم القراٰن لا یسجدون) مسئلہ اختیار پر واضح دلیل ہے۔ اور پھر ترکِ سجدہ پر ملامت کرنا اس امر کا ثبوت ہے کہ کفار جس طرح اصولِ دین کے مکلف ہیں اسی طرح فروعِ دین کے بھی مکلف ہیں۔ (یہ گفتگو اس صورت میں ہے جب لفظِ سجدہ مذکورہ بالا آیت میں نماز والے سجدے کے معنی میں ہو، یا کم از کم وسیع معانی رکھتا ہو جس میں سجدۂ نماز بھی شامل ہے)۔

خداوندا! جس دن سب لوگ تیری دادگاہِ عدل میں حاضر ہوں گے ہم پر حساب آسان کر دیجو۔

پروردگارا! اس راہ میں جہاں تمام بندے تیری طرف سفر کرتے ہیں صراطِ مستقیم طے کرنے میں ہماری مدد فرما۔

بارالٰہا! ہم تیرے قرآن کریم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوتے ہیں ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق مرحمت فرما۔

آمین یارب العالمین

اختتام سورۂ انشقاق۔

سورۂ بروج

یہ سورہ مکے میں نازل ہوا
اس میں ۲۲ آیتیں ہیں

سورہ بروج کے مضامین اور اس کی فضیلت

ابتدائے بعثت کے زمانے میں مومنین (مکہ میں) بہت سخت رنج و تکلیف اور دباؤ کی حالت میں تھے اور ہمیشہ دشمنوں کی طرف سے جسمانی اور روحانی اذیتوں میں گرفتار رہتے تھے اور یہ اس وجہ سے تھا کہ وہ راہ ایمان کو خیر باد کہہ دیں۔

اس سلسلہ میں ایک گروہ نے صورتِ حال کا مقابلہ کیا لیکن بعض کمزور افراد دشمنوں کے مقابلہ میں شکستہ دل ہو کر راہ ایمان سے پلٹ گئے۔ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکی ہے یوں نظر آتا ہے کہ اس کا مقصدِ اصلی مومنین کے قلب و روح میں تقویت پیدا کرنا ہے۔ یہ سورہ ان مومنین کو پامردی اور استقامت کا شوق دلاتا ہے۔

اس صورتِ حال کے حوالے سے پروردگارِ عالم اس سورہ میں اصحاب اخدود کے واقعہ کو نقل کرتا ہے؛ وہی لوگ جنہوں نے خندق کھودی، اس میں بہت زیادہ آگ جلائی اور مومنین کو اس آگ میں جلانے کی دھمکی دی اور ایک گروہ کو اس آگ میں جلایا لیکن انہوں نے راہ ایمان کو خیر باد نہیں کہا۔ پھر اس سورہ کے دوسرے حصہ میں ان کافروں کو تنبیہ کرتا ہے جنہوں نے مومنین پر دباؤ ڈال رکھا تھا اور انہیں جہنم کے جلانے والے عذاب کی خبر دیتا ہے جبکہ جنت کے پُرنعمت باغات کی مومنین کو بشارت دیتا ہے۔

بعد والے حصہ میں انہیں گزشتہ تاریخ کی طرف لے جاتا ہے اور فرعون و ثمود اور دیگر ظالم اقوام کی داستانیں ان کی نگاہوں کے سامنے مجسم کر کے پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ عذابِ الٰہی نے انہیں کس طرح نابود کر دیا، تاکہ کفارِ مکہ جو ان کی نسبت بہت کمزور تھے اپنا اندازہ لگالیں نیز یہ کہ یہ صورتِ حال پیغمبرؐ اور مومنین کے دلوں کی تسلی کا سبب بھی ہو۔

اس سورہ کے آخری حصہ میں قرآن مجید کی عظمت اور وحیِ الٰہی کی سب سے زیادہ اہمیت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اسی مفہوم پر سورہ کو ختم کرتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ سورہ مومنین کو ظالموں کے مقابلہ میں پامردی، استقامت اور صبر و شکیبائی کا درس دیتا ہے۔ اس کی آیتوں کے اندر نصرتِ الٰہی کا وعدہ بھی چھپا ہوا ہے۔ اس سورہ کا جو بروج نام رکھا گیا ہے وہ اس لفظ کی وجہ سے ہے جو اس کی پہلی آیت میں آیا ہے۔

اس سورہ کی فضیلت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ پیغمبرؐ اسلام کی ایک حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ:

(من قرأ هٰذه السورة اعطاه الله من الاجر بعدد كل من اجتمع فى جمعة وكل من اجتمع فى يوم عرفة عشر حسنات و قراءتها تنجى من المخاوف والشدائد)

"جو شخص اس سورہ کو پڑھے تو خداوندِ عالم اسے ان افراد کی تعداد سے جو نمازِ جمعہ میں جمع

ہوتے ہیں اور ان کی تعداد سے جو یوم عرفہ میں عرفات میں جمع ہوتے ہیں، دس گنا حسنات دیتا ہے اور اس کی تلاوت انسان کو خوف و ہراس اور مصائب سے رہائی بخشتی ہے[1]

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "شاہد و مشہود" کی ایک تفسیر روزِ جمعہ اور روزِ عرفہ ہے، نیز اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گزشتہ سورہ مصیبتوں کے مقابلہ میں مومنین کی مقاومت کو بیان کرتی ہے لہٰذا اس اجر و ثواب کی مناسبت سورہ کے مضامین سے واضح ہو جاتی ہے اور ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تمام اجر و ثواب ان لوگوں کے لیے ہے جو اسے پڑھیں، اس میں غور و فکر کریں اور پھر اس پر عمل کریں۔

---

[1] تفسیر برہان، جلد ۴ ص ۴۴۵۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الۡبُرُوۡجِ ۙ

(۲) وَالۡيَوۡمِ الۡمَوۡعُوۡدِ ۙ

(۳) وَشَاهِدٍ وَّمَشۡهُوۡدٍ ؕ

(۴) قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۙ

(۵) النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۙ

(۶) اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ ۙ

(۷) وَّهُمۡ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ شُهُوۡدٌ ؕ

(۸) وَمَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ ۙ

(۹) الَّذِىۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ ؕ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

(۱) قسم ہے آسمان کی جس کے بہت سے بروج ہیں۔

(۲) اور قسم ہے اُس موعود دن کی۔

(۳) اور شاہد و مشہود کی (شاہد سے مراد پیغمبرؐ اور اعمال کے گواہ ہیں اور مشہودؐ سے مراد اعمال ہیں)۔

۴) موت اور عذاب ہو ایذا دینے والے اصحابِ اخدود پر (آگ کی خندق)۔

۵) شعلہ اور آگ سے پُر خندقیں۔

۶) جس وقت وہ اس کے کنارے پر بیٹھے تھے۔

۷) اور جو کچھ وہ مومنین کی نسبت انجام دیتے تھے (سرد مہری سے) اسے دیکھ رہے تھے۔

۸) انہیں کوئی اعتراض ان (مومنین) پر نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ خداوند عزیز و حمید پر ایمان لاتے تھے۔

۹) وہی خدا کہ آسمانوں اور زمین کی حکومت جس کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

تفسیر

مومنین انسانوں کو جلانے والی بھٹیوں کے سامنے

ہمیں معلوم ہے کہ مکے کے مسلمان ابتدا میں سخت فشار اور دباؤ میں تھے اور دشمن ان کے لیے ہر قسم کی تکلیف کو جائز سمجھتے تھے اور جیسا کہ ہم نے سورہ کے مضامین کی تشریح میں کہا ہے اس سورہ کے نزول کا مقصد ان ایذا پہنچانے والے کفار کو خبردار کرنا ہے کہ وہ ماضی کی اپنے سے مشابہت رکھنے والی اقوام کے لوگوں کی سرنوشت کو پیشِ نظر رکھیں، اور ساتھ ہی یہ سورہ موجودہ مومنین کی تسلی، دلداری اور تقویتِ روحانی کا باعث اور تمام مسلمانوں کے لیے ایک درس بھی ہے۔ پہلے فرماتا ہے:

"قسم ہے آسمان کی جس کے بہت سے بروج ہیں" (والسماء ذات البروج) 'بروج' 'بُرج' کی جمع ہے جس کے معنی اصل میں قصر اور محل کے ہیں۔

بعض مفسرین نے اسے ظاہر و آشکار شے کے معنوں میں لیا ہے اور بلند و بالا عمارات کو اس نام سے منسوب کرنے کا سبب ان کے ظاہر ہونے کو قرار دیا ہے۔ اسی بنا پر شہر کے اطراف کی دیوار کے ایک خاص حصّہ کو اور لشکر کے جمع ہونے کی جگہ کو جو نمایاں ہوتی ہے، برج کا نام دیا جاتا ہے اور جب عورت اپنی زینت کا

اظہار کرے تو اسے تبرجت المراۃ کہا جاتا ہے[1]

آسمانی برج یا تو آسمان کے درخشاں اور روشن ستاروں کے معنی میں ہے یا آسمانی شکلوں اور صورتوں کے معنی میں ہے یعنی ستاروں کا ایسا مجموعہ جو ہماری نظروں کے اعتبار سے موجوداتِ زمین میں سے کسی ایک سے مشابہت رکھتا ہے اور بارہ برج بارہ فلکی شکلیں ہیں۔ سورج اپنے سالانہ سفر میں سے ہر ماہ ان میں سے ایک برج کی حدود میں گزارتا ہے البتہ سورج حرکت نہیں کرتا۔ زمین اس کے گرد گردش کرتی ہے لیکن نظر ایسا آتا ہے کہ سورج حرکت کر رہا ہے اور ان فلکی صورتوں میں سے کسی ایک کے سامنے آگیا ہے[2]

ان معانی میں سے جو بھی ہوں وہ عظیم ہیں اور پھر ان کی عظمت بھی ایسی ہے جو غالباً اس زمانے میں عربوں پر واضح نہیں تھی لیکن موجودہ زمانے میں ہمارے لیے جانی پہچانی ہے۔ اگرچہ زیادہ یہی نظر آتا ہے کہ مراد وہی آسمانی ستارے ہوں۔ ایک حدیث میں منقول بھی ہے کہ لوگوں نے پیغمبرِ اسلامؐ سے اس آیت کی تفسیر پوچھی تو آپؐ نے فرمایا کہ اس سے مراد ستارے ہیں[3]

اس کے بعد دوسری آیت میں ارشاد ہوا ہے: "اور قسم ہے اس موعود دن کی"، (قیامت کا دن جس کا وعدہ کیا گیا ہے)۔ (والیوم الموعود)۔ وہی دن جس کی تمام انبیاء اور پیغمبروں نے خبر دی ہے اور کئی سو قرآنی آیتیں جس کے ثبوت کے طور پر ہیں۔ وہی دن جو اولین و آخرین کی وعدہ گاہ ہے اور وہی دن جس میں سب کے حساب کا فیصلہ ہونا ہے۔

تیسری اور چوتھی قسم میں فرماتا ہے: "اور قسم ہے شاہد و مشہود کی" (وشاھد و مشھود)۔ یہ کہ شاہد و مشہود سے کیا مراد ہے اس کی علماء نے بہت سی تفسیریں کی ہیں جو تعداد میں تیس سے زیادہ ہیں جن میں سے اہم ترین درج ذیل ہیں:

۱۔ شاہد سے مراد پیغمبرِ اسلامؐ کی ذاتِ گرامی ہے جیسا کہ قرآن مجید کہتا ہے: (یا ایھا النبی انا ارسلناک شاھدًا و مبشرًا و نذیرًا) "اے پیغمبر ہم نے تجھے شاہد، بشارت دینے والے اور ڈرانے والے کی حیثیت سے بھیجا ہے" (احزاب۔ ۴۵)۔ اور مشہود سے مراد قیامت کا دن ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے: (ذالک یوم مجموع لہ الناس و ذالک یوم مشھود) قیامت کا دن وہ دن ہے جس میں تمام لوگ جمع ہوں گے وہ مکمل طور پر مشہود"

---

[1] بعض محققین کا نظریہ ہے کہ یہ لفظ فارسی لفظ "برز" سے لیا گیا ہے جو بلندی، بزرگی اور شکوہ کے معنی رکھتا ہے۔ برہان قاطع اور اس کے حاشیہ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[2] یہ بارہ صورتیں عبارت ہیں حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو اور حوت سے جو اسی ترتیب سے گوسفند، بیل، دو بچے جو اخروٹ کھیل رہے ہیں، کیکڑا، شیر، خوشہ، ترازو، بچھو، کمان، بکری، ڈول اور مچھلی کی شکلیں ہیں۔

[3] درالمنثور، جلد ۶ ص ۳۳۱۔

اور آشکار دن ہے ۔ (ہود ۔ ۱۰۳) ۔

۲۔ شاہد سے مراد انسان کے اعمال کے گواہ ہیں مثلاً اس کے جسم کے اعضاء وجوارح جیسا کہ سورہ نور کی آیت ۲۴ میں ہمیں ملتا ہے (یوم تشہد علیہم السنتہم وایدیہم وارجلہم بما کانوا یعملون) وہ دن جس میں ان کی زبانیں، ہاتھ اور پاؤں ان کے اعمال کی گواہی دیں گے ۔ لہٰذا مشہود سے مراد انسان اور اس کے اعمال ہیں ۔

۳۔ شاہد کے معنی جمعہ کا دن ہے جو نماز کے بہت ہی اہم مراسم کے سلسلہ میں مسلمانوں کے اجتماع کا شاہد ہے اور "مشہود" عرفہ کا دن ہے کہ بیت اللہ الحرام کے زائرین اس دن کے شاہد و ناظر ہیں ۔ ایک روایت میں پیغمبر اسلامؐ، امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے یہ تفسیر منقول ہے [1]

۴۔ شاہد عید قربان کا دن ہے اور "مشہود" عرفہ کا دن ہے (جو عید قربان سے ایک دن پہلے ہے) ۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص مسجد نبوی میں داخل ہوا اس نے کسی کو دیکھا کہ بیٹھا ہوا ہے اور رسول اللہؐ سے حدیث نقل کر رہا ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے اس شخص سے اس آیت کی تفسیر پوچھی تو اس نے کہا شاہد سے مراد جمعہ کا دن ہے اور مشہود عرفہ کا دن ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ میں وہاں سے ہٹ کر ایک دوسرے شخص کے پاس گیا وہ بھی رسول اللہؐ سے حدیث نقل کر رہا تھا تو میں نے اس آیت کی تفسیر اس سے بھی پوچھی تو اس نے کہا کہ شاہد جمعہ کا دن اور مشہود عید قربان کا دن ہے ۔ اس سے ہٹ کر میں ایک نوجوان کے پاس گیا جو خوبصورت تھا اور رسول خدا ہی سے حدیث بیان کر رہا تھا ۔ میں نے کہا اس آیت کی تفسیر کے بارے میں مجھے بتاؤ تو اس نے کہا: "شاہد محمدؐ ہیں اور مشہود قیامت کا دن ہے ۔ کیا تُو نے سنا نہیں کہ خدا کہتا ہے":

(یا ایھا النبی انا ارسلناک شاھدًا و مبشرًا و نذیرًا) اور یہ بھی نہیں سنا کہ خدا کہتا ہے: (ذالک یوم مجموع لہ الناس وذالک یوم مشھود)

میں نے سوال کیا کہ پہلا شخص کون تھا؟ لوگوں نے بتایا ابن عباس، دوسرے کے متعلق پوچھا تو بتایا عبداللہ بن عمر اور تیسرے کے متعلق پوچھا تو بتایا کہ وہ حسین بن علی علیہ السلام تھے [2]

۵۔ شاہد سے مراد راتیں اور دن ہیں اور مشہود سے مراد اولاد آدم جن کے اعمال کی وہ گواہی دیں گے جیسا کہ امام زین العابدینؑ کی صبح و شام کی دعا میں ہم پڑھتے ہیں (ھذا یوم حادث جدید وھو علینا شاھد عتید ان احسنا ودعنا بحمد وان اسأنا فارقنا بذم) یہ نیا دن ہے جو ہمارے اعمال کا شاہد ہے اگر ہم نیکی کریں تو

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۶۶ ۔

[2] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۴۳ ۔ یہی مضمون ابوالفتوح رازی اور طبرسی نے بھی اپنی تفسیروں میں نقل کیا ہے ۔

حمد و سپاس کے ساتھ ہم کو الوداع کہے گا اور اگر برائی کریں تو مذمت کرتا ہوا ہم سے جدا ہو گا۔[1]

۶۔ شاہد سے مراد ملائکہ اور مشہود سے مراد قرآن ہے۔

۷۔ شاہد سے مراد حجر الاسود اور مشہود سے مراد حجاج حرم ہیں جو اس کے پاس آتے ہیں اور اس پر ہاتھ رکھتے ہیں۔

۸۔ شاہد مخلوق اور مشہود حق تعالیٰ ہے۔

۹۔ شاہد سے مراد امت اسلامی اور مشہود سے مراد دوسری امتیں ہیں جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۴۳ میں آیا ہے (لتکونوا شہداء علی الناس) مقصد یہ ہے کہ تم دوسری امتوں پر گواہ ہو۔

۱۰۔ شاہد پیغمبرِ اسلام ہیں اور مشہود باقی تمام انبیاء ہیں۔ سورہ نساء کی آیت ۴۱ میں گواہی ہے (وجئنا بك علی هٰؤلاء شهيدًا) اس دن ہم تجھے دوسرے انبیاء کا گواہ بنا کر لائیں گے۔

۱۱۔ شاہد پیغمبرؐ اور مشہود حضرت علیؑ ہیں۔

البتہ اس آیت کی گزشتہ آیتوں سے مناسبت اس کو قبول کرتی ہے کہ روزِ قیامت کے شہود اور گواہوں کی طرف اشارہ ہو عام اس سے کہ وہ پیغمبرِ اسلام ہوں یا باقی انبیا اپنی امتوں کے مقابلہ میں، یا ملائکہ ہوں یا بدنِ انسانی کے اعضاء و جوارح یا رات دن یا کچھ امور اور مشہود سے مراد انسان ہوں یا ان کے اعمال۔

اسی طرح بہت سی تفسیریں ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں گی اور ایک مجموعی مفہوم میں ان کا خلاصہ ہو جائے گا، لیکن روزِ جمعہ، روزِ عرفہ اور روزِ عید جیسی تفسیریں ان معانی سے الگ ہیں، اگرچہ وہ بھی روزِ محشر کے مشہود اور انسانوں کے اعمال کے گواہ ہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک ایسا پُر ہجوم دن ہے جو اس دنیا میں قیامت کا ایک منظر شمار ہوتا ہے۔

اس بیان کی طرف توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ ان تفسیروں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ شاہد و مشہود کے وسیع مفہوم میں یہ سب شامل ہوں۔ اور یہ قرآن کی عظمت کی ایک نشانی ہے کہ اس میں اس قسم کے وسیع مفاہیم ہیں جو مختلف اور کافی تفسیروں کو اپنے اندر جگہ دیتے ہیں، اس لیے کہ شاہد ہر قسم کے گواہ کو کہتے ہیں اور مشہود ہر اس چیز کو جس کی گواہی دی جائے۔ پھر یہ دونوں نکرہ کی شکل میں بیان ہوئے ہیں جو اس شاہد اور مشہود کی عظمت کی طرف اشارہ ہے جو اوپر والی تفسیروں میں منعکس ہوا ہے۔

قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ ایک لطیف و عمدہ تعلق ان چار حصوں کے درمیان اور اس مطلب کے درمیان، جس کی قسم کھائی گئی ہے، موجود ہے۔ آسمان، درخشاں ستارے اور اس کے موزوں برج سب کے سب نظم و حساب کی نشانی ہیں اور یوم موعود حساب و کتاب کا واضح منظر ہے، شاہد و مشہود بھی اسی حساب کی نکتہ رسی کا ذریعہ ہیں۔

---

[1] صحیفہ سجادیہ، دعائے ششم۔

پھر یہ تمام قسمیں اس لیے ہیں کہ ایذا پہنچانے والے ظالموں کو خبردار کرے کہ سچے مومنین کے ساتھ کیے جانے والے ان کے تمام مظالم ثبت و ضبط ہیں اور یوم موعود کے لیے انہیں محفوظ کیا گیا ہے اور وہ مشہود جنہوں نے تمہارے جسم کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے، عام اس سے کہ وہ فرشتے ہوں یا تمہارے جسم کے اعضاء و جوارح یا رات دن یا اور اسی قسم کی اشیاء، وہ سب ان کاموں کو نظر میں رکھے ہوئے ہیں اور قیامت میں وہ گواہی دیں گے۔[1]

اس لیے ان قسموں کے بعد فرماتا ہے: "موت اور عذاب تشدد کرنے والوں پر ہو" (قتل اصحاب الاخدود)۔ "وہی خندقیں جو آگ اور لکڑیوں سے پُر تھیں جن میں سے بڑے بڑے شعلے نکل رہے تھے" (النار ذات الوقود)۔ "جس وقت وہ اس آگ کی خندق کے پاس بیٹھے ہوئے تھے (سرد مہری سے) (اذھم علیھا قعود)۔" اور جو کچھ وہ مومنین کے بارے میں انجام دے رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے" (وھم علیٰ ما یفعلون بالمؤمنین شھود)۔

"اخدود" مفردات میں راغب کے بقول زمین وسیع و عمیق اور کھلے ہوئے شگاف کے معنی میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں بڑی بڑی خندقوں اور گڑھوں کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع "اخادید" ہے اور اصل انسان کے خد سے لی گئی ہے جو انسان کی ناک کے دونوں طرف دائیں اور بائیں دو دھنسی ہوئی جگہوں کے معنی میں ہے۔ (رخسار) اور گریہ کرتے وقت اس پر آنسو جاری ہوتے ہیں۔

اس کے بعد بطور کنایہ اس گڑھے پر اس کا اطلاق ہوا ہے جو زمین پر ظاہر ہو (پھر ایک حقیقی معنی کی شکل اختیار کر گیا ہے)۔ یہ کہ یہ اذیت دینے والا گروہ کون تھا اور کس زمانے میں تھا مفسرین اور ارباب تاریخ اس سلسلہ میں مختلف نظریات کے حامل ہیں جن کی تشریح انشاء اللہ آیات کے ذیل میں نکات کی بحث میں آئے گی۔ لیکن یہ طے شدہ بات ہے کہ انہوں نے آگ کی بہت بڑی بڑی خندقیں بنا رکھی تھیں۔

وہ مومنین کو مجبور کرتے تھے کہ اپنے ایمان سے دستبردار ہو جائیں۔ مومنین جس وقت ان کے سامنے مقابلہ کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو وہ انہیں جلانے والی ان بھٹیوں میں ڈال کر آگ لگا دیتے تھے۔

"وقود" اصل میں اس مادہ کے معنی میں ہے جس سے وہ آگ لگاتے تھے (مثلاً لکڑیاں وغیرہ) اور ذات الوقود کی تعبیر اگرچہ ایندھن کی محتاج ہوتی ہے لیکن یہاں اس سے آگ بھڑکانے والے مواد کی کثرت کی طرف اشارہ ہے، جسے وہ استعمال کرتے تھے اور جس کی آگ طبعی طور پر بہت زیادہ اور تیز ہوتی تھی۔

---

[1] اس بنا پر جواب قسم یہاں محذوف ہے اور قتل اصحاب الاخدود کا جملہ یا ان الذین فتنوا المؤمنین و المؤمنات اس پر دلالت کرتے ہیں اور تقدیر میں اس طرح ہے اقسم بھٰذہ الامور ان الذین فتنوا المؤمنین والمؤمنات معذبون ملعونون کما لعن اصحاب الاخدود۔ میں ان امور کی قسم کھاتا ہوں جن لوگوں نے مومنین مرد و عورت کو مصیبت میں ڈالا وہ ملعون و معذب ہیں جس طرح خندق والے معذب تھے۔

یہی وجہ ہے، کہ جیسے بعض مفسرین نے سمجھا ہے کہ وقود کے دو معنی ہیں، ایک ایندھن اور دوسرے شعلہ اور انہوں نے افسوس کیا ہے کہ مفسرین و مترجمین نے اس نکتہ کی طرف توجہ کیوں نہیں کی۔

اس آیت (اذھم علیھا قعود) اور اس کے بعد کی دوسری آیت سے مراد یہ ہے کہ ایک گروہ انتہائی سرد مہری سے بیٹھا ہوا تھا اور اس تشدد کو دیکھ رہا تھا اور لذت حاصل کر رہا تھا جو خود ان کی انتہائی قساوت اور سخت دل ہونے کی نشانی ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ گروہ مذہب حق سے مومنین کو روگرداں کرنے پر مامور تھا۔ بعض نے انہیں دو گروہوں پر مشتمل سمجھا ہے، ایک اذیت دینے والا اور دوسرا تماشہ دیکھنے والا اور چونکہ دیکھنے والے تشدد کرنے والوں کے اعمال سے راضی تھے لہٰذا اس فعل کی ان سب کی طرف نسبت دی گئی ہے اور یہ فطری بات ہے کہ اس قسم کے کام میں ایک گروہ ہمیشہ کام کرنے والا ہوتا ہے اور ایک دیکھنے والا۔

علاوہ ازیں ان کے سرغنے عام طور پر حکم دیتے ہیں اور کارندے نچلے طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک گروہ بیٹھا ہوا تھا اور تشدد کے عمال کی نگرانی کر رہا تھا کہ وہ متعلقہ کام سے کسی قسم کی روگردانی نہ کریں اور بادشاہ کے سامنے گواہی دیں کہ انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح نبھایا ہے۔ اس گروہ کی تشکیل ان مختلف گروہوں سے بھی بعید نظر نہیں آتی لہٰذا ان تمام تفسیروں کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

بہر حال یفعلون کا جملہ فعل مضارع کی شکل میں اس بات کی دلیل ہے کہ یہ عمل ایک مدت تک استمرار رکھتا تھا اور کوئی یک لخت ہونے والا حادثہ نہیں تھا۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے: "وہ تشدد کرنے والے ان مومنین پر سوائے اس کے اور کوئی اعتراض نہیں رکھتے تھے کہ وہ خداوند عزیز و حکیم پر ایمان لائے ہوئے تھے" (وما نقموا منھم الا ان یؤمنوا باللہ العزیز الحمید)۔

جی ہاں! ان کا جرم اور گناہ صرف خدائے واحد و یگانہ و یکتا پر ایمان تھا۔ خداوند قادر جو ہر قسم کی ستائش کے لائق اور ہر قسم کے کمال کا جامع ہے، تو کیا اس قسم کے خدا پر ایمان لانا جرم و گناہ ہے یا ہر قسم کے شعور و شائستگی سے محروم بتوں پر ایمان رکھنا کوئی گناہ یا جرم ہے؟

"نقموا"، "نقم" (بروزن قلم) کے مادہ سے کسی چیز کا انکار کرنے یا اسے عیب لگانے کے معنی میں ہے۔ زبانی طور پر عیب لگانا یا کسی قسم کی عملی طور پر سزا دینا، یہ دونوں پہلو اس کے معنی میں داخل ہیں۔ اسی مادہ سے انتقام ہے۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ اس قسم کا کام ایک بڑے اور واضح گناہ کے مقابلہ میں سرانجام پاتا ہے نہ کہ پروردگار عالم پر ایمان لانے کے سلسلہ میں۔

اس قسم کے اقدام سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ قوم جو یہ کام کر رہی تھی اس کا تمدن نہایت پست اور بگڑا ہوا تھا جبھی تو ان کے نزدیک ایک افتخار و اعزاز والا کام عظیم ترین جرم و گناہ تھا۔

بہر حال یہ چیز سورہ مائدہ کی آیت ۵۹ میں آئی ہے کہ جادوگروں نے حضرت موسیٰ پر ایمان لانے اور

فرعون کی طرف سے تشدّد اور قتل کی دھمکی کے بعد اس سے کہا کہ (ھل تنقمون منا الا ان امنا باللہ) تو ہم سے صرف اس وجہ سے انتقام لے رہا ہے کہ ہم اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں۔

"عزیز" طاقتور اور شکست نہ کھانے والے اور "حمید" ہر قسم کی تعریف و توصیف کے قابل اور ہر قسم کے کمال کے حامل کی تعبیر حقیقت میں ان کے جرائم کا جواب ہے اور ان کے برخلاف ایک دلیل ہے یعنی کیا اس قسم کے خدا پر ایمان لانا جرم و گناہ ہے۔

ضمنی طور پر یہ بھی واضح ہے کہ یہ بات تشدّد کرنے والے کے لیے پورے دورِ تاریخ میں ایک قسم کی تہدید و تنبیہ بھی ہے کہ خداوند عزیز و حمید ان کی کمین گاہ میں ہے۔ اس کے بعد وہ عظیم معبود اپنے دو اور اوصاف کو بیان کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے:

"وہی خدا کہ آسمانوں اور زمین کی حکومت جس کے لیے ہے اور جو ہر چیز کا گواہ ہے اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہے (الذی لہ ملک السماوات والارض واللہ علیٰ کل شیء شھید)۔

حقیقت میں یہ چار اوصاف ایسے ہیں جو عبودیت کے لیے قابلیت کو مسلّم کر دیتے ہیں اور یہ بتا دیتے ہیں کہ خدا وہ ہے جو قادر و توانا ہے ہر قسم کے کمال کا حامل ہے وہ آسمانوں اور زمین کا مالک ہے اور ہر چیز سے آگاہ ہے۔ یہ چیز مومنین کے لیے بشارت بھی ہے کہ خدا حاضر و ناظر ہے اور ایمان کی حفاظت کے سلسلہ میں وہ ان کے صبر و استقامت کو دیکھتا ہے اور ان کے ایثار و قربانی اور فداکاری کا اسے علم ہے۔

ایسی صورتِ حال ان کو قوت، توانائی اور احساسِ نشاط عطا کرتی ہے دوسرے یہ ان کے دشمنوں کے لیے تہدید اور دھمکی ہے کہ اگر خدا ان کے کام میں مانع نہیں ہوتا تو یہ اس کی کمزوری کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ آزمائش اور امتحان کی وجہ سے ہے اور انجام کار یہ ظالم اپنے گناہ کے نتیجے میں دردناک عذاب کا تلخ مزہ چکھیں گے۔

چند نکات

۱۔ اصحابِ اُخدود کون لوگ تھے؟

ہم بتا چکے ہیں اُخدود عظیم گڑھے اور خندق کے معنی میں ہے اور یہاں بڑی بڑی خندقیں مراد ہیں جو آگ سے پُر تھیں تاکہ تشدّد کرنے والے اس میں مومنین کو پھینک کر جلائیں۔ یہ حقیقت کہ یہ واقعہ کس قوم سے متعلق ہے اور کس وقت معرضِ وجود میں آیا اور کیا یہ ایک خاص معین و مقرر واقعہ تھا یا دنیا کے مختلف علاقوں کے اسی قسم کے متعدد واقعات کی طرف اشارہ ہے،

مفسرین و مورخین کے درمیان اس موضوع پر اختلاف ہے سب سے زیادہ مشہور یہ ہے کہ یہ واقعہ سرزمین یمن کے قبیلہ حمیر[1] کے ذونواس نامی بادشاہ کے دور کا ہے۔

---

[1] حمیر یمن کے مشہور قبائل میں سے ایک قبیلہ تھا۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ذو نواس جو حمیر نامی قبیلہ سے متعلق تھا یہودی ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا پورا قبیلہ بھی یہودی ہو گیا۔ اس نے اپنا نام یوسف رکھا۔ ایک عرصہ تک یہی صورت حال رہی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ کسی نے اسے خبر دی کہ سرزمین نجران (یمن کا شمالی حصہ) میں ابھی تک ایک گروہ نصرانی مذہب پر قائم ہے۔ ذو نواس کے ہم مسلک لوگوں نے اُسے اس بات پر ابھارا کہ اہلِ نجران کو دینِ یہود کے قبول کرنے پر مجبور کرے۔

وہ نجران کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے وہاں کے رہنے والوں کو اکٹھا کیا اور دینِ یہود ان کے سامنے پیش کیا اور ان سے اصرار کیا کہ وہ اس دین کو قبول کریں۔ لیکن انہوں نے انکار کیا اور شہادت قبول کرنے پر تیار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے دین کو خیر باد نہ کہا۔ ذو نواس کے حکم پر اس کے حامیوں نے ایک بہت بڑی خندق کھودی اس میں لکڑیاں ڈالیں اور آگ لگا دی۔ ذو نواس اور اس کے ساتھیوں نے ایک گروہ کو پکڑ کر اس آگ میں زندہ جلایا اور ایک گروہ کو تلوار کے گھاٹ اتارا۔ اس طرح آگ میں جلنے والوں اور مقتولین کی تعداد بیس ہزار تک پہنچ گئی۔[1]

بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس سلسلہ وار و گیر سے بچ کر نصاریٰ بنی نجران کا ایک آدمی قیصرِ روم کے دربار میں جا پہنچا۔ اس نے وہاں ذو نواس کی شکایت کی اور اس سے مدد طلب کی۔ قیصر نے کہا تمہاری سرزمین مجھ سے دور ہے بادشاہ حبشہ کو خط لکھتا ہوں جو عیسائی ہے اور تمہارا ہمسایہ ہے میں اس سے کہتا ہوں کہ وہ تمہاری مدد کرے۔

پھر اس نے خط لکھا اور حبشہ کے بادشاہ سے نصاریٰ نجران کے عیسائیوں کے خون کا انتقام لینے کی خواہش کی۔ وہ نجرانی شخص بادشاہ حبشہ نجاشی کے پاس گیا۔ نجاشی اس سے یہ تمام ماجرا سن کر بہت متاثر ہوا اور سرزمین نجران میں شعلہ دینِ مسیح کے خاموش ہو جانے کا اسے بہت افسوس ہوا۔ اس نے ذو نواس سے شہیدوں کے خون کا بدلہ لینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

اس مقصد کے پیشِ نظر حبشہ کی فوج یمن کی طرف روانہ ہوئی اور ایک گھمسان کی جنگ کے نتیجے میں اس نے ذو نواس کو شکستِ فاش دی اور ان میں سے بہت سے افراد کو قتل کیا۔ جلد ہی نجران کی حکومت نجاشی کے قبضہ میں آگئی اور نجران حبشہ کا ایک صوبہ بن گیا۔[2]

بعض مفسرین نے تحریر کیا ہے کہ اس خندق کا طول چالیس ذراع (ہاتھ) تھا اور اس کا عرض بارہ ذراع تھا۔ (ایک ذراع تقریباً آدھا میٹر ہے اور بعض اوقات گز کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جو تقریباً ایک میٹر ہے)۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ سات گڑھے تھے جن میں سے ہر ایک کی وسعت اتنی ہی تھی جتنی اوپر بیان ہوئی۔[3]

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم قمی جلد ۲ ص ۴۱۴۔

[2] قصص قرآن بلاغی، ص ۲۸۸۔

[3] تفسیر روح المعانی اور ابوالفتوح رازی زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

مندرجہ بالا واقعہ تاریخ و تفسیر کی بہت سی کتابوں میں درج ہے۔ منجملہ دیگر کتب کے عظیم مفسر طبرسی نے مجمع البیان میں، ابوالفتوح رازی نے اپنی تفسیر میں، فخر رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں، آلوسی نے روح المعانی میں اور قرطبی نے اپنی تفسیر میں زیرِ بحث آیات کے ذیل میں اسی طرح ہشام نے اپنی سیرۃ (جلد اول ص ۳۵) میں اور ایک دوسری جماعت نے اپنی کتب میں اس واقعہ کو تحریر کیا ہے۔

جو کچھ ہم نے تحریر کیا اس سے واضح ہوتا ہے کہ تشدد کرنے والے بے رحم افراد آخر کار عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوئے اور ان سے اس خونِ ناحق کا انتقام دنیا ہی میں لیا گیا اور عاقبت کا عذاب جہنم ابھی ان کے انتظار میں ہے۔

انسانوں کو جلانے والی یہ بھٹیاں جو یہودیوں کے ہاتھ سے معرضِ وجود میں آئیں، احتمال اس امر کا ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں یہ پہلی آدم سوز بھٹیاں تھیں لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اسی قسم کی قساوت اور بے رحمی کا خود یہودی بھی شکار ہوتے جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے بہت زیادہ لوگ ہٹلر کے حکم سے آدم سوز بھٹیوں میں جلائے گئے اور اس جہان میں بھی عذابِ حریق کا شکار ہوئے۔

علاوہ ازیں ذونواس یہودی، جو اس منحوس اقدام کا بانی تھا، وہ بھی اپنی بداعمالی کے انجام سے نہ بچ سکا۔ جو کچھ اصحابِ اخدود کے بارے میں درج کیا گیا ہے یہ مشہور و معروف نظریات کے مطابق ہے لیکن اس ضمن میں کچھ اور روایات بھی موجود ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ اصحابِ اخدود صرف یمن میں ذونواس ہی کے زمانے میں نہیں تھے۔ بعض مفسرین نے تو ان کے بارے میں دس قول نقل کیے ہیں۔

ایک روایت حضرت امیرالمومنین علیؑ سے منقول ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ وہ اہلِ کتاب مجوسی تھے جو اپنی کتاب پر عمل کرتے تھے۔ ان کے بادشاہوں میں سے ایک نے اپنی بہن سے مباشرت کی اور خواہش ظاہر کی کہ بہن سے شادی کو جائز قرار دے لیکن لوگوں نے قبول نہیں کیا۔ بادشاہ نے ایسے بہت سے مومنین کو جنہوں نے یہ بات قبول نہیں کی تھی جلتی ہوئی آگ کی خندق میں ڈلوا دیا۔[1]

یہ فارس کے اصحاب الاخدود کے بارے میں ہے۔ شام کے اصحاب الاخدود کے بارے میں بھی علماء نے لکھا ہے کہ وہاں مومنین رہتے تھے اور آنتیاخوس نے انہیں خندق میں جلوایا تھا۔[2]

بعض مفسرین نے اس واقعہ کو بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر حضرت دانیالؑ کے اصحاب و انصار کے ساتھ مربوط سمجھا ہے جس کی طرف تورات کی کتاب دانیال میں اشارہ ہوا ہے اور ثعلبی نے بھی اخدود فارسی کو انہی پر منطبق کیا ہے۔[3]

کچھ بعید نہیں کہ اصحابِ اخدود میں یہ سب کچھ اور اُن جیسے دوسرے لوگ شامل ہوں اگرچہ اس کا مشہور و معروف مصداق سرزمینِ یمن کا ذونواس ہی ہے۔

۱، ۲، ۳ اعلام قرآن، ص ۱۲۷، ۱۲۸۔

۲۔ حفظِ ایمان کے سلسلہ میں استقامت

ایمان کی حفاظت کے سلسلہ میں ماضی و حال دونوں میں فداکاری کی بہت درخشاں مثالیں ہیں۔ تاریخِ انسانی بہت سے ایسے افراد کا پتہ دیتی ہے جنہوں نے اس راستے میں جامِ شہادت نوش کیا ہے اور سولی کی رسی اور جلادوں کی تلواروں کو بوسہ دیا ہے اور پروانہ وار تشدد کرنے والوں کی روشن کی ہوئی آگ میں جلے ہیں جن میں سے صرف ایک گروہ کا نام و نشان تاریخ میں محفوظ ہے۔

آسیہ زنِ فرعون کی داستان ہم نے سنی ہے جو موسیٰ بن عمران پر ایمان لانے کی وجہ سے ان تمام شدائد سے دوچار ہوئی اور جس نے انجام کار اس راہ میں اپنی جان جانِ آفرین کی بارگاہ میں پیش کی۔

ایک حدیث میں حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ خدا نے حبشہ کے لوگوں میں سے ایک پیغمبر ان پر مبعوث کیا۔ وہ لوگ اس پیغمبر کی تکذیب پر آمادہ ہوئے۔ ان کے درمیان جنگ ہوئی۔ آخرکار ان لوگوں نے اس پیغمبر کے اصحاب میں سے ایک گروہ کو قتل کیا اور ایک گروہ کو اس پیغمبر سمیت گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد ایک جگہ آگ تیار کی اور لوگوں کو اس کے قریب بلایا اور کہا جو شخص ہمارے دین پر ہے وہ ایک طرف ہو جائے اور جو اس گروہ کے دین پر ہے وہ اپنے آپ کو آگ میں ڈال دے۔ پیغمبر کے وہ مقید ہمراہی آگ میں کودنے پر ایک دوسرے سے سبقت کرتے تھے۔ اس موقع پر ایک عورت آئی جس کی گود میں ایک مہینے کا بچہ تھا۔ جس وقت عورت نے چاہا کہ اس آگ میں چھلانگ لگائے تو شفقتِ مادری جوش میں آئی اور سدِ راہ ہوئی تو اس بچے نے کہا اے مادرِ گرامی خوف نہ کھائیں آپ خود بھی اس آگ میں کود جائیں اور مجھ کو بھی ڈال دیں۔ خدا کی قسم یہ چیز راہِ خدا میں بہت معمولی ہے۔ (ان ھٰذا واللّٰہ فی اللّٰہ قلیل۔) اور یہ بچہ بھی ان افراد میں سے تھا جنہوں نے گہوارہ میں کلام کیا[1]

اس داستان سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھا گروہ اصحاب الاخدود کا حبشہ میں تھا۔ حضرت عمار یاسر کے ماں باپ اور ان جیسے دوسرے افراد کی داستان اور اس سے بڑھ کر حضرت امام حسینؑ کا واقعۂ جاں بازی اور میدانِ کربلا میں ایک دوسرے سے بڑھ کر جامِ شہادت نوش کرنا اسلام میں مشہور و معروف ہے۔

ہم نے اپنے اس زمانے میں بھی بہت زیادہ نمونے اس موضوع کے اپنے کانوں سے سنے ہیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں کہ بوڑھوں اور جوانوں نے دین و ایمان کی حفاظت کے سلسلہ میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر نہایت والہانہ انداز میں منزلِ شہادت کی طرف قدم بڑھاتے۔ کیا یہ چاہیئے کہ خدا کے دین کی بقا گزشتہ اور موجودہ زمانہ میں اس قسم کی قربانیوں کے بغیر ممکن نہ تھی۔

---

[1] تفسیر عیاشی مطابق نقل تفسیر المیزان، جلد ۲۰ ص ۳۰۷، (تلخیص کے ساتھ)۔

(۱۰) اِنَّ الَّذِیۡنَ فَتَنُوا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ لَمۡ یَتُوۡبُوۡا فَلَہُمۡ عَذَابُ جَہَنَّمَ وَ لَہُمۡ عَذَابُ الۡحَرِیۡقِ ؕ

(۱۱) اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَہُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ۬ؕ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡکَبِیۡرُ ؕ

(۱۲) اِنَّ بَطۡشَ رَبِّکَ لَشَدِیۡدٌ ؕ

(۱۳) اِنَّہٗ ہُوَ یُبۡدِئُ وَ یُعِیۡدُ ۚ

(۱۴) وَ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الۡوَدُوۡدُ ۙ

(۱۵) ذُو الۡعَرۡشِ الۡمَجِیۡدُ ۙ

(۱۶) فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ ؕ

ترجمہ

(۱۰) جنہوں نے صاحبِ ایمان مردوں اور عورتوں پر تشدد کیا، پھر انھوں نے توبہ نہ کی ان کے سبب دوزخ کا عذاب ہے اور آگ کا جلانے والا عذاب ہے۔

(۱۱) جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالح انجام دیئے ان کے لیے جنت کے باغات ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

(۱۲) تیرے پروردگار کی قہر آمیز گرفت اور سزا بہت ہی شدید ہے۔

(۱۳) وہی ہے جو خلقت کا آغاز کرتا ہے اور وہی ہے جو دوبارہ پلٹاتا ہے۔

(۱۴) اور بخشنے والا اور مومنین کا دوست رکھنے والا ہے۔

(۱۵) صاحب عرش مجید ہے۔

(۱۶) اور جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے۔

تفسیر

تشدد کرنے والے عذاب الٰہی کے سامنے

گزشتہ اقوام میں سے تشدد کرنے والوں کی عظیم بے رحمی کے بیان کے بعد جو صاحب ایمان لوگوں کو آگ میں زندہ جلاتے تھے ان آیات میں ان تشدد کرنے والوں کے متعلق خدا کے سخت عذاب اور مومنین کے لیے عظیم ثواب کی طرف نوید ہے۔ پہلے فرماتا ہے :

"وہ جنہوں نے ایماندار مردوں اور عورتوں کو مورد آزار وعذاب قرار دیا اور پھر توبہ نہیں کی ان کے لیے دوزخ کا عذاب ہے اور اسی طرح جلانے والی آگ کا عذاب ہے" (ان الذین فتنوا المؤمنین والمؤمنات ثم لم یتوبوا فلھم عذاب جھنم و لھم عذاب الحریق)۔

"فتنوا" "فتن" (بروزن متن) اور فتنہ کے مادہ سے اصل میں سونے کو آگ میں ڈالنے کے معنی میں ہے تاکہ اس کو پرکھا جاسکے اور کھرا کھوٹا قرار دیا جاسکے۔ اس کے بعد یہ مادہ (فتنہ) آزمائش، عذاب وعقاب، گمراہی اور شرک کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور زیر بحث آیت میں عذاب، آزار اور تشدد کے معنی میں ہے۔

اس کی نظیر سورہ ذاریات کی آیت ۱۳، ۱۴ میں بھی آئی ہے (یوم ھم علی النار یفتنون ذوقوا فتنتکم ھٰذا الذی کنتم بہ تستعجلون) "وہی دن جس دن وہ آگ میں جلائے جائیں گے اور ان سے کہیں گے کہ عذاب کا مزہ چکھو۔ یہ وہی چیز ہے جس کے بارے میں تمہیں جلدی تھی"۔ "ثم لم یتوبوا" کا جملہ بتاتا ہے کہ توبہ کا راستہ اس قسم کا تشدد کرنے والوں کے لیے بھی کھلا ہوا ہے اور یہ چیز یہ بتاتی ہے کہ پروردگار عالم گناہ گاروں پر کتنا رحم کرنا چاہتا ہے۔

ضمناً یہ مکے کے لوگوں کے لیے تنبیہ ہے کہ وہ جلد از جلد مومنین کو آزار پہنچانے اور تکلیف دینے سے باز آجائیں اور خدا کی طرف رجوع کریں۔ قرآن اصولی طور پر بازگشت کی راہ کسی پر بند نہیں کرتا اور یہ چیز بتاتی ہے کہ دردناک عذاب دنیا بھی مفسدین کی اصلاح کے لیے ہے اور ان کے حق کی طرف لوٹ آنے کے لیے ہے۔

قابل توجہ یہ ہے کہ اس آیت میں ان کے لیے دو قسم کے عذاب بیان ہوئے ہیں، ایک عذاب جہنم دوسرا

عذابِ حریق (جلانے والی آگ کا عذاب) ان دو عذابوں کا ذکر ہو سکتا ہے کہ اس بناء پر ہو کہ چونکہ جہنم میں کئی قسم کی سزائیں اور عذاب ہیں جن میں سے ایک جلانے والی آگ ہے۔ اس کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس بنا پر ہے کہ تشدد کرنے والے مذکورہ افراد مومنین کو آگ میں جلاتے تھے لہٰذا وہاں انہیں آگ کی سزا ملنی چاہیئے لیکن یہ آگ کہاں اور وہ آگ کہاں۔ وہ آگ خدا کے قہر و غضب کے شعلوں سے بھڑکائی گئی ہے اور وہ ہمیشہ قائم رہنے والی ہے، نیز ذلت و خواری اپنے ہمراہ لیے ہوتے ہے۔ جبکہ دنیا کی آگ ناپائیدار ہے جو کمزور مخلوق کی جلائی ہوئی ہے اور جو مومنین اس میں جلے ہیں وہ سربلند و پُر افتخار ہوں گے اور راہِ حق کے شہیدوں کی پہلی صف میں ان کی جگہ ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ عذابِ جہنم ان کے کفر کی سزا تھا اور عذابِ حریق ان کے تشدد اعمال کے نتیجے میں ہے۔ اس کے بعد مومنین کے اجر کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح انجام دیئے ان کے لیے جنت کے باغات ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور یہ بہت بڑی کامیابی و نجات ہے" (ان الذین اٰمنوا وعملوا الصالحٰت لھم جنات تجری من تحتھا الانھار ذالک الفوز الکبیر)۔

اس سے بہتر کونسی کامیابی ہوگی کہ پروردگار کے جوارِ قدس میں انواع و اقسام کی پائیدار نعمتوں کے درمیان سربلندی و افتخار کے ساتھ ان کو جگہ ملے۔ لیکن اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ اس فوزِ کبیر اور کامیابی کی اصل کلید ایمان اور عملِ صالح ہے۔ اس راہ کا اصلی سرمایہ یہی ہے، باقی جو کچھ ہے وہ اس کی شاخیں ہیں۔

"عملوا الصالحات" کی تعبیر (اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ صالحات صالح کی جمع ہے) بتاتی ہے کہ صرف ایک یا چند عمل صالح کافی نہیں ہیں بلکہ ضروری ہے کہ انسان ہر قدم پر عمل صالح انجام دے۔

"ذالک" کی تعبیر جو عربی زبان میں دُور کے اشارے کے لیے ہے، اس قسم کے مقامات پر اہمیت اور بلندی کو ظاہر کرتی ہے یعنی ان کے کامیابی، نجات اور اختیارات و اعزازات اس قابل ہیں کہ ہماری فکر کی دسترس سے خارج ہیں۔ اس کے بعد دوبارہ تشدد کرنے والوں اور کفار کو تنبیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"یہ یقینی بات ہے کہ تیرے پروردگار کی قہر آمیز گرفت اور سزا بہت ہی شدید ہے" (ان بطش ربک لشدید)۔

اس کے بعد فرماتا ہے: "یہ گمان نہ کرو کہ درمیان میں قیامت نہیں ہے، یا تمہاری بازگشت مشکل ہے، وہی ہے جو خلقت کا آغاز کرتا ہے اور وہی ہے جو واپس لوٹائے گا" (انہ ھو یبدئ و یعید)۔

"بطش" کے معنی ایسی گرفت کے ہیں جس میں قہر و قدرت کا دخل ہو۔ چونکہ عام طور پر یہ کام سزا کی تمہید ہوتا ہے اس لیے یہ لفظ سزا کے معنی میں بھی آیا ہے۔

"ربک" تیرا پروردگار کی تعبیر پیغمبر کے دل کی تسلی اور خدا کی طرف سے ان کی حمایت کی تاکید ہے۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت کئی قسم کی تاکیدوں کو لیے ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو لفظ بطش خود قہر آمیز گرفت کے معنی میں ہے اور اس میں شدت پوشیدہ ہے، دوسرے جملہ اسمیہ ہے جو عام طور پر تاکید کے لیے آتا ہے، تیسرے "شدید" کی تعبیر اور

چوتھے لفظ "ان"، پانچویں "لام تاکید" یہ سب اسی ایک آیت میں جمع ہیں۔ اس بنا پر قرآن مجید چاہتا ہے کہ انہیں انتہائی قطعی انداز میں سزاؤں کے بیان سے تہدید کرے اور دھمکائے اور انه هو يبدئ ويعيد کا جملہ جس میں معاد کی اجمالی دلیل پوشیدہ ہے کہ کر ایک اور تاکید کا اضافہ کرتا ہے۔[1]

اس کے بعد خدائے عظیم و برتر کے اوصاف میں سے پانچ اوصاف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ توبہ کرنے والے بندوں کو بخشنے والا اور مومنین کو دوست رکھنے والا ہے۔" (وهو الغفور الودود)۔

"وہ تخت و قدرت والا، عالمِ ہستی پر حکومتِ مطلقہ رکھنے والا اور صاحبِ مجد و عظمت ہے۔" (ذو العرش المجيد)۔

"وہ کام کا ارادہ کرکے اسے انجام دیتا ہے۔" (فعال لما يريد)۔

"غفور" و "ودود" دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں اور اس کی انتہائی بخشش اور محبت کی طرف اشارہ ہیں۔ گناہ گار توبہ کرنے والوں کا بخشنے والا اور بندگان صالح کے بارے میں شفیق و مہربان۔

حقیقت میں ان اوصاف کا ذکر اس تہدید کے مقابلہ میں جو گزشتہ آیات میں آئی ہے اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے ہے کہ بازگشت کا راستہ گناہ گاروں کے سامنے کھلا ہے اور خدا شدید العقاب ہونے کے باوجود غفور و ودود و رؤف و مہربان ہے۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ودود یہاں فاعل کے معنی رکھتا ہے، نہ کہ مفعول کے۔ اور یہ جو بعض مفسرین نے ودود کے لفظ کو اسم مفعول کے معنوں میں سمجھا ہے، مثل رکوب کے جو مرکوب کے معنی میں آیا ہے یعنی خدا سے بہت زیادہ محبت و دوستی کی گئی ہے، غفور کی صفت کے ساتھ جو اس سے پہلے آئی ہے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ خدا کا ہدف و مقصد بندوں سے محبت کرنا اور انہیں دوست رکھنا ہے نہ کہ بندوں کا اس کی نسبت دوست رکھنا اور محبت کرنا ہے۔

تیسری صفت یعنی ذو العرش، اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ عرش بلند تختِ شاہی کے معنی میں ہے، اس قسم کے موارد میں قدرت و حاکمیت کا کنایہ ہے اور اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ جہانِ ہستی کی حکومت اسی کے لیے ہے اور جو کچھ وہ ارادہ کرے وہ انجام پا جاتا ہے۔

اس بنا پر حقیقت میں "فعال لما يريد" کا جملہ اس حاکمیت مطلقہ کے لوازم میں سے ہے اور ان سب میں مسئلہ معاد اور مُردوں کو موت کے بعد زندہ کرنے اور تشدد کرنے والے جباروں کو سزا دینے اور کیفرِ کردار تک

---

[1] معاد کے بارے میں مندرجہ بالا خوب صورت دلیل وہی ہے جو سورہ یٰسین کے آخر میں آیہ ۷۹ میں بھی آئی ہے۔ (قل يحييها الذي انشأها اول مرة وهو بكل خلق عليم) کہہ دے وہی ذات جس نے اسے ابتدا میں خلق کیا ہے دوبارہ زندہ کرے گی اور وہ اپنی پوری مخلوق سے آگاہ ہے۔ کہتے ہیں کہ فارابی کی آرزو تھی کہ کاش مشہور یونانی فیلسوف ارسطو زندہ ہوتا تاکہ وہ محکم اور خوبصورت دلیل معاد و قیامت کے بارے میں قرآن مجید کی طرف سے سنتا۔

پہچاننے کے سلسلہ میں اس کی طاقت و قدرت کی نشاندہی کرتا ہے۔

"مجید" "مجد" کے مادہ سے کرم و شرافت وجلالت کی وسعت کے معنی میں ہے اور یہ ایسی صفات میں سے ہے جو خدا کی ذات سے مخصوص ہیں اور دوسروں کے بارے میں بہت کم استعمال ہوتی ہیں[1]

یہ پانچوں صفتیں ایک واضح انجام اور ایک دوسرے سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے کہ غفور و ودود ہونا اس وقت مفید ہے جب قدرت حاصل ہو اور کرم وسیع اور نعمت بے پایاں ہو تاکہ وہ جو کچھ ارادہ کرے انجام دے سکے۔ نہ کوئی چیز اس کے کام میں مانع ہو اور نہ کوئی مقابلہ کی قدرت رکھتا ہو اور اس کے ارادہ میں ضعف و نقاہت و شک اور تردید و فسخ کا امکان نہ ہو۔

---

[1] توجہ رکھنی چاہیئے کہ اوپر والی آیت میں مجید مشہور قرائت کی بناء پر مرفوع ہے اور خدا کے اوصاف میں سے ہے نہ کہ مجید اور عرش کے اوصاف میں سے۔

(۱۷) هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۙ

(۱۸) فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ۗ

(۱۹) بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ۙ

(۲۰) وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ۚ

(۲۱) بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۙ

(۲۲) فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۧ

ترجمہ

(۱۷) کیا لشکروں کی داستان تجھ تک پہنچی ہے؟

(۱۸) فرعون و ثمود کے لشکر۔

(۱۹) بلکہ کفار ہمیشہ حق کی تکذیب میں مصروف رہتے ہیں۔

(۲۰) اور خدا ان سب پر احاطہ رکھتا ہے۔

(۲۱) (یہ کوئی جادو اور جھوٹ نہیں ہے) بلکہ باعظمت قرآن ہے۔

(۲۲) جو لوحِ محفوظ میں موجود ہے۔

تفسیر

تُو نے دیکھا کہ خدا نے فرعون و ثمود کے لشکروں کے ساتھ کیا کیا؟

گزشتہ آیات خدا کی قدرتِ مطلقہ اس کی قطعی حاکمیت اور تشدد کرنے والے کفار کی تہدید کے طور پر تھیں۔ یہ بتانے کے لیے کہ یہ تہدیدیں عملی ہیں، باتوں اور نعروں کی حد تک محدود نہیں ہیں، زیرِ بحث آیات میں رُخِ سخن پیغمبرؐ کی طرف کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"کیا لشکروں کی داستان تجھ تک پہنچی ہے؟" (ھل اتاك حدیث الجنود)۔ وہ عظیم لشکر جنہوں نے خدائی پیغمبروں کے مقابلہ میں صف آرائی کی اور لڑنے کے لیے مستعد ہو گئے، اس گمان میں کہ وہ خدائی قدرت کے مقابلہ میں اپنے آپ کو پیش کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے دو بہت ہی واضح اور آشکار نمونوں کی طرف جن میں سے ایک قدیم الایام میں اور دوسرا بہت ہی نزدیک کے زمانہ میں وقوع میں آیا، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"وہی فرعون اور ثمود کے لشکر" (فرعون وثمود)۔ "وہی جن میں سے بعض نے دنیا کے مشرق و مغرب کو اپنے زیرِ تسلط کر لیا تھا اور بعض نے پہاڑوں کو چیر کر بڑے بڑے پتھر کاٹ کر ان سے بڑے بڑے مکانات، قصر اور محل بنائے اور کسی میں بھی ان کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں تھی لیکن خدا نے پہلے گروہ کو پانی کے ذریعہ اور دوسرے کی آندھی کے وسیلے سے، جو دونوں انسانی زندگی کا ذریعہ ہیں اور زیادہ لطیف موجودات شمار ہوتے ہیں، سرکوبی کی۔ دریائے نیل کی موجیں فرعون اور اس کے لشکر کو نگل گئیں اور ٹھنڈی اور سرکوبی کرنے والی ہوا قوم ثمود کو پرِکاہ کی طرح اٹھاتی اور تھوڑے وقفہ کے بعد ان کے بے جان جسموں کو سطح زمین پر پھینک دیتی تھی تاکہ مشرکین عرب جان لیں کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

جب خدا نے ان عظیم اور طاقتور لشکروں سے اس طرح انتقام لیا تو ان لوگوں کی کیا ہستی ہے جو ان کے مقابلہ میں بہت ہی کمزور و ناتواں ہیں، اگرچہ اس کی قدرت کے مقابلہ میں ضعیف و قوی سب برابر ہیں۔

گزشتہ عام اقوام میں سے قوم ثمود و فرعون کا انتخاب سرکش قوموں کے نمونہ کے طور پر اس بنا پر ہے کہ وہ دونوں قومیں انتہائی طاقتور تھیں۔ ایک گزشتہ ادوار سے متعلق تھی (قوم ثمود) اور دوسری زیادہ نزدیک ماضی سے تعلق رکھتی تھی (قوم فرعون)، علاوہ ازیں قوم عرب ان ناموں سے باخبر تھی اور اجمالی طور پر ان کی تاریخ سے آشنا تھی۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "بلکہ وہ لوگ کافر ہو گئے، وہ ہمیشہ حق کی تکذیب میں گرفتار و مبتلا ہیں" (بل الذین کفروا فی تکذیب)۔ اس طرح نہیں ہے کہ حق کی نشانیاں کسی سے مخفی ہیں، عناد اور ہٹ دھرمی اجازت نہیں دیتے کہ بعض لوگ راہ نکال کر منزلِ حق کی طرف قدم بڑھائیں۔

"بل" کی تعبیر، جو اصطلاح کے مطابق "اضراب" (ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف عدول کرنے) کے لیے ہے، گویا اس طرف اشارہ ہے کہ یہ مشرک گروہ قوم فرعون و ثمود سے بھی بدتر اور زیادہ ہٹ دھرم ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ قرآن کے انکار اور تکذیب میں لگے رہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے ہر ذریعہ اور وسیلہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن انہیں جان لینا چاہیئے کہ خدا ان سب پر احاطہ رکھتا ہے اور وہ سب اس کی قدرت کی گرفت میں ہیں (واللہ من ورائھم محیط)۔

اگر خدا انہیں مہلت دیتا ہے تو عجز و ناتوانی کی بناء پر نہیں ہے اور اگر انہیں جلدی سزا نہیں دیتا تو وجہ یہ نہیں

ہے کہ وہ اس کی اقلیم قدرت سے باہر ہیں۔ (ورائهم) ان کے پیچھے اور پسِ پشت کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ہر جہت سے قدرتِ الٰہی کے قبضہ میں ہیں اور قدرت تمام اطراف سے ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس بنا پر ممکن نہیں ہے کہ اس کی عدالت اور سزا سے راہ فرار اختیار کرسکیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد ان کے اعمال پر تمام جہات سے خدا کا علمی احاطہ ہو اس طرح سے کہ ان کی کوئی گفتار، ان کا کوئی کردار اور ان کا کوئی کام اس سے مخفی نہیں ہے۔ بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے:

"ان کا قرآن کی تکذیب پر اصرار اور اسے سحر، جادو، شعر اور کہانت سے تشبیہ دینا، بیہودہ اور فضول بات ہے بلکہ وہ قرآن مجید باعظمت اور بلند مرتبہ ہے" (بل ھو قراٰن مجید)۔ "ایسا کلام ہے جو لوحِ محفوظ میں ثبت ہے اور نااہل شیاطین اور کاہنوں کا ہاتھ ہرگز اس تک نہیں پہنچتا، اور ہر قسم کے تغیر، تبدیلی، اضافہ اور نقصان سے محفوظ ہے (فی لوح محفوظ)۔

اس بنا پر اگر وہ ناروا نسبتیں تیری طرف دیتے ہیں اور تجھے شاعر، ساحر، کاہن اور مجنوں کہتے ہیں تو تُو اس سے ہرگز غمگین نہ ہو۔ تیری تکیہ گاہ محکم، تیری راہ روشن و واضح اور تیرا حمایتی صاحبِ قدرت ہے۔

"مجید" جیسا کہ ہم نے کہا ہے "مجد" کے مادہ سے شرافت وجلالت کی وسعت کے معنی میں ہے اور یہ معنی قرآن کے بارے میں پورے طور پر صادق آتے ہیں، اس لیے کہ قرآن کے مشمولات ومضامین وسیع وعظیم ہیں اور اس کے معانی بلند و پُر مایہ ہیں۔

معارف وعقائد کے سلسلہ میں بھی اور اخلاق ومواعظ واحکام وسنن کے بارے میں بھی۔ (لَوح، لام کے زبر کے ساتھ) عریض و وسیع صفحہ کے معنی میں ہے جس پر کوئی چیز لکھتے ہیں اور لُوح (لام کے پیش کے ساتھ) پیاس کے معنی میں ہے۔ اس ہَوا کو بھی کہتے ہیں جو زمین وآسمان کے درمیان موجود ہے۔ وہ فعل جو پہلے تلفظ سے مشتق ہوتا ہے آشکار ہونے اور چمکنے کے معنوں میں ہے۔

بہرحال یہاں مراد وہ صفحہ ہے جس پر قرآن مجید تحریر ہے۔ لیکن وہ صفحہ نہیں جو ہمارے درمیان رائج ہے جو الواح کی مانند ہے بلکہ ایک تفسیر کے مطابق جو ابنِ عباس سے منقول ہے کہ:

لوحِ محفوظ کا طول زمین وآسمان کے درمیانی فاصلے کے برابر ہے اور عرض مغرب ومشرق کے فاصلے کے برابر ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں محسوس ہوتا ہے کہ لوحِ محفوظ وہی علمِ خدا کا ایک صفحہ ہے جس نے عالم کے شرق وغرب کو گھیر رکھا ہے اور وہ ہر قسم کی دگرگونی، تغیّر اور تبدیلی وتحریف سے محفوظ ہے۔

جی ہاں! قرآن کا سرچشمہ حق تعالیٰ کا علمِ بے پایاں ہے۔ یہ انسانی فکر کی پیداوار نہیں ہے نہ یہ القائے شیاطین کا نتیجہ ہے۔ اس کے مشمولات ومضامین اس حقیقت کے گواہ ہیں۔

یہ احتمال وہی چیز ہے جسے قرآن مجید میں کبھی کتاب مبین سے اور کبھی ام الکتاب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورہ رعد کی آیت ۳۹ میں ہم پڑھتے ہیں (یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت وعندہ ام الکتاب) خدا جسے چاہتا

ہے محو کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے اور اس کے پاس ام الکتاب ہے۔ اور سورہ انعام کی آیت ۵۹ میں آیا ہے (ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین) خشک و تر کی کوئی چیز ایسی نہیں مگر یہ کہ واضح کتاب میں ثبت ہے۔

خداوندا! ہمیں اپنی اس عظیم آسمانی کتاب کی حقیقت سے زیادہ آشنا فرما۔

پروردگارا! اس دن جس میں مومنینِ صالح فوزِ کبیر حاصل کریں گے اور کافرین مجرم عذابِ حریق میں گرفتار ہوں گے، ہمیں اپنے دامنِ عافیت میں پناہ دیجیو۔

بار الٰہا! تو غفور و ودود و رؤف و مہربان ہے، تو ہم سے وہ سلوک کر جو تیرے ان اسماء و صفات سے ہم آہنگ ہے۔ وہ سلوک نہ کیجو جس کا ہمارے اعمال تقاضا کرتے ہیں۔

آمین یارب العالمین

سورۂ بروج کا اختتام

سورۂ طارق

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا
اور اس میں ۱۷ آیتیں ہیں

سورہ طارق کے مضامین اور ان کی فضیلت

اس سورہ کے مطالب نہایت عمدہ طریقہ سے دو محوروں کے گرد گھومتے ہیں۔

۱۔ معاد و قیامت کا محور۔

۲۔ قرآن مجید اور اس کی قدر و قیمت و اہمیت کا محور۔

لیکن سورہ کے آغاز میں فکر آفریں قسموں کے بعد ان نگہبانوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو خدا کی طرف سے بندوں پر مقرر ہیں اور معاد و قیامت کے امکان کو ثابت کرنے کے بعد پہلی زندگی، یعنی انسان کے نطفہ کے پانی سے پیدا ہونے کی طرف اشارہ کر کے نتیجہ اخذ کرتا ہے اور فرماتا ہے:

"وہ خدا جو قدرت رکھتا ہے کہ اسے اس قسم کے بے قیمت اور ناچیز پانی سے پیدا کرے، وہ نئے سرے سے اس کی بازگشت کی توانائی اور طاقت بھی رکھتا ہے۔ بعد کے مرحلے میں روزِ قیامت کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کے بعد متعدد پُرمعنی قسموں کے حوالہ سے قرآن کی اہمیت کو گوش گزار کرتا ہے اور آخرکار سورہ کو خدائی عذاب کی اس تہدید پر ختم کرتا ہے جو کافروں کے لیے ہے۔

اس سورہ کی فضیلت کے بارے میں ایک حدیث میں ہمیں پیغمبرِ اسلامؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ (من قرأها اعطاه الله بعدد کل نجم فی السماء عشر حسنات) جو شخص اس کی تلاوت کرے خدا اسے ہر اس ستارے کی تعداد کے مقابلہ میں، جو آسمان میں ہے، دس نیکیاں عطا کرتا ہے[1]

اور ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے (من کان قرائته فی الفریضة والسماء والطارق کان له عند الله یوم القیامة جاه و منزلة وکان من رفقاء النبیین و اصحابهم فی الجنة) جو شخص نمازِ فریضہ و واجب میں سورہ والسماء والطارق کی تلاوت کرے وہ روزِ قیامت خدا کے ہاں عظیم مقام و منزلت کا حامل ہوگا اور جنت میں پیغمبروں کے رفقاء اور ان کے اصحاب میں سے ہوگا[2]

واضح رہے کہ سورہ کے مضامین پر عمل کرنا ہی ایسی چیز ہے جس کا یہ اجرِ عظیم ہے، نہ کہ وہ تلاوت جو عمل اور غور و فکر سے خالی ہو۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۶۹۔

[2] ثواب الاعمال مطابق نقل نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۴۹۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱ وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۝

۲ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۝

۳ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝

۴ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝

۵ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝

۶ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝

۷ يَّخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝

۸ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۝

۹ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۝

۱۰ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ۝

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے۔

۱ قسم ہے آسمان کی اور رات کے کھٹکھٹانے والے کی۔

۲ اور تو نہیں جانتا کہ رات کو کھٹکھٹانے والا کیا ہے؟

۳ وہی درخشاں ستارہ اور تاریکیوں کو چیرنے والا۔

۴ (اس عظیم خدائی آیت کی قسم) ہر شخص کا ایک مراقب و محافظ ہے۔

۵ انسان کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟

۶ وہ اچھلتے ہوئے پانی (منی) سے پیدا ہوا ہے۔

(۷) وہ پانی جو پشت اور سینوں کے درمیان سے خارج ہوتا ہے۔

(۸) (وہ جس نے اسے اس قسم کی ناچیز شے سے پیدا کیا ہے) اسے واپس لوٹا سکتا ہے۔

(۹) جس دن اسرار کھلیں گے۔

(۱۰) اور اس کے لیے کوئی قوت اور مددگار نہیں ہے۔

تفسیر

اے انسان دیکھ کہ تو کس چیز سے پیدا ہوا ہے؟

یہ سورۃ بھی قرآن کے آخری پارہ کی بہت سی دوسری سورتوں کی طرح خوبصورت اور فکر انگیز قسموں کے ساتھ شروع ہو رہا ہے۔ ایسی قسمیں ایک عظیم حقیقت کے بیان کی تمہید ہیں۔

"قسم ہے آسمان کی اور رات کو کھٹکھٹانے والے کی" (والسماء والطارق)۔ "اور تو نہیں جانتا کہ رات کو کھٹکھٹانے والا کیا ہے" (وما ادراک ما الطارق)۔ "بلند و درخشاں اور رات کی تاریکیوں کو چیرنے والا ستارہ ہے" (النجم الثاقب)۔

"طارق" طرق (بروزن برق) کے مادہ سے کوٹنے کے معنی میں ہے۔ راستے کو اس لیے طریق کہتے ہیں کہ وہ چلنے والے لوگوں کے قدموں سے روندا جاتا ہے اور مطرقہ اس ہتھوڑے کے معنوں میں ہے جسے دھاتوں وغیرہ کو کوٹنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ رات کو گھروں کے دروازے بند کر دیتے ہیں اس لیے وہ شخص جو رات کو آتا ہے دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہوتا ہے، لہٰذا رات کو آنے والے شخص کو طارق کہتے ہیں۔

امیرالمومنین حضرت علیؑ اشعث بن قیس منافق کے بارے میں، جو رات کے وقت آپ کے دروازہ پر آیا تھا اور حلوہ اپنے ساتھ لایا تھا کہ اپنے خیال ناقص میں حضرت علیؑ کو اپنی طرف متوجہ کرے اور کسی معاملے میں آپ سے اپنے موافق حکم حاصل کرے، فرماتے ہیں (واعجب من ذالک طارق طرقنا بملفوفة وعائها) اور اس سے زیادہ تعجب کی بات تو اس شخص کی ہے جس نے رات کے وقت دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور وہ لذیذ حلوہ سے پُر ڈھکا ہوا برتن اپنے ہمراہ لایا تھا[1]

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۲۴۔

لیکن قرآن یہاں طارق کی خود تفسیر کرتا ہے اور کہتا ہے یہ رات کا مسافر وہی درخشاں ستارہ ہے جو آسمان پر ظاہر ہوتا ہے اور اس قدر بلند ہے گویا چاہتا ہے کہ آسمان کی چھت میں سوراخ کر دے۔ اس کی روشنی آنکھوں کو اس قدر خیرہ کرنے والی ہے کہ تاریکیوں میں شگاف ڈال دیتی ہے اور انسان کی آنکھوں کے اندر نفوذ کرتی ہے۔ (توجہ فرمائیں کہ ثاقب ثقب کے مادہ سے سوراخ کرنے کے معنی میں ہے)۔

یہ بات کہ اس سے مراد کوئی معین ستارہ ہے، مثلاً ثریا نامی ستارہ (آسمان میں بلندی اور دوری کے لحاظ سے) یا زحل، پھر زہرہ یا شہب (خیرہ کرنے والی روشنی کے لحاظ سے) یا آسمان کے تمام ستاروں کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں کئی تفسیریں کی گئی ہیں۔ لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ بعد کی آیت میں اسے نجم ثاقب (نفوذ کرنے والے ستارے) کے نام سے ظاہر کیا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ہر ستارہ نہیں بلکہ وہ درخشاں ستارے ہیں جن کا نور تاریکی کے پردوں میں شگاف ڈال دیتا ہے اور انسان کی آنکھوں میں نفوذ کرتا ہے۔

بعض روایات میں النجم الثاقب کی زحل ستارے سے تفسیر کی گئی ہے جو نظامِ شمسی کے سیاروں میں سے بہت ہی پُر فروغ اور منور ستارہ ہے، اور یہ معنی اس حدیث سے بھی ظاہر ہوتے ہیں جو امام جعفر صادق علیہ السلام نے النجم الثاقب کی تفسیر کے سلسلہ میں ایک منجم کو بتائے ہیں۔

آپ نے فرمایا: زحل ستارہ ہے جو ساتویں آسمان میں طلوع ہوتا ہے اور اس کی روشنی تمام آسمانوں کو چیرتی ہوئی پہلے آسمان تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی لیے خدا نے اسے نجم ثاقب کہا ہے[1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ زحل آخری اور سب سے دور جو نظامِ شمسی ہے، اس کا ستارہ ہے، جو بغیر کسی آلے کی مدد کے خالی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اور وہ چونکہ نظامِ شمسی کے ستاروں کی ترتیب کے اعتبار سے سورج کی نسبت کے پیشِ نظر ساتویں مدار اور مقامِ گردش میں قرار پاتا ہے (چاند کے مدار کے حساب سے) تو امام اس حدیث میں اس کا مدار ساتواں آسمان بتاتے ہیں۔ اس ستارے کی کچھ خصوصیات ہیں جو اسے قابلِ قسم بناتی ہیں۔

ایک تو یہ نظامِ شمسی کے سب سے دُور ستاروں میں سے ہے۔ اس وجہ سے ادبِ عربی میں ہر بلندی کی اس سے مثال دیتے ہیں اور کبھی اسے شیخ النجوم بھی کہتے ہیں[2]

زحل ستارہ، جس کا فارسی نام کیوان ہے، اس کے کئی نورانی حلقے ہیں جو اس کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اس کے آٹھ چاند ہیں۔ زحل کے نورانی حلقے جو اس کا احاطہ کیے ہوتے ہیں عجیب ترین آسمانی مظاہر میں سے ہیں جن کے بارے میں ماہرین فلکیات کے مختلف نظریات ہیں اور وہ حلقے اب بھی پُر اسرار موجودات ہیں۔ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ زحل کے دس چاند ہیں جن میں سے آٹھ کا عام نجومی دوربینوں سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور دوسرے

---

[1] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۵۰ حدیث ۴۔

[2] دائرۃ المعارف دھخدا مادہ زحل۔

دو چاند صرف بہت بڑی دوربینوں سے نظر آسکتے ہیں[1]

مذکورہ اسرار اس وقت کسی پر قطعاً واضح نہیں تھے جب قرآن نازل ہوا تھا۔ وہ اس کے صدیوں بعد آشکار ہوئے۔ بہرحال نجم ثاقب کی زحل ستارے سے تفسیر خصوصیت کے ساتھ ممکن ہے، ایک واضح مصداق کے بیان کی قبیل سے ہو اور وہ اس راہ میں حائل نہ ہو کہ آسمان کے دوسرے درخشاں ستاروں سے تفسیر کی جائے اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ ہماری روایات میں مصداقی تفسیر بہت زیادہ ہے۔

سورہ صافات کی آیت ۱۰ میں ہم پڑھتے ہیں (الّا من خطف الخطفة فاتبعه شهاب ثاقب) "مگر وہ جو مختصر سے لمحے میں استراق سمع کے لیے (چوری چھپے کان لگا کر سننے کے لیے) آسمان کے نزدیک ہو تو شہاب ثاقب اسکا تعاقب کرتا ہے"

تو اس آیت میں شہاب کی توصیف لفظِ ثاقب سے ہوئی ہے اور چونکہ یہ آسمان میں وجود میں آنے والی چیز عجائبات عالم میں سے ایک ہے، لہٰذا ممکن ہے کہ زیر بحث آیت کی ایک تفسیر یہ بھی ہو۔ اس آیت کے لیے جو شانِ نزول بعض کتب تفسیر میں بیان ہوئی ہے وہ بھی ان معانی کی تائید کرتی ہے[2]

اب ہم دیکھیں گے کہ یہ قسمیں کس لیے ہیں۔ بعد میں آنے والی آیت میں فرماتا ہے: "مسلّم ہے کہ ہر ایک شخص کا ایک مراقب و محافظ ہے" (ان کل نفس لما علیها حافظ)[3]

جو اس کے اعمال کو لکھتا ہے اور حساب کتاب اور جزا و سزا کے لیے محفوظ رکھتا ہے۔ جیسا کہ سورہ انفطار کی آیت ۱۰، ۱۱، ۱۲ میں ہم پڑھتے ہیں (وان علیکم لحافظین کراماً کاتبین یعلمون ما تفعلون) "اور تم پر کچھ محافظ مقرر کر دیئے گئے ہیں، لکھنے والے مکرم و محترم، جو ہمیشہ تمہارے اعمال لکھتے رہتے ہیں اور جو کچھ انجام دیتے ہو وہ اس سے واقف ہیں"

اس طرح تم اکیلے اور تنہا نہیں ہو اور تم میں سے کوئی بھی ہو اور جہاں کہیں بھی ہو، وہ پروردگار کے مامورین کی زیر نگرانی ہوگا۔ یہ ایسا مفہوم ہے جس کی طرف توجہ انسان کی اصلاح و تربیت کے لیے بے حد مؤثر ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آیت میں یہ نہیں بیان کیا گیا کہ یہ حافظ کون ہے اور کن امور کی حفاظت کرتا ہے۔

لیکن قرآن کی دوسری آیتیں گواہی دیتی ہیں کہ حفاظت کرنے والے فرشتے ہیں اور جن چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں وہ انسان کے اعمال ہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ اطاعتیں ہوں یا معاصی و گناہ۔ یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ اس سے مراد انسان کی حوادث و مہلکات سے حفاظت ہے۔

---

[1] دائرۃ المعارف دھخدا مادہ زحل۔

[2] روح المعانی، جلد ۳۰ ص ۳۹۷۔

[3] اس آیت میں ان نافیہ ہے اور لما الّا کے معنی میں ہے۔

واقعی اگر خدا انسان کی حفاظت نہ کرے تو دنیا میں بہت کم افراد کو طبعی موت نصیب ہو۔ اس لیے کہ حوادث کا حجم اس قدر زیادہ ہے کہ کوئی بھی ان سے نہیں بچ سکتا۔ خصوصاً وہ بچے جن کی عمر ابھی چند سال ہی کی ہوتی ہے۔ ممکن ہے یہ بھی مراد ہو کہ شیطانی وسوسوں سے انسان کی حفاظت کی جاتی ہے، اس لیے کہ اگر خدا کی طرف سے فراہم کی ہوئی یہ حفاظت نہ ہو تو جن وانس پر مبنی شیاطین کے وسوسے اس قدر زیادہ ہیں کہ کوئی فرد بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ بعد والی آیت مسئلہ معاد و قیامت اور اعمال و کردار کے حساب کتاب میں گفتگو کرتی ہے لہٰذا پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے۔ اگرچہ اس آیت میں ان تینوں تفسیروں کو جمع کرنے سے بھی کوئی قباحت پیدا نہیں ہوتی۔

قابلِ توجہ یہ ہے کہ پہلے بیان شدہ قسموں کے اور اعمالِ انسان کی فرشتوں کے ذریعہ حفاظت کے مسئلہ کے درمیان ایک زندہ رابطہ ہے، اس لیے کہ بلند آسمان اور وہ ستارے، جو اپنے منظم راستوں میں مسلسل راہ پیمائی کر رہے ہیں، اس عالم عظیم میں نظم و ضبط اور حساب کتاب کے موجود ہونے کی دلیل ہے تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ انسان کے اعمال حساب کتاب کے بغیر ہوں اور مراقبین الٰہی اور محافظین خدائی ان کی نگرانی نہ کریں۔

اس کے بعد مسئلہ معاد کے ایک استدلال کے عنوان سے، ان لوگوں کے مقابلہ میں جو اسے غیر ممکن سمجھتے ہیں، فرماتا ہے: "انسان کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے" (فلینظر الانسان مم خلق)۔

اس طرح قرآن تمام لوگوں کا ہاتھ پکڑ کر پہلی خلقت کی طرف واپس لے جاتا ہے اور ایک جملہ استفہامیہ کے ذریعہ ان سے پوچھتا ہے "تمہاری خلقت کس چیز سے ہوئی ہے؟" اور بغیر اس کے کہ ان کے جواب کا انتظار کرے اس سوال کا جواب جو بالکل واضح ہے، خود دیتا ہے اور مزید کہتا ہے:

"وہ ایک ٹپکنے والے پانی سے خلق ہوا ہے" (خلق من ماء دافق)۔ جو مرد کے نطفہ کی توصیف ہے جو منی کے پانی میں تیرتا ہے اور باہر آتے وقت ٹپکتا ہے۔ اس کے بعد اس پانی کی ایک اور توصیف کرتے ہوئے کہتا ہے: "جو صلب و ترائب کے درمیان میں سے نکلتا ہے" (یخرج من بین الصلب والترائب)۔

"صلب" کے معنی پشت کے ہیں اور ترائب تریبہ کی جمع ہے جو علمائے لغت کے مطابق سینے کے اوپر کی ہڈیوں کے معنی میں ہے، جس کے اوپر گلوبند باندھا جاتا ہے۔ جیسا کہ ابن منظور لسان العرب میں کہتا ہے: (قال اھل اللغۃ اجمعون موضع القلادۃ من الصدر)

سب اہلِ لغت کہتے ہیں وہ سینے کے قلادہ والی جگہ ہے۔ اس کے باوجود اس کے کئی اور معانی بھی بیان ہوئے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ کہ ترائب کے معنی ہاتھ، پاؤں اور آنکھیں ہیں، یا یہ کہ سینے کی ساری ہڈیاں ہیں۔ یا دائیں طرف کی چار پسلیاں، یا بائیں طرف کی چار پسلیاں ہیں۔ بہرحال یہ کہ اس آیت شریفہ میں صلب و ترائب سے کیا مراد ہے، اس عنوان پر مفسرین کے درمیان بہت کچھ اختلاف ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے بہت سی

تفسیریں تحریر کی ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں :

۱۔ "صلب" مردوں کی طرف اشارہ ہے اور "ترائب" عورتوں کی طرف ، اس لیے کہ مرد مظہر صلابت اور عورتیں مظہر لطافت و زینت ہیں ۔ اسی لیے یہ آیت نطفۂ انسانی کی ترکیب کی طرف مرد و عورت کے نطفے کے حوالے سے اشارہ کرتی ہے جو موجودہ زمانے کی اصلاح میں "اسپرم" (SPERM) اور "اودل" کے نام سے موسوم ہے ۔

۲۔ "صلب" اشارہ ہے مرد کی پشت کی طرف اور ترائب اشارہ ہے اس کے سینے اور بدن کے اگلے حصّہ کی طرف ۔ اس بنا پر مراد صرف مرد کا نطفہ ہے جو شکم کے اندرونی حصوں میں سے پشت اور اگلے حصے کے اندر سے خارج ہوتا ہے ۔

۳۔ مراد عورت کے رحم سے جنین کا خروج ہے جو اس کی پشت اور بدن کے اگلے حصّہ میں قرار پاتا ہے ۔

۴۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت ایک دقیق علمی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جس سے اس آخری زمانہ کے انکشافات نے پردہ اٹھایا ہے ، جو نزولِ قرآن کے زمانے میں یقیناً پنہاں تھا اور وہ یہ کہ نطفۂ مرد کے بیضے اور عورت کے تخمدان سے لیا جاتا ہے اور ماہرین جنین شناسی کے حوالے بتاتے ہیں کہ یہ دونوں ابتداء میں جب جنین میں ظاہر ہوتے ہیں تو گردوں کے قرب میں ہوتے ہیں اور تقریباً پشت کے مہروں کے ستون کے وسط کے مقابلہ میں صلب اور ترائب (پشت اور انسان کی نچلی پسلیاں) کے درمیان قرار پاتے ہیں ۔ پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد اور ان دونوں اعضاء کے نشوونما سے اس جگہ سے نیچے آجاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی موجودہ جگہ پر آجاتا ہے ۔

چونکہ انسان کی پیدائش عورت و مرد کے نطفہ کی ترکیب سے ہوتی ہے اور دونوں ابتداء میں اصل محل صلب و ترائب کے درمیان قرار پاتا ہے لہٰذا قرآن نے اس قسم کی تعبیر کو منتخب کیا ہے ، وہ تعبیر جو اس زمانے میں کسی کو معلوم نہیں تھی اور جدید علمِ جنین شناسی نے اس پر سے پردہ اٹھایا ہے [1]

زیادہ واضح تعبیر میں مرد کا بیضہ اور عورت کا تخمدان ابتدائے خلقت میں ، یعنی اس وقت جب عورت و مرد خود عالم جنین میں تھے ، ان کی پشت میں قرار پایا تھا ، جو تقریباً پشت کے مہروں کے ستون کے وسط کے مدِمقابل تھا ۔ اس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ مرد کا نطفہ ساز کارخانہ اور عورت کی نطفہ ساز دستگاہ دونوں صلب و ترائب کے درمیان تھے ۔ لیکن آہستہ آہستہ جب مرد و عورت کی خلقت شکم مادر میں مکمل ہوتی ہے تو وہاں سے الگ ہو کر آہستہ آہستہ نیچے آتی ہے ، اس طرح سے کہ مرد کے بیضے کے تولد کے وقت شکم سے باہر اور آلہ تناسل کے قریب

---

[1] تفسیر مراغی ، جلد ۳۰ ص ۱۱۳ ۔

قرار پاتی ہے اور عورت کا تخمدان رحم کے قرب میں قرار پاتا ہے۔

لیکن اس تفسیر پر اہم اعتراض یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ وہ ٹپکنے والا پانی صلب و ترائب کے درمیان سے خارج ہوتا ہے، یعنی پانی خروج کے وقت ان دونوں کے درمیان سے گزرتا ہے، جبکہ اس تفسیر کے مطابق نطفہ کے پانی کے خروج کے وقت ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ نطفہ ساز دستگاہ اس موقع پر کہ جب خود شکم مادر میں تھی تو اس وقت صلب و ترائب کے درمیان تھی۔ اس سے قطع نظر ترائب کی تعبیر اگر نچلی آخری پسلیوں سے کی جائے تب بھی بحث و تنقید سے خالی نہیں ہے۔

۵۔ اس جملہ سے مراد یہ ہے کہ منی حقیقت میں انسان کے تمام اجزائے بدن سے لی جاتی ہے۔ اسی لیے خروج کے وقت سارے بدن میں ہیجان ہوتا ہے اور اس کے بعد تمام بدن میں سستی آجاتی ہے۔ اس لیے صلب و ترائب انسان کی عام پشت اور تمام اگلے حصّہ کی طرف اشارہ ہے۔

۶۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ عمدہ ترین منی کی پیدائش کا عامل "نخاع شوکی" حرام مغز ہے جو مرد کی پشت اور اس کے بعد دل و جگر ہیں، جن میں سے ایک سینے کی ہڈیوں کے نیچے اور دوسرا دونوں کے درمیان ہے اور یہی چیز سبب بنی کہ صلب و ترائب کے مابین کی تعبیر کا اس کے لیے انتخاب ہوا۔ لیکن ہر چیز سے پہلے مشکل کے حل کرنے کے لیے اس اہم نکتہ کی طرف توجہ کی جائے کہ مندرجہ بالا آیات میں صرف مرد کے نطفہ کے بارے میں گفتگو ہے اس لیے کہ "ماء دافق" کی تعبیر (اچھل کر نکلنے والا پانی) مرد کے نطفہ پر صادق آتی ہے نہ کہ عورت کے نطفہ پر۔

یہی وجہ ہے کہ بعد والی آیت پر "یخرج" کی ضمیر جس کی طرف لوٹتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ اچھل کر نکلنے والا پانی صلب و ترائب سے خارج ہوتا ہے، تو اس حساب سے اس بحث قرآنی میں عورت کو شریک کرنا مناسب نظر نہیں آتا، بلکہ زیادہ مناسب وہی تعبیر ہے کہ کہا جائے کہ قرآن نطفہ کے دو اصلی اجزاء میں سے ایک کی طرف، جو مرد کا نطفہ ہے اور سب کو معلوم ہے، اشارہ کرتا ہے اور صلب و ترائب سے مراد انسان کی پشت اور اگلا حصہ ہے اس لیے کہ مرد کے نطفہ کا پانی انہی دونوں کے درمیان میں سے نکلتا ہے[1]

یہ تعبیر واضح اور ہر قسم کی پیچیدگی سے خالی ہے اور لفظ کے معنی کے سلسلہ میں جو کچھ کتب لغت میں آیا ہے اس سے ہم آہنگ ہے۔ اس کے باوجود ممکن ہے کہ اس آیت میں ایک زیادہ اہم حقیقت بھی چھپی ہوئی ہو جو ہمارے موجودہ علم کی حد تک ہمارے لیے منکشف نہیں ہوئی اور ماہرین کے آئندہ کے انکشافات اس پر سے پردہ اٹھا سکیں گے۔

اس کے بعد اس بیان سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ جس نے انسان کو نطفہ کے پانی سے پیدا کیا

---

[1] قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی جب نطفہ سے انسان کی خلقت کی گفتگو درمیان میں آتی ہے تو زیادہ تر مرد ہی کے نطفہ پر، جو ایک محسوس امر ہے، انحصار کیا جاتا ہے۔ سورہ نجم کی آیت ۴۶ اور قیامت کی آیت ۳۷ کی طرف رجوع فرمائیں۔

ہے، قادر ہے کہ اسے دوبارہ زندگی کی طرف لوٹائے " (انه علیٰ رجعه لقادر)۔
ابتداء میں وہ مٹی تھا۔ پیچیدہ اور تعجب انگیز مراحل طے کرنے کے بعد کامل انسان میں تبدیل ہوا۔ اس لیے اس کی نئی زندگی کی طرف بازگشت کوئی مشکل پیدا نہیں کرتی۔ اس بیان کی نظیر قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی نظر آتی ہے۔

سورہ حج کی آیت ۵ میں فرماتا ہے: (یا ایها الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقناکم من تراب ثم من نطفة) "اے لوگو! اگر قرآن کے بارے میں شک میں مبتلا ہو تو ہم نے تمہیں خاک سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے" نیز سورہ مریم کی آیت ۶۷ میں ہم پڑھتے ہیں (اولا یذکر الانسان انا خلقناه من قبل ولم یک شیئًا) "کیا انسان اس بات کو یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اسے پہلے پیدا کیا، جبکہ وہ کوئی شے نہیں تھا"
اس کے بعد اس عظیم دن کی تعریف و توصیف کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "یہ بازگشت اس دن تحقق پائے گی جس دن اسرار آشکار ہوں گے" (یوم تبلی السرائر)[1]
"تبلی" "بلوی" کے مادہ سے آزمائش اور امتحان کے معنی میں ہے اور چونکہ آزمائش کے وقت اشیاء کی حقیقت آشکار و واضح ہو جاتی ہے لہٰذا یہ مادہ یہاں ظہور و بروز کے معنی میں آیا ہے۔
"سرائر" سریرہ کی جمع ہے جو اندرونی پوشیدہ حالات، صفات اور نیتوں کے معنی میں ہے۔
جی ہاں! اس دن جو یوم الظهور و یوم البروز ہے، اسرار آشکار ہو جائیں گے، قطع نظر اس سے کہ ایمان و کفر و نفاق ہوں، یا نیت خیر و شر، یا ریا و اخلاص۔
روز بروز یہ ظہور مومنین کے لیے باعثِ افتخار و فراوانی نعمت ہوگا اور مجرموں کے لیے شرمساری اور سر کے جھکنے کا سبب اور ذلت و خواری کا باعث۔ اور کیا ہی دردناک ہے کہ وہ انسان جس نے اپنی اندرونی خرابیوں اور برائیوں کو عمر بھر لوگوں سے چھپاتے رکھا ہو اور ان کے درمیان عزت سے زندگی گزاری ہو، لیکن اس دن، جس دن تمام اسرار آشکار ہوں گے، تو تمام مخلوق کے سامنے شرمسار اور ندامت سے سرنگوں ہو، اس لیے کہ بعض اوقات عذاب ندامت دوزخ کی آگ سے بھی زیادہ دردناک ہوتا ہے۔
سورہ الرحمٰن کی آیت ۴۱ میں بھی آیا ہے: (یعرف المجرمون بسیماهم) "قیامت میں گنہگار اپنے چہروں سے پہچانے جائیں گے" نیز دوسری آیات میں ہے کہ "قیامت میں ایک گروہ کے چہرے روشن اور تابناک ہوں گے اور دوسرے گروہ کے چہرے تاریک و غبار آلود ہوں گے" (عبس - ۳۸ - ۴۱)۔
جی ہاں! جس طرح طارق اور ستارے رات کے وقت آسمان میں ظاہر ہوتے ہیں اور پردے سے باہر آ

---

[1] یوم یہاں ظرف ہے اور رجع کا متعلق ہے جو گزشتہ آیت میں آیا ہے اور اس قسم کے موارد میں مصدر اور اس کے معمول کے درمیان فاصلہ ضرر نہیں رکھتا، اس لیے کہ یہ کسی اجنبی سے فاصلہ نہیں ہے۔

جاتے ہیں، وہ محافظ و مراقب جو انسان کے اعمال کے حفظ و ضبط پر مامور ہیں، وہ بھی وہاں سب کچھ ظاہر کر دیں گے۔

ایک روایت میں معاذ بن جبل سے منقول ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسولِ خداؐ سے اس آیت میں جو لفظ سرائر ہے اس کے معنی پوچھے کہ وہ کون سے اسرار ہیں جن کے ذریعہ خدا قیامت میں بندوں کو آزمائے گا؟ تو آپؐ نے فرمایا:

(سرائرکم ھی اعمالکم من الصلٰوۃ والصیام والزکٰوۃ والوضوء والغسل من الجنابۃ وکل مفروض لان الاعمال کلھا سرائر خفیۃ فان شاء الرجل قال صلیت ولم یصل وان شاء قال توضأت ولم یتوضأ فذالک قولہ یوم تبلی السرائر)

"تمہارے سرائر تمہارے اعمال ہی ہیں، مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، وضو، غسلِ جنابت اور ہر واجب عمل، اس لیے کہ تمام اعمال حقیقت میں پنہاں ہیں۔ اگر انسان چاہے تو کہہ دے کہ میں نے نماز پڑھی ہے جبکہ اس نے نہ پڑھی ہو اور کہہ سکتا ہے کہ میں نے وضو کیا ہے جبکہ نہ کیا ہو۔ یہ ہے خدا کے اس کلام کی تفسیر (یوم تبلی السرائر)"[1]

اس دن اہم مشکل یہ ہوگی کہ انسان کے لیے کوئی قوت و طاقت اندر سے اور کوئی یاور و ہمدرد باہر سے نہیں ہوگا (فما لہ من قوۃ ولا ناصر)۔ کوئی طاقت جو اس کے بُرے اعمال اور بُری نیت پر پردہ ڈالے اور کوئی مددگار جو اسے عذابِ الٰہی سے رہائی بخشے۔

یہ مفہوم بہت سی قرآنی آیات میں آیا ہے کہ اس دن نہ کوئی مددگار ہوگا نہ کوئی فدیہ اور فدا ہونے والا قبول ہوگا، نہ ہی کوئی فرار اور بازگشت کی راہ انسان کے سامنے ہوگی اور نہ کوئی راستہ عدالتِ پروردگار کے چنگل سے فرار کرنے کا راستہ ہوگا۔ نجات کا وسیلہ صرف اور صرف عمل صالح ہوگا۔ جی ہاں! نجات کا وسیلہ صرف یہی ہے۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۷۲۔ اس مفہوم سے مشابہ تفسیر درالمنثور، جلد ۶، ص ۳۳۶ میں بھی آئی ہے۔

(۱۱) وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجۡعِ ۙ

(۱۲) وَالۡاَرۡضِ ذَاتِ الصَّدۡعِ ۙ

(۱۳) اِنَّهٗ لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ ۙ

(۱۴) وَّمَا هُوَ بِالۡهَزۡلِ ؕ

(۱۵) اِنَّهُمۡ يَكِيۡدُوۡنَ كَيۡدًا ۙ

(۱۶) وَّاَكِيۡدُ كَيۡدًا ۚۖ

(۱۷) فَمَهِّلِ الۡكٰفِرِيۡنَ اَمۡهِلۡهُمۡ رُوَيۡدًا ۠

ترجمہ

(۱۱) پُر بارش آسمان کی قسم۔

(۱۲) اور پُر شگاف زمین کی قسم۔

(۱۳) کہ یہ ایک سچی بات ہے۔

(۱۴) اور یہ مذاق نہیں ہے۔

(۱۵) وہ ہمیشہ مکر کرتے ہیں۔

(۱۶) اور مَیں اس کے مقابلہ میں چارہ جوئی کرتا ہوں۔

(۱۷) اب جبکہ ایسا ہے تو کافروں کو تھوڑی سی مہلت دے دے۔ (تاکہ اپنے اعمال کی سزا دیکھ لیں)

تفسیر

مَیں دشمنوں کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیتا ہوں

گزشتہ آیات کے بعد، جن میں انسان کے نطفہ اور اس کی پہلی زندگی کی طرف توجہ کے حوالے سے استدلال

تھا، ان آیات میں پھر امرِ معاد پر تاکید کرتے ہوئے اور دوسرے دلائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"قسم ہے بارش سے پُر آسمان کی" (والسماء ذات الرجع) ۔ "اور قسم ہے زمین کی جو شگافتہ کی جاتی ہے اور اس میں سے سبزہ پھوٹتا ہے" (والارض ذات الصدع) ۔ "کہ یہ ایک حق بات ہے کہ تم زندہ ہو جاؤ گے" (انہ لقول فصل)۔

"یہ پکی بات ہے اور اس میں کسی قسم کی شوخی اور مزاح نہیں ہے" (وما ھو بالھزل)۔

"رجع" رجوع کے مادہ سے بازگشت کے معنی میں ہے اور عرب بارش کو رجع کہتے ہیں، اس وجہ سے کہ پانی زمین اور سمندروں سے اٹھتا ہے اور بارش کی صورت میں زمین کی طرف لوٹ آتا ہے۔ یا یہ کہ مختلف فاصلوں پر بار بار بارش ہوتی ہے۔

وہ گڑھے جن میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے انہیں بھی رجع کہتے ہیں؛ بارش کے پانی کے جمع ہو جانے کی بنا پر، یا ان لہروں اور موجوں کی بنا پر جو ان کی سطح پر ہوا کی جنبش سے پیدا ہوتی ہیں[1]

"صدع" سخت اجسام میں شگاف پڑ جانے کے معنی میں ہے، اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو کچھ رجع کے معنی میں کہا گیا ہے اس کو خشک و سخت زمینوں کے بارش کے نزول کے بعد شگافتہ ہونے اور سبزہ کی نشوونما کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ حقیقت میں یہ دونوں قسمیں اشارہ ہیں مردہ زمینوں کے بارش کی وجہ سے زندہ ہونے کی طرف جسے قرآن نے بار بار مسئلہ معاد کے سلسلہ میں بطور دلیل پیش کیا ہے۔ مثلاً سورہ ق کی آیت ۱۱ (واحیینا بہ بلدة میتاً کذالک الخروج) "ہم نے بارش کے ذریعہ مُردہ زمینوں کو زندہ کیا اور قیامت میں تمہارا خروج بھی اسی طرح ہوگا"

اسی طرح ان قسموں کے درمیان اور ان چیزوں کے درمیان جن کے لیے قسم کھائی گئی ہے، واضح مناسبت ہے۔ یہ قرآن کے محاسن میں سے ایک ہے کہ قسموں کے درمیان اور ان کے درمیان جن کے لیے یہ قسمیں کھائی جا رہی ہیں، ایک عمدہ اور پُرکشش تناسب نظر آتا ہے۔ جس طرح سورہ حج کی آیت ۵ میں مسئلہ معاد پر نطفہ سے انسان کی خلقت اور جنین کے اسرار سے استدلال کرتا ہے اور بارش کے نزول کے زیرِ اثر مُردہ زمینوں کے زندہ ہونے پر استدلال کرتا ہے، اسی طرح اس سورہ (سورہ طارق) میں بھی ان دونوں مسائل پر انحصار کیا ہے۔

بعض مفسرین نے "والسماء ذات الرجع" کے جملے کے لیے ایک اور تفسیر بھی بیان کی ہے اور وہ ہے آسمان کے ستاروں کی گردش کی تکرار اور ان کا پہلی حالت کی طرف پلٹنا، زمین کی مختلف ادوار میں اپنے گرد اور سورج کے گرد گردش اور نظامِ شمسی کے سیاروں کی حرکت، چاند، سورج اور ستاروں کی طلوع و غروب کی حرکت۔ یہ سب حرکات بازگشت کی حامل ہیں۔ ان بازگشتوں کا وجود انسان کی حیاتِ تازہ کی طرف بازگشت کی علامت ہے۔ البتہ پہلے معنی

---

[1] مفردات راغب مادہ رجع۔

زمین کے شگافتہ ہونے اور مسئلہ معاد کے دلائل کے ساتھ بہت زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔

قول فصل کے معنی ایسی بات کے ہیں جو حق و باطل کو الگ الگ کر دے۔ یہاں گزشتہ آیتوں کے قرینہ سے ایک گروہ نے اسے قیامت کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جبکہ مفسرین کی ایک دوسری جماعت اسے قرآن کی طرف اشارہ سمجھتی ہے۔

معصومینؑ کی بعض روایات میں بھی اس طرف اشارہ ہوا ہے۔ البتہ قیامت کو یوم الفصل سے تعبیر کرنا قرآن کی بہت سی آیتوں میں نظر آتا ہے، جو ضمنی طور پر معاد کی خبر دیتی ہیں۔ اس طرح دونوں تفسیروں کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

ایک حدیث میں امیرالمومنین حضرت علیؑ کے واسطے سے پیغمبرِ اسلامؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

(انها ستكون فتنة قلت فما المخرج منها يارسول الله قال كتاب الله فيه نبأ من قبلكم وخبر ما بعدكم وحكم ما بينكم هو الفصل ليس بالهزل من تركه من جبار قصمه الله ومن ابتغى الهدى فى غيره اضله الله)

"عنقریب تمہارے درمیان فتنہ ظاہر ہوگا۔ میں نے عرض کیا اے خدا کے رسولؐ اس سے نجات کی کیا صورت ہے؟ فرمایا: قرآن جس میں گزشتہ اور آئندہ لوگوں کی خبریں اور تمہارے درمیان کے فیصلے ہیں اور وہ ایسا کلام ہے جو حق کو باطل سے جدا کر دیتا ہے، محکم و پختہ ہے، اس میں شوخی و مزاح نہیں ہے۔ جو جبار اس کو چھوڑے گا خدا اس کی کمر توڑے گا اور جو شخص اس کے غیر سے ہدایت چاہے گا خدا اس کو گمراہ کرے گا[1]

اس کے بعد پیغمبرؐ و مومنین کو تسلی دینے کے لیے اور دشمنانِ اسلام کی تہدید کی غرض سے خداوندِ عالم مزید فرماتا ہے: "وہ ہمیشہ مکر و حیلہ کرتے ہیں اور منصوبے بناتے ہیں (انهم يكيدون كيدًا)۔ میں بھی ان کے مقابلہ میں ایک منصوبہ بناتا ہوں اور ان کی سازش کو خاک میں ملا دیتا ہوں۔ (واكيد كيدًا)۔ اب جبکہ معاملہ اس طرح ہے تو کافروں کو تھوڑی سی مہلت دے دے تاکہ وہ اپنے اعمال کا انجام دیکھ لیں۔ (فمهل الكافرين امهلهم رويدًا)۔

ہاں! وہ ہمیشہ منحوس منصوبے تجھ سے لڑنے کے بناتے رہتے ہیں۔ کبھی مذاق اڑاتے ہیں، کبھی دیوانہ کہتے ہیں، کبھی صبح کو ایمان لاتے ہیں اور عصر کے وقت کافر ہو جاتے ہیں تاکہ ایک گروہ کو اپنے ساتھ واپس کفر کی طرف لے جائیں۔

کبھی کہتے ہیں کہ جو لوگ تیرے گرد جمع ہو گئے ہیں وہ فقراء و بے نوا ہیں، انہیں دور کر تاکہ ہم تیرا ساتھ دیں۔ کبھی کہتے ہیں کم از کم ہمارے بعض خداؤں کو قانونی طور پر قبول کرلے تو ہم تیرا ساتھ دیں گے۔ کبھی تجھے جلاوطن کرنے کا

---

[1] صحیح ترمذی، سنن دار مطابق نقل روح المعانی جلد ۳ ص ۱۰۰ اور تفسیر مراغی، جلد ۳۰ ص ۱۸۔

اور قتل کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہر لمحے ایک نئے بھیس میں آتے ہیں تاکہ تیری جماعت کو متفرق و منتشر کر دیں اور تیرے اصحاب و انصار پر دباؤ ڈالیں یا تجھے ختم کر دیں اور خدا کے نور کو بجھا دیں۔

لیکن انہیں جاننا چاہیئے کہ خدا نے ارادہ کیا ہے کہ یہ نور عالمگیر ہو جائے۔ یہ خدا کا نور ہے۔ یہ کسی کے پھونک مارنے سے نہیں بجھ سکتا۔ یہ فروزاں آفتاب ہے جو چمگادڑوں کی چشم پوشی سے ختم نہیں ہو سکتا۔ وہ منصوبہ بناتے ہیں اور ہم بھی اپنی تدابیر کرتے ہیں۔

"کید" بقول مفرداتِ راغب، ایک قسم کی چارہ جوئی ہے اور یہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک مذموم دوسرا پسندیدہ، اگرچہ اس کا استعمال مذموم چارہ جوئی میں زیادہ ہوتا ہے لیکن ممدوح چارہ جوئی میں بھی ہوتا ہے مثلاً (کذالک کدنا لیوسف) ہم نے اس طرح یوسف کے لیے چارہ جوئی کی۔ (یوسف ۔ ۷۶)۔

دشمنوں کے کید و مکر کی مراد زیر بحث آیت میں واضح ہے۔ یہ وہی صورتِ حال ہے جس کے کچھ عنوانات کے متعلق ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اور قرآن ان کی ایذا رساں سازشوں اور شرارت پر مبنی واقعات سے پُر ہے۔ باقی رہا خدائی کید، اس سے یہاں کیا مراد ہے؟

بعض نے یہاں کہا ہے کہ وہی مہلت دینا ہے جو دردناک عذاب پر منتہی ہوتی ہے اور بعض نے خود عذاب کے معنی میں سمجھا ہے۔ لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ کہا جائے کہ مراد وہی الطاف الٰہی ہیں جو پیغمبرؐ اور مومنین کے شامل حال تھے اور دشمنانِ اسلام کو غافل کر دیتے اور ان کی کوششوں کو ختم کر دیتے۔ ان کی سازشوں کو درہم برہم کر دیتے جس کے نمونے تاریخِ اسلام میں بہت زیادہ ہیں۔

ان آیات میں خصوصیت کے ساتھ پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ کافروں سے لطف و مدارت سے پیش آ، انہیں مہلت دے اور ان کے فنا ہو جانے کے بارے میں عجلت سے کام نہ لے۔ انہیں چھوڑ دے کہ کافی حد تک اتمامِ حجت ہو جائے اور انہیں رہنے دے تاکہ جو لوگ مختصر سی آمادگی بھی رکھتے ہوں وہ آخرکار مشرف بہ اسلام ہو جائیں۔

اصولی طور پر جلد بازی وہ ہوتا ہے جو فرصتوں کے خوف اور امکانات کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ رکھتا ہے اور یہ چیز خداوندِ قادر و قاہر کے بارے میں کوئی مفہوم نہیں رکھتی۔

قابلِ توجہ یہ کہ فرماتا ہے: (فمھل الکافرین) "کافروں کو مہلت دے" اور دوبارہ تاکید کرتے ہوئے کہتا ہے (امھلھم) "انہیں مہلت دے"۔

ان میں سے ایک باب تفعیل سے ہے اور دوسرا افعال سے اور اس کی تکرار تاکید کے لیے ہے بغیر اس کے کہ لفظ کی تکرار ہو اور اس کے کانوں کو بوجھ محسوس ہو۔

"رویدًا"، "رود" (بروزن عود) کے مادہ سے آمد و رفت رکھنے اور کسی کام کو نرمی سے انجام دینے کے معنی میں ہے۔ یہاں اس کے مصدری معنی مراد ہیں اور تصغیر کا پہلو لیے ہوئے ہیں یعنی انہیں تھوڑی سی مہلت دے۔[1]

---

[1] اس بنا پر رویدًا یہاں مفعول مطلق کا جانشین ہے اور حقیقت میں ایسا ہے جیسا کہ کہا جائے امھلھم امھالا قلیلا اور یہ جو بعض نے احتمال پیش (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس طرح خدا اس مختصر سے جملے میں اپنے پیغمبر کو تین مرتبہ ان سے مدارات کرنے اور انہیں مہلت دینے کی ہدایت کرتا ہے۔ یہ تمام مسلمانوں کے لیے نمونۂ عمل ہے کہ وہ اپنے کاموں میں، خصوصاً جبکہ ان کا دشمن سے مقابلہ ہو، اس وقت حوصلہ اور صبر و شکیبائی سے کام لیں اور ہر قسم کی جلد بازی سے پرہیز کریں۔ کوئی بے محل اقدام نہ کریں اور ہر کام کا منصوبہ بنائیں۔ علاوہ ازیں دینِ حق کی تبلیغ کی راہ میں ہمیشہ جلد بازی سے پرہیز کریں تاکہ وہ تمام افراد جن کی ہدایت کا احتمال موجود ہے ایمان لے آئیں اور باقی تمام افراد کے بارے میں اتمامِ حجت ہو جائے۔

یہ بات کہ یہ مہلت کم اور مختصر کیوں شمار کی گئی ہے، اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ اسلام مختصر سی مدت میں دشمنوں کے مقابلہ میں کامیاب ہو گیا تھا اور کافروں کے منصوبے خاک میں مل گئے تھے۔ انہوں نے پہلی ضرب کا مزہ جنگِ بدر میں چکھا۔ اس کے بعد بہت جلد میدانِ احزاب و خیبر و حنین وغیرہ میں ان کے ارادے خاک میں ملے۔ پیغمبرؐ کی زندگی کے آخری دنوں میں نورِ اسلام سارے جزیرۃ العرب پر چھا گیا اور ایک صدی گزرنے سے پہلے دنیا کے اُس دَور کے عمدہ اور اہم حصّوں پر اس نے اپنا سایہ ڈال دیا۔ یا پھر اس وجہ سے ہے کہ قیامت کا عذاب بھی نزدیک ہے اور اصولی طور پر جو کچھ قطعی ہو وہ نزدیک شمار ہوتا ہے۔

بہر حال یہ سورہ آسمان اور ستاروں کی قسم سے شروع ہوتا ہے اور سازش کرنے والے حقیقت کے دشمن کفار کی تہدید پر ختم ہوتا ہے۔ درمیان میں معاد و قیامت کے خوبصورت اور مؤثر دلائل اور انسانوں پر نگہبانوں کے تقرر کے بارے میں پُر لطف بیانات ہیں۔ نیز مومنین کی تشفّی و دلداری ہے۔ یہ تمام عنوانات مختصر قسم کی عبارتوں کے ساتھ، جو نہایت ہی لطیف ہے اور مخصوص قسم کی قاطعیت لیے ہوتے ہیں، بیان ہوتے ہیں۔

خداوندا! دشمنوں کے کید و مکر کا رُخ، جو ہمارے زمانے میں بہت زیادہ ہو گیا ہے، خود انہی کی طرف کر دے اور ان کے منحوس منصوبے نقش بر آب کر دے۔

پروردگارا! جس روز اسرار کھل جائیں گے اس روز ہمیں شرمندہ نہ کیجو۔

بارالٰہا! ہم تیرے علاوہ کوئی قوت، ناصر اور مددگار نہیں رکھتے۔ ہمیں اپنے غیر کے سپرد نہ کیجو۔

آمین یا رب العالمین

سورۂ طارق کا اختتام

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) کیا ہے کہ رویداً یہاں امر کے معنی رکھتا ہے اسی لیے تین امر پے در پے آتے ہیں، بعید نظر آتا ہے۔ البتہ روید امر کے معنی میں اور اسم مفعول کی شکل میں بھی آیا ہے لیکن زیرِ بحث آیت سے مناسب اور اس لفظ کے منصوب ہونے کے ساتھ موزوں یہی ہے کہ مفعول مطلق ہو۔

سورۂ اعلیٰ

یہ سورہ مکّہ میں نازل ہوا
اس میں ۱۹ آیتیں ہیں

تاریخ ابتدا : ۲۴ر شعبان / ۱۴۰۷ھ

سورۂ اعلیٰ کے مضامین اور ان کی فضیلت

اس سورہ کے درحقیقت دو حصّہ ہیں۔ایک حصّہ تو وہ ہے جس میں روئے سخن خود پیغمبرؐ کی طرف ہے اور ان کے لیے تسبیح پروردگار اور ادائے فرض رسالت کے سلسلہ میں احکام جاری کیے گئے ہیں۔اُس حصہ میں خدائے بزرگ و برتر کے سات اوصاف شمار کرائے گئے ہیں۔

دوسرا حصّہ وہ ہے جو خوفِ خدا رکھنے والے مومنین اور شقی القلب کفار کی بات کرتا ہے۔اس حصہ میں ان دونوں گروہوں کی سعادت و شقاوت کے عوامل و اسباب اختصار کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

سورہ کے آخر میں اعلان کیا گیا ہے کہ یہ مطالب صرف قرآن ہی میں نہیں آئے بلکہ وہ حقائق ہیں جن پر گزشتہ کتب و صحف اور صحفِ ابراہیم و موسیٰ میں بھی تاکید آئی ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں ہم تک بہت سی روایات پہنچی ہیں۔ایک حدیث ہمیں پیغمبرِ اسلامؐ کی ملتی ہے کہ آپ نے فرمایا:

(من قرأ ھا اعطاہ اللّٰہ عشر حسنات بعدد کل حرف انزل اللّٰہ علی ابراھیم و موسٰی و محمد (صلوٰۃ اللّٰہ علیھم) "جو شخص سورہ اعلیٰ کی تلاوت کرے خدا ہر اس حرف کے بدلے جو اس نے ابراہیم، موسیٰ اور محمدؐ پر نازل کیا ہے دس نیکیاں اسے عطا فرماتے گا"[1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ (من قرأ سبح اسم ربک الاعلیٰ فی فرائضہ او نوافلہ قیل لہ یوم القیامۃ ادخل الجنۃ من ای ابواب الجنۃ شئت انشاء اللّٰہ) جو شخص اپنے فرائض یا نوافل میں سورہ اعلیٰ کی تلاوت کرے تو قیامت کے دن اس سے کہا جائے گا کہ جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جا (انشاءاللہ)[2]

متعدد روایات میں آیا ہے کہ جس وقت پیغمبرؐ یا ائمہ ہدیٰ " سبح اسم ربک الاعلیٰ " پڑھتے تو اس کے بعد اس حکم پر عمل کرتے ہوئے فرماتے " سبحان ربی الاعلیٰ "[3]

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ حضرت علیؑ کے اصحاب میں سے ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے بیس راتوں کو آپ کی اقتدار میں نماز پڑھی تو سوائے سبح اسم ربک الاعلیٰ کے اور کوئی سورہ آپ نماز میں نہیں پڑھتے تھے۔آپ فرماتے تھے اگر تم جانتے کہ اس میں کیا برکتیں ہیں تو تم میں سے ہر شخص اسے دس مرتبہ پڑھتا۔اور جو شخص اسے پڑھے گویا اس نے موسیٰ و ابراہیم کے صحف کی تلاوت کی ہے[4]

۱۔ تفسیر نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۴۳۔

۲و۳۔ تفسیر نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۴۳۔

۴۔ تفسیر نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۴۴۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مجموعہ روایات جو اس سلسلہ میں دستیاب ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں تک کہ ایک حدیث میں حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ یہ سورہ پیغمبرِ اکرمؐ کو محبوب سورۃ تھا (کان رسول اللّٰہ یحب ھٰذہ السورۃ سبح اسم ربک الاعلیٰ)[1]

یہ بات کہ یہ سورہ مکی ہے یا مدنی، اس میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ مشہور یہ ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا جبکہ بعض کا نظریہ ہے کہ مدینہ میں نازل ہوا۔ علامہ طباطبائی رحمۃ اللّٰہ علیہ اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ اس سورہ کا پہلا حصہ مکی ہو اور دوسرا حصہ (ذیلی) مدنی۔ وہ اس لیے کہ ذیل میں گفتگو نماز اور زکوٰۃ کی ہے اور، اس تفسیر کے مطابق جو آئمہ اہلِ بیتؑ سے ہم تک پہنچی ہے، نماز سے مراد نماز عیدالفطر اور زکوٰۃ سے مراد فطرہ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ماہِ رمضان کے روزے، نمازِ عید اور زکوٰۃ فطرہ مدینہ میں نازل ہوتے ہیں[2]

لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ نماز و زکوٰۃ کا حکم اس سورہ کے آخری حصہ میں ایک عام حکم کے طور پر ہے، اگرچہ نمازِ عیدالفطر اور زکوٰۃ فطرہ اس کے ایک واضح مصداق شمار ہوتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ واضح مصداق کے ساتھ روایاتِ اہلِ بیت بہت ہی فراواں ہے۔ اس وجہ سے ان مشہور علماء کا نظریہ جو کہتے ہیں کہ تمام سورہ مکی ہے بعید نظر نہیں آتا بالخصوص جبکہ آغاز سورہ کی آیات اور اختتام سورہ کی آیات مکمل طور پر، مقاطع حروف کے لحاظ سے ہم آہنگ ہیں۔ لہٰذا مشکل ہے کہ یہ کہا جاسکے کہ ایک حصہ مکہ میں نازل ہوا اور ایک مدینہ میں۔

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ مسلمانوں کا جو گروہ بھی مدینہ میں داخل ہوتا تو یہی سورہ مدینہ میں لوگوں کے سامنے پڑھتا[3] پس یہ احتمال کہ اس کا صرف صدر حصہ مکہ میں اور اس کا ذیل حصہ مدینہ میں نازل ہوا ہو، بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۷۲۔

[2] المیزان، جلد ۲۰ ص ۳۸۶۔

[3] تفسیر درالمنثور، ج ۶ ص ۳۳۷ یہ مفصل حدیث ہے جس کے اجمالی مفہوم کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّکَ الۡاَعۡلَی ۙ

(۲) الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪ۙ

(۳) وَ الَّذِیۡ قَدَّرَ فَہَدٰی ۪ۙ

(۴) وَ الَّذِیۡۤ اَخۡرَجَ الۡمَرۡعٰی ۪ۙ

(۵) فَجَعَلَہٗ غُثَآءً اَحۡوٰی ؕ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

(۱) اپنے بلند مرتبہ پروردگار کے نام کی تسبیح کر (اور اسے منزہ رکھ)۔

(۲) وہ خدا جس نے پیدا کیا اور منظم کیا۔

(۳) اور وہ جس نے منظم کیا اور ہدایت فرمائی۔

(۴) اور وہ جس نے چراگاہ کو ظاہر کیا۔

(۵) پھر اسے خشک اور سیاہ قرار دیا۔

تفسیر

خداوندِ عظیم کی تسبیح کر

یہ سورہ حقیقت میں مکتبِ انبیا کی دعوتِ فکر کا نچوڑ اور خلاصے، یعنی پروردگارِ عالم کی تسبیحِ اقدس سے شروع ہوتا ہے۔

پروردگارِ عالم ابتداء میں روئے سخن پیغمبرِ اسلامؐ کی طرف کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اپنے بلند مرتبہ پروردگار کے نام کو ہر عیب و نقص سے منزہ شمار کر"۔ (سبح اسم ربک الاعلیٰ)۔

مفسرین کی ایک جماعت کا نظریہ ہے کہ یہاں اسم سے مراد مسمیٰ ہے جبکہ ایک جماعت نے کہا ہے کہ مراد

خود اسم پروردگار ہے، وہ نام جو مسمیٰ پر دلالت کرتا ہے۔ ان دونوں تفسیروں کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں۔ بہرحال مراد یہ ہے کہ خدا کا نام بتوں کے ناموں کا ہم ردیف قرار نہ دیا جائے اور اس کی ذات پاک کو ہم ہر قسم کے عیب و نقص سے، جسم و جسمانیات کے عوارض سے اور ہر قسم کی محدودیت و نقصان سے منزہ شمار کریں بت پرستوں کی طرح نہیں جو خدا کا نام بتوں کے نام کے ساتھ لیتے تھے، یا وہ لوگ جو خدا کو جسم و جسمانیات سے منزہ خیال نہیں کرتے۔

" اعلیٰ " کی تعبیر اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ وہ ہر شخص اور ہر اُس چیز سے، جس کا ہم تصور کر سکتے ہیں، ہر خیال و قیاس و گمان سے اور ہر قسم کے جلی و خفی شرک سے برتر و بالا ہے۔

" ربک " (تیرا پروردگار) کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ وہ پروردگار جس کی طرف تُو لوگوں کو بلاتا ہے بت پرستوں کے پروردگار سے الگ ہے۔

رب و اعلیٰ کی دو صفتوں کے بعد ان کی وضاحت کے لیے پانچ اور صفات بیان کرتا ہے جو سب کی سب پروردگار کی اعلیٰ ربوبیت کی تشریح میں فرماتا ہے: " وہ خدا جس نے پیدا کیا اور مرتب و منظم کیا " (الذی خلق فسوّٰی)۔

" سوّٰی " تسویہ کے مادہ سے نظام بخشنے اور مرتب کرنے کے معنی میں ہے اس کا ایک وسیع مفہوم ہے جو عالم کے تمام نظاموں پر محیط ہے۔ قطع نظر اس نظام سے جو آسمانی ستاروں پر حاکم ہے، یا جو زمینی مخلوقات پر حکم فرما ہے، انسان کی جسم و جان کے لحاظ سے۔

اور یہ جو بعض مفسرین نے صرف انسان کے ہاتھ پاؤں اور آنکھوں کے خاص نظام یا انسان کے راست قامت ہونے کے ساتھ تفسیر کی ہے، درحقیقت وہ اس مفہوم کے ایک محدود مصداق کا بیان ہے۔ بہرحال عالمِ آفرینش کا نظام جو عظیم ترین آسمانی نظاموں پر حاوی ہے، پروردگار کی ربوبیت اور اس کے وجود کے اثبات کے لیے سادہ اور عام موضوعات کا مؤید ہے۔ مثلاً انسان کی انگلیوں کی پوروں کی لکیروں تک، جن کی جانب سورۂ قیامت میں اشارہ ہوا ہے: (بلیٰ قادرین علیٰ ان نسوّی بنانہ) (قیامت - ۴)۔ اس مختصر سی تعبیر میں مطالب کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔

آفرینش اور خلقت کی تنظیم کے مسئلہ کے بعد حرکتِ کمالی اور اس کی راہ میں موجودات کی ہدایت کے لیے لائحہ عمل مقرر کرنے کے موضوع کو پیش کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: " وہ جس نے تقدیر مقرر کی اور ہدایت فرمائی " (والذی قدّر فھدٰی)۔

تقدیر سے مراد اندازہ، اہداف و مقاصد اور رو بہ عمل ہونے کے لائحہ عمل کی تعیین ہے جن کے لیے موجودات کو خلق کیا گیا ہے۔ ہدایت سے مراد وہی ہدایت تکوینی ہے جو محرکات اور قوانین کی شکل میں ہے اور جسے ہر موجود پر حاکم قرار دیا جاتا ہے (عام اس سے کہ وہ اندرونی محرک ہوں یا بیرونی)۔

مثلاً ایک طرف ماں کے پستان اور اس کے دودھ کو بچے کی غذا کے لیے پیدا کیا ہے، ماں کو شدید محبت مادری سے نوازا ہے اور دوسری طرف بچے میں محرک پیدا کیا ہے جو اسے ماں کے پستان کی طرف کھینچتا ہے۔ یہ آمادگی دونوں طرف کی قوتِ جاذبہ تمام موجودات کی راہِ مقاصد میں نظر آتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہر موجود کی ساخت کے بارے میں تدبر و تفکر کرنا اور وہ راہِ عمل جسے وہ اپنی پوری زندگی میں طے کرتا ہے، یہ دونوں باتیں اس حقیقت کا پتہ دیتی ہیں کہ نہایت باریک بینی پر مبنی ایک لائحہ عمل تجویز کیا گیا ہے، طاقتور جسٹِ ہدایت اس کے پیچھے ہے جو اس لائحہ عمل کے اجراء میں مدد کرتا ہے، اور یہ پروردگار کی ربوبیت کی ایک اور نشانی ہے۔

البتہ انسان کے لیے ہدایتِ تکوینی کے پروگرام کے علاوہ ایک اور قسم کی ہدایت بھی موجود ہے جو وحی اور بعثتِ انبیاء کے ذریعہ صورت پذیر ہوئی ہے۔ اس کا نام ہدایتِ تشریعی ہے۔ قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ انسان کی ہدایتِ تشریعی بھی اس کی ہدایتِ تکوینی کی تکمیل کرتی ہے۔

اسی مفہوم کو سورہ طٰہٰ کی آیت ۵۰ میں بھی پیش کیا گیا ہے جہاں حضرت موسیٰؑ فرعون کے اس سوال کے جواب میں کہ تم دونوں کا پروردگار کون ہے؟ (فمن ربکما یا موسٰی) فرماتے ہیں (ربنا الذی اعطٰی کل شیء خلقه ثم هدٰی) "ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر موجود کو اس کی خلقت کا لازمہ عطا فرمایا اور پھر اس کی ہدایت کی ہے"۔

اس بات کا مفہوم موسیٰؑ ابن عمران کے زمانہ میں یا نزولِ قرآن کے زمانہ میں اگرچہ مختصراً معلوم تھا لیکن موجودہ زمانہ میں، جبکہ انسانی علوم و دانش نے انواعِ موجودات کی شناخت کے سلسلہ میں خصوصاً پودوں اور جانداروں کے بارے میں بڑی پیش رفت کی ہے، اب بہت سی معلومات عام ہو چکی ہیں اور ہزارہا کتابیں اس تقدیر اور ہدایتِ تکوینی کے سلسلہ میں معرضِ تحریر میں آچکی ہیں۔ اس کے باوجود محققین کہتے ہیں کہ جو کچھ ابھی معلوم نہیں کیا جا سکا وہ کئی گنا زیادہ ہے۔

بعد والے مرحلہ میں گیاہ و نباتات یعنی چوپاؤں کی غذا کی طرف خصوصی اشارہ کرتے ہوتے مزید فرماتا ہے:

"وہ جو چراگاہ کو وجود میں لایا اور) اسے زمین کے اندر سے باہر نکالا" (والذی اخرج المرعٰی)۔

"اخرج" کی تعبیر "اخراج" کے مادہ سے اس طرف اشارہ ہے۔ گویا یہ سب زمین کے اندر موجود تھے اور خدا نے انہیں باہر نکالا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ حیوانات کی غذا انسانی غذا کی تمہید ہے اور اس کا فائدہ آخر کار انسان کو پہنچتا ہے۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "اس کے بعد خدا نے اسے خشک اور سیاہ قرار دیا" (فجعله غثاءً احوٰی)۔

"غثاء" اصل میں خشک گھاس کے معنی میں ہے جو سیلاب کے نتیجہ میں نکلتی ہے۔ وہ جھاگ جو دیگ کے جوش کھانے سے پیدا ہوتا ہے، اسے بھی غثاء کہتے ہیں۔ یہ تعبیر ہر اس چیز کے لیے کنایہ ہے جو ضائع ہو جاتی ہے۔

زیر بحث آیت میں غثا کے معنی خشک گھاس اور فضول چیز کے ہیں ۔

" احوی " " حوہ " (بروزن قوہ) کے مادہ سے کبھی سبز رنگ اور کبھی سیاہ رنگ کے معنی دیتا ہے اور دونوں ایک ہی معنی کی طرف لوٹتے ہیں، اس لیے کہ سبز رنگ جب زیادہ سبز ہو تو سیاہی مائل ہو جاتا ہے ۔ یہ تعبیر اس بنا پر ہے کہ خشک گھاس جب اوپر تلے پڑی ہو تو آہستہ آہستہ سیاہ ہونے لگتی ہے ۔ اس تعبیر کا انتخاب، باوجودیکہ خدائی نعمتوں کے بیان کے محل پر ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ مندرجہ ذیل تین علتوں میں سے اس کی ایک علت ہو ۔

۱۔ پہلی علت یہ کہ گھاس وغیرہ کی کیفیت دنیا کے فانی ہونے کو ظاہر کرتی ہے اور انسانوں کے لیے ہمیشہ درس عبرت کا کام دیتی ہے ۔ وہ سبزہ جو فصلِ بہار میں تر و تازہ اور مسرت بخش تھا، چند ماہ گزرنے کے بعد خشک ہو کر سیاہ رنگ اختیار کر لیتا ہے اور اس پر مُردنی چھا جاتی ہے ۔ گویا زبانِ حال سے دنیا کی ناپائیداری اور وقت کے تیزی سے گزرنے کی داستان سناتی ہے ۔

۲۔ دوسرے یہ کہ خشک گھاس جب اوپر نیچے رکھ دی جائے اور بوسیدہ ہو جائے تو ایک قسم کی کھاد بن جاتی ہے جو نئی گھاس کو پرورش کے لیے مفید ہوتی ہے اور زمین کی تقویت کا باعث بنتی ہے ۔

۳۔ تیسری علت یہ ہے کہ بعض مفسرین کے مطابق اس آیت میں گھاس اور درختوں سے پتھر کے کوئلوں کی تخلیق کی طرف اشارہ ہے، اس لیے ہم جانتے ہیں کہ پتھر کا کوئلہ جو کرۂ زمین سے حاصل ہونے والی قوتوں میں سے ایک اہم ترین قوت ہے، انسان اپنی روزمرہ کی زندگی میں اپنی صنعتوں اور کارخانوں میں اس سے بہت زیادہ فائدہ اٹھا چکا ہے اور اب بھی اٹھاتا ہے ۔

یہ کوئلہ گیاہ اور درختوں کا باقی ماندہ حصّہ تھا جو کئی ملین سال سے خشک ہو کر زمین میں دفن ہو گیا اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ پتھر بن کر سیاہ رنگ اختیار کر چکا ہے ۔ بعض ماہرین کا نظریہ ہے کہ وہ چراگاہیں جو موجودہ زمانے میں پتھر کے کوئلے کی شکل اختیار کر کے نکل آئی ہیں تقریباً ڈھائی ملین سال پہلے موجود تھیں اور پھر زمین میں دفن ہو گئیں ۔

یہ چراگاہیں اس قدر زیادہ ہیں کہ اگر موجودہ زمانے میں پتھر کے کوئلہ کا مصرف ہم اپنی نگاہ میں رکھیں تو وہ چار ہزار سال سے زیادہ دنیا کے لوگوں کی ضرورت کو پورا کر سکتا ہے [1]

آیت کی تفسیر خصوصیت کے ساتھ آخری معنی کے حوالہ سے بعید از قیاس نظر آتی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ آیت کے جامع معانی ہوں، جس میں تینوں تفسیریں جمع ہوں ۔

بہرحال (غثاءً احوی) " خشک سیاہ رنگ کی گھاس " بہت سی منفعتیں رکھتی ہے ۔ سردی کے زمانے میں جانوروں کی مناسب غذا بھی ہے، انسان کے لیے آگ کی فراہمی کا ذریعہ بھی اور زمینوں کے لیے مناسب کھاد بھی ہے ۔

---

[1] آخری تفسیر کتاب " قرآن برفراز اعصار " تالیف ع نوفل ترجمہ بہرام پور میں بیان ہوئی ہے ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ سات صفتیں، جو مندرجہ بالا آیت میں آئی ہیں، بلند و بالا ربوبیت، خلقت، تسویہ، تقدیر، ہدایت اور گیاہ و نباتات کی تخلیق، یہ حقیقت میں پروردگار کی اعلیٰ ربوبیت کے مسئلہ کی نہایت احسن انداز میں تشریح ہے جس کا مطالعہ انسان کو خدا کے اعلیٰ مقام ربوبیت سے اچھی طرح آشنا ہے، اس کے دل میں ایمان کی روشنی پیدا کرتا ہے، خدا کی اہم ترین نعمتوں کو اجمالی طور پر بیان کرتا ہے اور انسان میں شکرگزاری کا احساس پیدا کرتا ہے۔

ایک نکتہ

مسئلہ تقدیر اور موجوداتِ عالم کی عمومی ہدایت جو اوپر والی آیات میں پروردگار کی ربوبیت کے مظاہر میں شمار ہوئی ہے، ایسے مسائل میں سے ہے کہ جس قدر زمانہ گزرتا جائے اور انسانی علم و دانش میں پیش رفت ہوگی اسی قدر اس میں زیادہ سے زیادہ حقائق آشکار ہوتے جائیں گے۔ علمی انکشافات ہمیں یہ امکان فراہم کرتے ہیں کہ ہم تمام ذراتِ عالم میں نئے، تعجب انگیز اور زیادہ شوق آور چہرے دیکھیں۔

بعض مفسرین نے یہاں مشہور ماہر حیوانات کریسی موریسن کی کتاب (رازِ آفرینشِ انسان) کی تحریروں سے استناد کرتے ہوئے مختلف جانداروں کے حوالے سے حیوانات کی ہدایت کے بارے میں اس عظیم راز کے نمونے پیش کیے ہیں جس کا ایک مختصر سا نمونہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

۱۔ مہاجر پرندے، جو کبھی ایک سال کے اندر سمندروں، جنگلوں اور بیابانوں کا ہزار ہا میل کا راستہ طے کرتے ہیں، اپنے آشیانوں کو کبھی نہیں بھولتے اور واپسی پر ٹھیک اپنے وطن پہنچ جاتے ہیں۔ اسی طرح شہد کی مکھیاں اپنے چھتے سے خواہ کتنی ہی دُور کیوں نہ ہو جائیں اور تیز ہَوا انہیں کتنا ہی منتشر کیوں نہ کر دے، پھر بھی وہ ٹھیک اپنے چھتے کی طرف واپس لوٹ آتی ہیں، جبکہ انسان اپنے وطن کی طرف لوٹنے کے لیے واضح نشانیوں، پتوں اور رہنماؤں کا محتاج ہوتا ہے۔

۲۔ حشرات الارض خورد بینی آنکھیں رکھتے ہیں جن کی ساخت اور دیکھنے کی طاقت انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے جبکہ باز جیسے پرندے دور بینی آنکھ رکھتے ہیں۔

۳۔ انسان رات کے وقت اپنا راستہ معلوم کرنے کے لیے مجبور ہے کہ منبع نور سے فائدہ اٹھائے لیکن بہت سے پرندے انتہائی تاریکیٔ شب میں اچھی طرح دیکھ لیتے ہیں۔ ان کا یہ دیکھنا ایسی آنکھوں کے ذریعہ ہے جو ایسی شعاؤں کے مقابلہ میں جو سرخ رنگ سے کم ہیں، حساسیت رکھتی ہیں اور اس طرح راڈار کی دستگاہ کی مانند ہیں جن میں سے بعض کے اندر یہ دستگاہ یادگار کے طور پر رکھی ہوئی ہے۔

۴۔ کتے ایک اضافی قوتِ شامہ رکھنے کی وجہ سے ہر اس جانور کو جو ان کے سامنے آئے، سونگھ کر پہچان لیتے ہیں، جبکہ انسان، ان وسائل و ذرائع کے باوجود جو اسے میسر ہیں، اس قسم کی قوت سے محروم ہے۔

۵۔ تمام جانور ان آوازوں کو سن لیتے ہیں جن کی شدتِ ارتعاش ہماری قوتِ سامعہ کی گرفت سے باہر ہے۔ ان کی

قوت سماعت ہماری قوت سماعت سے کئی گنا زیادہ ہے۔ انسان اپنی اس کوتاہی کی تلافی علمی وسائل و آلات کے ذریعہ کر سکتا ہے اور مکھی کے پروں کی آواز جو اس سے کئی کلومیٹر دور ہو، اس طرح سن سکتا ہے گویا یہ آواز اس کی کان کی لو کے نزدیک ہے۔ شاید انسان اور حیوان کی قوت وطاقت و سماعت کا یہ فرق، جو خدا نے دونوں میں رکھا ہے اس بنا پر ہے کہ انسان علم و عقل کے ذریعہ اپنی کوتاہیوں کی تلافی کر سکتا ہے جب کہ حیوان اس سے محروم ہیں۔

۶۔ چھوٹی مچھلی کی ایک قسم ہے جو سالہا سال سمندر میں زندگی گزارتی ہے۔ اس کے بعد تخم ریزی کے لیے اُس نہر یا دریا کی طرف لوٹ جاتی ہے جس میں وہ پیدا ہوئی ہے۔ یہ مچھلی امواج کے برعکس بڑھتی ہے اور اپنے اس اصلی وطن کو، جو اس کی پرورش سے مناسبت رکھتا ہے کئی سال دور فاصلہ پر رہنے کے باوجود اسے تلاش کر لیتی ہے۔

۷۔ پانی کے بعض جانوروں کی داستان اس سے زیادہ عجیب ہے۔ وہ اپنے راستے کو اس طریقہ کے برعکس طے کرتے ہیں۔

(۶) سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى ۙ

(۷) اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ؕ

(۸) وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۚۖ

(۹) فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ؕ

(۱۰) سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۙ

(۱۱) وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۙ

(۱۲) الَّذِىْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۚ

(۱۳) ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ؕ

ترجمہ

(۶) ہم عنقریب تیرے سامنے (قرآن کو) پڑھیں گے اور تُو اسے کبھی فراموش نہیں کرے گا۔

(۷) مگر جو کچھ خدا چاہے۔ وہ آشکار اور پنہاں کو جانتا ہے۔

(۸) اور ہم تمہیں ہر اچھے کام کے انجام دینے کے لیے آمادہ کریں گے۔

(۹) تو جہاں تک سمجھانا مفید ہو، سمجھاتے رہو۔

(۱۰) اور عنقریب وہ لوگ جو خدا سے ڈرتے ہیں متذکر ہوں گے۔

(۱۱) لیکن زیادہ بدبخت لوگ اس سے دُوری اختیار کرتے ہیں۔

(۱۲) وہی جو بہت بڑی آگ میں داخل ہو گا۔

۱۳۔ پھر اس آگ میں نہ مرے گا، نہ زندہ رہے گا۔

تفسیر

ہم تجھے ہر اچھے کام کے لیے آمادہ کریں گے

گزشتہ آیتوں میں پروردگار کی ربوبیت اور توحید کے بارے میں گفتگو تھی۔ اس کے بعد زیر بحث آیات میں قرآن اور پیغمبر کی نبوت کی بات ہو رہی ہے۔ گزشتہ آیات میں عام موجودات کی ہدایت کے متعلق گفتگو تھی اور زیر بحث آیات میں نوعِ انسانی کی ہدایت کی بات ہے۔ خلاصہ یہ کہ گزشتہ آیات میں پروردگارِ علی و اعلیٰ کی تسبیح کا ذکر آیا تھا اور ان آیات میں اس قرآن کی بات ہے جو اس تسبیح کو بیان کرتا ہے۔

فرماتا ہے: "ہم عنقریب تیرے لیے قرأت کریں گے اور تُو کبھی نہیں بھولے گا" (سنقرئك فلا تنسٰی)۔ اس بناپر نزولِ وحی کے وقت عجلت سے کام نہ لے اور آیاتِ الٰہی کے بھول جانے کے بارے میں کبھی پریشان نہ ہو۔ وہ ذات جس نے یہ عظیم آیات انسانوں کی ہدایت کے لیے تجھ پر نازل کی ہیں، وہ ان کا محافظ و نگہبان بھی ہے۔ وہ ان آیات کا نقش تیرے مبارک سینے میں اس طرح ثبت کرے گا کہ نسیان کا گرد و غبار اسے کبھی مکدر نہیں کرے گا۔

یہ اس مفہوم کی نظیر ہے جو سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۱۴ میں آیا ہے (ولا تعجل بالقراٰن من قبل ان یقضٰی الیک وحیه وقل رب زدنی علمًا) "قرآن پڑھنے کے سلسلہ میں اس سے پہلے کہ اس کی وحی تجھ پر تمام ہو، جلدی نہ کراور کہہ پروردگار میرے علم میں اضافہ فرما"۔

پھر سورہ قیامت کی آیت ۱۶، ۱۷ میں ہم پڑھتے ہیں: (لا تحرك به لسانك لتعجل به ان علینا جمعه وقراٰنه) "اپنی زبان کو قرآن کے ساتھ حرکت نہ دے اس سے پہلے کہ وحی تجھ پر تمام ہو۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس کو جمع کریں اور تیرے سامنے پڑھیں"۔

اس کے بعد خدائی قدرت کو ثابت کرنے اور یہ کہ جو کچھ خیر و برکت ہے وہ اسی کی طرف ہے، مزید کہتا ہے: "تُو آیاتِ الٰہی میں سے کسی چیز کو نہیں بھولے گا، مگر وہ جسے خدا چاہے۔ اس لیے کہ وہ آشکار و پنہاں کو جاننے والا ہے" (الا ما شاء اللّٰه انه یعلم الجهر وما یخفٰی)۔

اس تعبیر کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ پیغمبرؐ آیاتِ الٰہی میں سے کسی چیز کو بھول جائیں گے، یا ان کی گفتگو سے اطمینان سلب ہو جائے گا۔

مقصودِ کلام یہ ہے کہ آیاتِ الٰہی کو یاد رکھنے کی نعمت خدا کی طرف سے ہے، لہٰذا جس وقت وہ چاہے اسے پیغمبرؐ سے چھین سکتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں ہدف و مقصدِ خدا کے علم ذاتی اور اس کے پیغمبرؐ کے علم وہبی کے درمیان جو فرق ہے اس کو بیان کرتا ہے۔

یہ آیت حقیقت میں اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ ہود کی آیت ۱۰۸ میں اہلِ بہشت کے جنت میں ہمیشہ رہنے کے بارے میں آئی ہے (واما الذین سعدوا ففی الجنة خالدین فیہا ما دامت السماوات والارض الّا ما شاء ربک عطاء غیر مجذوذ) "سعادت مند ہمیشہ جنت میں رہیں گے، جب تک کہ آسمان و زمین قائم ہیں، مگر وہ جو تیرا پروردگار چاہے، یہ عطا ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوگی۔"

یہ طے شدہ بات ہے کہ اہلِ جنت ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور آیت کا آخری حصہ گواہ ہے۔ (الّا ما شاء ربک) کا جملہ خدا کے ارادہ وحاکمیت کی قدرت کی طرف اشارہ ہے اور اس طرف اشارہ ہے کہ ہر چیز اس کی مشیت سے ربط رکھتی ہے، اپنی ابتداء خلقت میں بھی اور بقاء واستمرار میں بھی۔

من جملہ ان امور کے جو اس موضوع کے گواہ ہیں یہ ہے کہ بعض مسائل کو یاد رکھنا اور بعض کو بھول جانا تمام انسانوں میں موجود ہے اور یہ کوئی امتیاز و خصوصیت نہیں ہے کہ خدا اپنے پیغمبر کے لیے ایک نعمت کے طور پر بیان کرے۔ لہٰذا مراد تمام آیاتِ قرآن اور احکام ومعارف اسلام کا حفظ اور یاد رکھنا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس استثناء سے مراد وہ آیتیں ہیں جن کے معنی اور تلاوت دونوں منسوخ ہو گئے ہیں لیکن یہ تفسیر بہت بعید نظر آتی ہے۔ اصولی طور پر اس قسم کی آیات کا وجود ہی ثابت نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی پیش کیا ہے کہ استثناء قرأت سے متعلق ہے، اس لیے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم عنقریب تیرے لیے قرأت کریں گے اور اپنی آیات کو بیان کریں گے، مگر وہ آیات جن کے بارے میں تیرے پروردگار نے ارادہ کیا ہے اور اس کے علم مخزون میں پوشیدہ رہ جائیں۔ یہ تفسیر بھی آیات کے سیاق کی طرف توجہ کرتے ہوئے بعید نظر آتی ہے۔ (انہ یعلم الجہر وما یخفٰی) کا جملہ حقیقت میں اس مفہوم کی علت کا بیان ہے جو سنقرئک کے جملہ میں آیا ہے، جو اس طرف اشارہ ہے کہ وہ خدا جو تمام آشکار و پنہاں حقائق سے باخبر ہے، وہ تجھ پر نوعِ بشر کی احتیاجات میں سے باقی رہ جانے والی چیزیں وحی کے ذریعہ القا کرتا ہے اور اس سلسلہ میں کسی چیز کو نظر انداز نہیں کرے گا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ مراد یہ ہو کہ پیغمبر وحی کے حصول میں عجلت نہ کریں اور بھول چوک کا خوف نہ رکھیں، اس لیے کہ وہ خدا، جو آشکار و پنہاں حقائق کا عالم ہے، اس نے وعدہ کیا ہے کہ پیغمبر کو نسیان نہیں ہوگا۔

بہرحال یہ پیغمبرِ اسلامؐ کا ایک معجزہ ہے کہ طولانی آیات کو جبرائیلؑ کے ایک ہی مرتبہ تلاوت کرنے سے یاد کر لیتے، ہمیشہ یاد رکھتے اور کوئی بات بھی نہیں بھولتے تھے۔

اس کے بعد پیغمبر کی دلداری کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "ہم تجھے ہر اچھے کام کے انجام دینے کی توفیق دیں گے" (ونیسرک للیسریٰ) [1]

---

[1] بعض نے کہا ہے کہ واقعی آیت کا مفہوم و نیسر الیسریٰ لک تھا، اور تاکید کے عنوان سے تقدیم و تاخیر ہوئی ہے اور نیسرک للیسریٰ ہو گیا ہے۔ البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ نیسرک نوفقک کے معنی میں نہ ہو ورنہ تقدیم و تاخیر کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسرے لفظوں میں مقصودِ کلام یہ ہے کہ اس راستہ میں جو تجھے درپیش ہے بہت سی سختیاں اور مشکلات ہیں، وحی کے اخذ کرنے اور اسے یاد رکھنے کی راہ میں بھی، تبلیغِ رسالت میں بھی اور اچھے کام انجام دینے میں بھی۔ ہم ان تمام امور میں (وحی کے حصول، اس کی تبلیغ، نشر و اشاعت، تعلیم دینے اور اس پر عمل کرنے میں) تیری مدد کریں گے اور مشکلات کو تجھ پر آسان کر دیں گے۔

یہ جملہ، ہو سکتا ہے کہ دعوتِ فکرِ پیغمبرؐ کے نفس مضمون، پیغمبرؐ کی ذمہ داریوں اور خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے لائحہ عمل کی طرف بھی اشارہ ہو، یعنی اس کا مفہوم و مضمون آسان ہے، اس کی شریعتِ سہلہ ہے اور اس خدائی دین میں حوصلہ شکن تکلیفیں اور ذمہ داریاں نہیں ہیں۔

اس بنا پر مندرجہ بالا آیات کا ایک بہت ہی وسیع مفہوم ہے۔ اگرچہ بہت سے مفسرین نے اسے اس کی ایک ہی جہت میں محدود کر دیا ہے، اور واقعی اگر خدا کی مدد، توفیق اور نصرت نہ ہوتی تو ان تمام مشکلات پر پیغمبرؐ کا قابو پانا ممکن نہیں تھا۔ خود پیغمبرِ اسلامؐ کی زندگی بھی اس حقیقت کی تعلیم کا ایک نمونہ تھی۔ آپ کسی چیز میں بھی، قطع نظر اس سے کہ لباس، خوراک، سواری یا زندگی کے دوسرے وسائل میں سخت گیر نہیں تھے۔ ہر مناسب غذا کھا لیتے، ہر قسم کا لباس جو باعثِ عیب و نقص نہ ہوتا، زیبِ تن فرما لیتے، کبھی بستر پر آرام کرتے، کبھی عام فرش پر، حتیٰ کہ کبھی بیابان کے ریت پر۔ نیز آپ ہر قسم کے تعلق اور تقید سے آزاد تھے۔

پیغمبرِ اسلامؐ پر وحی آسمانی کی موہبت و نعمت اور آپ کے لیے توفیق اور تسہیل امور کے وعدے کے بیان کرنے کے بعد آپ کی اہم ترین ذمہ داری کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "پس تذکر اگر تذکر مفید ہو" (فذکر ان نفعت الذکریٰ)۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تذکر ہر حال مفید ہے۔ وہ افراد جو اس سے کسی طرح بھی مستفید نہ ہوں، وہ بہت کم ہیں۔ علاوہ ازیں اور کچھ نہیں تو کم از کم منکرین پر اتمامِ حجت کا سبب تو ہے، جو بجائے خود ایک بہت بڑی منفعت ہے[1]

جبکہ بعض کا نظریہ ہے کہ آیت میں کچھ محذوف ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ تذکر کر اور یاد دہانی کرا چاہے مفید ہو یا نہ ہو (فذکر ان نفعت الذکریٰ اولم تنفع) یہ حقیقت میں اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ نحل کی آیت ۸۱ میں آئی ہے (وجعل لکم سرابیل تقیکم الحر) خدا نے تمہارے لیے پیراہن قرار دیئے ہیں جو تمہیں گرمی (سردی)

---

[1] اور یہ جو قرآن کہتا ہے سواء علیہم ءانذرتہم ام لم تنذرہم لا یؤمنون) ان کے لیے برابر ہے چاہے تو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے (بقرہ - ۶) یہ لوگوں کی صرف ایک اقلیت کے لیے ہے، ورنہ اکثریت ہر حال اچھی باتوں کا اثر لیتی ہے۔ البتہ بعض لوگ بہت زیادہ اور اس کے برعکس بعض لوگ بہت کم اثر لیتے ہیں۔ لیکن ہر حال سنجیدہ باتیں عام طور پر اثر کرتی ہیں۔ اس وجہ سے یہاں جملہ شرطیہ قید غالب کی قبیل سے ہے جو اثر نہیں رکھتی۔

سے محفوظ رکھتے ہیں۔

اس آیت میں صرف گرمی کا ذکر ہوا ہے اور سردی قرینۂ تقابل سے معلوم ہوتی ہے لیکن بعض مفسرین کا اصرار ہے کہ جملہ شرطیہ یہاں مفہوم رکھتا ہے اور مراد یہ ہے کہ وہاں تذکر کر جہاں مفید ہو اور جہاں اس کا کوئی فائدہ نہ ہو تو پھر اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ " ان " یہاں شرطیہ نہ ہو بلکہ قدؔ کے معنی میں تاکید و تحقیق کے لیے ہو، اور جملہ کا مفہوم یہ ہو کہ تذکر کر کیونکہ تذکر مفید و فائدہ بخش ہے۔ ان چاروں تفسیروں میں سے سب سے زیادہ مناسب پہلی تفسیر ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کا لائحۂ عمل بھی اس پر گواہ ہے کہ وہ اپنی تبلیغات و تذکرات کے لیے کسی قسم کی قید و شرط کے قائل نہیں تھے۔ سب کو وعظ و نصیحت کرتے اور خوفِ خدا دلاتے تھے۔

بعد والی آیت میں تذکر، وعظ اور انذار کے مقابلہ میں لوگوں کے ردِ عمل کو پیش کرتا ہے اور انہیں دو گروہوں میں تقسیم کرتے ہوئے فرماتا ہے: "عنقریب وہ لوگ جو خدا سے ڈرتے ہیں اور مسئولیت و ذمہ داری کا احساس کرتے ہیں، متذکر ہوں گے" (سیذکر من یخشٰی)۔

جی ہاں! جب تک روح میں خوفِ خدا اور خشیتِ الٰہی نہ ہو، یا دوسرے لفظوں میں حق طلبی اور حق جوئی کی روح انسان میں نہ ہو، جو تقویٰ کا ایک مرتبہ ہے تو مواعظِ الٰہیہ اور تذکراتِ انبیاء فائدہ نہیں پہنچاتے۔ اسی لیے سورہ بقرہ کے آغاز میں پروردگار قرآن کو پرہیزگاروں کے لیے سببِ ہدایت شمار کرتے ہوئے فرماتا ہے: (ھدًی للمتقین) ایک بعد والی آیت میں دوسرے گروہ کو پیش کرتے ہوئے مزید ارشاد ہوتا ہے: "لیکن زیادہ بدبخت افراد اس سے دوری اختیار کرتے ہیں" (ویتجنبھا الاشقی) [1]

بعض روایات میں آیا ہے کہ ابن عباس کہتے ہیں کہ آیت (سیذکر من یخشٰی) عبداللہ ابن مکتوم، پاک دل و حق طلب نابینا کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ (ویتجنبھا الاشقی) ولید بن مغیرہ اور عتبہ بن ربیعہ کے بارے میں ہے، جو کفار و مشرکین کے سرغنہ تھے [2]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اشقیٰ سے مراد یہاں معاندین اور دشمنانِ حق ہیں، اس لیے کہ لوگوں کے تین گروہ ہیں: ایک عارف و آگاہ گروہ، دوسرا متوقف اور شک کرنے والا گروہ اور تیسرا دشمنی کرنے والا گروہ۔ فطری و طبعی امر ہے کہ پہلا اور دوسرا گروہ تو نصائح سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ صرف تیسرا گروہ ہے جو مثبت فائدہ نہیں اٹھاتا۔ ان کے بارے میں نصائح کی تاثیر صرف وہی اتمامِ حجت ہے جس کا ذکر کیا گیا۔

---

[1] یتجنبھا کی ضمیر ذکریٰ کی طرف لوٹتی ہے جو گزشتہ آیات میں آیا ہے (غور کیجئے)۔

[2] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰ ص ۷۱۱۰، دوسرا حصہ تفسیر کشاف و روح المعانی زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

اس آیت سے ضمنی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام تیسرے گروہ کو بھی اپنی نصائح سے مستفید فرماتے تھے، لیکن وہ لوگ دُوری اختیار کرتے اور روگرداں ہوتے تھے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں شقاوت و خشیت کا نقطۂ مقابل قرار دیا گیا ہے جبکہ قاعدۃً اسے سعادت کے مقابلہ میں قرار پانا چاہیئے تھا۔ یہ اس بنا پر ہے کہ انسان کی سعادت اور خوش بختی کا اصل سبب مسئولیت و ذمہ داری کا احساس اور خشیت ہی ہے۔

بعد والی آیت میں آخری گروہ کی سرنوشت اس طرح بیان فرماتا ہے: " وہ شقی جو دوزخ کی عظیم آگ میں داخل ہوگا اور وہاں قرار پائے گا " (الذی یصلی النار الکبریٰ)۔ پھر اس آگ میں ہمیشہ رہے گا، نہ مرے گا اور نہ زندہ رہے گا۔ (ثم لا یموت فیھا ولا یحییٰ)۔ یعنی نہ تو مرے گا تاکہ آسودہ ہو اور نہ اس حالت کو جس میں وہ ہوگا زندگی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ وہ ہمیشہ زندگی اور موت کے درمیان ہاتھ پاؤں مارتا رہے گا جو کیفیت ایسے افراد کے لیے بدترین بلا و مصیبت ہے۔

(النار الکبریٰ) سے کیا مراد ہے؟ ایک جماعت کا کہنا ہے کہ جہنم کا سب سے نچلا طبقہ اسفل السافلین ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ وہ شقی ترین اور معاند ترین لوگ ہیں۔ لہٰذا ان پر نازل ہونے والا عذاب بھی سخت ترین اور ہولناک ترین ہونا چاہیئے۔ لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آگ کی لفظ کبریٰ کے ساتھ توصیف آتشِ صغریٰ کے مقابلہ میں ہے یعنی اس دنیا کی آگ کے مقابلہ میں، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

(ان نارکم ھذہ جزء من سبعین جزء من نار جھنم وقد اطفئت سبعین مرۃ بالماء ثم التھبت ولولا ذالک ما استطاع ادمی ان یطیقھا)۔ " یہ تمہاری آگ جہنم کی آگ کے ستر اجزا میں سے ایک ہے۔ وہ پانی سے ستر مرتبہ دھوئی گئی پھر بھی وہ بھڑک اٹھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر کوئی آدمی اس کے تحمل کی طاقت نہ رکھتا اور اس کے قریب نہ ٹھہر سکتا[1]

مشہور دعائے کمیل جو امیرالمومنین حضرت علیؑ سے منقول ہے اس میں دنیا کی آگ اور آخرت کی آگ کے موازنہ میں ہم پڑھتے ہیں (علی ان ذالک بلاء و مکروہ قلیل مکثہ یسیر بقائہ قصیر مدتہ) یہ ایسی بلا اور مکروہ و ناپسندیدہ چیز ہے جس میں توقف کم ہے، اس کی بقا مختصر ہے اور اس کی مدت تھوڑی ہے۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۸ ص ۲۸۸ حدیث ۲۱۔

(۱۴) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰىۙ

(۱۵) وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰىؕ

(۱۶) بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَاؗۖ

(۱۷) وَ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰىؕ

(۱۸) اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰىۙ

(۱۹) صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰى۠

ترجمہ

(۱۴) یقیناً وہ رستگار ہوگا جو تزکیہ کرے۔

(۱۵) اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرے اور نماز پڑھے۔

(۱۶) بلکہ تم دنیا کی زندگی کو مقدم سمجھتے ہو۔

(۱۷) جبکہ آخرت زیادہ پائیدار اور بہتر ہے۔

(۱۸) یہ احکام پہلی آسمانی کتب میں آچکے ہیں۔

(۱۹) کتب ابراہیم و موسیٰ میں۔

تفسیر

وہ دستور العمل جو تمام آسمانی کتب میں آیا ہے

گزشتہ آیات میں کفار اور دشمنانِ حق کے بارے میں سخت سزا کا اشارہ ہوا ہے۔ زیرِ بحث آیات میں اہلِ ایمان کی نجات اور اس نجات کے اسباب و عوامل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے:

"یقیناً وہ شخص فلاح پائے گا جو اپنا تزکیہ کرے" (قد افلح من تزکّٰی)۔ اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر

کرے اور اس کے بعد نماز پڑھے (و ذکر اسم ربہ فصلّٰی)۔ اس طرح فلاح و رستگاری اور کامیابی و نجات کے عوامل ان تین چیزوں کو بتایا ہے۔ تزکیہ، نام خدا کا ذکر اور اس کے بعد نماز پڑھنا۔

تزکیہ سے مراد کیا ہے؟ اس سلسلہ میں علماء نے مختلف تفسیریں کی ہیں۔ پہلی روح کو نجاستِ شرک سے پاک کرنا ہے، گزشتہ آیات کے قرینہ سے، نیز اس قرینہ سے بھی کہ اہم ترین تطہیر شرک سے تطہیر ہے۔

دوسری یہ کہ تزکیہ سے مراد دل کو اخلاقی رذائل سے پاک کرنا اور اعمال صالح بجالانا ہے۔ قرآن مجید میں آیاتِ فروح کے نقطۂ نظر سے دوسری آیات کے علاوہ سورۂ مومنین کے آغاز کی آیتیں ہیں جو فلاح کو اعمال صالح کی روح قرار دیتی ہیں اور سورۂ شمس آیہ ۹ کے حوالے سے جس میں تقویٰ اور فجور کے بیان کے بعد فرماتا ہے: (قد افلح من زکّٰھا) وہ فلاح پا گیا جس نے اپنے نفس کو فسق و فجور اور دوسرے بُرے اعمال سے پاک کیا اور تقویٰ سے آراستہ کیا۔

تیسری تفسیر یہ ہے کہ تزکّی سے مراد زکوٰۃ فطرہ دینا ہے۔ عید فطر کے دن پہلے زکوٰۃ فطر ادا کی جائے، پھر نمازِ عید پڑھی جائے۔ جیسا کہ متعدد روایات میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے[1] اور یہی معانی منابع اہل سنت میں امیرالمومنینؑ سے منقول ہیں[2]

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورہ اعلیٰ مکّی ہے اور مکّہ میں نہ زکوٰۃ فطرہ مقرر ہوئی تھی، نہ ماہِ رمضان کے روزے، نہ نمازِ عید ہی اور فطرہ کے مراسم۔ اس سوال کے جواب میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ کوئی مانع نہیں ہے کہ اس سورہ کا پہلا حصّہ مکّہ میں نازل ہوا ہو اور ذیلی حصّہ مدینہ میں۔

یہ احتمال بھی قوی طور پر موجود ہے کہ مندرجہ بالا تفسیر ایک واضح مصداق کے بیان کی قبیل سے ہو اور آیت کی تطبیق کسی واضح فرد پر ہو۔ بعض نے یہاں تزکیہ کو مالی صدقہ دینے کے معنی میں سمجھا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ تزکیہ کے وسیع معانی ہیں۔ یہ رُوح سے شرک کی آلودگی کو دور کرنے کے معنی میں بھی ہے، اخلاقِ رذیلہ سے خود کو پاک کرنے کے معنی میں بھی، ہر قسم کے مکر و ریا سے پاک کرنے کے معنی میں بھی اور راہِ خدا میں زکوٰۃ دے کر مال و جان کی تطہیر کے معنی میں بھی۔ جیسے کہ سورۂ توبہ آیہ ۱۰۳ (خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم و تزکیھم بھا) "ان کے مال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) لے تاکہ انہیں اس کے ذریعہ پاک کرے اور ان کا تزکیہ کرے" کے مطابق زکوٰۃ کا دینا روح و جان کی پاکیزگی کا سبب ہے۔

اس بناء پر تمام تفسیریں آیت کے وسیع معنی کے اعتبار سے ممکن ہے کہ ٹھیک ہوں۔ قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں پہلے تزکیہ، اس کے بعد پروردگار کا ذکر اور پھر نماز کی بات ہوئی ہے۔

---

[1] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۵۶ حدیث ۱۹ تا ۲۱۔

[2] روح المعانی، جلد ۳۰ ص ۱۱۰ اور تفسیر کشاف، جلد ۴ ص ۷۴۰۔

بعض مفسرین کے بقول مکلف کے تین عملی مراحل ہیں۔ پہلا دل سے فاسد عقائد کا ازالہ، اس کے بعد اللہ کی معرفت اور اس کے صفات و اسماء کا دل میں حضور، اور تیسرا مشغلہ ہے " اشتغال بخدمت" یہ مندرجہ بالا آیت نے تین مختصر جملوں میں ان تینوں مرحلوں کی طرف اشارہ کیا ہے[1]

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ نماز کا ذکر پروردگار کی فرع شمار کیا گیا ہے۔ یہ اس بنا پر ہے کہ جب تک اس کی یاد میں محو نہ ہو اور نورِ ایمان دل میں سایہ فگن نہ ہو اس وقت تک بندہ نماز کے لیے کھڑا نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں وہ نماز قدر و قیمت رکھتی ہے جس کے ساتھ اس کا ذکر بھی ہو اور وہ اس کی یاد کو ساتھ لیے ہوئے ہو اور یہ جو بعض لوگوں نے ذکر پروردگار سے مراد صرف اللہ اکبر یا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو لیا ہے، یہ درحقیقت اس کے بعض مصادیق کا بیان ہے۔

اس کے بعد اس فلاح و رستگاری کے دستور العمل سے انحراف کے اصلی عامل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "بلکہ تم دنیاوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو اور اسے ترجیح دیتے ہو" (بل تؤثرون الحیٰوۃ الدنیا) جبکہ آخرت بہتر اور زیادہ پائیدار ہے (والاٰخرۃ خیر و ابقٰی)۔

یہ حقیقت میں وہی مفہوم ہے جو احادیث میں بھی آیا ہے (حب الدنیا رأس کل خطیئۃ) "دنیا کی محبت ہر گناہ کا سرچشمہ ہے"[2]

حالانکہ عقل کبھی اجازت نہیں دیتی کہ انسان سرائے باقی کو متاعِ فانی کے بدلے فروخت کرے اور ان مختصر سی لذتوں کو جو انواع و اقسام کے درد و رنج ساتھ لیے ہوئے ہیں ان تمام جاودانی اور ہر قسم کی تکالیف سے مبرا نعمتوں پر مقدم سمجھے اور ان پر ترجیح دے۔

انجام کار سورہ کے آخر میں فرماتا ہے: "یہ احکام جو بتائے گئے ہیں اس کتابِ آسمانی ہی میں محدود نہیں ہیں بلکہ پہلی کتب اور صحف میں بھی آچکے ہیں": (انّ ھٰذا لفی الصحف الاولیٰ) یعنی صحف و کتب ابراہیمؑ و موسیٰؑ میں۔ (صحف ابراھیم و موسیٰ)[3]

یہ بات کہ ھذا کا مشارٌ الیہ کیا ہے اس سلسلہ میں کئی نظریات موجود ہیں۔ ایک جماعت نے کہا ہے تزکیہ، نماز اور حیاتِ دنیا کو آخرت پر ترجیح نہ دینے کے آخری حکم کے سلسلہ میں اشارہ ہے، اس لیے کہ یہی انبیاء کی سب سے اہم اور بنیادی تعلیمات تھیں اور ان کا بیان تمام کتبِ آسمانی میں موجود ہے۔

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۳۱ ص ۱۴۷۔

[2] یہ حدیث مختلف عبارتوں کے ساتھ امام جعفر صادقؑ اور امام زین العابدینؑ سے، بلکہ تمام انبیاء سے نقل ہوئی ہے اور یہ اس کی حد سے زیادہ اہمیت کی بنا پر ہے۔ نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۵۶، ۵۵۔

[3] ہو سکتا ہے کہ صحف ابراہیم و موسیٰ صحف الاولیٰ کی وضاحت ہو، یہ احتمال بھی ہے کہ اس کا بیان اور واضح مصداق ہو۔ پہلی صورت میں گزشتہ تمام انبیاء کی کتب پر حاوی ہوگا اور دوسری صورت میں صرف ابراہیم و موسیٰ کے صحیفے مراد ہوں گے۔

بعض دوسرے مفسرین اس کو ساری سورۃ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، اس لیے کہ سورۃ توحید سے شروع ہوتی ہے اور نبوت کا تذکرہ جاری رکھتے ہوئے عملی دستورالعمل پر ختم ہو جاتی ہے۔ بہرحال یہ تعبیر بتاتی ہے کہ اس سورہ کا اہم مضمون، بالخصوص آخری آیات عالم ادیان کے اصولِ اساسی میں سے ہے، تمام انبیاء کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے اور یہ خود اس سورۃ کی عظمت اور ان تعلیمات کی اہمیت کی نشانی ہے۔

"صحف" صحیفہ کی جمع ہے جو یہاں لوح، تختی اور صفحہ کے معنی میں ہے جس پر کوئی چیز لکھتے ہیں۔ مندرجہ بالا آیات بتاتی ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ بھی آسمانی کتابوں کے حامل تھے۔ ایک روایت حضرت ابوذرؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے پیغمبرِ اکرمؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ انبیاء کی تعداد کیا ہے تو آپ نے فرمایا "ایک لاکھ چوبیس ہزار" میں نے عرض کیا "ان میں سے رسول کتنے تھے؟" فرمایا "تین سو تیرہ اور باقی صرف نبی تھے" میں نے عرض کیا "حضرت آدمؑ نبی تھے؟" فرمایا "ہاں۔ خدا نے ان سے کلام کیا اور انہیں اپنے دستِ قدرت سے خلق فرمایا"

اس کے بعد پیغمبرِ اکرمؐ نے مزید فرمایا: "اے ابوذر! انبیاء میں سے چار افراد عرب تھے: ہود، صالح، شعیب اور تیرا پیغمبر" میں نے کہا "اے اللہ کے رسولؐ! خدا نے کتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں؟" فرمایا "ایک سو چار کتابیں۔ دس کتابیں آدمؑ پر، پچاس کتابیں شیثؑ پر اور تیس کتابیں اخنوخ پر، جو ادریسؑ ہیں۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم سے لکھا۔ ابراہیمؑ پر دس کتابیں اور توریت، انجیل، زبور اور فرقان موسیٰؑ، عیسیٰؑ، داؤدؑ اور پیغمبرِ اسلام پر نازل ہوئیں"[1]

(الصحف الاولیٰ) کی تعبیر ابراہیمؑ و موسیٰؑ کی کتب کے بارے میں آخری صحف کے مقابل ہے جو حضرت عیسیٰؑ اور پیغمبرِ اسلامؐ پر نازل ہوئے۔

ایک نکتہ

حُبّ الدنیا رأس کل خطیئۃ کی تحلیل

یقیناً مومن افراد کے لیے یہ قرآنی محاسبہ، جو مندرجہ بالا آیت میں آیا ہے اور جو دنیا و آخرت کے موازنے کے سلسلہ میں ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ آخرت بہتر اور زیادہ پائیدار ہے، مکمل طور پر واضح ہے۔ لیکن اس کے باوجود مومن اکثر اوقات اپنے اس علم و آگاہی کو اپنے قدموں تلے روندتا ہے اور گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے۔

اس سوال کا جواب ایک ہی جملہ میں دیا جا سکتا ہے کہ یہ سب ان خواہشات کے نتیجے میں ہوتا ہے جن کا انسان کے وجود پر غلبہ ہوتا ہے اور خواہشات کے غلبہ کا سرچشمہ بھی حُبِّ دنیا ہی ہے۔ حُبِّ دنیا میں یہ سب چیزیں شامل ہیں:۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۷۶۔

حُبِ مال، حُبِ مقام، شہوتِ جنسی، تفوّق طلبی، تن پروری، جذبۂ انتقام اور اسی قسم کے دیگر امور جو انسان کی رُوح میں کبھی کبھی اس قسم کا طوفان برپا کر دیتے ہیں کہ اُس کی تمام معلومات کو برباد کر دیتے ہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات اس کی حسِ تشخیص ہی کو ختم کر دیتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے۔

یہ جو بعض اسلامی روایات میں بار ہا حُبِ دُنیا کو تمام گناہوں کا سرچشمہ بتایا گیا ہے یہ ایک حقیقت واقعی ہے جسے ہم نے خود اپنی زندگی اور دوسروں کی زندگی میں بار ہا آزمایا ہے۔ اسی بنا پر گناہ کی جڑوں کو کاٹنے کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ ہم دنیا کی محبت اور اس کے عشق کو دل سے باہر نکال دیں۔

ہمیں چاہیئے کہ ہم دنیا کو ایک وسیلہ، رہگزر، پل اور کھیتی سمجھیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ دنیا کے عاشق، جو دو راہے پر کھڑے ہیں یعنی متاعِ دنیا کے حصول اور رضائے خدا کے حصول کا دوُا ہے، وہ کسی دوسری چیز کو ترجیح دیں۔

اگر ہم اپنے جرائم کے دفتر کو دیکھیں تو مندرجہ بالا آیت کی حقیقت ہمیں اس میں اچھی طرح نظر آجائے گی۔ اگر ہم لڑائیوں، خونریزیوں اور قتل و غارت کے اسباب و علل کو موردِ توجہ قرار دیں تو ان سب میں حُبِ دنیا بنائے فساد کے طور پر ملے گی۔

باقی رہا یہ کہ حبِ دنیا کو کس طرح دل سے نکالا جاسکتا ہے جبکہ ہم سب ابنائے دنیا ہیں اور ماں سے بیٹے کی محبت ایک امرِ فطری ہے۔ یہ چیز فکری تعلیم و تربیت اور تہذیبِ نفس کی متقاضی ہے۔ من جملہ ان امور کے جو حُبِ دنیا کو دل سے نکالنے کے خواہشمند لوگوں کی مدد کر سکتے ہیں اہلِ دنیا کے انجام کار کا مطالعہ ہے۔

فراعنہ نے باوجود قوت اور مالی وسائل کے آخر کار کیا کیا؟ قارون ان خزانوں میں سے جن کی چابیاں کئی طاقتور انسان مشکل سے اٹھا سکتے تھے، اپنے ساتھ کیا لے کر گیا؟ وہ عظیم طاقتیں جنہیں ہم اپنے زمانے میں دیکھتے ہیں ایک موجِ ہوا کے ذریعہ ان کی زندگی کا چراغ گل کر دیا جاتا ہے اور صرف ایک گردشِ لیل و نہار کے نتیجے میں ان کا تختِ سلطنت الٹ کر رکھ دیا جاتا ہے۔ وہ اپنے قصرِ دولت و ثروت کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، یا زیرِ خاک پنہاں ہو جاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں ہمارے لیے بہترین معلّم کا کام دے سکتی ہیں۔

اس وسیع و عریض گفتگو کو ہم امام زین العابدینؑ کی ایک بہت ہی معنی خیز حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ آنجنابؑ سے کچھ لوگوں نے پوچھا "خدا کے نزدیک سب سے افضل عمل کونسا ہے"؟ آپؑ نے فرمایا:

رما من عمل بعد معرفة الله عزوجل و معرفة رسوله افضل من بغض الدنیا) "خدا اور اس کے رسولؐ کی معرفت کے بعد بغضِ دنیا سے بہتر کوئی عمل نہیں ہے"؟ اس کے بعد آپ نے مزید فرمایا "محبت دنیا کے بہت سے شعبے ہیں اور گناہوں کے بھی بہت سے شعبے ہیں۔ سب سے پہلی چیز جس کی وجہ سے خدا کی نافرمانی ہوئی وہ ابلیس کی نافرمانی تھی، جس وقت اس نے انکار کیا اور تکبر کر کے کافرین میں سے ہو گیا۔

اس کے بعد حرص تھی جو آدمؑ و حوّا کے ترکِ اولیٰ کا سبب بنی، جس وقت کہ خداوندِ متعال نے ان سے فرمایا جنت کی جس جگہ سے چاہو کھاؤ لیکن اس ممنوع درخت کے قریب نہ جانا ورنہ ظالم ہو جاؤ گے۔ لیکن وہ اس چیز کی

طرف گئے جس کی انہیں ضرورت نہیں تھی۔یہی چیز ان کی اولاد کے لیے قیامت تک باقی رہ گئی، اس لیے کہ زیادہ تر چیزیں جو انسان طلب کرتا ہے اس کی ضرورت سے تعلق نہیں رکھتیں۔ (عام طور پر ضرورتیں گناہ کا سبب نہیں ہیں۔ وہ چیز جو سبب گناہ ہے وہ ہوا و ہوس اور ضرورت سے زائد امور ہیں)۔

اس کے بعد حسد تھا جو آدمؑ کے بیٹے کا سببِ گناہ تھا۔اس نے اپنے بھائی سے حسد کیا اور اس کو قتل کر دیا۔ اس کے شعبوں میں سے عورتوں کی محبت، دنیا کی محبت[1] حُبِّ ریاست، حُبِّ راحت و آرام، حُبِّ گفتگو وکلام، حُبِّ برتری اور حُبِّ دولت و ثروت ہے۔ یہ سات صفات ہیں جو سب کی سب حُبِّ دنیا میں جمع ہیں۔ اسی لیے انبیاء و مرسلین اور علمائے اعلام نے اس حقیقت سے آگاہی کے لیے کہا ہے کہ "حُبّ الدنیا راس کل خطیئۃ" ہے[1]

خداوندا! دنیا کی محبت، جو تمام گناہوں کا سرچشمہ ہے، اسے ہمارے دلوں سے نکال دے۔

پروردگارا! تو خود ہی تکامل وارتقار کے پرپیچ راستے میں ہمارا ہاتھ تھام کر منزلِ مقصود تک ہماری ہدایت فرما۔

بار الٰہا! تو آشکار و پنہاں سب سے آگاہ ہے۔ ہمارے مخفی اور آشکار گناہ اپنے لطف وکرم سے بخش دے۔

آمین یارب العالمین

سورۂ اعلیٰ کا اختتام

آغاز ماہ مبارک رمضان ۱۴۰۷ھ

---

[1] ایسا نظر آتا ہے کہ یہاں حُبِّ دنیا سے مراد دنیا میں باقی رہنے کی محبت ہے، جو سات شعبوں میں سے ایک شمار ہوتی ہے اور عام طور پر طویل امیدوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اصولِ کافی جلد ۲ باب حُبّ الدنیا والحرص علیھا حدیث ۸۔ اصولِ کافی کے اس باب میں اس سلسلہ میں ۱۷ روایات نقل ہوئی ہیں جو بہت ہی اخلاقی اور تربیتی ہیں۔

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا

اس میں ۲۶ آیتیں ہیں

تاریخِ ابتدا یکم رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ

سورہ غاشیہ کے مشتملات اور اس کی فضیلت

یہ سورہ جو مکی سورتوں میں سے ہے، زیادہ تر تین محوروں کے گرد گردش کرتا ہے۔

پہلا۔ معاد وقیامت کی بحث، بالخصوص مجرموں کا دردناک انجام اور مومنوں کو ملنے والا شوق انگیز ثواب۔

دوسرا۔ توحید کی بحث جو آسمان کی خلقت، پہاڑوں اور آسمان کی آفرینش کی طرف اشارہ اور انسان کی تین موضوعات کی طرف توجہ کے بیان سے عبارت ہے۔

تیسرا۔ نبوت کی بحث، پیغمبر اسلامؐ کے فرائض اور ان کی ذمہ داریوں کے بیان پر مبنی ہے۔

یہ سورہ مجموعی طور پر مکی سورتوں کے مقاصد ہی کو موضوع گفتگو بناتا ہے جن سے ایمان واعتقاد کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے سلسلہ میں ایک حدیث پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے: من قرأ ھا حاسبہ اللہ حساباً یسیراً "جو شخص اس کی تلاوت کرے گا پروردگار عالم بروز قیامت اس کا حساب آسان کرے گا۔

ایک اور حدیث امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے "جو شخص واجب اور مستحب نمازوں میں اس سورہ کی قرأت کی پابندی کرے گا، خدا اسے دنیا وآخرت میں اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے گا"۔

یقیناً یہ سب ثواب اسی صورت میں انسان کو حاصل ہوگا جب اس کی تلاوت اس کے لیے فکر وعمل کا محرک ثابت ہو۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

(۱) هَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ الۡغَاشِيَةِ ؕ

(۲) وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۙ

(۳) عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۙ

(۴) تَصۡلٰى نَارًا حَامِيَةً ۙ

(۵) تُسۡقٰى مِنۡ عَيۡنٍ اٰنِيَةٍ ؕ

(۶) لَيۡسَ لَهُمۡ طَعَامٌ اِلَّا مِنۡ ضَرِيۡعٍ ۙ

(۷) لَّا يُسۡمِنُ وَلَا يُغۡنِىۡ مِنۡ جُوۡعٍ ؕ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے۔

(۱) کیا غاشیہ (قیامت کا دن جس کے وحشت ناک حوادث سب کا احاطہ کر لیں گے) کی داستان تجھ تک پہنچی ہے؟

(۲) چہرے اس دن خاشع اور ذلّت بار ہوں گے۔

۳ وہ جنہوں نے ہمیشہ عمل کیا ہے اور تھک چکے ہیں (اور کوئی نتیجہ انہیں حاصل نہیں ہوا)۔

۴ دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔

۵ انہیں حد سے زیادہ گرم چشمے سے پلایا جائے گا۔

۶ ضریع (بدبودار اور تلخ خشک کانٹے) کے علاوہ انہیں اور کوئی کھانا نہیں ملے گا۔

ایسی غذا جو نہ انہیں موٹا کرے گی اور نہ ان کی بھوک کو ختم کرے گی۔

تفسیر

بدنصیب تھکے ماندے

اس سورہ کے آغاز میں ہمارا سامنا قیامت کے ایک نئے نام سے ہوا ہے جو غاشیہ ہے۔ فرماتا ہے: "کیا غاشیہ کی داستان تجھ تک پہنچی ہے؟" (ھل اتٰک حدیث الغاشیۃ)۔

"غاشیۃ" "غشاوۃ" کے مادہ سے ڈھانپنے کے معنوں میں ہے۔ قیامت کے لیے اس نام کا انتخاب اس وجہ سے ہے کہ وحشت ناک حوادث اچانک سب کو ڈھانپ لیں گے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دن اولین و آخرین حساب کے لیے جمع ہوں گے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ مراد اس طرح کی آگ ہے جو کافروں اور مجرموں کے چہرہ کو ڈھانپ لے گی۔

پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس آیت میں مخاطب خود پیغمبرؐ کی ذاتِ اقدس ہے۔ اور پیغمبرِ اسلامؐ سے یہ جملہ استفہام کی شکل میں اس عظیم دن کی اہمیت کے پیشِ نظر کہا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی تجویز کیا ہے کہ اس آیت میں مخاطب ہر انسان ہے۔ لیکن یہ مفہوم بعید نظر آتا ہے۔ اس کے بعد مجرموں کی حالت کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"چہرے اس دن خاشع اور ذلّت بار ہوں گے" (وجوہ یومئذ خاشعۃ)۔ ذلّت عذاب اور عظیم سزا کے خوف نے اس دن ان کے تمام وجود کو گھیر رکھا ہوگا، اور چونکہ انسان کے باطنی حالات ہر جگہ سے زیادہ اس کے چہرہ سے ظاہر ہوتے ہیں، لہٰذا خوف، ذلّت اور وحشت کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو اس کے تمام چہرے کو ڈھانپ لیں گے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں "وجوہ" سے کفر کے بڑے بڑے لوگ اور سرغنے مراد ہیں جو ایک گہری ذلّت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لیکن پہلے معنی زیادہ مناسب نظر آتے ہیں۔ اس وقت مزید فرماتا ہے: "یہ ایسے لوگ ہیں جو مسلسل کام کر کے تھک چکے ہیں" (عاملۃ ناصبۃ)۔ زندگانی دنیا میں بہت زیادہ کوشش کرتے ہیں، لیکن تھکن کے علاوہ انہیں کوئی فائدہ نصیب نہیں ہوتا، نہ ان کا بارگاہِ خدا میں کوئی عمل مقبول ہے اور نہ اس دولت و ثروت میں سے وہ کوئی چیز اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں جسے انہوں نے جمع کر رکھا ہے، نہ اپنے بعد وہ کوئی نیک نامی چھوڑ جاتے ہیں، نہ کوئی اولاد صالح۔ وہ محض تھک جانے والے زحمت کش ہیں۔ کتنی بہترین اور عمدہ تعبیر ہے۔ (عاملۃ ناصبۃ)

بعض مفسرین نے اس جملہ کی تفسیر میں کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اس دنیا میں وہ عمل کرتے ہیں لیکن اس کی

خستگی و رنج و تکلیف اپنے ساتھ آخرت میں لے جاتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ مجرموں سے دوزخ میں محنتِ شاقہ لی جائے گی تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ عذاب جھیلیں۔

لیکن ان تینوں تفسیروں میں سے پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔

آخرکار یہ خستہ، تھکے ہوئے اور فضول کام کرنے والے زحمت کش بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے اور اس میں جلیں گے۔ (تصلیٰ ناراً حامیۃً)۔ "تصلیٰ" صلی (بروزن نفی) کے مادہ سے آگ میں داخل ہونے اور اس میں جلنے کے معنی میں ہے (صلی بالنار ای لزمھا واحترق بھا - "آگ میں ہمیشہ رہا اور جلتا رہا")

لیکن ان کا عذاب اسی پر ختم نہیں ہوگا۔ جب وہ آگ کی حرارت کی وجہ سے پیاس میں مبتلا ہوں گے تو حد سے زیادہ کھولتے ہوئے چشمے سے انہیں پلایا جائے گا۔ (تسقٰی من عین اٰنیۃ)۔ "اٰنیۃ" مؤنث ہے اٰنی کے (انی بروزن حلی) مادہ سے جو تاخیر میں ڈالنے کے معنی میں ہے اور کسی چیز کے بیان کرنے کے وقت کے پہنچ جانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہاں ایسے جلانے والے پانی کے معنی میں ہے جس کی حرارت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہو۔

سورہ کہف کی آیت ۲۹ میں ہم پڑھتے ہیں (وان یستغیثوا یغاثوا بماء کالمھل یشوی الوجوہ بئس الشراب وساءت مرتفقاً) اور اگر پانی مانگیں گے تو ان کے لیے ایسا پانی لائیں گے جو کسی پگھلی ہوئی دھات کی طرح ہوگا جو ان کے چہروں کو بھون دے گا۔ وہ کتنا بُرا مشروب ہے اور وہ محلِ اجتماع کتنا بُرا ہے۔

بعد والی آیت میں ان کی خوراک کے بارے میں، جبکہ وہ بھوکے ہوں گے، مزید فرماتا ہے: "وہ ضریع کے علاوہ کوئی طعام نہیں رکھتے" (لیس لھم طعام الا من ضریع)۔ یہ ضریع کیا ہے؟ اس سلسلہ میں مفسرین کے پاس مختلف تفاسیر ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ایک قسم کا کانٹا ہے جو زمین سے چمٹ جاتا ہے۔ اگر وہ تر ہوتا تو قریش اسے شبرق کہتے تھے اور جب خشک ہوتا تو ضریع کہتے۔ وہ ایک زہریلی گھاس ہے جسے کوئی جانور منہ نہیں لگاتا۔[1]

علمائے لغت میں سے خلیل کا کہنا ہے کہ ضریع بدبودار اور سبز گھاس ہے جو دریا سے باہر آن گرتی ہے۔ ابن عباس نے کہا ہے کہ یہ آتشِ جہنم کا ایک درخت ہے جو اگر دنیا میں ہو تو زمین اور جو کچھ اس میں ہے اس سب کو جلا کر فنا کر دے۔ ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے کہ ضریع دوزخ کی آگ میں ایک چیز ہے جو کانٹے کی طرح ہے، حنظل سے زیادہ تلخ اور مردار سے زیادہ بدبودار، آگ سے زیادہ جلانے والی ہے۔ خدا نے اس کا نام ضریع رکھا ہے۔ (الضریع شیٔ یکون فی النار یشبہ الشوک اشد مرارۃ من الصبر وانتن من الجیفۃ واحر من النار سماہ اللہ ضریعاً) بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ضریع ایک ذلیل غذا ہے کہ جہنمی جس سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے بارگاہِ خدا میں تضرع کریں گے)[2] (ہم اس بات کو نہ بھول جائیں کہ ضرع کا مادہ ضعف، ذلت اور خضوع

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰ ص ۱۱۹۷۔

[2] تفسیر قرطبی " " ص ۱۲۰۷۔

کے معنی میں ہے۔[1]

یہ تفاسیر ایک دوسرے کے ساتھ منافات نہیں رکھتیں اور ہو سکتا ہے کہ اس لفظ کے معنی میں یہ سب جمع ہوں۔ اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے:

"نہ وہ انہیں موٹا کرتا ہے نہ ان کی بھوک کو ختم کرتا ہے" (لا یسمن ولا یغنی من جوع)۔ یقیناً اس قسم کی غذا نہ جسم کی تقویت کے لیے اور نہ بھوک کو ختم کرنے میں مفید ہے، وہ ایک ایسی غذا ہے جو بجائے خود ایک عذاب ہے۔ جیسا کہ سورہ مزمل کی آیت ۱۳ میں ہم پڑھتے ہیں:

(وطعاماً ذا غصة و عذاباً الیماً) ہمارے پاس گلے میں پھندہ لگانے والی غذائیں ہیں اور وہ دردناک عذاب ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے اس دنیا میں انواع واقسام کی لذیذ، مرغن اور شیریں غذائیں دوسروں پر ظلم کر کے فراہم کی ہیں اور جنہوں نے محروم لوگوں کو ناگوار غذائیں کھانے کے علاوہ اور کسی غذا کے حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا، ضروری ہے کہ وہاں ان کی ایسی غذا ہو جو ان کے لیے عذاب الیم بنے۔ البتہ جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے جنت کی نعمتیں اور دوزخ کے عذاب دونوں ہم جیسے اسیران زندگی کے لیے ناقابل تشریح ہیں۔ یہ سب اشارے ہیں جنہیں ہم سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

---

[1] ایک اور بحث دوزخیوں کی غذا کے بارے میں جسے قرآن کبھی ضریع، کبھی زقوم اور کبھی غسلین کے نام سے یاد کرتا ہے اور ان تعبیرات میں فرق ہے۔ یہ سب تفسیر نمونہ کی جلد ۱۴ پر سورۂ حاقہ کی آیت ۳۶ کے ذیل میں ہم پیش کر چکے ہیں۔

۸ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۙ
۹ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۙ
۱۰ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۙ
۱۱ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ۚ
۱۲ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۚ
۱۳ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ۙ
۱۴ وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ۙ
۱۵ وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ۙ
۱۶ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ۚ

ترجمہ

۸ اُس دن کچھ چہرے شاداب ہوں گے۔
۹ اس لیے کہ اپنی کوشش سے مسرور ہوں گے۔
۱۰ جو بہشت عالی میں ہوں گے۔
۱۱ جس میں تو کوئی لغو اور بیہودہ بات نہیں سنے گا۔
۱۲ اس میں چشمے جاری ہیں۔
۱۳ اس میں خوبصورت بلند تخت ہوں گے۔
۱۴ اور پیالے جو ان چشموں کے پاس رکھے ہوں گے۔

اور تکیے جو صف بستہ ہوں گے۔

اور بچھے ہوئے فاخرہ فرش ہوں گے۔

تفسیر

بہشت کی روح پرور نعمتوں کے مناظر

اس تشریح کے بعد جو گزشتہ آیات میں دوسری دنیا میں مجرموں اور بدکاروں کی حالت اور جہنم کے عذاب کے بارے میں آئی تھی، ان آیتوں میں نیکوکار مومنین کی حالت کی تشریح اور جنت کی بے نظیر نعمتوں کی توصیف پیش کرتا ہے تاکہ قہر کو مہر سے ملا دے اور انذار کو بشارت سے مربوط کر دے۔ فرماتا ہے:

"چہرے اس دن پُر طراوت اور مسرور ہوں گے" (وجوہ یومئذ ناعمۃ)۔ بدکاروں کے چہروں کے برعکس، جن کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے کہ وہ ذلت و اندوہ میں غرق ہوں گے۔

"ناعمۃ" نعمت کے مادہ سے یہاں ایسے چہروں کی طرف اشارہ ہے جو نعمت سے سرشار، تروتازہ، شاداب اور مسرور و نورانی ہوں گے، جیسا کہ سورہ مطففین کی آیت ۲۴ میں آیا ہے کہ جنتیوں کی توصیف میں فرماتا ہے:

(تعرف فی وجوھھم نضرۃ النعیم) "ان کے چہروں میں تجھے طراوت اور نعمت کی شادابی نظر آئے گی"۔

یہ چہرے ایسے نظر آئیں گے کہ وہ اپنی سعی و کوشش سے راضی اور خوش ہوں گے (لسعیھا راضیۃ)، دوزخیوں کے برعکس جنہوں نے اپنی سعی و کوشش سے سوائے تھکن اور رنج کے اور کچھ حاصل نہیں کیا (عاملۃ ناصبۃ)

بہشتی اپنی سعی و کوشش کو احسن وجہ سے دیکھیں گے اور مکمل طور پر راضی اور خوش ہوں گے، ایسی سعی و کوشش جو لطفِ خدا کے پرتو کے سائے میں کبھی کئی گنا، کبھی دس گنا اور کبھی سات سو گنا اور کبھی اس سے بھی زیادہ بڑھ چکی ہو۔ اور وہ کبھی اس سے بے حد و حساب جزا حاصل کر چکے ہوں گے (انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب) (زمر-۱۰)

اس کے بعد اس مفہوم کی شرح پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے: "وہ بہشت عالی میں قرار پائے ہیں" (فی جنۃ عالیۃ)۔

لفظ "عالیۃ" ممکن ہے کہ علوِ مکانی کی طرف اشارہ ہو، یعنی وہ جنت کے عالی طبقات میں ہیں، یا یہ علوِ مقامی ہے۔ مفسرین نے دونوں احتمال تجویز کیے ہیں، لیکن دوسری تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے، اگرچہ دونوں کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

اس کے بعد اس جنت کی ایک اور صفت، جو روحانی اور معنوی پہلو رکھتی ہے، بیان فرماتا ہے: "وہاں تو کوئی لغو اور بیہودہ بات نہیں سنے گا" (لا تسمع فیھا لاغیۃ)[1] نہ ایسی بات جو نفاق کا پہلو لیے ہوتے ہو،

---

[1] "لاغیۃ" اگرچہ اسم فاعل ہے لیکن اس قسم کے موارد میں اس چیز کے معنی میں ہے جو لغویت لیے ہوئے ہو۔ اسی لیے مفسرین نے اس کی (ذاتِ لغو) لغو لیے ہوئے تفسیر کی ہے۔

نہ عداوت و جنگ و جدل کی، نہ کینہ پروری اور حسد کی، نہ جھوٹ نہ تہمت و افترا، نہ غیبت، نہ لغو و بے فائدہ۔
وہ ماحول کیسا آرام دہ ہوگا جو ان فضولیات سے پاک و مبرا ہو۔

اگر ہم ٹھیک طرح غور و فکر کریں تو دنیاوی زندگی کی پریشانیوں کا زیادہ تر حصہ اسی قسم کی باتوں کا سننا ہے جو روح و جان کے سکون اور اجتماعی نظاموں کو درہم برہم کر دیتا ہے، فتنوں کی آگ بھڑکاتا ہے اور انہیں شعلہ ور کرتا ہے۔

اس روحانی اور آرام و سکون بخش نعمت کے ذکر کے بعد جو جنتیوں کی روح و جان کو لغو و بیہودہ باتیں نہ ہونے کی وجہ سے حاصل ہے، جنت کی مادی نعمتوں کے ایک حصہ کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اس جنت میں چشمے جاری ہیں" (فیھا عین جاریۃ)۔ اگرچہ عین یہاں نکرہ ہے اور عام طور پر نکرہ ایک فرد کے لیے بھی آتا ہے لیکن قرآن کی باقی آیات کے قرینہ سے جنس کے معنی رکھتا ہے اور مختلف چشموں کے معنی میں ہے، جیساکہ سورہ ذاریات کی آیت ۱۵ میں ہے (ان المتقین فی جنات و عیون) پرہیزگار اور متقی لوگ جنت کے باغات اور چشموں کے درمیان قرار پاتے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ جنتیوں کے محلوں میں سے ہر محل میں ایک چشمہ جاری ہے اور عین کا مفرد ہونا یہاں اس طرف اشارہ کرتا ہے، ایسا چشمہ جو جنت والوں کی خواہش کے مطابق جس طرف چاہیں گے اسی طرف بہے گا اور جنت والے نہر وغیرہ بنانے کے محتاج نہیں ہوں گے۔ البتہ کئی چشموں کا ہونا خوبصورتی و زیبائی و طراوت کے اضافہ کے علاوہ یہ فائدہ بھی رکھتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک مخصوص مشروب ہو اور جنتیوں کے ذائقہ کو انواع و اقسام کی شراب طہور سے شیریں و معطر کرتا ہو۔

ان چشموں کے تذکرہ کے بعد جنت کے تخت اور پلنگوں کو موضوع بنا کر فرماتا ہے: "جنت کے ان باغوں میں بلند اور اونچے تخت اور پلنگ ہوں گے" (فیھا سرر مرفوعۃ)۔ "سرر" جمع ہے سریر کی، "سرور" کے مادہ سے، ایسے تخت اور پلنگوں کے معنی میں کہ جن پر مجالس انس و سرور میں بیٹھتے ہیں[1]

ان پلنگوں کا بلند ہونا اس بنا پر ہے کہ جنتی اپنے اطراف کے تمام مناظر اور حسن دیکھ سکیں اور ان کے مشاہدہ سے لذت حاصل کریں۔ ابن عباس کہتے ہیں یہ بلند تخت اور پلنگ اس قسم کے ہیں کہ جس وقت ان کے مالک ان پر بیٹھنے کا ارادہ کریں گے تو وہ تواضع و خضوع کریں گے اور نیچے ہو جائیں گے اور بیٹھنے کے بعد اپنی پہلی حالت پر پلٹ جائیں گے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ان پلنگوں کی مرفوعۃ کے لفظ کے ساتھ توصیف ان کے قیمتی ہونے کی طرف اشارہ ہو اور جیساکہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ وہ سونے کے ٹکڑوں سے بنے ہوئے ہوں گے اور دُر و یاقوت و زبرجد سے مزین

---

[1] مفردات راغب مادہ "سر"۔

ہوں گے۔ دونوں تفسیروں کے مابین جمع بھی ممکن ہے۔

چونکہ ان خوشگوار چشموں اور جنت کی شراب طہور سے فائدہ اٹھانا برتنوں کی احتیاج رکھتا ہے، لہٰذا بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "خوبصورت اور جاذب نظر پیالے ان چشموں کے پاس رکھے ہوں گے" (و اکواب موضوعۃ)۔ جس وقت وہ ارادہ کریں گے تو پیالے چشموں سے پُر ہو کر ان کے سامنے آجائیں گے اور وہ تازہ تازہ نوش کریں گے' ایسی لذت جس کا شعور ساکنین دنیا کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اکواب جمع کوب (بر وزن خوب) جو قدح، پیالے یا ایسے ظرف کے معنی میں ہے جس میں دستہ لگا ہوا ہو۔

اس نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ قرآن میں اہل جنت کی شراب طہور کے برتنوں کے بارے میں مختلف تعبیریں آئی ہیں یہاں اور بعض دوسری آیات میں اکواب کی تعبیر آئی ہے جبکہ بعض دوسری آیات میں اباریق (ابریق کی جمع) کی تعبیر آئی ہے جو ایسے ظرف کے معنی میں ہے جس کا دستہ اور ٹونٹی ہو، سیال چیزوں کو انڈیلنے کی غرض سے۔ یا پھر کأس کا لفظ آیا ہے جس کے معنی شراب سے لبریز جام کے ہیں (یطوف علیھم ولدان مخلدون باکواب واباریق وکأس من معین) ان کے گرد ایسے جوان گردش کرتے ہوں گے جو ہمیشہ جوانی کی طراوت و تر و تازگی کے حامل ہوں گے جبکہ شراب طہور سے لبریز پیالے اور جام ان کے ہاتھ میں ہوں گے اور وہ ان کے سامنے پیش کریں گے۔ (واقعہ ۱۷، ۱۸)۔

اس کے بعد جنت کی نعمتوں کی جزئیات کے متعلق مزید نکات پیش کرتے ہوئے اضافہ فرماتا ہے: "وہاں پلنگوں پر تکیے اور گاؤ تکیے ہوں گے جو صف بستہ ہوں گے" (و نمارق مصفوفۃ)۔ نمارق نمرق (بروزن غلظ) کی جمع ہے جس کے معنی چھوٹے تکیے کے ہیں جس کا سہارا لیتے ہیں[1] اور عام طور پر مکمل استراحت کے وقت ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور مصفوفۃ کی تعبیر اشارہ ہے نظم خاص اور تعدد کی طرف جو ان پر حاکم ہے۔

یہ تعبیر بتاتی ہے کہ وہ مجالس اُنس تشکیل دیں گے اور یہ مجلسیں جو ہر قسم کی لغویت اور بیہودگی سے پاک ہوں گی۔ ان میں صرف الطاف الٰہی، اس کی بے پایاں نعمتوں اور دنیا کے درد و رنج اور عذاب سے نجات کے بارے میں گفتگو ہوگی، اس قدر لطف اور لذت رکھتی ہوں گی کہ کوئی چیز ان کی ہمسر نہیں ہو سکتی۔

آخری زیر بحث آیت میں جنت کے قیمتی فرشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے، "وہاں گراں بہا اور خوبصورت فرش بچھے ہوئے ہوں گے" (و زرابی مبثوثۃ)۔

"زرابی" جمع ہے زربیہ کی جو ایسے قیمتی فرش کے معنی میں ہے جو نرم، راحت بخش اور بیش قیمت ہونگے۔ واضح ہے کہ ان آسائش و لذت کے وسائل و ذرائع کے برابر اور بہت سے دوسرے وسائل موجود ہوں گے جبکہ یہ مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق ہیں۔ ان آیتوں میں جنت کی سات اہم نعمتیں بیان ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک دوسری

---

[1] صحاح اللغۃ مادہ نمرق۔

سے زیادہ جاذب تر اور زیبا تر ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ جنت ایک بے نظیر جگہ ہے، جس میں کسی قسم کا لڑائی جھگڑا نہیں ہے۔ وہاں انواع و اقسام کے رنگ برنگ کے پھل، دل خوش کن نغمے، آبِ جاری کے چشمے، شرابِ طہور، شائستہ خدمتگار، بے مثل بیویاں، مرصّع پلنگ، قیمتی فرش اور پُرخلوص دوست ہوں گے۔ نیز عمدہ اور خوبصورت پیالے ہوں گے جو چشموں کے پاس رکھے ہوئے ہوں گے۔ مختصر یہ کہ ایسی نعمتیں وہاں دستیاب ہوں گی جن کی نہ اس دنیا کے الفاظ کے ذریعے تشریح ممکن ہے اور نہ عالم خیال ہی اس کی توضیح کر سکتا ہے۔

یہ سب چیزیں ان مومنین کی تشریف آوری کی منتظر ہیں جنہوں نے اپنے اعمالِ صالح کے ذریعہ نعمتِ الٰہی کے اس مرکز میں ورود کی اجازت لے لی ہے۔

مذکورہ بالا مادّی لذتوں کے علاوہ معنوی لذتیں بھی ہیں۔ سب سے بڑھ کر لقاء اللہ کی نعمت ہے۔ اس معبودِ حقیقی کے لطف و کرم ہیں کہ اگر ایک لمحے کے لیے مل جائیں تو وہ جنت کی تمام مادّی نعمتوں کے مقابلہ میں بہتر و برتر ہیں۔ بقولِ شاعر ؎

گرم بہ دامن وصل تو دسترس باشد دگر ز طالع خویشم چہ ملتمس باشد؟

اگر بہ ہر دو جہاں یک نفس زنم بر دوست مراز ہر دو جہاں حاصل آن نفس باشد

اگر مجھے تیرے وصل کے دامن تک دسترس حاصل ہو جائے تو پھر میں اپنے مقدر سے اور کیا مانگوں۔ اگر دونوں جہان کے بدلے دوست کے ساتھ ایک سانس لوں تو ان دونوں جہان کا ماحصل یہی ایک سانس ہوگا۔

۱۷ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝

۱۸ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝

۱۹ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝

۲۰ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۝

۲۱ فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝

۲۲ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝

۲۳ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ۝

۲۴ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ۝

۲۵ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ۝

۲۶ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۝

ترجمہ

۱۷ کیا وہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ کس طرح اسے پیدا کیا گیا ؟

۱۸ اور آسمان کی طرف نہیں دیکھتے کہ کس طرح بلندی پر قائم کیا گیا ؟

۱۹ اور پہاڑوں کی طرف کہ کس طرح وہ اپنی جگہ نصب ہوتے ہیں ؟

۲۰ اور زمین کی طرف کہ وہ کس طرح مسطح ہوتی ہے ؟

۲۱ پس نصیحت کر کہ تو صرف نصیحت کرنے والا ہے ۔

۲۲ تو ان پر مسلط نہیں ہے کہ انہیں (ایمان لانے پر) مجبور کرے ۔

(۲۳) مگر وہ شخص جو پشت پھیرے اور کافر ہو جائے۔

(۲۴) جسے خدا بہت بڑے عذاب کی سزا دے گا۔

(۲۵) یقیناً ان کی بازگشت ہماری طرف ہے۔

(۲۶) اور یقیناً ان کا حساب کتاب ہمارے پاس ہے۔

تفسیر

اونٹ کی طرف دیکھو جو خود ایک آیت ہے

گزشتہ آیات میں بہت زیادہ بحثیں جنت اور اس کی آیتوں کے بارے میں آئی تھیں لیکن زیرِ بحث آیات میں ان نعمتوں تک پہنچنے کی اصل کلید کی گفتگو ہے جو اللہ کی معرفت ہے۔ خدا کی قدرت کے چار مظاہر بیان کر کے خدا کی نادر خلقت اور انسان کو اس کے مطالعہ کی دعوت کے ساتھ جنت میں داخل ہونے کی راہ بتاتا ہے اور ضمنی طور پر یہ بھی اشارہ کرتا ہے کہ خدا کی قدرت بے پایاں ہے، جو مسئلہ معاد کے حل کرنے کی کلید ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "کیا وہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح پیدا کیا گیا ہے؟" (افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت)۔ یہاں ہر چیز سے پہلے اونٹ کی تخلیق کے عنوان کو کیوں منتخب کیا گیا ہے؟ اس سلسلہ میں مفسرین نے بہت کچھ تحریر کیا ہے، لیکن یہ چیز واضح ہے کہ ابتدا میں روئے سخن مکہ کے عربوں کی طرف تھا، جن کی زندگی کے بہت سے کام اونٹ سے وابستہ تھے۔ اس سے قطع نظر یہ جانور عجیب و غریب خصوصیتوں کا حامل ہے، جو اسے دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ:

۱۔ بعض جانور ایسے ہیں جن کے صرف گوشت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، بعض ایسے ہیں جن کے صرف دودھ سے استفادہ ہوتا ہے، بعض ایسے ہیں جو صرف سواری کے کام آتے ہیں اور بعض صرف باربرداری کے کام آتے ہیں لیکن اونٹ ایسا جانور ہے جس میں یہ تمام خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اس کا گوشت بھی قابلِ استعمال ہے اور دودھ بھی۔ یہ سواری کے کام بھی آتا ہے اور باربرداری کے لیے بھی اسے کام میں لایا جاتا ہے۔

۲۔ اونٹ زیادہ طاقتور اور زیادہ قوتِ مقاومت رکھنے والا جانور ہے۔ یہ بہت زیادہ سامان اٹھا لیتا ہے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ جس وقت وہ بیٹھا ہوا ہو تو بھاری بوجھ اس پر رکھ دیتے ہیں اور ایک ہی حرکت کے ساتھ اپنے ہاتھوں کے سہارے کھڑا ہو جاتا ہے، جبکہ دوسرے جانور اس قسم کا کام نہیں کر سکتے۔

۳۔ اونٹ آٹھ دس روز تک پیاسا رہ سکتا ہے، اور اس میں بھوک کو برداشت کرنے کی بھی بہت

صلاحیت ہوتی ہے۔

۴۔ اونٹ ہر روز راستے کی طولانی مسافت طے کر سکتا ہے اور ایسی زمینوں سے، جن میں سے گزرنا مشکل ہو جیسے ریگستانی علاقہ جس کو عبور کرنا مشکل ہوتا ہے، آسانی سے گزر سکتا ہے۔ اسی بناء پر عرب اسے صحرائی جہاز کہتے ہیں۔

۵۔ وہ غذا کے اعتبار سے بہت ہی سستا ہے، ہر قسم کے خار وخس وخاشاک کھا لیتا ہے۔

۶۔ وہ غذا کے نامناسب حالات میں بیابان کے ایسے طوفانوں کے درمیان، جو آنکھ اور کان کو اندھا بہرا کر دیتے ہیں، اپنے مخصوص وسائل کے ساتھ، جو خدا نے اس کی پلکوں، کانوں اور ناک میں مہیا کیے ہیں، مقابلہ کرتا ہوا اپنے سفر کو جاری رکھتا ہے۔

۷۔ وہ اپنی پوری قوت وطاقت کے باوجود نہایت مطیع جانور ہے۔ ایک چھوٹا سا بچہ بھی اونٹ کی قطار کی مہار ہاتھ میں لے کر جدھر اس کا دل چاہے انہیں لے کر جا سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ اس جانور کی خصوصیات کچھ اس قسم کی ہیں کہ اس کی خلقت کے بارے میں اگر غور وفکر کیا جائے تو وہ انسان کو خالق عظیم کی طرف متوجہ کرتی ہے، جو ایسی مخلوق کا پیدا کرنے والا ہے۔ جی ہاں! قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: "کیا یہ وادیٔ غفلت کے گمشدہ اس مخلوق کے حیران کن اسرار پر غور نہیں کرتے تاکہ انہیں حق کی راہ حاصل ہو اور یہ بے راہ روی سے بچ جائیں؟" یہ بات بغیر کہے واضح ہے کہ "افلاینظرون" کے جملہ میں نگاہ سے مراد عام نگاہ نہیں، بلکہ ایسی نگاہ ہے جس میں غور وفکر وتفکر وتدبر شامل ہو۔

اس کے بعد آسمان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرماتا ہے: "کیا وہ آسمان کی طرف نہیں دیکھتے کہ کس طرح قرار دیا گیا ہے؟" (والی السماء کیف رفعت)۔ آسمان اپنی اس عظمت کے ساتھ اور اپنے ان سب عجائبات کے ساتھ ستاروں اور کہکشاؤں کے ساتھ اور اس سارے جمال وزیبائی وشکوہ کے ساتھ، جس نے انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے، جس کی وجہ سے اپنے آپ کو وہ اس عظیم اور نظم وحساب سے پُر جہان کے پیدا کرنے والے کے مقابلہ میں چھوٹا اور ناچیز بلکہ اس لامحدود کے مقابلہ میں صفر کے برابر سمجھتا ہے، کس طرح یہ عظیم کرّے اپنی اپنی جگہ پر میخ کی طرح گڑے ہوئے ہیں اور بغیر ستون کے اپنی جگہ برقرار ہیں۔

اس نظام شمسی کے کرّوں کو عالم وجود میں آتے ہوئے لاکھوں سال گزر چکے ہیں، لیکن ان کی حرکتِ اصلی کے محور تبدیل نہیں ہوئے۔ آسمان کی خلقت اگرچہ ہمیشہ عجیب تھی لیکن موجودہ زمانہ کے علمی انکشافات کے سائے میں اس کے عجائبات کئی گنا زیادہ ہو گئے ہیں اور اس کی عظمت اور بھی نمایاں ہو گئی ہے۔ کیا اس عالم عظیم کے خالق ومدبّر کے بارے میں غور وفکر نہیں کرنا چاہیے اور اس کے بلند وعظیم مقاصد کے قریب نہیں جانا چاہیے؟

اس کے بعد آسمان سے ہٹ کر زمین کو موضوعِ گفتگو بناتے ہوئے فرماتا ہے: "کیا وہ پہاڑوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح اپنی جگہ پر نصب ہوئے ہیں؟" (والی الجبال کیف نصبت)۔ وہ پہاڑ جن کی جڑیں ایک دوسرے سے متصل ہیں، زمین کے اطراف کو زرہ کے حلقوں کی مانند گھیرے ہوئے ہیں اور اندرونی پگھلے ہوئے مادہ سے پیدا

ہونے والے زلزلوں اور چاند وسورج کی قوتِ جاذبہ سے پیدا ہونے والے مدّ و جزر کو کم کرتے ہیں۔ وہ پہاڑ جوان طوفانوں کے مقابلہ میں قابلِ اطمینان پناہ گاہ اور ڈھال ثابت ہوتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو کرہ زمین ایسے بیابانوں میں تبدیل ہو جاتا جن میں زندگی گزارنا ناممکن ہوتا۔

وہ پہاڑ جو پانی کے ذخیروں کو اپنے اندر محفوظ کیے ہوئے ہیں اور انہیں آہستہ آہستہ پیاسی زمینوں کی طرف روانہ کرتے ہیں اور اپنے چاروں طرف زندگی کی مسرت، ہریالی، خوشی، طراوت اور تروتازگی پیدا کرتے ہیں۔ غالباً یہی پہلو ہیں جن کی وجہ سے دوسری آیات میں پہاڑوں کو زمین کی میخیں کہا گیا ہے۔ اصولی طور پر پہاڑ عظمت وصلابت کے مظہر ہیں اور ہر جگہ خیر وبرکت کا سبب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان پہاڑوں پر تفکر کی زیادہ صلاحیت محسوس کرتا ہے اور یہ بات بلا سبب نہیں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اپنی بعثت سے مدتوں پہلے جبلِ نور اور غارِ حرا میں عبادت میں مشغول رہتے تھے۔

"نصبت" ، نصب کے مادہ سے ثابت قرار دینے کے معنی میں ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ تعبیر ضمنی طور پر آغازِ خلقت میں پہاڑوں کی خلقت کی کیفیت کی طرف اشارہ ہو، وہی چیز جس پر سے موجودہ علم نے پردہ اٹھایا ہے، اسے پہاڑوں کی خلقت کے متعدد اسباب وعوامل کی طرف نسبت دی ہے اور ان کے لیے انواع واقسام کی قائل ہے۔

وہ پہاڑ جو زمین کے گھومنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، وہ پہاڑ جو آتش فشانیوں کے نتیجے میں وجود میں آتے ہیں، وہ پہاڑ جو بارش سے پیدا ہونے والے جھاگ کا نتیجہ ہیں، وہ پہاڑ جو سمندروں کے اندر بنتے ہیں اور جو سمندر کی کیچڑ اور اس میں پھنس جانے والے جانوروں کا مجموعہ ہیں۔ (مثلاً مرجانی پہاڑ اور جزیرے)۔

جی ہاں! ان پہاڑوں میں سے ہر ایک کی بناوٹ اور اس کے آثار وبرکات مشکل سے سمجھ میں آنے والے ہیں، اہمیت کے حامل بھی اور بیدار مغز انسانوں کے لیے قدرتِ حق کی نشانیاں بھی۔

اس کے بعد زمین کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کیا وہ زمین کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح مسطح ہوتی ہے؟" (والی الارض کیف سطحت)۔

کس طرح مسلسل بارشوں نے پہاڑوں کو غسل دے کر مٹی کے ذرات کو وجود دیا ہے، پھر گڑھوں کو وسعت دے کر ایسی صاف زمین تیار کی ہے جو زراعت کے لیے بھی موزوں ہے اور ہر قسم کی تعمیر کے لیے بھی اور اسے انسانوں کے اختیار میں دے دیا گیا ہے۔

اگر تمام کرہ زمین پہاڑوں اور دروں پر مشتمل ہوتا تو اس پر زندگی گزارنا کس قدر مشکل اور طاقت رُبا ہوتا۔ وہ کون ہے جس نے ہمارے پیدا ہونے سے پہلے اسے مسطح کر کے قابلِ استفادہ بنایا۔ یہ سب ایسے امور ہیں جن پر غور وفکر کی قرآن ہمیں دعوت دیتا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان چاروں امور کے درمیان کونسا ربط ہے: اونٹ، آسمان، پہاڑ اور زمین۔

فخر رازی اپنی تفسیر میں کہتے ہیں کہ:

یہ اس بنا پر ہے کہ قرآن عربی میں نازل ہوا ہے اور عرب عام طور پر سفر میں رہتے تھے۔ چونکہ ان کے علاقہ میں زراعت

اور کھیتی باڑی نہیں تھی اور ان کے سفر زیادہ تر اونٹوں پر ہی ہوتے تھے۔ جب وہ ہولناک بیابانوں اور غیر آباد ریگستانوں میں سفر کرتے تھے تو ان میں تفکر کا مادہ پیدا ہوتا تھا۔ کوئی موجود نہ ہوتا جس سے وہ بات کرتے۔ کوئی چیز ایسی نہ ہوتی جو ان کی آنکھ اور کان کو اپنی طرف متوجہ رکھتی۔ ایسی حالت میں جب وہ غور و فکر کرتے تو سب سے پہلے ان کی نظر اونٹ پر پڑتی جس پر وہ سوار ہوتے تھے۔ وہ اس کا عجیب منظر دیکھتے اور سوچ میں ڈوب جاتے۔ جب وہ سر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھتے تو آسمان کے علاوہ کوئی چیز انہیں نظر نہ آتی۔ جب دائیں بائیں نگاہ کرتے تو پہاڑوں کے سوا انہیں کچھ نظر نہ آتا، اور جب اپنے قدموں کی طرف دیکھتے تو زمین کے علاوہ کوئی چیز موجود نہ ہوتی۔ گویا خدا انہیں دعوتِ فکر دے رہا ہے اور دعوتِ فکر بھی ایسی جو تنہائی کے موقع پر دی جائے اور اس کا دائرہ صرف چار چیزوں تک محدود ہو۔[1]

لیکن اگر ہم چاہیں کہ ہم عربوں کے ماحول سے نگاہ ہٹا کر زیادہ وسیع فضا میں غور و فکر کریں تو کہا جا سکتا ہے کہ چاروں امور جو اوپر والی آیت میں آئے ہیں، انسانی زندگی کی بنیاد کو تشکیل دیتے ہیں۔ آسمان نور و روشنی کا مرکز ہے اور بارش و ہوا کا بھی۔ زمین انواع و اقسام کے موادِ غذائی کی پرورش کا مرکز ہے۔

پہاڑ آرام و سکون کی رمز اور پانی اور معدنیات کا ذخیرہ ہیں۔ اونٹ خانگی جانوروں کا نمونہ ہے جسے انسان کے اختیار میں دیا گیا ہے۔ اس طرح زراعت کے مسائل، جانور رکھنے کے مسائل اور صنعت و کارگیری کے مسائل انہی چاروں میں پوشیدہ ہیں۔ ان گوناں گوں نعمتوں کے بارے میں غور و فکر انسان کو بہر حال شکرِ منعمِ حقیقی پر ابھارتا ہے اور شکرِ منعم انہیں اللہ کی معرفت اور خالقِ نعمت کی شناخت کی دعوت دیتا ہے۔

توحید سے متعلق اس بحث کے بعد پیغمبرؐ کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: "اب جبکہ ایسا ہی ہے تو انہیں یاد دلا اور نصیحت کر اور تُو تو صرف یاد دہانی کرانے والا ہی ہے" (فذکر انما انت مذکر)۔ تُو ان پر بالکل مسلط نہیں ہے کہ انہیں ایمان لانے پر مجبور کرے۔ (لست علیھم بمصیطر)۔

جی ہاں! آسمان و زمین، پہاڑوں اور جانوروں کی خلقت بتاتی ہے کہ یہ عالمِ ظاہر حساب و کتاب کے بغیر نہیں ہے اور اس کی خلقت کا کوئی ہدف و مقصد ہے۔ اب جبکہ ایسا ہی ہے تو تُو انہیں یاد دہانیوں اور نصیحتوں سے خلقت و آفرینش پر غور کرنے کی تلقین کر، انہیں قربِ خدا کی راہ دکھا اور راہِ تکامل و ارتقا میں ان کا رہبر و رہنما بن جا۔

البتہ راہِ کمال اسی صورت میں طے کی جاتی ہے جب ارادہ و اختیار کے ساتھ میل و رغبت بھی شامل ہو۔ وہ تکامل و ارتقاء جو حالتِ جبر کے نتیجے میں ہو اُس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تُو انہیں مجبور نہیں کر سکتا اور اگر مجبور کر بھی سکتا تو کوئی فائدہ نہیں تھا۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ حکم فرمانِ جہاد کے نزول سے پہلے تھا اور حکمِ جہاد کے نزول سے یہ حکم منسوخ ہو

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۳۱ ص ۱۰۸۔

گیا یہ سمجھنا بڑا اشتباہ اور غلطی ہے۔ پیغمبرؐ کے تذکر و تبلیغ کا سلسلہ پہلے دن سے شروع ہوا اور آپؐ کی زندگی کے آخری دن تک جاری رہا۔

آپؐ کے بعد بھی آپ کے معصوم جانشینوں اور علمائے دین کے ذریعہ جاری و ساری رہا اور ہے۔ یہ فسخ ہونے والی چیز نہیں ہے۔ اسی طرح لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور نہ کرنا بھی ایک بنیادی بات ہے۔ جہاد کا مقصد بھی زیادہ تر سرکش افراد سے جنگ کرنا ہے اور حق طلب لوگوں کے راستے سے رکاوٹوں کو دُور کرنا ہے۔

یہ مفہوم اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ نساء کی آیت ۸۰ میں آئی ہے، جس میں فرماتا ہے: (ومن تولّٰی فما ارسلناک علیھم حفیظًا) "اور جو شخص روگردانی کرے تو ہم نے تجھ کو اس کا ذمہ دار نہیں بنایا، اور سورہ انعام کی آیت ۱۰۷ اور شوریٰ کی آیت ۴۸ میں انہی معانی کو بیان کرتی ہیں۔

"مصیطر" سطر کے مادہ سے کتاب کی سطور کے معنی میں ہے اور مسیطر وہ شخص ہے جو سطروں کو مرتب کرتا ہے۔ اس کے بعد ہر وہ شخص جو کسی چیز پر مسلط ہو اور اس کو منظم کرے یا اسے کسی کام کے انجام دینے پر مجبور کرے۔

بعد والی آیت میں ایک استثناء کی شکل میں فرماتا ہے: "مگر وہ شخص جو پشت پھیرے اور کافر ہو جائے" (الا من تولّٰی و کفر)۔ "اسے خدا ایک بہت بڑے عذاب کی سزا دے گا۔" (فیعذبہ اللہ العذاب الاکبر)۔ یہ بات کہ یہ استثناء کس جملے سے متعلق ہے، اس کی مختلف تفسیریں ہیں۔

پہلی یہ کہ فذکر کے جملے کے مفعول سے استثناء ہے۔ یعنی ضروری و لازمی نہیں ہے کہ ان معاند افراد سے روگردانی کرتے ہیں اور پند و نصیحت کو قبول نہیں کرتے تُو نصیحت کر اور یاد دہانی کرا۔ حقیقت میں یہ اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ زخرف کی آیت ۸۳ میں آئی ہے (فذرھم یخوضوا و یلعبوا حتّٰی یلاقوا یومھم الذی یوعدون) "انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دے تاکہ وہ اپنے باطل میں الجھے رہیں اور کھیل کود میں لگے رہیں، یہاں تک کہ وہ دن آجائے جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔"

دوسرے یہ کہ ایک محذوف جملے سے استثناء ہے اور معنوی طور پر اس طرح ہے "نصیحت کر اس لیے کہ نصیحت سب لوگوں کے لیے نفع بخش ہے، مگر وہ جو حق کے ساتھ دشمنی رکھتے ہیں" اس چیز کے مشابہ جو سورۂ اعلیٰ کی آیت ۹ میں آئی ہے (فذکر ان نفعت الذکریٰ) اس بنا پر کہ آیت معنی شرط رکھتی ہو۔

تیسرے یہ کہ "علیھم" کی ضمیر سے استثناء ہے جو گزشتہ آیت میں ہے یعنی تُو ان پر کوئی تسلط نہیں رکھتا، مگر وہ لوگ جو روگرداں ہو جائیں اور راہِ عناد اختیار کریں تیری ذمہ داری ہے کہ ان سے مقابلہ کرے[1]

یہ سب تفاسیر اس صورت میں ہیں کہ اگر استثناء اصطلاح کے مطابق متصل ہو، لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ استثناء

---

[1] ایک حدیث سے جو در المنثور میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ کی ذمہ داری تھی کہ بت پرستوں سے جنگ کریں اور اس صورت کے علاوہ باقی حالات میں ان کی ذمہ داری صرف یہ تھی کہ نصیحت کریں۔

منقطع ہو، جو تقریباً بلکہ کا مفہوم رکھتا ہے اور جملہ کے معنی اس طرح ہیں "بلکہ وہ لوگ جو روگرداں ہو جائیں اور کافر ہو جائیں تو خدا ان پر مسلط ہے، یا خدا انہیں بہت بڑے عذاب کی خبر دے گا۔"

ان تفسیروں میں سے دو تفسیریں سب سے زیادہ مناسب ہیں۔ پہلی یہ کہ استثنار متصل ہو اور لست علیھم بمصیطر کے جملے کی طرف لوٹے، جو طاقتوروں کے مقابلہ میں طاقت سے کام لینے کی طرف اشارہ ہو۔ یا استثنار متصل ہو اور ہٹ دھرم کافروں کے لیے عذابِ الٰہی کی خبر کے معنوں میں ہو۔

عذابِ اکبر سے مراد آخرت کا عذاب ہے، دنیا کے عذاب کے مقابلہ میں جو چھوٹا ہے اور کم اہم ہے جیسا کہ سورہ زمر کی آیت ۲۶ میں ہم پڑھتے ہیں (فاذاقھم اللّٰہ الخزی فی الحیٰوۃ الدنیا و لعذاب الاٰخرۃ اکبر) خدا نے ذلت وخواری کا مزہ انہیں اس دنیا میں چکھایا اور آخرت کا عذاب اکبر ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ عذابِ اکبر سے مراد عذابِ قیامت و دوزخ کا شدید ترین حصہ ہے اس لیے کہ دوزخ میں تمام مجرموں کا عذاب ایک جیسا نہیں ہے۔ اس سورہ کے آخر میں تہدید آمیز لہجے میں فرماتا ہے: "یقیناً ان کی بازگشت ہماری طرف ہے" (انّ الینا ایابھم)۔ اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: "اس کے بعد یقیناً ان کا حساب ہمارے ہاتھ میں ہے" (ثم انّ علینا حسابھم)۔

یہ حقیقت میں پیغمبرؐ کے دل کے لیے ایک قسم کی تشفی و تسلی ہے کہ کافروں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے پریشان و غمزدہ نہ ہوں اور اپنے کام کو جاری رکھیں۔ ضمنی طور پر یہ سب ہٹ دھرم کافروں کے لیے دھمکی ہے تاکہ وہ جان لیں کہ ان کا حساب کتاب کسی کے اختیار میں ہے۔ اس طرح سورہ غاشیہ جو قیامت کے موضوع سے شروع ہوا تھا، قیامت ہی کے موضوع پر ختم ہو رہا ہے، درمیان میں توحید و نبوت کی طرف جو قیامت کی بنیادوں کو تشکیل دیتے ہیں، اشارہ ہوا ہے۔

اس سورہ کی ابتدائی آیات کے ضمن میں مجرموں کو ملنے والی سنگین سزاؤں کا ایک حصہ اور اس کے بعد مومنین کے روح پرور حساب کا اہم حصہ آیا ہے۔ ضمنی طور پر راستے کے انتخاب کا اختیار دیا گیا کو دیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ انہیں خبردار کیا گیا ہے کہ سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور اس کو ان سے حساب لینا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ پیغمبرؐ تبلیغ رسالت پر مامور ہیں اور لوگوں کے کفر و گناہ کے ذمہ دار ہیں، راہِ حق کے تمام مبلغین کی ذمہ داری اسی قسم کی ہوتی ہے۔

خداوندا! جس دن تمام مخلوقات کی بازگشت تیری طرف ہے اور سب کا حساب تجھے لینا ہے ہم پر اپنا لطف و کرم کیجیو۔

پروردگارا! ہمیں اپنی رحمتِ کبریائی سے کام لے کر عذابِ اکبر سے رہائی بخش۔

بارالٰہا! تیری جنت کی نعمتیں جن کا ایک گوشہ تُو نے اس سورہ میں بیان کیا ہے بہت ہی بیش بہا اور شوق انگیز ہیں۔ اگر ہم اپنے اعمال کی وجہ سے اس کے مستحق نہیں ہیں تو تُو ہمیں ان کو اپنے فضل و کرم سے مرحمت فرما۔

آمین یا رب العالمین

سورۂ غاشیہ کا اختتام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳ رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ

سورۂ فجر

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا

اس میں تیس آیات ہیں

تاریخ ابتداء ۳ر رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ

سورۂ فجر کے مشمولات اور اس کی فضیلت

یہ سورہ بہت سے دوسرے سوروں کی طرح، جو مکے میں نازل ہوئے، مختصر، متزلزل کر دینے والی، پُرجلال اور بہت زیادہ ڈرانے والی آیات کا حامل ہے۔ اس سورہ کے پہلے حصّہ میں ہمیں بہت سی قسمیں ملتی ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے نئی ہیں اور یہ قسمیں ظالموں کے لیے عذابِ الٰہی کی تہدید کے طور پر ہیں۔

اس سورہ کے دوسرے حصہ میں گزشتہ سرکشی کرنے والی بعض اقوام، مثلاً قوم عاد و ثمود و فرعون اور ان سے خدا کے شدید انتقام لینے کی طرف اشارہ ہے، تاکہ دوسری طاقتیں اپنے انجام پر غور کریں۔

اس سورہ کے تیسرے حصہ میں مسئلہ معاد اور مجرمین و کافرین کی سرنوشت اور اسی طرح مومنین کے اجر کو، جو صاحب نفس مطمئنہ ہیں، موضوع بنایا گیا ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے سلسلہ میں ہمیں ایک حدیث پیغمبر اسلامؐ کی ملتی ہے (من قرأ ھا فی لیال عشر غفر اللہ لہ ومن قرأ ھا سائر الایام کانت لہ نورًا یوم القیامۃ) جو شخص اسے دس راتوں (اول ذی الحج کی دس راتوں) میں پڑھے، خدا اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے اور جو شخص باقی ایام میں پڑھے تو قیامت کے دن اس کے لیے نور و روشنی ہو گی۔[1]

ایک حدیث امام جعفر صادقؑ کی ہے کہ سورہ فجر کو ہر واجب و مستحب نماز میں پڑھو کہ یہ حسینؑ بن علیؑ کا سورہ ہے۔ جو شخص اسے پڑھے گا وہ قیامت میں امام حسینؑ کے ساتھ بہشت میں ان کے درجہ میں ہو گا۔[2]

اس سورہ کا تعارف سورۂ امام حسینؑ کے عنوان سے ممکن ہے کہ اس وجہ سے ہو کہ نفس مطمئنہ کا واضح مصداق جو اس سورہ کی آخری آیات میں واقع ہوا ہے، حسینؑ بن علیؑ ہی ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے انہی آیات کے ذیل میں آیا ہے۔ یا پھر اس بنا پر کہ لیال عشر (دس راتوں سے مراد) کی تفسیر محرم الحرام کی پہلی دس راتیں ہیں جو حسینؑ بن علیؑ سے خاص رابطہ رکھتی ہیں۔ بہر حال یہ سب اجر و ثواب و فضیلت ان اشخاص کے لیے ہے جو اس کی تلاوت کو اپنی اصلاح اور تربیت کی تمہید قرار دیں۔

---

[1] و [2] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۸۱۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) وَالۡفَجۡرِ ۙ

(۲) وَلَیَالٍ عَشۡرٍ ۙ

(۳) وَّالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ ۙ

(۴) وَالَّیۡلِ اِذَا یَسۡرِ ۚ

(۵) ھَلۡ فِیۡ ذٰلِکَ قَسَمٌ لِّذِیۡ حِجۡرٍ ؕ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے۔

(۱) صبح کی قسم۔

(۲) اور دس راتوں کی۔

(۳) اور زوج و فرد کی۔

(۴) اور رات کی جبکہ وہ (دن کی روشنی کی طرف) حرکت کرتی ہے قسم ہے (کہ) تیرا پروردگار ظالموں کی گھات میں ہے)۔

(۵) کیا جو کچھ کہا گیا ہے اس میں صاحبانِ عقل کے لیے اہم قسم نہیں ہے؟

تفسیر

تمہاری صبح کی سفیدی کی قسم

اس سورہ کے آغاز میں پانچ بیدار کرنے والی قسموں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ پہلے فرماتا ہے:
"قسم ہے فجر اور رات کے سیاہ پردے کے چاک ہونے کی" (والفجر)۔ "اور قسم ہے دس راتوں کی" (ولیال عشر)۔

"فجر" اصل میں وسیع شگاف کے معنی میں ہے۔ چونکہ صبح کا نور شب کی تاریکی میں شگاف ڈال دیتا ہے، لہٰذا اُسے فجر کہا گیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ فجر دو قسم کی ہے کاذب اور صادق۔ فجر کاذب طولانی سفیدی ہے جو آسمان میں ظاہر ہوتی ہے اور اسے لومڑی کی دُم سے تشبیہ دیتے ہیں جس کا باریک نقطہ افق کی طرف ہے اور اس کا قاعدۂ مخروط وسط آسمان میں ہے۔

فجرِ صادق ابتدا ہی سے افق میں وسعت پیدا کرتی ہے۔ اس میں نورانیت اور صاف قسم کی شفافیت ہوتی ہے۔ وہ آبِ زلال کی نہر کی مانند افقِ مشرق کو گھیر لیتی ہے۔ اس کے بعد پورے آسمان میں پھیل جاتی ہے۔ فجرِ صادق رات کے ختم ہونے اور دن کے آغاز کا اعلان ہے۔ اس موقع پر روزہ داروں کو اکل و شرب سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیئے۔ اس وقت صبح کی نماز کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت میں فجر کے اس کے مطلق معنی یعنی صبح کی سفیدی مراد لی ہے جو یقیناً عظمتِ پروردگار کی ایک نشانی ہے۔ یہ انسانوں اور تمام زمینی موجودات کے لیے نور کی حاکمیت کے آغاز اور ظلمت کے ختم ہونے کا نقطۂ عطفی ہے۔ یہ زندہ موجودات کی جنبش و حرکت کا آغاز اور نیند و سکوت کا اختتام ہے۔ اسی زندگی کی بنا پر خدا اس کی قسم کھاتا ہے۔

لیکن بعض مفسرین نے اس سے نئے سال کا پہلا دن یعنی پہلی محرم مراد لی ہے۔ بعض نے اس کی تفسیر عید قربان کی فجر کی ہے جس میں حج کے اہم مراسم انجام پاتے ہیں اور یہ دس راتوں سے متصل ہے۔ بعض نے اس کو ماہ رمضان مبارک کی صبح قرار دیا ہے اور بعض نے روزِ جمعہ کی فجر سمجھا ہے۔ لیکن آیت کا وسیع مفہوم ہے جو ان سب مفاہیم پر حاوی ہے، اگرچہ اس کے بعض مصداق دوسرے بعض مصداقوں سے زیادہ واضح اور اہم بھی ہیں۔

بعض نے آیت کے معنی اس سے زیادہ وسیع سمجھے ہیں اور کہا ہے کہ فجر سے مراد ہر وہ روشنی ہے جو تاریکی میں چمکتی ہے۔ اس بنا پر اسلام اور نورِ پاکِ محمدیؐ کا عصرِ جاہلیت پر طلوع ہونا اس فجر کا ایک مصداق ہے۔ اسی طرح قیامِ مہدیؑ کی صبح کی سفیدی کا عالم کے ظلم و ستم کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہونے کے وقت چمکنا، اس کا ایک دوسرا مصداق شمار ہوتا ہے جیسا کہ بعض روایات میں اس کی طرف اشارہ ہُوا ہے[1]

علیٰ ہٰذا دشتِ کربلا میں عاشورۂ حسینیؑ کا قیام اور اس کا بنی امیّہ کے مظالم کے تاریک پردوں کو چاک کرنا اور اُن دیو صفت لوگوں کے حقیقی چہروں کو بے نقاب کرنا، اس کا ایک اور مصداق ہے۔

اسی طرح تمام سچے انقلاب، جو کفر و جہالت اور ظلم و ستم کے خلاف گزشتہ اور موجودہ تاریخ میں برپا ہوتے ہیں، نہ صرف وہ فجر کے مصداق ہیں بلکہ بیداری کا وہ پہلا شعلہ جو گنہگاروں کے تاریک دل میں ظاہر ہوتا ہے اور انہیں توبہ کی دعوت دیتا ہے، وہ بھی فجر ہے۔ البتہ یہ آیت کے مفہوم کی ایک وسعت ہے جبکہ ظاہر آیت وہی فجر ہے،

---

[1] یہ معنی امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث میں نقل ہوئے ہیں۔ تفسیر برہان، جلد ۴ ص ۴۵۰ حدیث (۱)۔

یعنی سپیدہ صبح کا طلوع ہونا۔

باقی رہا "لیالِ عشر" (دس راتیں) تو مشہور وہی ذوالحج کی دس راتیں ہیں جو مسلمانانِ عالم کے سیاسی اور عبادتی عظیم ترین اور نہایت متاثر کرنے والے اجتماعات کی گواہ ہیں۔ یہ معانی ایک حدیث میں جابر بن عبداللہ انصاری کے واسطے سے پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہوئے ہیں۔[1]

بعض مفسرین نے ان دس راتوں کو ماہِ مبارکِ رمضان کی آخری دس راتیں قرار دیا ہے جن میں شب قدر ہے۔ بعض نے محرم کی ابتدائی دس راتوں کو "لیالِ عشر" کا مصداق قرار دیا ہے۔ ان تینوں تفسیروں کو جمع کرنا بھی مکمل طور پر ممکن ہے۔

بعض ایسی روایات جو بطونِ قرآن کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ان کے مطابق فجر سے مراد حضرت مہدیؑ کا وجودِ ذی جود ہے اور یہاں عشر ان سے پہلے کے دس ائمہ ہیں اور شفع جو بعد والی آیت میں آیا ہے اس سے مراد حضرت علیؑ و حضرت فاطمۃ الزہراؑ ہیں۔ بہرحال ان دس راتوں کی قسم خواہ اس کی تفسیر کچھ بھی کیوں نہ ہو، ان کی حد سے زیادہ اہمیت کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ قسم ہمیشہ اہم امور کی کھائی جاتی ہے۔[2]

ان تمام معانی کی جمع بھی ممکن ہے۔

اس کے بعد قسموں کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "جفت وطاق کی قسم" (والشفع والوتر)۔ یہ کہ شفع و وتر (زوج و فرد) سے اس آیت میں کیا مراد ہے، مفسرین نے بہت سے اقوال اور احتمال بیان کیے ہیں۔ بعض نے ۲۰ اقوال تک پیش کیے ہیں[3] اور بعض نے اس سے بھی زیادہ یعنی ۳۶ اقوال تک نقل کیے ہیں۔[4]

ان میں سے زیادہ اہم امور مندرجہ ذیل اقوال ہیں:

۱۔ مراد زوج و فرد اعداد ہیں۔ اس تفسیر کے مطابق خدا نے ان تمام اعداد کی قسم کھائی ہے جو زوج و فرد سے تشکیل پاتے ہیں۔ وہ اعداد ایسے ہیں کہ تمام حسابات اور تمام نظام ان کے محور کے گرد گھومتے ہیں اور انہوں نے سارے عالم ہستی کو گھیر رکھا ہے۔ گویا فرماتا ہے:

قسم ہے نظم و ضبط اور حساب و کتاب کی، اور حقیقت میں عالم ہستی میں اہم ترین مفہوم یہی نظم و حساب اور عدد

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی، جلد ۱۲ ص ۴۷۔

[2] اگرچہ "لیالِ عشر" یہاں نکرہ کی شکل میں بیان ہوئی ہیں لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ نکرہ یہاں بیانِ عظمت کے لیے ہے لہٰذا یہ عہد کا مفہوم پیدا کرتی ہیں اور یہ ان مخصوص راتوں کی طرف اشارہ ہے جو اوپر بیان ہوتی ہیں۔

[3] تفسیر فخر رازی، جلد ۳۱ ص ۱۶۴۔

[4] علامہ طباطبائی نے المیزان میں بعض مفسرین سے جلد ۲۰ ص ۴۰۶ پر نقل کیا ہے اور روح المعانی نے التحریر و التحبیر سے جلد ۳۰ ص ۱۲۰ پر نقل کیا ہے۔

کا مسئلہ ہے جو انسانی زندگی میں اصل بنیاد کو تشکیل دیتا ہے۔

۲۔ شفع سے مراد مخلوقات ہیں کیونکہ ساری مخلوق جوڑا جوڑا ہے اور ایک دوسرے کی قرین ہے جبکہ وتر سے مراد خدا ہے، جس کی شبیہ و نظیر و مانند و مثل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تمام ممکنات ماہیت و وجود سے مرکب ہیں، جسے فلسفہ میں زوج ترکیبی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ صرف غیر متناہی شئے جو ماہیت کے بغیر ہے، وہ خدا کی اپنی ذات ہے۔ اس تفسیر کی طرف معصومینؑ کی بعض روایات میں اشارہ ہوا ہے[1]

۳۔ زوج و فرد سے مراد اس جہان کی تمام مخلوق ہے جو ایک لحاظ سے زوج اور ایک لحاظ سے فرد ہے۔

۴۔ مراد نمازیں ہیں جن میں رکعات کی تعداد کے لحاظ سے بعض زوج اور بعض فرد ہیں۔ یہ معنی بھی ایک روایت میں معصوم سے نقل ہوئے ہیں[2] یا یہ کہ وہی نماز شفع و وتر ہے جو نماز تہجد کے آخر میں پڑھی جاتی ہے۔

۵۔ شفع سے مراد روز ترویہ ہے (آٹھویں ذی الحج جس دن حاجی عرفات کی طرف کوچ کرنے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں) اور وتر سے مراد عرفہ کا دن ہے جس میں خانہ خدا کے زائرین عرفات میں ہوتے ہیں۔ یا یہ کہ شفع سے مراد عید قربان کا دن ہے (دس ذی الحج) اور وتر سے مراد عرفہ کا دن ہے۔ یہ تفسیر بھی معصومینؑ کی روایات میں آئی ہے[3]

عمدہ بات یہ ہے کہ اگر الف لام ان دونوں الفاظ میں عموم کے لیے ہوں تو یہ تمام معانی اس میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ان تفسیروں میں سے ہر ایک تفسیر اس کی کوئی نہ کوئی مصداق ہے۔ شفع و وتر کا خصوصیت سے ذکر ہونا اس مفہوم میں مخصوص ہونے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ ایک واضح مصداق سے مطابقت رکھنے کی قسم سے ہے۔ لیکن الف لام اگر ان دونوں میں عہد کا ہو تو پھر خاص قسم کے زوج و فرد کی طرف اشارہ ہوگا اور یہاں گزشتہ قسموں کی مناسبت سے سب سے زیادہ دو معنی مناسب ہیں:

ایک یہ کہ عید کا دن اور عرفہ کا دن ہو جو ذی الحج کی ابتدائی دس راتوں سے مکمل طور پر مناسبت رکھتا ہے اور مناسک حج کا اہم ترین حصہ انہیں دنوں میں انجام پاتا ہے۔ یا یہ کہ مراد نمازیں ہوں جو فجر کی قسم کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں، جو سحر کا اور بارگاہ خدا میں راز و نیاز کا وقت ہے، خصوصاً جبکہ یہ دونوں تفاسیر ان روایات میں بھی وارد ہوئی ہیں جو معصومینؑ سے مروی ہیں۔

آخر میں آخری قسم میں فرماتا ہے: "اور قسم ہے رات کی جبکہ وہ صبح اور دن کی روشنی کی طرف جاتی ہے" (واللیل اذا یسر)[4]

---

[1] ابو سعید خدری نے اسے پیغمبرؐ سے نقل کیا ہے۔ مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۸۵۔

[2]، [3] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۸۵۔

[4] یسر اصل میں یسری ہے جو مادہ سری کا فعل مضارع ہے اس کے بعد اس کے بعد اس کی یا تخفیف اور گزشتہ آیات سے ہم آہنگی کی بناء پر حذف ہوگئی ہے۔

کیسی پُرکشش اور عمدہ تعبیر ہے کہ چلنے کی نسبت رات کی طرف دی ہے، وہ بھی رات کو چلنا اس لیے کہ یسر "سُری" کے مادہ سے (بروزن سُما) بقول راغب مفردات میں رات کے چلنے کے معنی میں ہے۔ گویا رات ایک زندہ وجود ہے اور حس و حرکت رکھتی ہے جو تاریکی میں قدم بڑھاتی ہے اور روشن صبح کی طرف جاتی ہے۔

جی ہاں! اس تاریکی کی قسم کھائی ہے جس کا رُخ روشنی کی طرف ہے، متحرک تاریکی نہ کہ ٹھہری ہوئی ——

تاریکی اس وقت وحشتناک ہوتی ہے جب وہ رُکی ہوئی ہو لیکن اس میں اگر نور و روشنی کی طرف حرکت ہو تو اس کی قدر و قیمت زیادہ ہوتی ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ ظلمت شب کرۂ زمین پر حرکت کی حالت میں ہے اور اصولی طور پر جو رات اہم مفید اور حیات بخش ہے وہ وہی رات ہے جو حرکت کی حالت میں ہو، یعنی جو مستقل طور پر بتدریج خود کو دن سے تبدیل کرے، اس لیے کہ اگر رات کرۂ زمین کے نصف حصہ پر جا کر رُک جائے اور میخ کی طرح گڑ جائے تو وہ آدھا حصہ بھی ختم ہو جائے اور دوسرا آدھا حصہ بھی جو ہمیشہ سورج کی روشنی کے مقابل ہو۔

رات سے مراد یہاں کیا ہے؟ کیا سب راتیں مراد ہیں، یا کوئی خاص رات؟

اس میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ اگر اس کا الف لام عموم کے لیے ہو تو اس میں تمام راتیں شامل ہوں گی، جو خدا کی آیات میں سے خود ایک آیت ہیں اور آفرینش کے مظاہر میں سے خود ایک مظہر ہیں۔ اگر اس کا الف لام عہد ہو تو پھر معین رات کی طرف اشارہ ہے اور گزشتہ قسموں کی مناسبت سے مراد عید قربان کی رات ہے جس میں حجاج کرام مزدلفہ (مشعر الحرام) کی طرف اور اس وادیٔ مقدس میں رات گزارنے کے بعد طلوع آفتاب کے وقت سرزمین منیٰ کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ تفسیر معصومینؑ سے منقول روایات میں بھی آئی ہے[1]

جن لوگوں نے اس رات کا منظر قریب سے عرفات و مشعر میں دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ کس طرح ہر گوشہ و کنار سے لاکھوں افراد حرکت کی حالت میں ہوتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رات اپنے وجود کے ساتھ حرکت کر رہی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حاجی چل رہے ہوتے ہیں لیکن یہ حرکتِ عمومی اس قدر وسعت رکھتی ہے گویا زمین و زمان سب حرکت میں ہوں اور یہ سب اس وقت محسوس ہوتا ہے جب انسان عید کی رات اس سرزمین میں ہو اور واللیل اذا یسر کے معنی اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ بہرحال رات کسی بھی معنی میں ہو، عام یا خاص، عظمت الٰہی کی نشانی ہے اور عالم ہستی کے اہم موضوعات میں سے ہے۔

رات ہوا کی حرارت میں اعتدال پیدا کرتی ہے، تمام موجودات کو آرام پہنچاتی ہے اور بارگاہ خدا میں راز و نیاز کے لیے فضا میں سکون پیدا کرتی۔ باقی رہی عید قربان کی رات جس کا نام (لیلۃ جمع) ہے، وہ بھی اس مقدس وادی مشعر الحرام میں سال کی عجیب ترین رات ہے۔

---

[1] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۷۱۔

بہرحال ان پانچ قسموں کا رشتہ (فجر کی قسم، دس راتوں کی قسم، زوج و فرد کی قسم اور رات کی قسم) اس صورت میں بالکل واضح ہے جب ہم ان سب کو ایام ذی الحج اور حج کے عظیم مراسم سے متعلق سمجھیں۔

اس صورت حال کے علاوہ پھر عالم تکوین اور عالم تشریع کے اہم حوادث کے مجموعہ کی طرف اشارہ ہے جو خدا کی عظمت کی نشانیاں ہیں اور عالم ہستی کے عجیب وغریب اور حیران کن مظاہر ہیں۔ ان پُرمعنی اور بیدار کرنے والی قسموں کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

"کیا جو کچھ کہا گیا ہے اس میں صاحبان خرد کے لیے اہم قسم ہے" (ھل فی ذالک قسم لذی حجر)۔

حجر یہاں عقل کے معنی میں ہے اور اصل میں منع کے معنی میں ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ قاضی نے فلاں شخص کو حجر (بروزن زجر) کیا یعنی اسے اس کے اموال میں تصرف کرنے سے منع کر دیا۔ یا یہ کہ کمرہ کو حجرہ کہا جاتا ہے، اس لیے کہ وہ ایک محفوظ و ممنوع جگہ ہوتی ہے کہ اس میں دوسرے وارد نہیں ہو سکتے۔

دامن اور آغوش کو حجر (بروزن فکر) کہا جاتا ہے دوسروں سے محفوظ ہونے اور ممنوع ہونے کی وجہ سے، اور عقل بھی انسان کو غلط کاموں سے روکتی ہے لہٰذا اسے حجر سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ خود لفظ عقل کے معنی بھی خود منع کرنے کے ہیں۔ اسی لیے وہ رسی جسے اونٹ کے گھٹنے سے باندھتے ہیں کہ اسے چلنے پھرنے سے روکیں عقال کہلاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مقسم بہ (وہ چیز جس کے لیے یہ قسمیں کھائی گئی ہیں) کیا ہے؟ اس سلسلہ میں دو احتمال ہیں۔ پہلا یہ کہ جملہ (ان ربک لبالمرصاد) تیرا پروردگار کمین گاہ میں ہے، ان قسموں کا جواب قسم ہے۔ دوسرا یہ کہ جواب قسم محذوف ہے اور آنے والی آیات جو سرکشوں کی سزا اور ان پر نازل ہونے والے عذاب کی بات کرتی ہے اور وہ اس پر گواہ ہیں۔ یہ معنی کے لحاظ سے اس طرح ہے۔ قسم ہے ان چیزوں کی جو کہی گئی ہیں کہ ہم کافروں اور سرکشوں پر عذاب نازل کریں گے[1] اس طرح قسم اور مقسم بہ واضح ہو جاتے ہیں۔

---

[1] تقدیر میں اس طرح ہے لنعذبن الکفار والطاغین۔

۶ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝

۷ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝

۸ الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ ۝

۹ وَثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝

۱۰ وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ ۝

۱۱ الَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ ۝

۱۲ فَاَكْثَرُوْا فِیْهَا الْفَسَادَ ۝

۱۳ فَصَبَّ عَلَیْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝

۱۴ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝

ترجمہ

۶ کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے قوم عاد کے ساتھ کیا کیا؟

۷ اور اس با عظمت شہر ارم کے ساتھ۔

۸ وہی شہر جس کی نظیر شہروں میں پیدا نہیں کی گئی۔

۹ اور قوم ثمود جو دروں میں سے بڑے بڑے پتھر کاٹتی تھی۔

۱۰ اور فرعون جو صاحب قوت اور سخت سزا دینے والا تھا۔

۱۱ وہی قومیں جنہوں نے شہروں میں سرکشی کی۔

۱۲ اور ان میں بہت زیادہ فساد انہوں نے کیا۔

(۱۳) لہٰذا خدا نے ان کو عذاب کا تازیانہ لگایا۔

(۱۴) یقیناً تیرا پروردگار کمین گاہ میں ہے۔

تفسیر

تیرا پروردگار ظالموں کی گھات میں ہے

گزشتہ آیات کے بعد جو سرکشوں کی سزا اور ان پر نازل ہونے والے عذاب کے بارے میں بامعنی قسموں کی ضمانت لیے ہوئے تھیں، ان آیات میں گزشتہ اقوام میں سے چند طاقتور قوموں کے متعلق، جن میں سے ہر ایک عظیم قوت کی مالک تھی، لیکن ساتھ ہی مغرور بھی متکبر و سرکش بھی تھی، ان کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ان کی دردناک سرنوشت کو واضح کرتا ہے تاکہ مشرکین مکہ اور دوسری اقوام جو اُن کے مقابلہ میں بہت کمزور ہیں، اپنا اندازہ لگالیں اور خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائیں۔ پہلے فرماتا ہے: "کیا تُو نے دیکھا نہیں کہ تیرے پروردگار نے قوم عاد کے ساتھ کیا کیا ہے۔" (الم تر کیف فعل ربك بعاد)۔

رویت (دیکھنا) سے یہاں مراد علم و آگاہی ہے چونکہ ان اقوام کی داستانیں اس قدر مشہور و معروف تھیں کہ گویا بعد کے زمانے کے لوگ بھی انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے، لہٰذا رویت کی تعبیر صرف ہوئی ہے۔ البتہ اس آیت میں مخاطب پیغمبرؐ ہیں لیکن مقصود سب کو تنبیہ کرنا اور خبردار کرنا ہے۔

"عاد" خدا کے عظیم پیغمبر حضرت ہودؑ کی قوم ہے۔ بعض مؤرخین کا نظریہ ہے کہ عاد کا اطلاق دو قبیلوں پر ہوتا ہے: ایک وہ جو بہت پہلے تھا اور قرآن نے اسے عاد الاولیٰ سے تعبیر کیا ہے۔ (نجم۔ ۵۰)۔ وہ غالباً تاریخ سے پہلے موجود تھا۔ دوسرا قبیلہ جو تاریخ بشر کے دور میں اور تقریباً ولادتِ مسیحؑ سے سات سو سال پہلے تھا اور عاد کے نام سے مشہور تھا۔ یہ احقاف یا یمن میں رہائش پذیر تھا۔ اس قبیلے کے افراد بلند قامت اور قوی الجثہ تھے اور اسی بنا پر بہت نمایاں جنگجو شمار ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ متمدن بھی تھے۔ ان کے شہر آباد اور زمینیں سرسبز و شاداب تھیں۔ ان کے باغات پُر بہار تھے اور انہوں نے بڑے بڑے محل تعمیر کیے تھے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ عاد اس قبیلے کے جدِاعلیٰ کا نام تھا اور وہ قبیلے کو اپنے جد کے نام سے موسوم کر کے پکارتے تھے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"وہی پُرشکوہ اور عظیم شہر ارم" (ارم ذات العماد)، اس بات میں کہ ارم کسی شخص کا نام ہے یا قبیلے کا یا جگہ کا یا کسی شہر کا، مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے۔ زمخشری کشاف میں نقل کرتا ہے کہ عاد بیٹا ہے عوص کا، وہ بیٹا ہے ارم کا، وہ بیٹا ہے سام ابن نوح کا اور چونکہ قبیلے کے اجداد سے قبیلے منسوب ہوتے تھے، لہٰذا عاد کو ارم بھی کہتے ہیں۔ بعض مؤرخین کا نظریہ یہ ہے کہ ارم وہی عادِ اولیٰ ہے اور عاد دوسرا قبیلہ ہے جبکہ کچھ اور حضرات کا نظریہ ہے کہ ارم ان کے

شہر اور سرزمین کا نام ہے[1]

لیکن بعد والی آیت سے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ارم ان کے بے نظیر شہر کا نام ہے۔

عماد کے معنی ہیں ستون اس کی جمع ہے عمد (بروزن شتر)۔ پہلی تفسیر کی بنا پر قوم عاد کے طاقتور جسموں اور ستون جیسے پیکروں کی طرف اشارہ ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق باعظمت عمارتوں، بلند و بالا محلات اور ان عظیم ستونوں کی طرف اشارہ ہے جو عظیم محلوں میں تعمیر کیے گئے تھے اور ان دونوں صورتوں میں قوم عاد کی طاقت و قوت کا اشارہ ہے[2] دوسری تفسیر (ان کے محلوں کے عظیم ستون) زیادہ مناسب ہے۔

اس کے بعد والی آیت میں فرماتا ہے؛ وہی شہر و دیار جن کی مانند و مثل دنیا کے شہروں میں پیدا نہیں ہوئی تھی (التی لم یخلق مثلھا فی البلاد)۔ یہ تعبیر بتاتی ہے کہ ارم سے مراد وہی شہر ہے نہ کہ قبیلہ و طائفہ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض بزرگ مفسرین نے اسی تفسیر کو قبول کیا ہے اور ہم نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے[3]

بعض مفسرین نے جزیرۃ العرب کے بیابانوں اور عدن کے صحراؤں میں شہر ارم کے برآمد ہونے کی ایک دلچسپ داستان بیان کی ہے جس میں وہ اس شہر کی بلند و بالا عمارات اور سامان زینت وغیرہ کی بات کرتے ہیں۔ لیکن مذکورہ داستان واقعیت کی نسبت خواب یا افسانے سے زیادہ تعلق رکھتی ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ قوم عاد طاقتور قبائل پر مشتمل تھی، ان کے شہر ترقی یافتہ تھے اور جیسا کہ قرآن اشارہ کرتا ہے ان جیسے شہر پھر آباد نہیں ہو سکے۔ بہت سی داستانیں شداد کی جو عاد کا بیٹا تھا، زبان زدِ عام ہیں اور تاریخ میں مرقوم ہیں یہاں تک کہ شداد کی بہشت اور اس کے باغات ضرب المثل کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ لیکن ان داستانوں کی حقیقت کچھ نہیں ہے یا یہ محض افسانے ہیں۔ یہ ایسے افسانے ہیں کہ ان کی حقیقت پر بعد میں حاشیہ آرائی کر لی گئی۔

اس کے بعد گزشتہ اقوام کے دوسرے سرکش گروہ کا حوالہ دے کر فرماتا ہے؛ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے قوم ثمود کے ساتھ کیا کیا؛ جو وادی میں بڑے بڑے پتھروں کو کاٹتی اور ان سے گھر اور قصر بناتی تھی (وثمود الذین جابوا الصخر بالواد)۔ ثمود کی قوم قدیم ترین اقوام میں سے ہے۔ ان کے پیغمبر حضرت صالحؑ تھے اور وہ وادی القریٰ نامی سرزمین میں رہتے تھے، جو مدینہ اور شام کے درمیان تھی۔ ان کا تمدن ترقی یافتہ تھا، زندگی مرفہ الحال تھی اور ان کی عمارتیں عظیم تھیں۔

بعض مؤرخین کہتے ہیں ثمود اس قبیلے کے باپ کا نام تھا۔ اسی نام سے وہ قبیلہ موسوم ہوا[4] جابوا اصل میں جوبہ

---

[1] تفسیر کشاف، جلد ۴، ص ۷۴۷۔ اس مضمون کو قرطبی نے بھی اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ اسی طرح دوسری تفسیروں میں بھی ہے۔

[2] پہلی تفسیر کی بنا پر ذات کا مؤنث ہونا طائفہ و قبیلہ کی بنا پر ہے جو مؤنث لفظی ہے۔

[3] ارم غیر منصرف ہے اسی لیے حالتِ جر میں منصوب ہوتا ہے۔

[4] ثمود اہل لغت کے لحاظ سے ثمد (بروزن صمد) اس تھوڑے سے پانی کے معنی میں ہے جس کا کوئی مادہ نہ ہو اور مثمود اس شخص کو کہتے ہیں جس (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بروزن توبہ) سے لیا گیا ہے جو پست زمین کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد ہر قطعہ زمین کی قطع و برید کے معنی میں آیا ہے۔ کسی بات کے جواب کو اس لیے جواب کہتے ہیں گویا وہ ہوا کو قطع کرتا ہے اور کہنے والے کے منہ سے نکل کر سننے والے کے کان تک پہنچتا ہے (یا اس لحاظ سے کہ سوال کو کاٹ کر ختم کر دیتا ہے)۔

بہرحال یہاں مراد پہاڑوں کے ٹکڑوں کا کاٹنا اور اطمینان کے ساتھ ان سے گھر بنانا ہے، جیسا کہ سورۂ حجر کی آیت ۸۲ میں اسی قوم ثمود کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں (وکانوا ینحتون من الجبال بیوتاً اٰمنین)۔ وہ دو پہاڑوں کے اندر پُرسکون گھر بناتے تھے۔ ان معنی کی نظیر سورہ شعرآ کی آیت ۱۴۹ میں آئی ہے وہاں بیوتاً فارھین کی تعبیر صرف ہوئی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان گھروں میں عیش و عشرت سے زندگی بسر کرتے اور ہوس رانی سے کام لیتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ قوم ثمود وہ پہلی قوم تھی جنہوں نے پہاڑوں سے پتھر کاٹ کر پہاڑوں کے اندر مضبوط و محکم گھر بنانے کا اقدام کیا۔

"واد" جو اصل میں وادی تھا، دریا یا سیلابوں کی گزرگاہ کے معنی میں ہے اور کبھی درّہ کے معنی میں بھی آیا ہے، اس لیے کہ سیلاب ان سے جو پہاڑوں کے قریب ہوتے ہیں، گزرتے ہیں۔ یہاں دوسرے معنی مناسب ہیں یعنی درّے اور پہاڑ کے دامن، اس لیے کہ قرآن کی وہ آیات بھی یہی بتاتی ہیں جو اس قوم کے متعلق بیانات دیتی ہیں اور اس کا اوپر بھی اشارہ ہوا ہے کہ قوم ثمود اپنے گھر پہاڑوں کے دامن میں بناتی تھی۔ اس طرح وہ پتھر کاٹتے اور ان کے اندر پُرامن گھر بناتے تھے[1]

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ غزوہ تبوک کے موقع پر راستہ چلتے ہوئے دبستان کے شمال میں وادی ثمود میں پہنچے۔ آپؐ گھوڑے پر سوار تھے۔ فرمایا جلدی کرو اس وقت تم ملعون و معذب سرزمین پر ہو[2]

اس میں شک نہیں کہ قوم ثمود کا تمدن ترقی یافتہ تھا کہ ان کے شہر آباد تھے لیکن پھر بھی ایسے اعداد و شمار سے واسطہ پڑتا ہے جو مبالغہ آمیز نظر آتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ مفسرین کی ایک جماعت نے لکھا ہے کہ انہوں نے ایک ہزار سات سو شہر بنائے تھے جو سب کے سب پتھروں سے تعمیر ہوئے تھے۔

اس کے بعد تیسری قوم کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اور اسی طرح فرعون صاحب ثروت" (وفرعون ذی الاوتاد)۔ جو اس طرف اشارہ ہے کہ کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے طاقتور ظالم اور بیدادگر قوم فرعون کے ساتھ کیا کیا۔

"اوتاد" جمع وتد کی (بروزن صمد) جس کے معنی میخ کے ہیں۔ فرعون کو ذی الاوتاد کیوں کہتے ہیں؟ اس

بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ: سے زیادہ مال کا مطالبہ کریں اتنی مقدار جس سے اس کے مال میں نقص پیدا ہو جائے بعض اس لفظ کو بھی کہتے ہیں۔ مفردات راغب۔

[1] جابوا الصخر بالواد میں بار بظاہر ظرفیت کے معنی رکھتا ہے۔

[2] روح البیان، جلد ۲ ص ۴۲۵۔

کی مختلف تفسیریں ہیں۔

پہلی یہ کہ اس کے بہت سے لشکر تھے جن میں سے بہت سے خیموں میں زندگی گزارتے تھے اور جو خیمے ان کے لیے گاڑے جاتے تھے ان میں میخیں استعمال ہوتی تھیں۔

دوسری یہ کہ فرعون جس شخص پر غضبناک ہوتا، زیادہ تر اس کو یہ سزا دیتا کہ اس کے چاروں ہاتھ پاؤں میخوں سے باندھ دیتا، یا اس کے ہاتھ اور پاؤں میں میخیں گڑوا دیتا اور اس کو چھوڑ دیتا یہاں تک کہ وہ مرجاتا۔ یہ تفسیر ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے[1]

تاریخ میں آیا ہے کہ جس وقت فرعون کی بیوی حضرت آسیہ حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آئیں تو انہیں بھی یہی سزا دی گئی اور شہید کیا گیا۔ ذی الاوتاد اصولی طور پر قوت اور استقرار حکومت کا کنایہ ہے۔

تینوں تفسیریں آپس میں منافات بھی نہیں رکھتیں۔ ہو سکتا ہے کہ آیت کے معنی میں جمع ہوں۔ اس کے بعد مجموعی طور پر ان تینوں اقوام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

"وہی جنہوں نے شہروں میں سرکشی کی" (الذین طغوا فی البلاد)۔ اور ان میں بہت سا فساد برپا کیا اور خرابی کی (فاکثروا فیھا الفساد)۔ فساد جو ہر قسم کے ظلم و ستم، تجاوز عن الحدود، عیاشی اور ہوس رانی پر مشتمل تھا واقعی ان کی سرکشی ایک اثر رکھتی ہے اور ہر سرکشی کرنے والی قوم آخرکار ہر قسم کے فساد میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد ایک مختصر اور پُرمعنی جملے کے ساتھ ان تمام سرکش قوموں کی دردناک سزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اضافہ فرماتا ہے: "لہٰذا خدا نے ان کو عذاب کا تازیانہ لگایا" (فصب علیھم ربک سوط عذاب)۔

"سوط" کے معنی تازیانے کے ہیں۔ اس کے معنی اصل میں ایک چیز کو دوسری چیز سے مخلوط کرنے کے ہیں۔ اس کے بعد اس کا تازیانہ پر بھی اطلاق ہوا ہے جو چمڑے وغیرہ سے بنا ہو۔ بعض مفسرین کے نزدیک عذاب کا کنایہ ہے، ایسا عذاب جو انسان کے گوشت و خون سے مخلوط ہو جائے اور اس کو سخت پریشان و بے حال کر دے۔

امیرالمؤمنین حضرت علیؑ کے کلام میں امتحان کے بارے میں ملتا ہے (والذی بعثہ بالحق لتبلبلن بلبلۃ و لتغربلن غربلۃ ولتساطن سوط القدر)۔ "قسم ہے اس کی جس نے پیغمبرؐ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا تم شدت و سختی کے ساتھ مورد امتحان و آزمائش قرار پاؤ گے، چھلنی کی مانند ہو جاؤ گے، دیگ میں جو چیز ہو اس کی طرح اس کے جوش کھانے اور اُبال آنے کے وقت مل جل جاؤ گے اور اوپر نیچے ہو جاؤ گے"[2]

"صب" کی تعبیر جو اصل میں پانی انڈیلنے اور پھینکنے کے معنی میں ہے، یہاں اس عذاب کی شدت اور استمرار کی طرف اشارہ ہے اور ہو سکتا ہے کہ صفحۂ زمین کے ان سرکشوں کے وجود سے پاک ہونے کی طرف اشارہ ہو۔ بہرحال

---

[1] علل الشرائع نور الثقلین کی نقل کے مطابق جلد ۵ ص ۱۰۵ حدیث ۶۔

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۶۔

سوط کے تمام معانی میں سے یہاں مناسب وہی پہلے معنی یعنی تازیانہ ہے۔ وہی تعبیر جو روزمرہ کی گفتگو میں بھی رائج ہے جیسا کہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے دشمن کی پشت پر عذاب کا تازیانہ لگایا۔

یہ مختصر سی تعبیر شدید اور مختلف قسم کے عذابوں کی طرف اشارہ ہے جو اس قوم پر نازل ہوئے۔ قوم عاد تو قرآن مجید کے بقول تیز ٹھنڈی اور جلانے والی ہوا اور آندھی سے ہلاک ہوئی (واما عاد فاهلكوا بريح صرصر عاتية) (حاقہ۔ ۶)۔ باقی رہی قوم ثمود تو وہ عظیم آسمانی چیخ کے ذریعہ نابود ہوئی۔ (فاما ثمود فاهلكوا بالطاغية) (حاقہ۔ ۵) اور قوم فرعون دریائے نیل کی موجوں میں غرق اور دفن ہوگئی (فاغرقناهم اجمعين) (زخرف: ۵۵)

آخری زیر بحث آیت میں ان تمام لوگوں کو ہشیار اور خبردار کرنے کے لیے، جو اس راستہ پر چلتے ہیں جس پر وہ سرکش لوگ چلتے تھے، فرماتا ہے:

"یقیناً تیرا پروردگار کمین گاہ میں ہے" (ان ربك لبالمرصاد) "مرصاد" "رصد" کے مادہ سے کسی چیز کی نگہبانی کرنے کے لیے آمادگی کے معنی میں ہے۔ فارسی میں اسے کمین گاہ کہتے ہیں۔ یہ لفظ عام طور پر ایسی جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں کچھ افراد مجبور ہوں کہ کسی گزرگاہ سے گزریں اور کوئی شخص اس گزرگاہ میں ضرب لگانے کے لیے آمادہ و تیار ہو۔

اس ساری گفتگو میں اس طرف اشارہ ہے کہ گمان نہ کرو کہ کوئی شخص عذاب الٰہی سے بچ کر جا سکتا ہے، سب کچھ اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور جس وقت وہ ارادہ کرے ان کو سزا دے سکتا ہے اور ان پر عذاب نازل کر سکتا ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ خدا کا کوئی مکان نہیں ہے اور وہ کسی گزرگاہ میں بھی نہیں بیٹھتا۔ یہ تعبیر اس بات کا کنایہ ہے کہ پروردگار اپنی قدرت کے ذریعہ تمام سرکشوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ایک حدیث حضرت علیؑ سے منقول ہے، (ان ربك قادر على ان يجزى اهل المعاصى جزائهم) "تیرا پروردگار قدرت و توانائی رکھتا ہے کہ گنہگاروں کو کیفر کردار تک پہنچائے"[1]

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: (المرصاد قنطرة على الصراط لا يجوزها عبد بمظلمة عبد) "مرصاد ایک پل ہے اس راستہ پر جو جہنم کے اوپر سے گزرتا ہے، جس شخص کی گردن پر کسی مظلوم کا حق ہوگا وہ اس پر سے نہیں گزر سکے گا"[2]

یہ حقیقت میں ایک واضح مصداق کے بیان کی قسم میں سے ہے اس لیے کہ خدا کی کمین گاہ قیامت اور مشہور پل صراط تک محدود نہیں ہے۔ خدا تو اس دنیا میں بھی ہر ظالم کی گھات میں ہے اور گزشتہ تینوں اقوام پر نازل ہونے

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۸۷۔

[2] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۸۷۔

والا عذاب اس کا واضح مصداق ہے۔

"ربک" (تیرا پروردگار) کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ سنتِ الٰہی تیری امت کی سرکش، ظالم اور ستمگر قوموں کے بارے میں بھی جاری ہوگی۔ پیغمبرؐ اور مومنین کے دلوں کی تسکین بھی ہے کہ وہ سمجھ لیں کہ یہ ہٹ دھرم اور کینہ پرور دشمن خدا کی قدرت کے چنگل سے کبھی فرار نہیں کرسکیں گے اور یہ ان لوگوں کے لیے خطرہ کی تنبیہ بھی ہے جو پیغمبر اکرمؐ اور مومنین پر ہر قسم کا ظلم و ستم روا رکھتے تھے۔ انہیں جان لینا چاہیئے کہ وہ لوگ جو ان سے زیادہ صاحبِ طاقت تھے، ایک تیز آندھی، ایک طوفان، ایک شعلہ اور صیحۂ آسمانی کے مقابلے میں تابِ مقاومت نہ لاسکے تو یہ کس طرح سوچتے ہیں کہ اپنے ان غلط اعمال کے باوجود عذابِ الٰہی سے نجات پاسکیں گے۔

ایک حدیث پیغمبرِ اسلامؐ سے منقول ہے آپؐ فرماتے ہیں، "جبرائیل امین نے مجھ کو خبر دی کہ جس وقت خدا وند یکتا و اولین و آخرین کی مخلوق کو میدانِ حشر میں جمع کرے گا تو جہنم کو لے آئے گا اور پل صراط کو، جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے، اس پر رکھ دے گا۔ اس صراط پر تین پل ہوں گے۔ پہلے پُل پر امانت و دست گاری اور رحمت و محبت ہے۔ دوسرے پُل پر نماز اور تیسرے پُل پر پروردگارِ عالم کا عدل ہوگا۔ لوگوں کو حکم دیا جائے گا کہ وہ اس پُل پر سے گزریں۔ جنہوں نے امانت اور رحم میں کوتاہی کی ہوگی وہ پہلے پُل پر ہی رہ جائیں گے۔ اگر اس سے گزر گئے تو نماز میں کوتاہی کی ہوگی تو دوسرے پُل پر ہی رہ جائیں گے۔ اور اگر اس سے بھی گزر گئے تو اپنے راستے کے آخر میں عدلِ الٰہی پائیں گے اور ان ربک لبالمرصاد کے یہی معنی ہیں"[1]

حضرت علیؑ کے ارشادات و کلمات میں ہم پڑھتے ہیں (ولئن امھل اللہ الظالم فلن یفوت اخذہ وھو لہ بالمرصاد علی مجاز طریقہ و بموضع الشجی من مساغ ریقہ) اگر خدا ظالم کو مہلت دے دے تو اس کی سزا ہرگز ختم نہیں ہوگی، وہ ستمگاروں کی گھات میں ہے اور اس طرح ان کے حلق کو اپنے دستِ قدرت میں لیے ہوئے ہے کہ جس وقت چاہے گا اس طرح دبا دیگا کہ اس کا لعاب دہن تک گلے سے نیچے نہیں جاسکے گا[2]

---

[1] روضہ کافی مطابق نقل نور الثقلین، جلد ۵ ص ۳، ۵۔

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۹۷۔

(۱۵) فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّىْٓ اَكْرَمَنِ ؕ

(۱۶) وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّىْٓ اَهَانَنِ ۚ

(۱۷) كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۙ

(۱۸) وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۙ

(۱۹) وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۙ

(۲۰) وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ؕ

ترجمہ

(۱۵) لیکن انسان کو جس وقت خدا آزمائش کے لیے عزت دیتا ہے (اس کا اکرام کرتا ہے) اور نعمت بخشتا ہے تو (مغرور ہو جاتا ہے) اور کہتا ہے میرے پروردگار نے میرا اکرام کیا ہے۔

(۱۶) لیکن جب امتحان کے لیے اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو مایوس ہو جاتا ہے اور کہتا ہے میرے پروردگار نے مجھے ذلیل و خوار کیا ہے۔

(۱۷) ایسا نہیں ہے جیسا تم نے خیال کیا ہے بلکہ تم یتیموں کا احترام نہیں کرتے۔

(۱۸) اور ایک دوسرے کو مساکین و فقراء کو کھانا کھلانے کا شوق نہیں دلاتے۔

(۱۹) اور میراث کو جائز و ناجائز طریقہ سے جمع کر کے کھاتے ہو۔

(۲۰) اور مال و دولت کو بہت دوست رکھتے ہو۔

تفسیر

نہ اس کی نعمت کے ملنے پر غرور کرو اور نہ سلب نعمت پر مایوس ہو

گزشتہ آیات کے بعد جو سرکشی کرنے والوں کو خبردار کر رہی تھیں اور انہیں خدا کے عذاب سے ڈرا رہی تھیں، زیر بحث آیات میں مسئلۂ امتحان کو پیش کرتا ہے جو ثواب اور عتاب الٰہی کا معیار ہے اور انسانی زندگی کا اہم ترین مسئلہ شمار ہوتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے:

لیکن انسان، جس وقت اس کا پروردگار اور اس کی آزمائش کے لیے اس کا اکرام کرے اور نعمت بخشے، تو مغرور ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے عزت دی ہے (فاما الانسان اذا ما ابتلاہ ربه فاکرمه و نعمه فیقول ربی اکرمن)۔ وہ نہیں جانتا کہ خدائی آزمائش کبھی نعمت کے ذریعہ اور کبھی انواع و اقسام کی مصیبتوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ نہ نعمت کا حصول سبب غرور بننا چاہیئے اور نہ مصائب مایوسی اور ناامیدی کا سبب بنیں، لیکن یہ کم ظرف انسان دونوں حالتوں میں مقصدِ آزمائش کو بھول جاتا ہے۔ نعمت کے ملنے کے وقت اس طرح خیال کرتا ہے کہ وہ مقرب بارگاہ خدا ہوگیا ہے اور یہ نعمت اس قرب کی دلیل ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ابتدا میں کہتا ہے کہ خدا اسے موردِ اکرام قرار دیتا ہے۔ لیکن آیت کے ذیل میں ہے کہ انسان خود کو موردِ اکرام خدا دیکھتا ہے۔ اس کی مذمت ہو رہی ہے۔ یہ اس بنا پر ہے کہ پہلا اکرام انعام ہی کے معنی میں ہے اور دوسرا اکرام بارگاہ خدا کے قرب کے معنی میں ہے۔ لیکن جس وقت امتحان لینے کے لیے اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے تو مایوس ہو جاتا ہے اور کہتا ہے:

"میرے پروردگار نے مجھے ذلیل و خوار کر دیا ہے" (واما اذا ما ابتلاہ فقدر علیه رزقه فیقول ربی اھانن)۔ ناامیدی اسے ہر طرف سے گھیر لیتی ہے اور وہ اپنے پروردگار سے رنجیدہ و ناخوش ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے غافل ہے کہ یہ سب چیزیں تو اس کی آزمائش اور امتحان کے ذرائع ہیں۔ وہ امتحان جو انسان کی پرورش اور ارتقا کی رمز ہے اور اس کے بعد استحقاقِ ثواب کا سبب اور مخالفت کی صورت میں استحقاقِ عذاب کا باعث ہے۔

یہ دونوں آیتیں خبردار کرتی ہیں کہ نہ تو نعمت کا ورود تقربِ خدا کی دلیل ہے اور نہ اس کا سلب ہو جانا حق سے دُوری کی دلیل۔ یہ تو امتحان کی مختلف صورتیں ہیں کہ خدا اپنی حکمت کے مطابق ہر گروہ کو کسی چیز سے آزمائش کرتا ہے۔ یہ کم ظرف انسان ہیں جو کبھی مغرور ہو جاتے ہیں اور کبھی مایوس ہو جاتے ہیں۔ سورہ حٰم سجدہ کی آیت ۵۱ میں بھی آیا ہے:

(واذا انعمنا علی الانسان اعرض و نا بجانبه و اذا مسه الشر فذو دعاء عریض)۔ جس وقت

ہم کسی انسان کو نعمت دیتے ہیں تو وہ روگردانی کرتا ہے اور تکبر کر کے حق سے دور ہو جاتا ہے، لیکن جب اُسے تھوڑی سی تکلیف پہنچے تو ہمیشہ دعا کرتا ہے اور بے تابی دکھاتا ہے۔ اسی طرح سورہ ہود کی آیت ۹ میں آیا ہے (ولئن اذقنا الانسان منا رحمۃ ثم نزعناها منه انه لیئوس کفور)۔ جس وقت ہم انسان کو رحمت کا ذائقہ چکھائیں اور اس سے چھین لیں تو نا امید اور ناشکرا ہو جاتا ہے۔

یہ دونوں آیتیں علاوہ اس کے کہ خدا کی آزمائش کے مسئلہ کو مختلف طریقوں سے بیان کرتی ہیں، یہ نتیجہ بھی بخشتی ہیں کہ نعمت سے بہرہ ور ہونا یا اس سے محروم ہونا قرب خدا یا دُوریٔ پروردگار کی دلیل نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ اور ہر جگہ ایمان و تقویٰ کا معیار ہے۔

کتنے پیغمبر تھے جو اس دنیا میں انواع و اقسام کے مصائب میں مبتلا رہے۔ ان کے مقابلہ میں کتنے کافر تھے جو گوناگوں نعمتوں سے بہرہ مند تھے۔ دنیا کی زندگی کا مزاج و طبیعت یہی ہے۔ اس آیت کے ضمن میں پروردگارِ عالم ابتلاءات اور دردناک حوادث کے فلسفہ کی طرف ایک سربستہ اور اجمالی اشارہ بھی کرتا ہے۔ اس کے بعد ان اعمال کی تشریح کرتا ہے جو خدا سے دوری اور عذابِ الٰہی کے چنگل میں پھنسنے کا موجب ہیں۔ فرماتا ہے:

"ایسا نہیں ہے جیسا تم خیال کرتے ہو (کہ تمہارے اموال پروردگار کے نزدیک تمہارے قربِ منزلت کی دلیل ہیں، بلکہ تمہارے اعمال تو تمہاری خدا سے دُوری کی کیفیت کو بیان کرتے ہیں)" "تم تو یتیموں کا احترام نہیں کرتے" (کلا بل لا تکرمون الیتیم)۔ "اور ایک دوسرے کو فقراء و مساکین کو کھانا کھلانے کا شوق نہیں دلاتے" (ولا تحاضون علی طعام المسکین)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یتیموں کو کھانا کھلانے کی بات نہیں کرتا، بلکہ اکرام و احترام کی بات کرتا ہے۔ اس لیے کہ یتیموں کے سلسلہ میں صرف بھوک کا مسئلہ درپیش نہیں ہوتا بلکہ اسے احترام سے محرومی کا سامنا کرنا ہوتا ہے اور وہ یہ احساس کرنے لگتا ہے کہ چونکہ اس کا باپ مرگیا ہے لہٰذا وہ ذلیل و خوار ہو گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی عزت کی جائے تاکہ وہ باپ کے نہ ہونے کا احساس نہ کرے۔

اسی لیے اسلامی روایات میں یتیموں سے محبت اور ان پر نوازش کرنے کے مسئلہ کو ایک خاص اہمیت دی گئی ہے۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ (ما من عبد یمسح ید ہ علی رأس یتیم رحمۃ له الا اعطاہ اللہ بکل شعرۃ نوراً یوم القیامۃ) کوئی شخص کسی یتیم کے سر پر دستِ شفقت نہیں پھیرتا مگر یہ کہ خدا ان بالوں کی تعداد کے برابر جو اس کے ہاتھ کے نیچے آتے ہیں قیامت میں اُسے نور بخشے گا۔[1]

سورہ ضحیٰ کی آیت ۹ میں بھی آیا ہے (فاما الیتیم فلا تقھر) "باقی رہا یتیم تو اسے موردِ قہر و تحقیر قرار نہ دے" یہ بالکل اس چیز کے مقابلہ میں ہے جو ایمان و اخلاق سے دور کل کے دورِ جاہلیت کے معاشرہ کی طرح آج کے معاشرہ

---

[1] بحار الانوار، جلد ۱۵ ص ۱۲۰ (چاپ قدیم)۔

میں بھی رواج رکھتی ہے کہ یتیموں کے مال کو مختلف حیلوں اور بہانوں سے اپنی ملکیت بنایا جاتا ہے اور اس یتیم کو اس طرح تنہا چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ باپ کی غیر موجودگی کا دکھ تلخ ترین شکل میں محسوس کرتا ہے۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یتیموں کا اکرام ان کے مال کی حفاظت تک محدود نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے خیال کیا ہے، بلکہ اس کے ایک واضح، صاف اور وسیع معنی ہیں جو مال کی حفاظت اور دوسرے امور دونوں کے متقاضی ہیں۔

"تحاضون"[1] کا جملہ حض کے مادہ سے تحریص و ترغیب کے معنی میں ہے جو اس طرف اشارہ ہے کہ صرف مسکین کو کھانا کھلانا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ لوگ ایک دوسرے کو اس کار خیر کے سلسلہ میں شوق دلائیں تاکہ یہ طریق کار معاشرہ کی فضا میں وسعت پیدا کرے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ سورہ حاقہ کی آیت ۳۴،۳۳ میں اس موضوع کو خداوند عظیم پر ایمان نہ لانے کے برابر بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

(انہ کان لا یؤمن باللہ العظیم ولا یحض علی طعام المسکین) وہ خدائے عظیم پر ایمان نہیں رکھتا اور دوسروں کو مسکین کو کھانا کھلانے کا شوق نہیں دلاتا ہے[2]

اس کے بعد اس کے تیسرے غلط کام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں مورد مذمت و ملامت قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے: "تم میراث کو (حلال و حرام طریقہ سے) جمع کرکے کھا جاتے ہو۔ (و تأکلون التراث اکلا لمّا) [3]

اس میں شک نہیں کہ اس مال کا کھانا، جو شرعی میراث کے طور پر کسی شخص کو پہنچے، بُرا نہیں ہے۔ اس بنا پر مندرجہ بالا آیت میں اس کام کی مذمت ہو سکتا ہے کہ ذیل کے امور میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ ہو۔

پہلا یہ کہ مراد اپنے اور دوسروں کے حق کو جمع کر لینا ہو اس لیے کہ "لم" کا لفظ اصل میں جمع کے معنی میں ہے اور بعض مفسرین مثلاً زمخشری نے کشاف میں خصوصیت سے اس کی حرام و حلال کے درمیان جمع کرنے سے تفسیر کی ہے۔ خصوصاً زمانہ جاہلیت کے عربوں کی حالت یہ تھی کہ وہ عورتوں اور بچوں کو میراث سے محروم کر دیتے تھے اور ان کا حق خود لے لیتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ میراث انہیں ملنی چاہیئے جو جنگجو ہوں (اس لیے ان کے ہاتھ جو اموال لگتے تھے ان میں سے بہت سے مال وہ ہوتے تھے جو غارتگری کے نتیجے میں حاصل ہوتے تھے) لہٰذا وہ صرف ان لوگوں کو حقدار سمجھتے تھے جو غارتگری کے قابل ہوں۔

دوسرے یہ کہ جب میراث تم تک پہنچتی ہے تو تم فقیر و مسکین، عزیزوں اور رشتہ داروں اور معاشرہ کے محروم افراد پر بالکل خرچ نہیں کرتے اور جب تم میراث کے مال کے ساتھ، جو بغیر کسی زحمت و تکلیف کے تمہارے ہاتھ آتا ہے،

---

[1] تحاضون اصل میں تتحاضون تھا جس کی ایک تا تخفیف کے لیے حذف ہوگئی۔

[2] طعام اس آیت میں اور زیر بحث آیت میں مصدری معنی رکھتا ہے اور اطعام (کھانا کھلانے) کے معنی میں ہے۔

[3] "لم" کے معنی جمع کرنا ہیں اور کبھی ایسا جمع کرنا جس میں اصلاح کا مقصد بھی کار فرما ہو اس کے معنی میں آتا ہے۔

اسس طرح کرتے ہو تو یقیناً اپنے کمائے ہوئے مال کے بارے میں تو تم زیادہ بخیل اور سخت ہو گے جو بہت بڑا عیب ہے۔

تیسرے یہ کہ میراث اور چھوٹے بچوں کے حقوق کھانا ہے' اس لیے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بے ایمان افراد اور وہ جو کسی قانون کے پابند نہیں ہوتے، جب میراث کا مال ان کے ہاتھ لگ جائے تو وہ یتیم اور چھوٹے بچوں کا کوئی لحاظ نہیں کرتے اور چونکہ وہ یتیم اور چھوٹے بچے اپنے حقوق کی حفاظت نہیں کر سکتے لہٰذا یہ بے ایمان لوگ اس مال سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ قبیح ترین اور شرمناک ترین گناہ ہے۔ ان تینوں تفسیروں کے درمیان جمع بھی ممکن ہے[1]

اسس کے بعد ان کے چوتھے مذموم عمل کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے :

"اور تم دولت و ثروت کو زیادہ عزیز رکھتے ہو" (و تحبون المال حبًّا جمًّا)[2] تم دنیا پرست اور مال و متاعِ دنیا کے عاشق افراد ہو اور یقیناً وہ شخص جو مالِ دنیا سے ایسا لگاؤ رکھے وہ اس کے جمع کرنے کے وقت جائز و ناجائز، حلال و حرام کا خیال نہیں رکھتا۔ اس قسم کا شخص حقوقِ الٰہی کو بالکل تسلیم نہیں کرتا، یا ان میں کمی کا مرتکب ہوتا ہے۔ جس شخص کو حُبِ دنیا نے گھیر رکھا ہو، اس کے دل میں یادِ خدا کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

اس طرح نعمت و بلا کے ذریعہ انسانوں کی آزمائش کے ذکر کے بعد چار ایسی اہم آزمائشوں کی طرف متوجہ کرتا ہے جن کے بارے میں یہ مجرم گروہ ناکام ہو کر مردود ہوا تھا، یتیموں کے بارے میں آزمائش، مسکینوں کو کھانا کھلانے کی آزمائش، میراث کے حصّوں کی جائز و ناجائز طریقہ سے جمع کرنے کی آزمائش اور آخر میں بغیر کسی قید و شرط کے اموال جمع کرنے کی آزمائش۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ تمام آزمائشیں مالی پہلو رکھتی ہیں۔ واقعی اگر کوئی شخص مالی آزمائشوں سے عہدہ برآ ہو جائے تو پھر اس کے لیے دوسری آزمائشیں آسان ہو جائیں گی۔ یہ دنیا کا مال ہی ہے جو مشہور قول "ایمان خاک دادہ بباد" کے مطابق دنیا میں ایمان کو خراب کر دیتا ہے۔ آدم کے بیٹے کی عظیم ترین لغزشیں اسی شعبہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جو مال کے ایک حد تک قوانین ہیں لیکن جب ان کا پیمانہ پُر ہو جائے اور وہ اس حد سے گزر جائیں تو شیطانی وسوسے انہیں خیانت کی طرف کھینچ کرلے جاتے ہیں۔ سچے مومنین وہ ہیں جو امانت اور صحتِ عمل کا خیال دوسروں کے واجب و مستحب حقوق کے سلسلہ میں مال کی ہر حد میں بغیر کسی قید و شرط کے رکھتے ہیں۔ اس قسم کے افراد کو ایمان اور تقویٰ کا دعویٰ زیب دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ جو افراد ہر حالت میں اور مال کی ہر مقدار کے سلسلہ میں امتحان و آزمائش سے عہدہ برا ہو سکیں، وہ قابلِ اعتماد، متقی، پرہیزگار اور عمدہ شخصیت کے حامل ہوتے ہیں اور بہترین دوست و احباب شمار ہو سکتے ہیں وہ دوسرے معاملات میں بھی (عام طور پر) پاک اور عمدہ افراد ہوتے ہیں۔ مندرجہ بالا آیات جو مالی آزمائشوں تک محدود ہیں وہ اسی وجہ سے ہیں۔

---

[1] تراث اصل میں وراث (تراث ہی کے وزن پر) تھا اس کی واؤ تا میں تبدیل ہو گئی ہے۔

[2] جم جیسا کہ مصباح اللغۃ اور مقاییس میں آیا ہے کثیر اور فراواں کے معنی میں ہے اور جمّۃ بروزن جبّۃ سر کے آگے جمع شدہ بالوں کے معنی میں ہے۔

(۲۱) كَلَّآ إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝

(۲۲) وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝

(۲۳) وَجِایٓءَ يَوْمَئِذٍۢ بِجَهَنَّمَ ۚ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ وَأَنَّىٰ لَهُ الذِّكْرَىٰ ۝

(۲۴) يَقُولُ يَٰلَيْتَنِى قَدَّمْتُ لِحَيَاتِى ۝

(۲۵) فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهُۥٓ أَحَدٌ ۝

(۲۶) وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُۥٓ أَحَدٌ ۝

ترجمہ

(۲۱) ایسا نہیں ہے جیسا کہ وہ خیال کرتے ہیں جس دن زمین کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دی جائے گی۔

(۲۲) اور تیرے پروردگار کا فرمان پہنچے گا اور ملائکہ صف بہ صف ہوں گے۔

(۲۳) اور اس دن جہنم کو حاضر کریں۔ جی ہاں! اس دن انسان متذکر ہوگا، لیکن کیا فائدہ اس لیے کہ یہ تذکر اس کے لیے سود مند نہیں ہوگا۔

(۲۴) وہ کہے گا کاش اس زندگی کے لیے مَیں نے کوئی چیز بھیجی ہوتی۔

(۲۵) اس دن کوئی بھی اس جیسا عذاب نازل نہیں کرے گا۔

(۲۶) اور کوئی شخص اس کی طرح کسی کو قید و بند میں نہیں جکڑے گا۔

تفسیر

اس دن بیدار ہوں گے کہ جب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہوگا

ان مذمتوں کے بعد جو گزشتہ آیات میں سرکشی کرنے والوں، دنیا پرستوں اور دوسروں کے حقوق پر ہاتھ

صاف کرنے والوں کی ہوئی تھیں، ان آیات میں انہیں خطرے سے آگاہ کرتا ہے کہ آخر کار قیامت آنے والی ہے اور حساب و کتاب اور جزا و سزا کا مرحلہ در پیش ہے۔ ضروری ہے کہ آپ خود کو اس کے لیے تیار کریں۔ پہلے فرماتا ہے:

"ایسا نہیں ہے جیسا وہ گمان کرتے ہیں (کہ حساب و کتاب نہیں ہے اور اگر خدا نے انہیں مال دیا ہے تو ان کے احترام و اکرام کی وجہ سے دیا ہے، نہ کہ آزمائش و امتحان کے لیے) (کلا)۔

جس وقت زمین کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دی جائے گی (اذا دکت الارض دکا دکا)۔ دک اصل میں نرم و صاف زمین کے معنی میں ہے۔ پھر اونچی جگہ اور عمارتوں کے لیے کوٹنے اور ریزہ ریزہ کرنے اور صاف کرنے پر اطلاق ہوا ہے۔ "دکان" اس جگہ کو کہتے ہیں جو صاف اور نشیب و فراز کے بغیر ہو۔ "دکہ" (چبوترا) اس اونچی جگہ کو کہتے ہیں جسے بیٹھنے کے لیے صاف اور تیار کرتے ہیں۔ "دک" کی تکرار مندرجہ بالا آیت میں تاکید کے لیے ہے۔

مجموعی طور پر یہ تاکید دنیا کے اختتام اور قیامت کے آغاز کے زلزلوں اور جھنجوڑ دینے والے حوادث کی طرف اشارہ ہے موجودات میں اس قسم کا تزلزل رونما ہوگا کہ پہاڑ ریزہ ریزہ اور زمینیں ہموار ہو جائیں گی، جیسا کہ سورہ طٰہٰ کی آیہ ۱۰۵ سے ۱۰۷ تک آیا ہے:

(ویسئلونک عن الجبال فقل ینسفھا ربی نسفاً فیذرھا قاعاً صفصفاً لا تری فیھا عوجاً ولا امتاً) تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہہ دے میرا پروردگار انہیں برباد کر دے گا اور اس کے بعد زمین کو صاف و ہموار اور بے آب و گیاہ کر دے گا اس طرح کہ تو اس میں کسی طرح کا نشیب و فراز نہیں دیکھے گا۔

قیامت کے پہلے مرحلہ کے اختتام یعنی اس جہان کی ویرانی کے بعد دوسرا مرحلہ شروع ہوگا۔ سارے انسان زندہ ہو جائیں گے اور عدالت الٰہی میں ظاہر ہوں گے۔ اس وقت تیرے پروردگار کا فرمان آن پہنچے گا۔ فرشتے صف در صف حاضر ہوں گے (وجاء ربک والملک صفاً صفاً)۔ محشر میں موجود لوگوں کے اطراف کا محاصرہ کر لیں گے اور فرمانِ حق کے اجراء کے لیے آمادہ ہوں گے۔

یہ تصویر کشی اس عظیم دن کی عظمت اور عدالت کے چنگل سے انسان کے فرار کرنے کی توانائی نہ ہونے کی ہے۔

(جاء ربک) "تیرا پروردگار آئے گا" کی تعبیر اس حقیقت کا کنایہ ہے کہ مخلوقات کے حساب و کتاب کا فرمان پہنچے گا۔ یا پھر خدا کی عظمت کی علامتوں کا ظہور مراد ہے، یا پروردگار کے ظہور سے مراد اس دن اس کی معرفت کا ظہور ہے، اس طرح سے کہ کسی شخص کے لیے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ گویا سب لوگ اپنی آنکھوں سے اس کی ذات بے مثال کے جمال کا مشاہدہ کریں گے۔ بہر حال مسلّم ہے کہ خدا کا آنا، اس لفظ کے حقیقی معنی جن کا لازمہ جسم ہے اور کسی مکان میں منتقل ہونا ہے کوئی امکان نہیں رکھتے اور وہ مراد نہیں رہی اس لیے کہ خدا جسم اور خواص جسم سے مبرا ہے[1]

---

[1] فخر رازی اپنی تفسیر میں کہتا ہے کہ آیت میں کچھ محذوف ہے اور یہ محذوف ہو سکتا ہے کہ لفظ امر یا قہر یا جلائل آیات یا ظہور معرفت ہو، دوسرے مفسرین نے بھی ان چار الفاظ میں سے خصوصاً پہلے لفظ کو تقدیر آیت کے عنوان سے بیان کیا ہے۔

یہی مفہوم بڑی صراحت کے ساتھ ایک حدیث میں امام علیؑ بن موسیٰ رضاؑ سے منقول ہے۔ [1] اس تفسیر کی شاہد سورہ نحل کی آیت ۳۳ ہے جس میں فرماتا ہے:

(هل ينظرون الّا ان تأتيهم الملائكة او يأتي امر ربك) کیا وہ اس کے علاوہ توقع رکھتے ہیں کہ فرشتے ان کے پاس آئیں یا تیرے پروردگار کا امر آن پہنچے؟ صفاً صفاً کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ ملائکہ محشر میں مختلف صفوں میں وارد ہوں گے۔ احتمال ہے کہ ہر آسمان کے فرشتے ایک الگ صف میں حاضر ہوں گے اور اہل محشر کے گرد گھیرا ڈال دیں گے۔ اس کے بعد فرماتا ہے:

"اور اس دن جہنم کو لے آئیں گے، اس دن انسان متذکر ہوگا لیکن اس کو اس کا کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا" (وجیء یومئذ بجهنم یومئذ یتذکر الانسان وانّٰی له الذکرٰی)۔ اس تعبیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہنم چلانے کے قابل ہے اور اسے لاکر مجرموں کے قریب کر دیا جائے گا، جیسا کہ جنت کے بارے میں بھی سورہ شعراء کی آیت ۹۰ میں ہم پڑھتے ہیں (وازلفت الجنة للمتقین) جنت پرہیزگاروں کے نزدیک کر دی جائے گی۔

اگرچہ بعض مفسرین مائل ہیں کہ ان الفاظ کو مجازی معنوں پر محمول کریں اور جنت وجہنم کے نیکوکاروں اور بدکاروں کے سامنے ظہور کا کنایہ سمجھیں، لیکن اس خلاف ظاہر کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ بہتر ہے کہ انہیں اس کے ظاہر پر چھوڑ دیا جائے، اس لیے کہ عرصۂ محشر کی حقیقتیں ہم پر مکمل طور پر واضح نہیں ہیں اور وہاں کے حالات ہماری دنیا کے حالات سے بہت مختلف ہیں، پھر اس کا کوئی مانع نہیں ہے کہ اس روز دوزخ وجنت کو ان کی جگہ سے ہٹائیں گے۔

ایک حدیث پیغمبر اسلامؐ میں ہمیں ملتا ہے کہ جس وقت مندرجہ بالا آیت (وجیء یومئذ بجهنم) نازل ہوئی تو آپؐ کے چہرہ مبارک کا رنگ متغیر ہوگیا۔ یہ حالت اصحاب پر گراں گزری۔ وہ حضرت علیؑ کے پاس آئے اور ماجرا بیان کیا۔ حضرت علیؑ آئے اور پیغمبر اسلامؐ کے دونوں شانوں کے درمیان بوسہ دیا اور کہا:

"اے خدا کے رسولؐ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہو جائیں۔ کیا حادثہ رونما ہوا ہے؟"

آپؐ نے فرمایا: "جبرائیلؑ آئے تھے اور یہ آیت تلاوت کی ہے"

حضرت علیؑ کہتے ہیں: "میں نے عرض کیا کس طرح جہنم کو لے آئیں گے"؟

فرمایا: "ستر ہزار فرشتے ستر ہزار مہاروں کے ذریعہ اسے کھینچ کر لائیں گے اور وہ سرکشی کی حالت میں ہوگی۔ اگر اس کو چھوڑ دیں تو وہ سب کو آگ لگا دے گی۔ پھر میں جہنم کے سامنے کھڑا ہو جاؤں گا اور وہ کہے گی: اے محمدؐ مجھے آپ سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ خدا نے آپ کا جسم مجھ پر حرام کیا ہے"

اس دن ہر شخص اپنی فکر میں ہوگا لیکن جناب سید المرسلینؐ کہیں گے: "رب امتی رب امتی" (پروردگار میری

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۲۰ ص ۴۱۶۔

امت (میری امت) ؎۱

جی ہاں! جب مجرم انسان ان مناظر کو دیکھے گا تو ہل جائے گا، بیدار ہو جائے گا اور غم و اندوہ میں ڈوب جائے گا، اپنے ماضی پر نگاہ ڈالے گا اور اپنے اعمال سے سخت پشیمان ہوگا لیکن یہ پشیمانی اس کو کوئی فائدہ نہ دے گی۔ انسان آرزو کرے گا کہ واپس پلٹ جائے اور اپنے تاریک ماضی کی تلافی کرے لیکن واپسی کے دروازے مکمل طور پر بند ہوں گے۔ وہ چاہے گا کہ توبہ کرے لیکن توبہ کا زمانہ ختم ہو چکا ہوگا۔ وہ چاہے گا کہ اعمالِ صالح بجا لائے تاکہ اپنے بُرے اعمال کی تلافی کر سکے لیکن اعمال کا دفتر بند ہو چکا ہوگا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اس کی فریاد بلند ہوگی اور وہ کہے گا: "اے کاش! میں نے اپنی زندگی کے لیے اعمالِ صالح بھیجے ہوتے" (یقول یالیتنی قدمت لحیاتی)۔

قابلِ توجہ یہ ہے کہ یہ نہیں کہے گا کہ اپنی آخرت کی زندگی کے لیے، بلکہ کہے گا اپنی زندگی کے لیے، گو زندگی کا لفظ آخرت کی زندگی کے علاوہ کسی اور زندگی کے لیے موزوں نہیں ہے۔ اور جلدی گزر جانے والی، انواع و اقسام کے مصائب کی آمیزش رکھنے والی دنیاوی زندگی، زندگی شمار ہی نہیں ہوتی، جیسا کہ سورہ عنکبوت کی آیت ۶۴ میں ہم پڑھتے ہیں (وما هٰذه الحيٰوة الدنيا الّا لهو ولعب وانّ الدار الاٰخرة لهى الحيوان لو كانوا يعلمون) "یہ دنیا کی زندگی کھیل کود اور لہو و لعب کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور حقیقی زندگی آخرت کی زندگی ہے اگر تم جانتے ہو"۔

جی ہاں! وہ لوگ جنہوں نے یتیموں کا مال کھایا، بھوکوں کے منہ میں لقمہ نہیں دیا، ان کا مال و میراث غارت کیا اور مالِ دنیا کی محبت نے ان کے دل کو مسخر کر رکھا تھا، وہ اس دن آرزو کریں گے کہ کاش کوئی چیز آخرت کی زندگی کے لیے، جو حقیقی اور جاودان زندگی ہے، ہم نے آگے بھیجی ہوتی۔ لیکن یہ آرزو بے نتیجہ ہوگی۔

اس کے بعد دو مختصر جملوں میں اس دن کے عذاب کی شدت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اس دن خدا اس قسم کی سزا دے گا کہ اس جیسی سزا کوئی بھی نہیں دے سکے گا" (فیومئذ لا یعذب عذابه احد)۔

جی ہاں! یہ سرکش جو اپنی قوت کے وقت بدترین جرائم اور گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں، اس دن ان کو اس قسم کی سزا ملے گی جو اس سے پہلے کسی کو نہیں ملی ہوگی، جیسا کہ نیکوکار اس قسم کی جزا پائیں گے جو کسی کے خیال و گمان میں بھی نہیں گزری ہوگی، اس لیے کہ خدا ارحم الراحمین بھی ہے اور اشد المعاقبین بھی۔ نیز اس دن کوئی بھی خدا کی طرح کسی کو قید و بند کی سزا نہیں دے گا۔

(ولا یوثق وثاقه احد)۔ نہ اس کی قید و بند و زنجیر کی کوئی مثال ہے، نہ اس کے عذاب کی کوئی مثل و نظیر ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو جبکہ انہوں نے اس دنیا میں خدا کے مظلوم بندوں کو جتنا ان سے ممکن تھا قید و بند میں رکھا اور ان کو سخت تکالیف پہنچائیں۔

؎۱ مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۸۳۔ اس معنی کے قریب نیز تفسیر در المنثور میں آیا ہے "المیزان" کی نقل کے مطابق جلد ۲۰ ص ۴۱۵۔

(۲۷) يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝

(۲۸) ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝

(۲۹) فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝

(۳۰) وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝

ترجمہ

(۲۷) تُو اے سکون و اطمینان یافتہ نفس۔

(۲۸) اپنے پروردگار کی طرف پلٹ جا، اس حالت میں کہ تُو بھی اس سے راضی ہے اور وہ بھی تجھ سے راضی ہے۔

(۲۹) اور میرے بندوں کی صف میں شامل ہو جا۔

(۳۰) اور میری جنت میں وارد ہو جا۔

تفسیر

اے صاحب نفس مطمئنہ!

اس وحشتناک عذاب کے تذکرے کے بعد جو سرکشوں اور دنیا پرستوں پر قیامت میں نازل ہوگا، زیر بحث آیات میں اس کے برعکس جو صورت حال ہے اس کو پیش کرتا ہے۔ اب نفسِ مطمئنہ اور ان مومنین کی طرف جو ان عظیم طوفانوں میں مکمل سکون و اطمینان سے بہرہ ور رہے، متوجہ ہوا ہے۔ انہیں نہایت لطف و محبت سے مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اے نفسِ مطمئنہ!" (یا ایتھا النفس المطمئنۃ)۔ "اپنے پروردگار کی طرف پلٹ آ، اس حالت میں کہ تُو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے" (ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیّۃ)۔ "اور میرے بندوں کی صف میں داخل ہو جا" (فادخلی فی عبادی)۔ "اور میری جنت میں داخل ہو جا" (وادخلی جنتی)۔

کیا ہی پُرکشش، دل خوش کن اور روح پرور تعبیریں ہیں، جن سے لطف و صفا اور اطمینان کی خوشبو آتی ہے۔

پروردگار کی دعوتِ مستقیم ایسے نفوس کے لیے، جو ایمان کے سائے میں اطمینان وسکون کی حالت کو پہنچے ہوتے ہیں، انہیں اپنے پروردگار، اپنے مالک و مربی اور مصلح کی طرف بازگشت کی دعوت دیتا ہے، ایسی دعوت جو طرفین کی رضامندی لیے ہوتے ہے۔ دلدادہ عاشق کی رضامندی معشوق کے لیے اور محبوب ومعبودِ حقیقی کی رضامندی۔ اس کے بعد افتخارِ عبودیت کا تاج اس کے سر پر رکھنا اور لباسِ زندگی سے اُسے مفتخر کرنا اور اپنے خاصانِ بارگاہ کی سلک میں انہیں پرونا اور جگہ دینا۔

اس کے بعد انہیں جنت میں ورود کی دعوت دینا اور وہ بھی "میری جنت میں داخل ہو جا" کی تعبیر کے ساتھ جو بتاتی ہے کہ اس مہمان کا میزبان صرف اور صرف خدا کی ذات پاک ہے عجیب دعوت، عجیب مہمان اور عجیب میزبانی ہے۔

نفس سے مراد یہاں وہی انسان ہے اور مطمئنہ کی تعبیر اس سکون واطمینان کی طرف اشارہ ہے جو ایمان کے پرتو کے سائے میں پیدا ہوا ہے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: (الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب) "جان لو کہ صرف اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو سکون واطمینان حاصل ہوتا ہے"۔ (رعد-۲۸) اس قسم کا نفس اللہ کے وعدوں پر بھی اطمینان رکھتا ہے اور جو راہ اس نے اختیار کی ہے اس پر بھی مطمئن ہوتا ہے۔ دنیا اس کی طرف بڑھے، تب بھی اور اس سے منہ موڑے تب بھی، طوفانوں میں بھی اور حوادث وبلاؤں میں بھی، اور سب سے بالاتر خوف ووحشت اور قیامت کے عظیم اضطراب میں بھی۔

پروردگار کی طرف بازگشت سے مراد، مفسرین کی ایک جماعت کے نظریہ کے مطابق، اس کے ثواب و رحمت کی طرف بازگشت ہے، یعنی اس کے جوار وقرب میں جگہ پانا، معنوی وروحانی بازگشت پانا نہ کہ مادی وجسمانی۔

کیا پروردگار کی طرف بازگشت کی یہ دعوت صرف قیامت میں ہوگی یا جان دینے اور عمر کے لمحات کے ختم ہونے سے متعلق ہے؟ آیات کا سیاق تو البتہ قیامت سے مربوط ہے، اگرچہ خود اس آیت کی تعبیر مطلق و وسیع ہے۔ راضیہ کی تعبیر اس بنا پر ہے کہ ثوابِ خداوندی کے تمام وعدوں کو، اس سے زیادہ کہ جتنا وہ تصور کر سکتا تھا، وہ حقیقی طور پر دیکھے گا اور اس طرح خدا کا فضل وکرم اس کے شاملِ حال ہوگا کہ وہ مجسم رضا بن جائے گا۔ باقی رہی مرضیہ کی تعبیر تو وہ اس بنا پر ہے کہ وہ موردِ قبول و رضائے دوست واقع ہوا ہے۔

اس قسم کا بندہ اس طرح کے اوصاف کے ساتھ اور مکمل رضا وتسلیم کے مقام پر پہنچنے کے ساتھ جس نے عبودیت کی اس حقیقت کو جو معبود کی راہ میں ہر چیز کو چھوڑ دینا ہے، پالیا ہے اور اس نے خدا کے بندگانِ خاص کے دائرہ میں قدم رکھا ہے۔ یقیناً اس کے لیے جنت کے علاوہ کوئی دوسری جگہ نہیں ہے۔

بعض تفاسیر میں آیا ہے کہ یہ آیتیں سید الشہداء حضرت حمزہؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکی ہے، یہ حقیقت میں ایک قسم کی تطبیق ہے، نہ کہ شانِ نزول، جیسا کہ امام حسینؑ کے بارے میں بھی ہم نے سورہ کے آغاز میں پڑھا ہے۔ قابلِ توجہ یہ کہ کافی میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ایک روایت میں ہمیں ملتا ہے کہ آپ کے ایک صحابی نے پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک مومن اپنی روح کے قبض ہو جانے سے خوش نہ ہو؟ تو آپ نے فرمایا:

"نہیں خدا کی قسم! جب موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے کے لیے آتا ہے تو وہ ناخوشی و ناراضی کا اظہار کرتا ہے۔ اس وقت موت کا فرشتہ اس سے کہتا ہے "اے ولی خدا! پریشان نہ ہو، قسم ہے اس ذات کی جس نے محمدؐ کو مبعوث کیا ہے، مَیں تجھ پر مہربان باپ سے زیادہ شفیق ہوں۔ ٹھیک طرح سے اپنی آنکھیں کھول کر دیکھ لے۔" وہ دیکھے گا رسول خداؐ، امیرالمؤمنینؑ، فاطمۃ الزہراؑ، حسنؑ و حسینؑ اور ان کی ذریت میں سے باقی ائمہ کو، تو فرشتہ اس سے یہ کہے گا: "یہ رسول خداؐ، امیرالمؤمنین، حضرت فاطمۃ الزہراؑ، حسنؑ و حسینؑ اور باقی ائمہ تیرے دوست و محبوب ہیں"۔ وہ اپنی آنکھوں کو کھولے گا اور دیکھے گا۔ اچانک ایک کہنے والا پروردگار کی طرف سے کہے گا "یا ایتھا النفس المطمئنۃ" اے وہ شخص جو حضرت محمدؐ اور ان کے اہلبیتؑ پر ایمان رکھتا ہے، پلٹ آ اپنے پروردگار کی جانب، اس حالت میں کہ تُو ان کی ولایت پر راضی ہے اور وہ اپنے ثواب پر تجھ سے راضی ہیں۔ داخل ہو جا میرے بندوں یعنی محمدؐ اور ان کی اہلبیتؑ کے درمیان اور داخل ہو جا میری جنت میں۔ تو اس موقع پر اس مومن کے لیے کوئی اور چیز زیادہ محبوب نہیں ہوگی۔ وہ چاہے گا کہ جس قدر جلد ہو روح بدن سے رہا ہو اور اس منادی کے ساتھ مل جائے۔"[1]

خداوندا! ہمیں اس قسم کے اطمینان و سکون سے متنعم فرما تاکہ ہم اس عظیم خطاب کے لائق و شائستہ بنیں۔

پروردگارا! اس مقام تک پہنچنا تیرے لطف و کرم کے بغیر ممکن نہیں ہے ہمیں اپنے لطف و کرم سے نواز۔

خداوندا! یقیناً کوئی چیز تیرے کرم سے کم نہیں ہوگی، اگر ہمیں صاحبان نفوس مطمئنہ میں سے قرار دے، ہم پر احسان و کرم فرما۔

بارالٰہا! ہم جانتے ہیں کہ یہ سکون و اطمینان تیرے ذکر کے سائے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تُو ہمیں اپنے ذکر کی خود توفیق عطا فرما۔ آمین یارب العالمین

(اختتام سورہ فجر اور حصہ ۲۹ تفسیر نمونہ کا اختتام)

۷ رمضان المبارک / ۷ ۔ ۴ ھ

اختتام ترجمہ بتاریخ ۴ ۲ جمادی الثانی ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۹۸۸ء بوقت ۹ بجکر ۲۰ منٹ شب برمکان سیٹھ نوازش علی، E-81، ماڈل ٹاؤن لاہور، بدست حقیر پُر تقصیر سید صفدر حسین نجفی فرزند سید غلام سرور مرحوم۔

---

[1] کافی جلد ۳ باب انّ المؤمن لا یکرہ علی قبض روحہ۔ حدیث ۲۔

سُورَہ بَلَد

- یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔
- اس کی بیس آیات ہیں۔

سُورۂ بلد کی فضیلت اور اُس کا مضمون

یہ سُورہ مختصر ہونے کے باوجود عظیم حقائق اپنے اندر لیے ہوئے ہے :۔

۱۔ اس سُورہ کے پہلے حصّہ میں پُرمعنی قسموں کے ذکر کے بعد اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ انسان کی زندگی اس عالم میں مشکلات اور تکلیفوں کے ساتھ توام ہوتی ہے، تاکہ وہ ایک طرف تو اپنے آپ کو مشکلات سے جنگ کرنے کے لیے آمادہ کرے اور دُوسری طرف اس دُنیا میں راحت و آرام اور مطلق آسُودگی کی توقع اپنے ذہن سے نکال دے، کیونکہ مطلق آسُودگی و راحت تو صرف آخرت کی زندگی میں ہی ممکن ہے۔

۲۔ یہ سورہ دُوسرے حصّہ میں انسان پر اللہ کی کچھ اہم ترین نعمتوں کو شمار کرتا ہے، اور اس کے بعد ان نعمتوں کے مقابلہ میں اس کی ناشکری اور کُفرانِ نعمت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۳۔ اس سُورہ کے آخری حصّہ میں لوگوں کو دو گروہوں " اصحابِ میمنہ " اور " اصحابِ مشئمہ " میں تقسیم کرتا ہے، اور پہلے گروہ (صالح مومنین) کے صفاتِ اعمال کے ایک گوشہ کو اور پھر ان کی سرنوشت کو بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد ان کے نقطۂ مقابل یعنی کفّار و مجرمین اور ان کی سرنوشت کو پیش کرتا ہے۔

اس سُورہ کی آیات کی تعبیریں بہت ہی قاطع اور دو ٹوک اور چُبھنے والی ہیں، اس کی جُملہ بندیاں مختصر اور زوردار ہیں الفاظ بہت ہی مؤثر اور انتہائی فصیح ہیں، آیات کی صُورت اور اس کا مضمون اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ یہ شُورہ مکّی سُورتوں میں سے ہے۔

اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا :

" من قرأها اعطاه الله الامن من غضبه يوم القيامة "۔

"جو شخص سورہٴ بلد کو پڑھے گا خدا اُسے قیامت میں اپنے غضب سے امان میں رکھے گا۔"[1]

نیز ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ:

"جو شخص نمازِ واجب میں سورہ لا اقسم بھذا البلد" کو پڑھے گا وہ دُنیا میں صالحین میں شمار ہوگا اور آخرت میں ایسے لوگوں میں سے پہچانا جائے گا جو بارگاہِ خدا میں مقام و منزلت رکھتے ہیں، اور وہ انبیاء، شہداء اور صلحاء کے دوستوں میں سے ہوگا۔"[2]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۹۰

[2] "ثواب الاعمال" مطابق نقل نورالثقلین جلد ۵ ص ۵۷۸۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ لَآ اُقۡسِمُ بِہٰذَا الۡبَلَدِ ۝

۲۔ وَ اَنۡتَ حِلٌّۢ بِہٰذَا الۡبَلَدِ ۝

۳۔ وَ وَالِدٍ وَّ مَا وَلَدَ ۝

۴۔ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ ۝

۵۔ اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ عَلَیۡہِ اَحَدٌ ۝

۶۔ یَقُوۡلُ اَہۡلَکۡتُ مَالًا لُّبَدًا ۝

۷۔ اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّمۡ یَرَہٗۤ اَحَدٌ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ قسم ہے اس شہر مقدس (مکہ) کی۔

۲۔ وہ شہر کہ جس میں تو ساکن ہے!

۳۔ اور قسم ہے باپ اور اس کے بیٹے کی (ابراہیمؑ خلیل و اسمٰعیلؑ ذبیح)۔

۴۔ کہ ہم نے انسان کو تکلیف میں پیدا کیا ہے۔ (اور اس کی زندگی رنج و الم سے پُر ہے)۔

۵۔ کیا وُہ یہ گمان کرتا ہے کہ اس پر کوئی بھی قُدرت نہیں رکھتا ؟!

۶۔ وُہ یہ کہتا ہے کہ میں نے بہت سا مال (اچھے کاموں میں) تلف کر دیا ہے !

۷۔ کیا وُہ یہ گمان کرتا ہے کہ اُسے کسی نے نہیں دیکھا۔ (اور نہ ہی دیکھتا ہے) ؟

تفسیر

اس شہرِ مقدس کی قسم

بہت سے موارد میں قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ اہم حقائق کو قسم کے ساتھ شروع کرتا ہے۔ ایسی قسمیں جو خود بھی انسانی عقل اور فکر و نظر کے تحرک کا سبب ہوتی ہیں، ایسی قسمیں جو اس موردِ نظر مطلب کے ساتھ ایک خاص ربط رکھتی ہیں۔

یہاں بھی اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے کہ دُنیا میں انسان کی زندگی دُکھ، درد اور رنج و الم کے ساتھ توأم ہے ایک نئی قسم سے شروع کرتا ہے اور فرماتا ہے :

"قسم ہے اس شہرِ مقدس مکہ کی" (لا اقسم بھٰذا البلد)[1]

"وہ شہر کہ جس میں تو ساکن ہے" (وانت حل بھٰذا البلد)۔

اگرچہ ان آیات میں مکہ کا نام صراحت کے ساتھ نہیں آیا، لیکن ایک طرف تو اس سُورہ کے مکی ہونے کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور دُوسری طرف اس مقدس شہر کی حد سے زیادہ اہمیت کی بنا پر یہ بات واضح ہے کہ اس سے مُراد مکہ ہی ہے۔ اور مفسرین کا اجماع بھی اسی پر ہے۔

یقیناً سرزمین مکہ کی شرافت اور عظمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ خدا اس کی قسم کھائے، کیونکہ توحید اور پروردگار کی عبادت کا پہلا مرکز یہیں بنایا گیا تھا، اور عظیم پیغمبروں نے اس گھر کے گرد طواف کیا ہے۔ لیکن "وانت حل بھٰذا البلد" کا جملہ ایک نئے مطلب کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے، جو یہ کہتا ہے کہ یہ شہر تیرے وجود کے فیض و برکت سے اس قسم کی عظمت کا حامل ہو گیا ہے کہ وہ اس قسم کے لائق ہو گیا ہے۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ سرزمینوں کی قدر و قیمت ان میں مقیم انسانوں کی قدر و قیمت کی وجہ سے ہوا کرتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کفار یہ تصور کرنے لگیں کہ قرآن نے جو اس سرزمین کی قسم کھائی ہے تو وہ ان کا وطن ہونے، یا ان کے بتوں کا مرکز ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت کا قائل ہو گیا ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اس شہر کی قدر و قیمت (اس کے مخصوص تاریخی حالات سے قطع نظر) خدا کے خاص

---

[1] یہاں "لا" زائدہ ہے، جو تاکید کے لیے آیا ہے۔ البتہ ایک دوسری تفسیر کے مطابق احتمال ہے کہ "لا" نافیہ ہو (اس سلسلہ میں مزید وضاحت سُورۂ قیامت کی ابتداء میں دی گئی ہے)۔

بندے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجودِ ذیجود کی بنا پر ہے :

اے کعبہ را ز یمن قدوم تو صد شرف

وی مروہ را زِ مقدمِ پاکِ تو صد صفا

بطحا ز نورِ طلعت تو یافتہ فروغ

یثرب ز خاک پائے تو با رونق و نوا

اے وہ کہ تیرے قدوم میمنت لزوم سے کعبہ کا شرف سوگنا ہوگیا ہے۔

اور تیرے پاک قدم کے آنے سے مروہ کو صفائی حاصل ہوگئی ہے۔

بطحا نے تیرے نور کی چمک سے روشنی حاصل کی ہے ۔

اور یثرب تیرے پاؤں کی خاک کی وجہ سے بارونق اور خوشحال ہوگیا ہے۔

یہاں ایک اور تفسیر بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ : " میں اس شہرِ مقدس کی قسم نہیں کھاتا، جب کہ انہوں نے تیرے احترام کی ہتک کی ہے، اور تیری جان و مال اور عزت و آبرو کو حلال اور مباح شمار کر لیا ہے۔"

اور یہ کفار قریش کے لیے ایک شدید سرزنش اور توبیخ ہے کیونکہ وہ خود کو حرم مکہ کے خادم اور محافظ سمجھتے تھے اور وہ اس سرزمین کے احترام کے اس قدر قائل تھے کہ اگر ان کے باپ کا قاتل بھی اس میں آجاتا تو وہ بھی امان میں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ کہتے ہیں کہ جو لوگ مکہ کے درختوں کا چھلکا بھی لے کر اپنے بدن سے باندھ لیتے تھے تو وہ بھی اس کی وجہ سے امان میں ہوتے تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ان تمام آداب و سنن کو پاؤں تلے کیوں روند ڈالا !!

اور آپؐ کے اور آپؐ کے اصحاب کے بارے میں ہر قسم کے آزار اور اذیت کو جائز کیوں سمجھ لیا، یہاں تک کہ ان کے خون کو بھی مباح سمجھنے لگے !!

یہ تفسیر ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے بھی نقل ہوئی ہے[۱]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: " قسم ہے باپ اور اُس کے بیٹے کی" (و والد وما ولد)۔

اس بارے میں کہ اس باپ اور بیٹے سے کون مراد ہے ؟ کئی تفاسیر بیان کی گئی ہیں ۔

پہلی تفسیر یہ ہے کہ " والد " سے مراد " ابراہیم خلیل " اور " ولد " سے مراد " اسمٰعیلؑ ذبیح " ہیں ۔ اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گزشتہ آیت میں شہر مکہ کی قسم کھائی گئی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ کعبہ اور شہر مکہ کی بنیاد رکھنے والے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند اسمٰعیل علیہ السلام ہی تھے، یہ تفسیر بہت ہی مناسب نظر آتی ہے، خصوصاً زمانۂ جاہلیت کے عرب بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند کی حد سے زیادہ اہمیت کے قائل تھے، اور ان پر فخر کرتے تھے اور اُن میں سے بہت سے اپنا نسب ان دونوں تک پہنچاتے تھے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے بیٹے ہیں۔

---

[۱] " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۴۹۳

تیسری تفسیر یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت میں سے جو پیغمبر اور انبیاء مبعوث ہوئے وُہ مراد ہیں۔
چوتھی تفسیر یہ ہے کہ اس سے ہر باپ اور بیٹا مراد ہیں کیونکہ مختلف زمانوں میں توّلد اور نسلِ انسانی کی بقاء کا مسئلہ خلقت کی آفرینش کے حیرت انگیز ترین مسائل میں سے ہے، اور خدا نے خصوصیت کے ساتھ اس کی قسم کھائی ہے۔
ان چاروں تفسیروں کے درمیان جمع بھی بعید نہیں ہے اگرچہ پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔[1]
اس کے بعد اس چیز کو بیان کرتا ہے جو ان قسموں کا اصل مقصد ہے فرماتا ہے: "یقیناً ہم نے انسان کو رنج اور تکلیف میں پیدا کیا ہے، (لقد خلقنا الانسان فی کبد)۔
"کبد" مجمع البیان" میں طبرسی کے قول کے مطابق اصل میں شدّت کے معنی میں ہے، اسی لیے جب دُودھ گاڑھا ہو جاتا ہے تو اُسے "تکبد اللبن" کہتے ہیں۔
لیکن "مفردات" میں "راغب" کے قول کے مطابق "کبد" (بروزن حسد) اس درد کے معنی میں ہے جو انسان کے "کبد" (سیاہ جگر) کو عارض ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہر قسم کی مشقت اور دُکھ تکلیف کے لیے اطلاق ہونے لگا۔
اس لفظ کی اصل چاہے جو کچھ بھی ہو اس کا اس مقام پر مفہوم وہی رنج و تکلیف اور دُکھ درد ہی ہے۔
ہاں! انسان آغازِ زندگی سے ہی، یہاں تک کہ اسی لمحہ سے جب اس کا نطفہ قرارگاہ رحم میں واقع ہوتا ہے، مشکلات اور درد و رنج کے بہت سے مرحلے طے کرتا ہوا متولد ہوتا ہے اور پیدا ہونے کے بعد بچپنے میں، اور اس کے بعد جوانی میں، اور سب سے زیادہ بڑھاپے میں، طرح طرح کی زحمتوں، مشقتوں اور تکلیفات سے رُوبرو ہوتا ہے۔ دُنیا کی زندگی کا مزاج یہی ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور توقع رکھنا غلطی ہی غلطی ہے۔ ایک شاعر عرب کے قول کے مطابق:

طبعت علی کدر وانت تریدها
صفوًا عن الاکدار والاقذار؟
ومکلف الایام ضد طباعها
متطلب فی الماء جذوة نار؟

جہاں کی طبیعت کدورت اور گندے پن پر ہے اور تو چاہتا ہے کہ
ہر قسم کی کدورت اور ناپاکی سے صاف ہو،
تو جو شخص دُنیا کے دَور کو اس کے مزاج کے برخلاف طلب کرے گا،
وُہ اس شخص کی مانند ہے جو پانی کی موجوں کے درمیان آگ کا شعلہ طلب کرے۔

انبیاء اور اولیاء اللہ کی زندگیوں کی طرف نگاہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے آفرینش کے ان سر سبد پھولوں کی زندگی بھی انواع و اقسام کے غیر مناسب امور اور درد و تکلیف میں گھری ہوئی تھی۔ جب دُنیا ان کے لیے اس طرح ہے تو دُوسروں کے لیے اس کی وضع و کیفیت واضح ہے

---

[1] بعض تفاسیر میں والد سے مراد امیرالمومنینؑ اور اولاد سے مراد ان کے فرزندانِ گرامی ہیں، اور شاید وہ جناب اس کے بہترین مصداق ہوں لہٰذا اس تفسیر کو ذکر کرنا زیادہ مناسب تھا (مترجم)

اور اگر ہمیں کچھ افراد یا معاشرے ایسے نظر آتے ہیں جنہیں بظاہر کوئی دُکھ اور تکلیف نہیں ہوتی تو وہ یا تو ہمارے سطحی مطالعہ کی وجہ سے ایسا دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے جب ہم اور زیادہ نزدیک ہوتے ہیں تو انہیں مرفہ الحال زندگی والوں کے درد و رنج کے عمق اور گہرائی سے آشنا ہو جاتے ہیں' اور یا پھر وہ ایک محدود مدت اور استثنائی زمانہ کے لیے ہوتا ہے، جو عالم کے قانونِ کلی کو نہیں توڑتا۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "کیا یہ انسان یہ گمان کرتا ہے کہ کوئی بھی اس پر دست رسی کی قدرت نہیں رکھتا" (ایحسب ان لن یقدر علیہ احد)[1]۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کی زندگی کی ان تمام درد، دکھ اور تکالیف کے ساتھ آمیزش اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بالکل کوئی قدرت نہیں رکھتا۔

لیکن غرور و تکبر کے گھوڑے پر سوار ہے اور ہر قسم کے غلط کام گناہ جُرم اور حد سے بڑھ جانے کا مرتکب ہوتا رہتا ہے، گویا وہ خود کو امن و امان میں سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو سزاؤں کی قلم رَو سے دُور خیال کرتا ہے۔ جب اُسے قدرت حاصل ہو جاتی ہے تو تمام خُدائی احکام کو پاؤں کے نیچے روند ڈالتا ہے، جیسے مطلقاً خدا کا بندہ نہیں ہے۔ کیا واقعاً وہ یہی خیال کرتا ہے کہ پروردگار کے عذاب کے چنگل سے رہائی حاصل کرلے گا؟ کتنا بڑا اشتباہ اور غلط فہمی ہے!

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس سے مُراد وہ دولت مند ہیں جو یہ خیال کرتے تھے کہ کوئی ان کی دولت و ثروت کو ان سے چھین لینے کی قدرت نہیں رکھتا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مُراد وہ لوگ ہیں جن کا عقیدہ یہ تھا کہ ان کے اعمال کی کوئی بھی باز پُرس نہیں کرے گا۔

لیکن آیت ایک جامع مفہوم رکھتی ہے جو ان تمام تفاسیر کو شامل ہو سکتی ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اُوپر والی آیت قبیلہ "جمح" کے ایک شخص کی طرف جس کا نام "ابو الاسد" تھا اشارہ ہے وہ اس قدر طاقت وَر تھا کہ چمڑے کے ایک ٹکڑے پر بیٹھ جاتا تھا اور دس آدمی اُسے اس کے نیچے سے کھینچنا چاہتے تھے تو نہیں کھینچ سکتے تھے وہ چمڑا ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا تھا، لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتا تھا[2]۔

لیکن آیت کا اس قسم کے مغرور شخص یا اشخاص کے بارے میں بیان اس مفہوم کی عمومیت و وسعت سے مانع نہیں ہے۔

اس کے بعد اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "وہ یہ کہتا ہے کہ میں نے بہت زیادہ مال تباہ کر دیا ہے"۔ (یقول اھلکت مالا لبدا)۔

یہ ایسے لوگوں کی طرف اشارہ ہے کہ جب انہیں کارِ خیر میں مال صرف کرنے کو کہتے تھے تو وہ غرور و نخوت کی بنا پر یہ کہتے تھے: ہم نے بہت زیادہ مال ان کاموں میں صَرف کیا ہے، حالانکہ انہوں نے خدا کی راہ میں کوئی چیز خرچ نہیں کی تھی۔ اور اگر انہوں نے کسی کو کچھ مال دیا بھی تھا تو وہ دکھاوے، ریاکاری اور شخصی اغراض کی بنا پر تھا۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آیت میں ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

[1] "ان" اس جملہ میں "مثقلہ" سے مخفف ہے" اور تقدیر میں "انہ لن یقدر علیہ احد" ہے۔

[2] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۹۲

کی دُشمنی اور اسلام کے بر خلاف سازشوں میں صَرف کیا تھا اور وُہ اس پر فخر کرتے تھے، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جنگ خندق کے دن جب علی علیہ السلام نے عمر بن عبدود کے سامنے اسلام کو پیش کیا تو اس نے جواب میں کہا:

" فاین ما انفقت فیکم مالاً لبدًا " :

" پس وُہ سارا مال جو میں نے تمہاری مخالفت میں صَرف کیا ہے اس کا کیا بنے گا؟" [1]

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آیت " حارث بن عامر جیسے بعض سرداران قریش کے بارے میں ہے، جو ایک گناہ کا مرتکب ہُوا تھا۔ اس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نجات کے بارے میں پُوچھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے کفارہ دینے کا حکم دیا۔ اُس نے کہا: جب سے میں دینِ اسلام میں داخل ہوا ہوں میرا تمام مال و دولت کفّاروں اور نفقات میں نابود ہوگیا ہے۔ [2]

اِن تینوں تفاسیر کے درمیان جمع میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے اگرچہ پہلی تفسیر آیت کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔

" اھلکت " کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے اموال درحقیقت نابود ہی ہوئے ہیں، اور اُسے ان سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

" لبد " (بروزن لغت) تہ بہ تہ اور انبوہ کثیر کے معنی میں ہے اور یہاں بہت زیادہ مال کے معنی میں ہے۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: " کیا وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اُسے کسی نے نہیں دیکھا، اور نہ ہی دیکھے گا " ؟! (ایحسب ان لم یرہ احد)۔

وہ اس حقیقت سے غافل ہے کہ نہ صرف اس کے ظاہری اعمال کو خلوت و جلوت میں دیکھتا ہے، بلکہ اس کے دل اور رُوح کی گہرائیوں سے بھی آگاہ ہے، اور اس کی نیتوں سے باخبر ہے: کیا یہ ممکن ہے کہ وہ خدا جس کا غیر متناہی وجود ہر چیز پر احاطہ رکھتا ہے کسی چیز کو نہ دیکھے اور نہ جانے؟ یہ غافل اس بات سے بے خبر ہیں کہ وہ اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے خود کو پروردگار کی دائمی نگرانی سے باہر خیال کر رہے ہیں۔

ہاں! خدا کو علم ہے کہ انہوں نے یہ اموال کہاں سے حاصل کیے ہیں اور انہیں کس راہ میں صَرف کیا ہے؟!

ایک حدیث میں ابنِ عباسؓ سے نقل ہوا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

" لا تزول قدما العبد حتی یسأل عن اربعة : عن عمره فیما افناه وعن ماله من این جمعه، وفیما ذا انفقه ؟ وعن عمله ماذا عمل به ؟ وعن حبنا اهل البیت "

" قیامت میں کوئی شخص اپنے قدم سے قدم نہیں اُٹھائے گا، مگر یہ کہ چار چیزوں کے بارے میں اس سے سوال ہوگا: اس کی عمر کے بارے میں کہ اُسے کس راہ میں فنا کیا، اس کے مال کے بارے میں کہ اسے کہاں سے جمع کیا، اور کس راہ میں اُسے صَرف کیا، اور اس کے عمل کے بارے

[1] " نورالثقلین جلد ۵ ص ۵۸۰ حدیث ۱۰

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۹۳

ہیں کہ اس نے کون کون سا عمل انجام دیا، اور ہم اہل بیتؑ کی محبت و مودت کے بارے میں؟[1]

خلاصہ یہ ہے کہ انسان کس طرح سے مغرور ہو جاتا ہے اور قدرت و طاقت کا دعویٰ کیسے کرتا ہے، حالانکہ اس کی زندگی درد و رنج اور تکلیفات کے ساتھ خمیر ہوئی ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ مال ہے تو ایک رات کے لیے ہے، اور اگر جان رکھتا ہے تو ایک بخار تک ہے۔ اور پھر وہ یہ دعویٰ کیسے کرتا ہے کہ میں نے بہت زیادہ مال خدا کی راہ میں خرچ کیا ہے جب کہ وہ اس کی نیت سے آگاہ ہے اور ان اموال کے غیر شرعی حصول کی کیفیت سے بھی آگاہ ہے، اور ریا کاری اور مغرضانہ طور پر صرف کرنے کی کیفیت سے بھی باخبر ہے۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۹۴۔ اسی معنی کے مانند تفسیر "روح البیان" جلد ۱۰ ص ۴۳۵ میں بھی آیا ہے۔

۸۔ اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَيۡنَيۡنِۙ ‏

۹۔ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيۡنِۙ ‏

۱۰۔ وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ‌ۚ ‏

ترجمہ

۸۔ کیا ہم نے اس (انسان) کے لیے دو آنکھیں قرار نہیں دیں؟

۹۔ اور ایک زبان اور دو ہونٹ (اُسے نہیں دیے)؟

۱۰۔ اور ہم نے اُسے اس کی بھلائی اور بُرائی کی دونوں راہیں دکھا دیں۔

تفسیر

آنکھ، زبان اور ہدایت کی نعمت

گزشتہ آیات کے بعد، جن میں سرکشی کرنے والے انسانوں کے غرور و غفلت کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی، زیرِ بحث آیات میں انسان پر خدا کی اہم ترین مادّی و معنوی نعمتوں کا کچھ حصہ بیان کرتا ہے۔ تاکہ ایک طرف تو اس کے غرور و غفلت کو توڑے اور دُوسری طرف اُسے ان نعمتوں کو خلق کرنے والے میں تفکر اور غور و خوض کرنے پر آمادہ کرے اور اس کے دل و جان کے اندر شکرگزاری کے احساس کو بیدار کر کے اُسے خالق کی معرفت کی طرف چلائے۔

پہلے فرماتا ہے: "کیا ہم نے اس انسان کے لیے دو آنکھیں قرار نہیں دیں"۔ (الم نجعل له عينين)۔

"اور ایک زبان اور دو ہونٹ (نہیں دیے)؟!" (ولسانًا و شفتين)۔

اور ہم نے اُسے اس کی بھلائی اور بُرائی کی دونوں راہیں دکھا دیں"۔ (وهديناه النجدين)۔

اس طرح ان چند مختصر جملوں میں تین اہم مادّی نعمتوں اور ایک عظیم معنوی نعمت کی طرف، جو سب کی سب خدا کی عظیم ترین نعمتیں ہیں، اشارہ کیا ہے۔ ایک طرف تو آنکھوں، زبان اور لبوں کی نعمت ہے اور دُوسری طرف خیر و شر کی معرفت و ہدایت کی نعمت ہے۔

(اس بات کی طرف توجہ ہے کہ "نجد" اصل میں مرتفع اور بلند مقام کے معنی میں ہے، "تہامہ" کے مقابلہ میں جو پست

زمینوں پر بولا جاتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں " بلند جگہ " اور " پست جگہ " اور یہاں خیر و شر اور سعادت و شقاوت کی راہ سے کنایہ ہے۔[1]

اُوپر والی نعمتوں کی اہمیت کے بارے میں بس اتنا کافی ہے کہ :

" آنکھ " بیرونی دُنیا سے انسان کے رابطہ کے لیے ایک اہم ترین ذریعہ ہے۔ آنکھ کے عجائبات اس قدر ہیں کہ وہ واقعی طور پر انسان کو خالق کے مقابلہ میں خضوع کرنے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ آنکھ کے سات طبقے جو صلبیہ (قرنیہ) مشیمیہ، عنبیہ، جلدیہ، زلالیہ، زجاجیہ اور شبکیہ کے نام سے موسوم ہیں، ان میں سے ہر ایک عجیب و غریب اور عمدہ ساخت رکھتا ہے جن میں نور روشنی اور آئینوں سے مربوط طبیعاتی اور جسمانی قوانین کا بہت ہی باریک بینی کے ساتھ خیال رکھا گیا ہے۔ اس طرح سے کہ تصویر کشی کی ترقی یافتہ ترین دور بینیں بھی اس کے مقابلہ میں بے قدر و قیمت ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ساری دُنیا میں انسان کے سوا، اور سارے وجودِ انسانی میں آنکھ کے علاوہ اور کوئی چیز نہ ہوتی، تو اس کی عجائبات کا مطالعہ پروردگار کے عظیم علم و قدرت کی شناخت کے لیے کافی تھا۔

باقی رہی " زبان " تو وہ انسان کے لیے دوسرے انسانوں سے ارتباط، اور ایک قوم سے دوسری قوم، اور ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف اطلاعات و معلومات کے نقل ہونے، اور مبادلہ کا ایک اہم ترین ذریعہ ہے۔ اور اگر یہ ارتباط کا ذریعہ نہ ہوتا تو انسان ہرگز بھی علم و دانش اور مادی تمدن اور معنوی مسائل میں اس حد تک ترقی نہ کر سکتا۔

باقی رہے " لب " تو " اولاً " بول چال میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے کیونکہ بہت سے حروف لبوں ہی کے ذریعے ادا ہوتے ہیں اس کے علاوہ ہونٹ کے چبانے، اور منہ کی رطوبت کو محفوظ رکھنے اور پانی کے پینے میں بہت زیادہ مدد کرتے ہیں، اور اگر یہ نہ ہوتے تو انسان کے کھانے پینے کا مسئلہ، یہاں تک کہ اس کے چہرہ کا منظر، اس کے لعاب دہن کے باہر کی طرف بہنے کی وجہ سے، اور بہت سے حروف کی ادائیگی پر قدرت نہ رکھنے کی بناء پر افسوس ناک ہوتا۔

اور چونکہ حقائق کا ادراک پہلے درجہ میں آنکھ اور زبان سے ہوتا ہے۔ ان کے بعد " عقل " اور فطری ہدایت آتی ہے، یہاں تک کہ آیت کی تعبیر " ہدایت تشریعی " کو بھی جو انبیاء و اولیاء کے ذریعے ہوتی ہے شامل ہے۔

ہاں! اس نے دیکھنے والی آنکھ اور زبان کو بھی انسان کے اختیار میں رکھا ہے، اور " راہ اور چاہ " کی بھی اسے نشان دہی کرا دی ہے " تا آدمی نگاہ کند پیش پائے خویش " تاکہ انسان اپنے سامنے کی ہر چیز کو دیکھ لے۔

لیکن ان روشن چراغوں کے باوجود، جو اس کے راستے میں موجود ہیں، اگر پھر بھی کوئی راستہ سے ہٹ جاتا ہے تو پھر کہنا چاہیئے : " بگذار تا بیفتد و ببیند سزائی خویش "! اُسے گرنے دو تاکہ وہ اپنی سزا پالے۔

" وھدیناہ النجدین " : (ہم نے اُسے بھلائی اور بُرائی کے دونوں راستے دکھا دیئے) کا جملہ علاوہ اس کے کہ وہ انسان کے ارادہ کی آزادی اور اختیار کے مسئلہ کو بیان کرتا ہے، اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ " نجد " اُونچی جگہ کو کہتے ہیں لہٰذا یہ اس بات

---

[1] یہ تفسیر ایک حدیث میں امیر المومنین علیؑ سے نقل ہوئی ہے (مجمع البیان زیر بحث آیات کے ذیل میں) اور یہ جو بعض نے ماں کے دو پستانوں سے جو سینہ پر اُبھرے ہوئے ہوتے ہیں تفسیر کی ہے بہت ہی بعید ہے ضمنی طور پر یہ بھی کہ تعبیر خیر کے بارے میں اس کی عظمت کی وجہ سے ہے اور شر کے بارے میں باب تغلیب سے ہے۔

کی طرف اشارہ ہے کہ خیر اور بھلائی کی راہ کو طے کرنا مشکلات، زحمت اور رنج سے خالی نہیں ہے، جیسا کہ اُونچی زمینوں کی طرف جانا مشکل ہے یہاں تک کہ شر اور بُرائی کی راہوں کو طے کرنا بھی مشکلات رکھتا ہے لہٰذا کیسی اچھی بات ہے کہ انسان سعی و کوشش سے خیر کی راہ کو اختیار کرے۔

لیکن اس کے باوجود راستہ کا انتخاب کرنا خود انسان کے اختیار میں ہے۔ یہ وہی ہے جو اپنی آنکھ اور زبان کو حلال یا حرام کے راستہ میں گردش دے سکتا ہے اور خیر و شر کی دونوں راہوں میں سے جسے چاہے انتخاب کر سکتا ہے۔

لہٰذا ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے خداوند تعالیٰ آدم علیہ السلام کی اولاد سے کہتا ہے:

"یا بن آدم ! ان نازعك لسانك فیما حرمت علیك فقد اعنتك علیه بطبقتین فاطبق، وان نازعك بصرك الی بعض ما حرمت علیك فقد اعنتك علیه بطبقتین فاطبق ..."

"اے اولادِ آدم! اگر تیری زبان تجھے کسی فعلِ حرام پر اُبھارنا چاہے، تو مَیں نے اُسے روکنے کے لیے دو ہونٹ تیرے اختیار میں دیے ہیں۔ پس تو ہونٹوں کو بند کر لے اور اگر تیری آنکھ تجھے حرام کی طرف لے جانا چاہے تو مَیں نے پلکیں تیرے اختیار میں دے دی ہیں تو انہیں بند کر لے ...." [1]

اس طرح سے خدا نے ان عظیم نعمتوں پر کنٹرول کے وسائل و ذرائع بھی انسان کے اختیار میں دیے ہیں اور یہ ایک اور اس کا عظیم لطف ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اُوپر والی آیات میں زبان کے بارے میں تو لبوں کی طرف اشارہ ہوا ہے، لیکن آنکھوں کے بارے میں پلکوں کی طرف اشارہ نہیں ہُوا۔ اس کے ظاہراً دو اسباب ہیں، ایک تو یہ ہے کہ لبوں کا کام بات کرنے، کھانا کھانے اور تمام پہلوؤں میں پلکوں کی نسبت آنکھوں کے لیے کام کرنے سے کئی گنا زیادہ ہے، اور دوسرا سبب یہ ہے کہ زبان کا کنٹرول کرنا آنکھ کے کنٹرول سے کئی درجے زیادہ اہم ہے، اور زیادہ بخت ساز ہے۔

چند نکات

۱۔ آنکھ کی حیرت انگیزیاں

آنکھ کو عام طور پر کیمرے کی دُوربین سے تشبیہ دیتے ہیں، جو اپنی بہت ہی چھوٹی سی پُتلی کے ساتھ مختلف مناظر کے فوراً آتی ہے ایسی تصویریں جو فلم کی بجائے "شبکیہ چشم" (آنکھ کی سکرین) پر منعکس ہوتی ہیں اور وہاں سے بینائی کے اعصاب کے ذریعے دماغ میں منتقل ہوتی ہیں۔

---

[1] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۵۸۱۔

تصویر کشی کا یہ حد سے زیادہ لطیف و دقیق کارخانہ، شب و روز میں کئی ہزار تصویریں مختلف مناظر کی اتار سکتا ہے، لیکن تصویر کشی اور فلمیں بنانے کی ترقی یافتہ ترین مشینوں پر بھی اس کا بہت سے پہلوؤں سے قیاس نہیں ہو سکتا، کیونکہ :

۱۔ اس مشین میں روشنی کو منظم کرنے والا دریچہ وہی آنکھ کی پتلی ہے جو خود کار طریقہ سے زیادہ قوی روشنی کے مقابلہ میں زیادہ تنگ اور کمزور روشنی کے مقابلہ میں زیادہ کشادہ ہو جاتی ہے حالانکہ کیمرے کی مشین کو اشخاص کے ذریعے منظم کرنا پڑتا ہے۔

۲۔ آنکھ کا عدسہ، ان تمام شیشوں کے برخلاف، جو دنیا کے تصویر کشی کے کیمروں میں استعمال ہوتے ہیں، ہمیشہ اپنی شکل بدلتا رہتا ہے اس طور پر کہ کبھی تو اس کا قطر ۱/۵ ملی میٹر ہو جاتا ہے اور کبھی ۸ ملی میٹر تک پہنچ جاتا ہے تاکہ وہ دور اور نزدیک کے مناظر کی تصویریں بنا سکے۔ اور یہ کام ان عضلات کے ذریعے، جنہوں نے عدسہ کو گھیرا ہوا ہے، اور وہ کبھی اُسے کھینچ لیتے ہیں اور کبھی چھوڑ دیتے ہیں، انجام پاتا ہے، اس طرح سے آنکھ کا ایک عدسہ تنہا سینکڑوں عدسوں کا کام انجام دیتا ہے۔

۳۔ تصویر کشی کی یہ مشین چار مختلف سمتوں کی طرف حرکت کرتی ہے، یعنی آنکھ کے عضلات کی مدد سے جس طرف چاہے حرکت کر سکتی ہے اور تصویر بنا سکتی ہے۔

۴۔ یہاں ایک اور اہم نکتہ بھی ہے کہ تصویر کشی کے کیمروں کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کی فلموں کو تبدیل کرتے رہیں، اور جب فلم کی ایک ریل ختم ہو جائے تو اس کی جگہ دوسری ریل رکھنی پڑتی ہے۔ لیکن انسان کی آنکھیں زندگی بھر تصویریں اتارتی رہتی ہیں، اور اس میں کوئی چیز تبدیل نہیں کرنی پڑتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنکھ کی سکرین کا وہ حصہ، جس پر تصویریں منعکس ہوتی ہیں، اس میں دو قسم کے سلول ہوتے ہیں :

۱۔ مخروطی سلول ، ۲۔ عمودی سلول، جو روشنی کے مقابلہ میں بہت ہی زیادہ حساس مادہ رکھتے ہیں اور روشنی کی تھوڑی سی چمک سے ہی ان کا تجزیہ ہو جاتا ہے اور وہ ایسی لہریں پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ دماغ کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد اس کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور سکرین دوبارہ نئی تصویر کھینچنے کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے۔

۵۔ تصویریں کھینچنے والی دُور بینیں بہت ہی محکم اور مضبوط مادوں سے بنائی گئی ہیں، لیکن آنکھ کی تصویر کھینچنے کی مشین اتنی لطیف ہے کہ جس میں معمولی سی چیز سے بھی خراش آجاتی ہے، اسی وجہ سے اس کو ایک مضبوط ہڈیوں سے بنی ہوئی حفاظت گاہ میں رکھا گیا ہے، لیکن اتنی ظرافت و نزاکت کے باوجود یہ لوہے اور فولاد سے بھی زیادہ چلنے والی چیز ہے۔

۶۔ فلمیں بنانے والوں اور تصویریں کھینچنے والوں کے لیے "روشنی کے منظم ہونے" کا مسئلہ ایک بہت ہی اہم مسئلہ ہے، اور اس مقصد کے لیے کہ تصویریں صاف ہوں، بعض اوقات کئی کئی گھنٹے روشنی اور اس کے مقدمات کو منظم کرنے میں مشغول رہنا پڑتا ہے، جبکہ آنکھ تمام حالات میں، چاہے روشنی قوی ہو یا درمیانی یا کمزور، یہاں تک کہ تاریکی میں بھی، بشرطیکہ معمولی اور خفیف سی روشنی بھی وہاں پر موجود ہو تصویر لے لیتی ہے۔ اور یہ چیز آنکھ کے عجائبات میں سے ہے۔

۷۔ بعض اوقات ہم روشنی سے تاریکی کی طرف جاتے ہیں، یا بجلی کے بلب اچانک بجھ جاتے ہیں، تو ہم اس وقت کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتے، لیکن چند ہی لمحے گزر جانے کے بعد ہماری آنکھ خود کار طور پر اپنی کیفیت کو اس کمزور روشنی کے ساتھ منطبق کر لیتی ہے، اس طرح سے کہ جب ہم اپنے اردگرد نظر کرتے ہیں کہ ہماری آنکھ تاریکی کی عادی ہو گئی ہے اور یہ عادت والی تعبیر جو سادہ اور عام زبان

میں ادا ہو جاتی ہے۔ ایک بہت ہی پیچیدہ مکانیزم (طرزِ ساخت) کا نتیجہ ہے جو آنکھ میں رکھی گئی ہے، اور وہ خود کو بہت ہی مختصر سے وقت میں نئے حالات پر منطبق کر سکتی ہے۔

اس کے برخلاف جب ہم تاریکی سے روشنی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کے برعکس ہوتا ہے۔ یعنی ابتداء میں ہماری آنکھ قوی روشنی کو برداشت نہیں کرتی، لیکن چند لمحات کے بعد وہ اس سے منطبق ہو جاتی ہے اور اصطلاح کے مطابق عادی ہو جاتی ہے لیکن یہ امور تصویر بنانے والے کیمروں میں ہرگز موجود نہیں ہیں۔

۸۔ تصویر بنانے والے کیمرے محدود فضا سے تصویر بنا سکتے ہیں جب کہ انسان کی آنکھ تمام اُفق کا نیم دائرہ جو اس کے سامنے ہوتا ہے دیکھ لیتی ہے، اور دوسرے لفظوں میں ہم اپنے اطراف کے تقریباً ۱۸۰ درجے کے دائرے کو دیکھ لیتے ہیں، جب کہ تصویر کشی کا کوئی کیمرہ ایسا نہیں ہے۔

۹۔ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ انسان کی دونوں آنکھیں، جن میں سے ہر ایک ایک مستقل مشین ہے، اس طرح منظم ہوئی ہیں کہ ان دونوں سے لیے گئے فوٹو ایک ہی نقطہ پر جا کر پڑتے ہیں۔ اس طرح سے اگر یہ تنظیم تھوڑی سی بھی خراب ہو جائے تو انسان اپنی دو آنکھوں سے ایک ہی جسم کو دو جسم دیکھتا ہے، جیسا کہ احول (جسے دو دو نظر آتے ہوں) اشخاص میں یہ معنی مشاہدہ ہوتا ہے۔

۱۰۔ دُوسرا قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ وہ تمام مناظر جن کی آنکھ تصویر کشی کرتی ہے آنکھ کی سکرین پر اُلٹے پڑتے ہیں، حالانکہ ہم کسی چیز کو اُلٹا نہیں دیکھتے، آنکھ کے عادی اور چیزوں کی ایک دوسرے سے نسبت کو ملحوظ رکھنے کی بناء پر ہے۔

۱۱۔ آنکھ کی سطح ہمیشہ مرطوب ہونی چاہیے، کیونکہ اگر وہ چند ساعت بھی خشک رہ جائے تو اس پر شدید ضرب پڑے۔ یہ رطوبت ہمیشہ آنسوؤں کے غدودوں سے حاصل ہوتی ہے جو آنکھ میں ایک طرف سے وارد ہوتے ہیں اور بہت ہی باریک اور ظریف رگوں سے، جو آنکھوں کے کناروں پر ہوتی ہیں، باہر نکلتے ہیں، اور ناک کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں اور اُسے بھی مرطوب رکھتے ہیں۔

اگر آنکھ کے غدود خشک ہو جائیں تو آنکھ خطرے میں پڑ جاتی ہے اور پلکوں کی حرکت غیر ممکن ہو جاتی ہے، اور اگر اس کا فعل حد سے زیادہ بڑھ جائے تو ہمیشہ چہرے پر آنسو بہتے رہیں، یا اگر آنکھ کے فاضل پانی کو خشک کرتے رہیں اور یہ کتنا بڑا دردِ سر ہے

۱۲۔ آنسوؤں کی ترکیب ایک پیچیدہ ترکیب ہے، اور اس میں دس سے زیادہ عناصر ہوتے ہیں اور وہ مجموعاً آنکھ کی نگہداشت کے لیے ایک بہترین اور مناسب ترین مائع یا مرکب ہوتا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ آنکھ کے عجائبات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے بارے میں کئی دن تک بیٹھ کر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے، اور ان کے لیے کئی کتابیں لکھنی پڑیں، اور ان تمام چیزوں کے باوجود اگر ہم اس کے اصلی مادہ کو دیکھیں تو وہ تقریباً چربی کے ایک ٹکڑے سے زیادہ نہیں ہے۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام اپنی ایک قابلِ قدر گفتگو میں فرماتے ہیں:

"اعجبوا لھذا الانسان ینظر بشحم، ویتکلم بلحم، ویسمع بعظم، ویتنفس من خرم!"

"تعجب ہے اس انسان پر جو چربی کے ایک ٹکڑے سے دیکھتا ہے، اور گوشت کے ایک ٹکڑے

سے بولتا ہے ہڈی سے سنتا ہے سوراخ سے سانس لیتا ہے اور وہ ان بزرگ
حیاتی کاموں کو ان چھوٹے سے وسائل کے ذریعے انجام دیتا ہے۔[1]

۲۔ زبان کی حیرت انگیزیاں

زبان بھی اپنی جگہ پر انسانی بدن کے بہت ہی حیرت انگیز اعضاء میں سے ہے اور اس کے ذمّے بہت ہی سخت ذمّہ داریاں ہیں۔ وہ غذا کو نگلنے میں مدد دینے کے علاوہ اس کو چبانے میں بھی اہم کام انجام دیتی ہے، اور بار بار غذا کے لقمہ کو دانتوں کی ہتھوڑی کے نیچے دھکیلتی رہتی ہے، لیکن اس کام کو اتنے ماہرانہ انداز میں انجام دیتی ہے کہ اپنے آپ کو دانتوں کی ضربوں سے محفوظ رکھتی ہے، حالانکہ ہمیشہ ان کے پاس اور ان سے چمٹی ہوئی رہتی ہے۔

بعض اوقات اتفاقیہ طور پر کھانے کو چباتے وقت ہم اپنی زبان کو بھی چبا لیتے ہیں تو ہماری چیخ نکل جاتی ہے اور ہم یہ بات سمجھ جاتے ہیں کہ اگر زبان میں وہ مہارت نہ ہوتی تو ہم پر کتنی مصیبت آن پڑتی۔

ضمنی طور پر غذا کھانے کے بعد منہ کی فضا اور دانتوں کو پاک و صاف کرتی اور جھاڑو دیتی ہے۔

اور ان سب کاموں سے زیادہ اہم بات کرنے کا مسئلہ ہے، جو زبان کی تیزی کے ساتھ منظم طور پر پے در پے حرکات اور جہتوں میں حرکت کرنے سے انجام پاتا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ خدا نے بات کرنے اور تکلم کے لیے ایک ایسا وسیلہ انسانوں کے اختیار میں دیا ہے جو بہت ہی سہل اور آسان، اور سب کی دسترس میں ہے، نہ کچھ تھکان ہوتی ہے اور نہ ہی رنج و ملال حاصل ہوتا ہے، اور نہ ہی کچھ خرچ ہوتا ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ عجیب بات انسان میں گفتگو کرنے کی استعداد کا مسئلہ ہے، جو انسان کی روح میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ اور انسان اپنے طرح طرح کے حد سے زیادہ مقاصد کو بیان کرنے کے لیے بے حد مختلف صورتوں میں زیادہ سے زیادہ جملہ بندیاں کر سکتا ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ اہم، مختلف زبانوں کی وضع کی استعداد ہے، اور ان ہزاروں زبانوں کے مطالعہ سے جو دنیا میں موجود ہیں اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے، واقعاً "العظمة لله الواحد القهار!" (عظمت و بزرگی واحد و قہار خدا کے لیے ہی ہے)۔

۳۔ نجدین کی طرف ہدایت

"نجد" جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، بلندی یا بلند سرزمین کے معنی میں ہے اور یہاں "خیر" و "شر" کی راہ مراد ہے۔ ایک حدیث میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"یا ایها الناس انما نجدان نجد الخیر ونجد الشر فما جعل نجد الشر احب الیکم من نجد الخیر"

"اے لوگو! دو بلند سرزمینیں موجود ہیں، خیر کی سرزمین اور شر کی سرزمین، اور شر کی سرزمین

---

[1] نہج البلاغہ "کلمات قصار" حکمت ۸

تمہارے لیے خیر کی سرزمین سے ہرگز زیادہ محبوب قرار نہیں دی گئی۔[1]

اس میں شک نہیں کہ "تکلیف" اور مسئولیت، معرفت و آگاہی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور اوپر والی آیت کے مطابق خدا نے یہ آگاہی انسانوں کے اختیار میں دے دی ہے۔

یہ آگاہی تین طریقوں سے انجام پاتی ہے:

۱۔ عقلی ادراکات اور استدلال کے طریق سے،

۲۔ فطرت و وجدان کے طریق سے، جس میں استدلال کی ضرورت نہیں ہوتی،

۳۔ وحی اور انبیاء و اوصیاء کی تعلیمات کے طریق سے۔ اور تکامل کی راہ کو طے کرنے کے لیے انسان کو جن جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، ان کی خدا نے ان تین طریقوں میں سے کسی ایک سے یا بہت سے موارد میں ان تینوں ہی طریقوں سے اسے تعلیم دی ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس حدیث میں اس بات کی تصریح ہوئی ہے کہ ان دونوں راستوں میں سے کسی ایک کا طے کرنا انسان کی طبیعت اور مزاج کے لیے دوسرے سے زیادہ آسان نہیں ہے اور یہ بات حقیقت میں اس عمومی تصور کی کہ انسان برائیوں کی طرف زیادہ میلان رکھتا ہے اور شر کے راستے کو طے کرنا اس کے لیے زیادہ آسان ہے، نفی کرتی ہے۔

اور سچی بات یہ ہے کہ اگر غلط تربیتیں اور فاسد ماحول نہ ہو تو انسان کو نیکیوں کے ساتھ لگاؤ اور محبت زیادہ ہوتی ہے۔ اور شاید "نجد" (بلند سرزمین) کی تعبیر نیکیوں کے بارے میں اسی بناء پر ہے، کیونکہ بلند زمینیں بہتر اور زیادہ عمدہ فضا رکھتی ہیں، اور شرور کے بارے میں تغلیب کی بناء پر ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ تعبیر خیر و شر کے راستہ کے ظاہر، نمایاں اور آشکار ہونے کی طرف اشارہ ہے، جس طرح سے مرتفع اور بلند سرزمین مکمل اور پورے طور پر نمایاں ہوتی ہے۔[2]

❖ ❖ ❖

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۹۴ و تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۷۱۵۵۔

[2] جیسا کہ چاند اور سورج کو "قمران" (دو چاند) کہا جاتا ہے۔

۱۱۔ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝

۱۲۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝

۱۳۔ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝

۱۴۔ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝

۱۵۔ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝

۱۶۔ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝

۱۷۔ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝

۱۸۔ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝

۱۹۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝

۲۰۔ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ۝

ترجمہ

۱۱۔ لیکن وہ (ناشکرا انسان) اس اہم گھاٹی سے اُوپر نہیں گیا۔

۱۲۔ اور تجھے کیا معلوم کہ وُہ گھاٹی کیا ہے ؟

۱۳۔ غلام کو آزاد کرنا ہے ۔

۱۴۔ یا بھوک کے دن کھانا کھلانا ہے ۔

۱۵۔ رشتہ داروں میں سے کسی یتیم کو ۔

۱۶۔ یا خاک پر پڑے ہوئے مسکین کو۔

۱۷۔ پھر اسے ایسے لوگوں میں سے ہونا چاہیئے جو ایمان لائے ہیں اور جو ایک دُوسرے کو صبر و شکیبائی اور رحم کرنے کی وصیّت کرتے ہیں ۔

۱۸۔ وہ اصحابُ الیمین ہیں (اور ان کے نامۂ اعمال کو ان کے دائیں ہاتھ میں دیں گے) ۔

۱۹۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کردیا ، وُہ شوم اور بدبخت لوگ ہیں اور ان کا نامۂ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔

۲۰۔ ان کو آگ نے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے ، (جس سے بھاگنے کی کوئی راہ نہیں ہے) ۔

تفسیر

دُشوار گزار گھاٹی

ان عظیم نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد ، جو گزشتہ آیات میں آئی تھیں ، زیرِ نظر آیات میں ناشکرگزار بندوں کو موردِ ملامت و سرزنش قرار دیتا ہے ، کہ ان تمام وسائلِ سعادت کے ہوتے ہوئے انہوں نے نجات کی راہ کیوں طے نہیں کی ، پہلے فرماتا ہے :۔

" یہ ناشکرا انسان اس عظیم گھاٹی سے اُوپر نہیں گیا " : (فلا اقتحم العقبة)[1]

اس بارے میں کہ یہاں عقبہ سے کیا مُراد ہے ، بعد والی آیات اس کی تفسیر کرتی ہیں ۔

---

[1] ظاہر یہ ہے کہ اس جملہ میں "لا" "نافیہ" اور "خبریہ" ہے اور یہ جو بعض نے اسے نفرین یا استفہام کے معنی میں سمجھا ہے بہت بعید نظر آتا ہے۔ وہ واحد اعتراض جو یہاں موجود ہے یہ ہے کہ جب فعل ماضی پر "لا" آتا ہے تو عام طور پر اس کا تکرار ہوتا ہے ، جیسا کہ سُورۂ قیامت کی آیہ ۳۱ میں آیا ہے
(باقی اگلے صفحہ پر)

فرماتا ہے: "تو نہیں جانتا وہ گھاٹی کیا ہے"؟: (وما ادرٰیک ما العقبۃ)۔
"غلام کو آزاد کرنا ہے": (فک رقبۃ)۔
"یا بھوک کے دن کھانا کھلانا ہے": (او اطعام فی یوم ذی مسغبۃ)۔
"قریبیوں میں سے کسی یتیم کو" (یتیما ذا مقربۃ)۔
"یا خاک پر پڑے ہوئے مسکین کو" (او مسکینا ذا متربۃ)۔

اس طرح یہ دشوار گزار گھاٹی جس سے گزرنے کے لیے ناشکرے انسانوں نے ہرگز خود کو تیار نہیں کیا ہے، اعمالِ خیر کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو ارادی طور پر خدمتِ خلق اور کمزوروں اور ضعیفوں کی مدد کرنے کے گرد گھومتا ہے، اور ان صحیح اور خالص عقائد کا مجموعہ بھی ہے جن کی طرف بعد والی آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

اور سچ تو یہ ہے، کہ اس شدید لگاؤ کو دیکھتے ہوئے، جو عام طور سے لوگ مال و ثروت کے ساتھ رکھتے ہیں، اس دشوار گزار گھاٹی سے گزرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

اسلام اور ایمان صرف دعویٰ اور باتوں سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ ہر مومن مسلمان کے سامنے ایسی دشوار گزار گھاٹیاں ہیں جن سے یکے بعد دیگرے، حول و قوۂ خدا اور روحِ ایمان و اخلاص سے مدد طلب کرتے ہوئے گزرنا پڑتا ہے۔

بعض نے یہاں "عقبہ" کی تفسیر ہوائے نفس کے معنی میں کی ہے، جس سے جہاد کرنے کو، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشہور حدیث کے مطابق، "جہادِ اکبر" کا نام دیا ہے۔

البتہ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہاں آیات نے "عقبہ" کی تفسیر کی ہے تو اس تفسیر سے مراد اس طرح ہونا چاہیئے کہ اصلی گھاٹی ہوائے نفس کی گھاٹی ہے، لیکن غلاموں کو آزاد کرنا، اور مسکینوں کو کھانا کھلانا، اس سے مبارزہ کرنے کے واضح مصادیق میں سے ہیں۔

بعض دوسرے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ اس "عقبہ" سے مراد قیامت میں ایک دشوار گزار گھاٹی ہے، جیسا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث میں آیا ہے:

"ان امامکم عقبۃ کؤداً لا یجوزھا المثقلون، وانا ارید ان اخفف عنکم لتلک العقبۃ":

"تمہارے سامنے ایک دشوار گزار گھاٹی ہے، جس سے بھاری بوجھ والے نہیں گزر سکیں گے، اور میں چاہتا ہوں کہ اس گھاٹی سے عبور کرنے کے لیے تمہارے بوجھ کو ہلکا کر دوں"۔[1]

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) فلا صدق ولا صلی: (نہ تو اس نے صدقہ دیا اور نہ ہی نماز پڑھی) جبکہ زیرِ بحث آیت میں "لا" کا تکرار نہیں ہوا، لیکن جیسا کہ مرحوم "طبرسی" نے "مجمع البیان" میں نقل کیا ہے کہ بعض اوقات یہ تکرار کے بغیر بھی استعمال ہوتا ہے، فخر رازی" اور" قرطبی" نے اپنی تفاسیر میں بعض عربی ادب کے بزرگوں سے نقل کیا ہے کہ اگر "لا" "لم" کے معنی میں ہو تو پھر تکرار کی ضرورت نہیں ہے، یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہاں تقدیر میں تکرار ہوا ہے: فلا اقتحم العقبۃ ولا فک رقبۃ ولا اطعم فی یوم ذی مسغبۃ"

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۹۵

البتہ یہ حدیث جو پیغمبرؐ سے نقل ہوئی ہے زیرِ بحث آیت کی تفسیر کے عنوان سے نہیں ہے، لیکن مفسرین نے اس سے یہی سمجھا ہے۔ لیکن ایسا سمجھنا اُس تفسیر کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو صراحت کے ساتھ آیات میں آئی ہے، مناسب دکھائی نہیں دیتا، مگر یہ کہ مراد یہ ہو کہ قیامت کی دشوار گزار گھاٹیاں اس جہان کی سخت اور سنگین اطاعتوں کا تجسم ہیں، اور ان سے عبور کرنا ان اطاعتوں سے عبور کرنے کی فرع ہے۔ (غور کیجئے)۔

یہاں پر "اقتحم" کی تعبیر جو "اقتحام" کے مادہ سے ہے، قابلِ توجہ ہے، جو اصل میں سخت اور خوفناک کام میں داخل ہونے کے معنی میں ہے۔ (مفرداتِ راغب) یا کسی چیز میں داخل ہونا یا اس کے پاس سے شدّت و مشقت سے گزرنا ہے (تفسیر کشاف) اور یہ چیز بتاتی ہے کہ اس گھاٹی سے گزرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور یہ اس بات پر ایک تاکید ہے جو سورہ کے آغاز میں آئی ہے؛ جس میں فرمایا ہے: "ہم نے انسان کو دُکھ اور تکلیف میں پیدا کیا ہے، اور اس کی زندگی بھی دُکھ درد اور رنج و تکلیف سے توام ہے، اور پروردگار کی اطاعت کرنا بھی بہر حال کوئی آسان کام نہیں ہے۔"

امیرالمومنین علی علیہ السلام کے ایک ارشاد میں آیا ہے:

"ان الجنة حفت بالمکارہ وان النار حفت بالشھوات"

"بے شک جنّت سختیوں کے درمیان گھری ہوئی ہے، اور دوزخ شہوات کے درمیان گھری ہوئی ہے۔"[1]

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ "فک رقبة" سے مُراد ظاہراً وہی غلاموں کو آزاد کرنا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک اعرابی پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی، اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے کوئی ایسا عمل تعلیم کیجئے کہ جو مجھے جنّت میں داخل کرے، آپؐ نے فرمایا:

"ان کنت اقصرت الخطبة لقد عرضت المسألة"

"اگرچہ تُو نے بات تو مختصر کی ہے، لیکن ایک بہت بڑے مطلب کا سوال کیا ہے"۔ (یا یہ کہ اگرچہ تُو نے مختصر سی بات کی ہے لیکن تُو نے اپنے مقصود کو اچھی طرح سے بیان کیا ہے)۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اعتق النسمة وفك رقبة"

"غلاموں کو آزاد کر اور گردنوں کو (طوقِ غلامی سے) رہائی دے۔"

راوی سوال کرتا ہے، کیا یہ دونوں چیزیں ایک ہی نہیں ہیں؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"نہیں! پہلے سے میری مُراد یہ ہے کہ تو غلام کو مستقل طور پر آزاد کر دے، اور دوسرے سے

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶۔

میری مراد یہ ہے کہ تو اس کی قیمت کی ادائیگی میں امداد کرے تاکہ وہ آزاد ہو جائے۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزید فرمایا:

"والفیء علی ذی الرحم الظالم، فان لم یکن ذالك فاطعم الجائع، واسق الظمأن، وامر بالمعروف وانه عن المنکر، فان لم تطق ذالك فکف لسانك الامن الخیر"۔

"ان رشتہ داروں کی طرف جنہوں نے تجھ سے قطع رحمی کی ہے اور تجھ پر ظلم کیا ہے، لوٹ جا۔ (اور ان سے نیکی کر) اور اگر اس قسم کا کام ممکن نہ ہو تو پھر بھوکوں کو کھانا کھلا اور پیاسوں کو پانی پلا، اور امر بالمعروف اور نہی از منکر کر اور اگر تجھ میں اس کام کے کرنے کی بھی طاقت نہیں ہے تو کم از کم اپنی زبان نیکی کے علاوہ کسی چیز کے لیے نہ کھول"۔[1]

۲۔ بعض مفسرین نے "فك رقبة" کو، اپنی گردن کو گناہوں کے بارے توبہ کے ذریعے آزاد کرنے، یا خود کو اطاعتوں کے ذریعے عذاب الٰہی سے آزاد کرنے کے معنی میں سمجھا ہے، لیکن ان آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو اس کے بعد آئی ہیں، اور یتیم و مسکین کے بارے میں وصیت کر رہی ہیں، ظاہراً اس سے مراد وہی غلاموں کو آزاد کرنا ہی ہے۔

۳۔ "مسغبة" "سغب" (بروزن غضب) کے مادہ سے بھوک کے معنی میں ہے، اس بنا پر "یوم ذی مسغبة" بھوک کے دن کے معنی میں ہے، اگرچہ بھوکے افراد انسانی معاشروں میں رہتے ہیں لیکن یہ تعبیر قحط رسالی اور خشک سالی اور اسی قسم کے دنوں میں کھانا کھلانے کی ایک تاکید ہے، جو اس موضوع کی اہمیت کی بنا پر ہے، ورنہ تو بھوکوں کو کھانا کھلانا ہمیشہ افضل اعمال سے رہا ہے اور ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"من اشبع جائعا فی یوم سغب ادخله الله یوم القیامة من باب من ابواب الجنة لا یدخلها الا من فعل مثل ما فعل"۔

"جو شخص کسی بھوکے کو قحط کے دنوں میں پیٹ بھر کر کھانا کھلائے گا تو خدا اس کو قیامت میں جنت کے دروازوں میں سے اس دروازے سے داخل کرے گا جس سے کوئی دوسرا داخل نہیں ہوگا سوائے اس شخص کے جس نے اس جیسا عمل انجام دیا ہوگا"۔[2]

۴۔ "مقربة" قرابت اور رشتہ داری کے معنی میں ہے اور یتیم رشتہ داروں کے بارے میں تاکید بھی ان کی اولویت کی بنا پر ہے، ورنہ تمام یتیموں کو کھانا کھلانا اور ان پر نوازش کرنا چاہیئے۔ یہ چیز اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ رشتہ دار اپنے خاندان کے یتیموں کے بارے میں زیادہ سخت ذمہ داری رکھتے ہیں۔

اس سے قطع نظر وہ غلط فائدے، جو خاص طور پر اس زمانے میں رشتہ دار یتیموں کے اموال سے اٹھائے جاتے تھے، تقاضا کرتے ہیں کہ

---

[1] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۵۸۳۔

[2] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۹۵

اس دشوار گزار گھاٹی کے بارے میں ایک خاص قسم کی تنبیہ کی جائے۔ ابوالفتوح رازی کا نظریہ یہ ہے کہ "مقربۃ" "قرابت" کے مادہ سے نہیں ہے بلکہ قرب کے مادہ سے ہے اور ایسے یتیموں کی طرف اشارہ ہے جن کے پہلو بھوک کی شدت سے ایک دوسرے سے چپٹے ہوئے ہیں[1] لیکن یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے۔

۵۔ "متربۃ" مصدر میمی ہے "ترب" (بروزن طرب) کے مادہ سے جو اصل میں "تراب" بمعنی "خاک" سے لیا گیا ہے۔ اور اس شخص پر بولا جاتا ہے جو فقر و فاقہ کی شدت کی بنا پر خاک نشین ہو گیا ہو۔ پھر یہاں یہ تاکید اس قسم کے مساکین کے لیے ان کی اولیت کی بنا پر ہے ورنہ تمام مساکین کو کھانا کھلانا اعمالِ حسنہ میں سے ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے:

"امام علی بن موسٰی رضا علیہ السلام جب کھانا کھانا چاہتے تھے تو یہ حکم دیتے تھے کہ ایک بہت بڑی سینی دسترخوان کے پاس رکھ دی جائے، اور دسترخوان پر جتنے کھانے ہوتے تھے ان میں سے بہترین کھانا اٹھا کر اس سینی میں ڈال دیتے تھے، اور پھر یہ حکم دیتے تھے کہ وہ حاجت مندوں کو دے دیں۔ پھر آپ اس آیت کی تلاوت فرماتے: فلا اقتحم العقبۃ ......

اس کے بعد مزید فرماتے: خداوند تعالٰی جانتا تھا کہ سب لوگ غلاموں کو آزاد کرنے پر قادر نہیں ہیں لٰہذا اپنی بہشت کی طرف ایک اور راستہ بھی قرار دیا ہے"۔[2]

بعد والی آیت میں، اس تفسیر کو جاری رکھتے ہوئے، جو اس دشوار گزار گھاٹی کے لیے یہاں فرمائی ہے، مزید کہتا ہے: "پھر وہ ایسے لوگوں میں سے ہو جو ایمان لائے ہیں، اور ایک دوسرے کو صبر و استقامت اور رحم کرنے کی وصیت کرتے ہیں"۔ (ثم کان من الذین اٰمنوا وتواصوا بالصبر وتواصوا بالمرحمۃ)۔

اس طرح سے وہ لوگ اس دشوار گزار گھاٹی سے عبور کر لیں گے جو صاحبِ ایمان بھی ہوں اور صبر کی دعوت کرنے اور عواطفِ انسانی جیسے اعلٰی اخلاق بھی رکھتے ہوں اور انہوں نے غلاموں کو آزاد کرنے اور یتیموں اور مسکینوں کو کھانا کھلانے جیسے اعمالِ صالح بھی انجام دیئے ہوں۔

یا دوسرے لفظوں میں وہ تین میدانوں، ایمان، اخلاق اور عمل میں قدم رکھیں اور اس سے سربلند و سرفراز ہو کر نکلیں۔ یہی ہیں وہ لوگ جو اس قسم کی دشوار گزار گھاٹی کو عبور کر لیں گے۔

"ثم" (بعد) کی تعبیر ہمیشہ ہی تاخیرِ زمانی کے معنی میں نہیں ہوتی کہ اس کلام کا لازمہ یہ ہو کہ پہلے کھانا کھلائیں اور انفاق کریں اور اس کے بعد ایمان لائیں، بلکہ اس قسم کے موارد میں۔ جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے تصریح کی ہے۔ مقام کی برتری کے بیان کے لیے ہے کیونکہ مسلّم طور پر ایمان کا رتبہ، اور صبر و مرحمت کی وصیت کرنے کا مرتبہ، حاجت مندوں کی مدد کرنے کے مرتبہ سے بالاتر ہے، بلکہ اعمالِ صالح کا سرچشمہ ایمان اور اخلاق ہی ہیں، اور ان سب کی جڑ بنیاد اعتقادات اور اعلٰی اخلاق میں ہی تلاش کرنا چاہیئے۔

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ "ثم" یہاں تاخیرِ زمانی کے معنی میں ہے، کیونکہ بعض اوقات اعمالِ صالح ایمان کی طرف جھکاؤ کا سرچشمہ بن جاتے ہیں اور خاص طور پر اخلاق کی بنیادوں کو محکم کرنے میں مؤثر واقع ہوتے ہیں، کیونکہ انسان کا خلق و خو پہلے "فعل" کی صورت میں،

---

[1] "تفسیر ابوالفتوح رازی"، جلد ۱۲ ص ۹۶

[2] کافی مطابق نقل تفسیر المیزان جلد ۲۰ ص ۲۹۴

ہوتا ہے، اس کے بعد "حالت" کی صورت میں اور پھر "عادت" بن جاتا ہے اور اس کے بعد وہ ایک "ملکہ" کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

"تواصوا" کی تعبیر جس کا مفہوم ایک دوسرے کو وصیت اور سفارش کرنا ہے، ایک اہم نکتہ اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور وہ یہ ہے کہ پروردگار کی اطاعت کی راہ میں صبر و استقامت اور ہوائے نفس سے مبارزہ و مقابلہ جیسے اہم مسائل، اور اسی طرح اصل محبت و مرحمت کو تقویت دینا معاشرے میں انفرادی صورت میں نہیں ہونے چاہئیں، بلکہ اسے ایک عمومی صورت میں سارے معاشرے میں جاری ہونا چاہیئے، اور سب افراد ہی ایک دوسرے کو اس "اصول" کی رعایت و حفاظت کرنے کی وصیت کریں تاکہ اس طریقہ سے اجتماعی تعلقات اور زیادہ محکم سے محکم ہوں۔

بعض نے کہا ہے کہ "صبر" یہاں فرمانِ خدا کی اطاعت میں استقامت اور اس کے اوامر میں اہتمام کرنے کے معنی میں ہے اور "مرحمت" مخلوقِ خدا کے لیے محبت کی طرف اشارہ ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ خالق و مخلوق سے ارتباط ہی دین کی اساس و بنیاد ہے۔ بہرحال صبر و استقامت ہی ہر قسم کی اطاعت و بندگی اور گناہ و عصیان کے ترک کرنے کی اصل و بنیاد ہے۔

اور ان اوصاف کے آخر میں ان اوصاف کے حاملین کے مقام کو اس طرح بیان فرماتا ہے: "وہ اصحاب یمین ہیں"۔ (اولٰئک اصحاب المیمنۃ)۔

اور ان کا نامۂ اعمال بارگاہِ خداوندی میں مقبول ہونے کی نشانی اور علامت کے طور پر ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ "میمنہ" "یمن" کے مادہ سے ہے یعنی وہ صاحبانِ برکت ہیں اور ان کا وجود خود ان کے لیے بھی برکت ہے اور معاشرے کے لیے بھی۔

اس کے بعد اس گروہ کے نقطۂ مقابل یعنی ان لوگوں کا بیان کرتے ہوئے، جو اس دشوار گزار گھاٹی سے نہیں گزرے، فرماتا ہے:

وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کا انکار کر دیا، ایسے بدبخت اور شوم ہیں کہ ان کا نامۂ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا:" (والذین کفروا بایاتنا ھم اصحاب المشئمۃ)۔

اور یہ اس بات کی نشانی ہے کہ ان کا ہاتھ حسنات اور نیکیوں سے خالی ہے اور ان کا نامۂ اعمال سیئات اور برائیوں سے سیاہ ہے۔

"مشئمۃ" "شوم" کے مادہ سے ہے "میمنۃ" کا جو "یمن" کے مادہ سے ہے، نقطۂ مقابل ہے۔ یعنی یہ کافر گروہ شوم، بدبخت اور نامبارک افراد ہیں۔ جو اپنی بدبختی کا سبب بھی ہیں اور معاشرے کی بدبختی کا بھی، لیکن چونکہ قیامت میں بدبخت و شوم ہونا اور مبارک ہونا اس چیز سے پہچانا جائے گا کہ ان کا نامۂ اعمال ان کے بائیں یا دائیں ہاتھ میں ہوگا۔ لہٰذا بعض نے اس تفسیر کو اسی وجہ سے پسند کیا ہے، خصوصاً جب کہ شوم کا مادہ لغت میں بائیں طرف کے جھکاؤ کے معنی میں بھی آیا ہے[1]۔

اس سورہ کی آخری آیت میں آخری گروہ کی سزا کی طرف ایک مختصر اور پُرمعنی اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ان کے اوپر آگ ہے، جو انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے، جس سے فرار کی کوئی راہ نہیں ہے": (علیھم نار مؤصدۃ)۔

"مؤصدۃ" "ایصاد" کے مادہ سے دروازہ کو بند کرنے اور اسے محکم کرنے کے معنی میں ہے۔ یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ انسان اس کمرے میں جس کی فضا گرم ہو یہ چاہتا ہے کہ اس کے دروازوں کو کھول دے، تاکہ تازہ ہوا آئے اور فضا کی گرمی کو معتدل کر دے۔

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۱۲ ص ۹۷ اور المنجد مادہ "شأم"

اَب سوچنا چاہیئے کہ دوزخ کی جلانے والی بھٹی میں، جب کہ تمام دروازے بند ہو جائیں، کیا حالت پیدا ہوگی !

خداوندا ! ہمیں اس قسم کے جان گداز عذاب سے اپنے لطف وکرم کی پناہ میں محفوظ رکھنا۔

پروردگارا ! ان گھاٹیوں سے گزرنا جو ہمارے سامنے ہیں، تیری توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تو اپنی توفیق کو ہم سے نہ روکنا۔

بارِ الٰہا ! ہمیں اصحاب میمنہ کی صف میں جگہ دینا اور نیک اور ابرار لوگوں کے ساتھ محشور فرمانا۔

آمین یا ربّ العالمین

سُورۂ "بلد" کا اختتام

سُورَۃُ الشَّمس

* یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا
* اس کی ۱۵ آیات ہیں

سورۃ الشمس اور اس کی فضیلت

یہ سورہ جو حقیقت میں "تہذیبِ نفس" اور دلوں کو آلائشوں اور ناپاکیوں سے پاک کرنے والا سورہ ہے، اسی معنی کے محور پر گردش کرتا ہے البتہ اس سورہ کے آغاز میں اس مطلب کو ثابت کرنے کے لیے کہ فلاح و رستگاری تہذیبِ نفس کی مرہونِ منت ہے، عالمِ خلقت کے گیارہ اہم موضوعات اور خدا کی ذاتِ پاک کی قسم کھائی گئی ہے۔ اور قرآن مجید کی بیشتر قسموں کو مجموعی طور پر اپنے اندر سمو لیا ہے۔

اور سورہ کے آخر میں باغی اور سرکش قوموں میں سے ایک کا ذکر، جو تہذیبِ نفس کو ترک کرنے کی بنا پر ابدی اور دائمی شقاوت و بدبختی میں ڈوب گئی تھی، اور خدا نے اُسے شدید عذاب میں گرفتار کیا تھا، یعنی قوم "ثمود"۔ بطور نمونہ پیش کرتا ہے، اور ایک مختصر سے اشارے کے ساتھ ان لوگوں کی سرنوشت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

حقیقت میں یہ مختصر سا سورہ بشر کی زندگی کے سرنوشت ساز مسائل میں سے ایک اہم ترین مسئلہ کو موضوع بناتا ہے اور انسانوں کے لیے اسلام کے قابلِ قدر نظام کو مشخص کرتا ہے۔

اس سورہ کی فضیلت کے بارے میں بس اتنا ہی کافی ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے،

"من قرأها فكانما تصدق بكل شيء طلعت عليه الشمس والقمر"۔

"جو شخص اس سورہ کو پڑھے گا تو گویا اس نے ان تمام چیزوں کی تعداد میں جن پر سورج اور چاند طلوع کرتے ہیں صدقہ دیا ہے۔"[1]

اور مسلمہ طور پر یہ عظیم فضیلت اس شخص کے لیے ہے جو اس چھوٹے سے سورہ کے عظیم مطالب پر دل و جان سے عمل کرے اور تہذیبِ نفس کو اپنا قطعی وظیفہ سمجھے۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۹۶۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۝

۲۔ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۝

۳۔ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ۝

۴۔ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ۝

۵۔ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ۝

۶۔ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ۝

۷۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝

۸۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۝

۹۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝

۱۰۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ سورج اور اس کی روشنی کے پھیلنے کی قسم۔

۲۔ اور چاند کی جب کہ وُہ اس کے پیچھے آئے۔

۳۔ اور دن کی جب کہ وُہ صفحۂ زمین کو روشن کرے۔

۴۔ اور قسم ہے رات کی جب کہ وُہ صفحۂ زمین کو ڈھانپ لے۔

۵۔ اور قسم ہے آسمان کی اور جس نے اُسے بنایا۔

۶۔ اور قسم ہے زمین کی اور جس نے اسے بچھایا۔

۷۔ اور قسم ہے انسان کے نفس کی اور جس نے اسے درست کیا۔

۸۔ پھر اُسے فجور و تقویٰ (خیر و شر) کا الہام کیا۔

۹۔ کہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا وُہ فلاح پا گیا (اور رستگار ہُوا)۔

۱۰۔ اور جس نے اپنے نفس کو معصیت اور گناہ سے آلودہ کیا وہ نا اُمید اور محروم ہُوا۔

تفسیر

تہذیبِ نفس کے بغیر نجات ممکن نہیں

وہ پے در پے اور اہم قسمیں جو اس سُورہ کے آغاز میں آئی ہیں ایک حساب سے "گیارہ" قسمیں ہیں اور دوسرے حساب سے "سات" قسمیں ہیں، اور قرآن کی بیشتر قسموں کو اپنے اندر سمویا ہوا ہے۔ یہ چیز اس بات کی اچھی طرح سے نشان دہی کرتی ہے کہ یہاں کوئی بہت ہی اہم مطلب درپیش ہے، ایسا مطلب جو آسمانوں، زمین، سُورج اور چاند کی عظمت کے برابر ہے اور ایک ایسا مطلب ہے جو سرنوشت ساز اور حیات بخش ہے۔

پہلے ضروری ہے کہ ہم ان قسموں کی تشریح و تفسیر پیش کریں اور اس کے بعد اس نہایت اہم مطلب پر غور کریں جس کے لیے یہ سب قسمیں کھائی گئی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: "سُورج اور اس کی روشنی کے پھیلنے کی قسم": (والشمس وضحاها)۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں قرآن کی قسموں کے عام طور پر دو مقصد ہوتے ہیں، پہلا مقصد اس مطلب کی اہمیت جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے اور دُوسرا ان امور کی اہمیت جن کی قسم کھائی گئی ہے کیونکہ قسم ہمیشہ اہم موضوعات کی کھائی جاتی ہے۔ اسی بنا

پر یہ قسمیں انسان کو غور و فکر کی طرف مائل کر دیتی ہیں تاکہ وہ عالمِ خلقت کے اُن اہم موضوعات کے بارے میں غور و فکر کریں، اور ان سے خدا کی طرف راستہ نکالیں۔

"سُورج" کا انسان اور تمام زندہ زمینی موجودات کی زندگی میں اہم ترین اور پائندہ ترین نقش و اثر ہے، کیونکہ اس بات کے علاوہ کہ وہ نُور و روشنی اور حرارت کا منبع ہے، اور یہ دونوں انسانی زندگی کے اصلی عوامل میں سے شمار ہوتے ہیں۔ دوسرے حیاتی منابع بھی اسی کے سبب سے وجود میں آتے ہیں۔ ہواؤں کا چلنا، بارش کا برسنا، نباتات کی پرورش، دریاؤں اور آبشاروں کا چلنا، یہاں تک کہ قوت پیدا کرنے والے منابع کا ظاہر ہونا، جیسا کہ تیل و پیٹرول اور پتھر کا کوئلہ وغیرہ، اگر ہم صحیح طور پر غور کریں تو ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی صورت میں سُورج کی روشنی سے ارتباط رکھتا ہے۔ اس طرح سے کہ اگر کسی دن یہ حیات بخش چراغ خاموش ہو جائے تو تاریکی و سکوت اور خاموشی و موت ہر جگہ کو گھیر لے۔

"ضحٰی" اصل میں سُورج کی روشنی کے پھیلنے کے معنی میں ہے یہ اس وقت ہوتا ہے جب سُورج اُفق سے اُوپر آجائے اور اس کی روشنی ہر جگہ کو گھیر لے۔ اس کے بعد دن کے اس موقع پر بھی "ضحٰی" کا اطلاق ہونے لگا۔

خصوصیت کے ساتھ "ضحٰی" پر تکیہ اس کی اہمیت کی بناء پر ہے کیونکہ وہ زمین پر سُورج کی روشنی کے تسلّط کا وقت ہوتا ہے۔

اس کے بعد تیسری قسم کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "قسم ہے چاند کی جب کہ وہ سُورج کے پیچھے پیچھے آئے" (والقمر اذا تلاھا)۔

یہ تعبیر۔ جیسا کہ مفسّرین کی ایک جماعت نے کہا ہے۔ حقیقت میں چاند کے بدرِ کامل ہونے یعنی چودھویں رات کی طرف اشارہ ہے کیونکہ چودھویں رات کا چاند غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی اُفقِ مشرق سے نمودار ہوتا ہے اور اپنے روشن چہرے کو ظاہر کرتے ہوئے اپنا تسلّط آسمان پر جما لیتا ہے۔ اور چونکہ یہ اس وقت ہر زمانے سے زیادہ عمدہ اور زیادہ پُر شکوہ ہوتا ہے لہٰذا اس کی قسم کھائی ہے۔

مفسّرین نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ اُوپر والی تعبیر چاند کے دائمی طور پر سُورج کے تابع ہونے اور اس منبعِ نُور سے روشنی حاصل کرنے کی طرف اشارہ ہے، لیکن اس صُورت میں "اذا تلاھا" کا جملہ قیدِ توضیحی ہوگا۔

بعض نے اس آیت کی تفسیر میں کچھ اور احتمال بھی دیے ہیں جو توجہ کے لائق نہیں ہیں، لہٰذا ان کو ذکر نہیں کیا گیا۔

چوتھی قسم میں مزید کہتا ہے: "اور دن کی قسم ہے جب کہ وہ صفحۂ زمین کو روشن کرے"۔ (والنھار اذا جلّاھا)۔

"جلّاھا" "تجلیۃ" کے مادہ سے، اظہار و ابراز کے معنی میں ہے۔

اس بارے میں کہ جلّاھا کی ضمیر کس طرف لوٹتی ہے، مفسّرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بہت سے اسے زمین یا دُنیا کی طرف لوٹاتے ہیں (جیسا کہ ہم نے اُوپر بیان کیا ہے)۔ یہ ٹھیک ہے کہ گزشتہ آیات میں "زمین" کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں تھی، لیکن یہ بات قرینۂ مقام سے واضح ہو جاتی ہے۔

بعض کا یہ بھی نظریہ ہے کہ یہ ضمیر "سُورج" کی طرف لوٹتی ہے۔ یعنی قسم ہے دن کی جب کہ وہ سُورج کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

بہر حال اس اہم آسمانی مخلوق کی قسم اس کی نوعِ بشر اور تمام زندہ موجودات کی زندگی میں اس کی حد سے زیادہ تاثیر کی بناء پر ہے، کیونکہ دن حرکت و جنبش اور حیات کا مظہر ہے، اور زندگی کی تمام جدوجہد، کشش اور کوشش عام طور پر دن کی روشنی میں ہی صُورت پذیر ہوتی ہے۔

پانچویں قسم میں فرماتا ہے: "رات کی قسم جب کہ وہ صفحۂ زمین (یا سُورج) کو ڈھانپ دیتی ہے" والّیل اذا یغشاھا)۔[1]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

رات اپنی تمام برکات و آثار کے ساتھ ایک طرف تو سورج کی دن کی حرارت میں اعتدال پیدا کرتی ہے اور دوسری طرف تمام زندہ موجودات کے آرام و سکون اور راحت پانے کا سبب بنتی ہے۔ کیونکہ اگر رات کی تاریکی نہ ہوتی، اور مسلسل سورج ہی چمکتا رہتا تو آرام و سکون کا وجود ہی نہ ہوتا، کیونکہ سورج کی جلانے والی حرارت ہر چیز کو نابود کر دیتی۔ یہاں تک کہ اگر شب و روز کا نظام موجودہ کیفیت کے خلاف ہوتا تو بھی یہی مشکل پیش آتی، جیسا کہ چاند میں جس کی راتیں کرۂ زمین کے دو ہفتوں کے برابر ہوتی ہیں اور دن بھی دو ہفتے کے برابر ہوتے ہیں۔ وہاں دوپہر کے وقت حرارت تقریباً تین سو درجہ سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتی ہے، جس میں کوئی بھی زندہ موجود جسے ہم پہچانتے ہیں باقی نہیں رہ سکتا۔ اور آدھی رات کے وقت اس کا درجہ حرارت صفر سے نیچے چلا جاتا ہے کہ اگر وہاں پر کوئی زندہ موجود ہو تو یقینی طور پر برف ہو کر نابود ہو جائے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں افعال "ماضی" کی صورت میں آئے تھے اور اس آیت میں مضارع کی صورت میں آئے ہیں تعبیر کا یہ فرق ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ شب و روز کے ظہور مثلاً حوادث کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتے وہ گزشتہ اور آئندہ سب کو شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے بعض فعل ماضی کی صورت میں اور بعض مضارع کی صورت میں آئے ہیں، تاکہ ان حوادث کی عمومیت کو زمانہ کے ضمن میں واضح کریں۔

چھٹی اور ساتویں قسم میں آسمان اور خالقِ آسمان کی طرف توجہ کرتا ہے اور مزید فرماتا ہے: "قسم ہے آسمان کی اور اس ذات کی جس نے آسمان کو بنایا" (والسماء وما بناها)۔

ایسی خیرہ کرنے والی عظمت کے ساتھ آسمان کی اصل خلقت، عالمِ خلقت کے عظیم عجائبات میں سے ہے، اور ان تمام ستاروں، اجرام سماوی اور ان پر حاکم نظام ایک تعجب خیز چیز ہے۔ اور ان سب سے زیادہ اہم اس آسمان کا خالق ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ لفظ "ما" عربی لغت میں عام طور پر "غیر ذوی العقول موجود" کے لیے آتا ہے: لہٰذا خداوندِ عالم حکیم پر اس کا اطلاق کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اس لیے بعض علماء یہاں "ما" کو "مصدریہ" مراد لینے پر مجبور ہوئے ہیں نہ کہ "موصولہ" اور اس صورت میں آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا: "قسم ہے آسمان کی اور اس کی بناء کی"۔

لیکن آیات "ونفس وما سواها فالهمها فجورها وتقواها" کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جن کی تفسیر عنقریب بیان کی جائے گی، اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے کہ "ما" "موصولہ" ہو اور خدا کی ذاتِ پاک کی طرف اشارہ ہو جو تمام آسمانوں کا خالق ہے، اور عربی زبان میں افراد ذوی العقول کے بارے میں بھی "ما" کا استعمال ہوتا رہتا ہے، جیسا کہ سورۂ نساء کی آیہ ۳ میں آیا ہے:

فانكحوا ما طاب لكم من النساء: جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان سے نکاح کرو۔

مفسرین کی ایک جماعت کا نظریہ، یہ ہے کہ "ما" (جس چیز) کی تعبیر یہاں اس بنا پر ہے کہ مبدأ جہان کو پہلے مبہم صورت میں (حاشیہ بر صفحہ بعد)

۱۔ اس بارے میں کہ "یغشاها" کی ضمیر کس چیز کی طرف لوٹتی ہے؛ یہاں بھی دو نظریے ہیں، ایک تو یہ ہے کہ یہ "زمین" کی طرف لوٹتی ہے، کیونکہ رات ایک پردہ کی مانند ہے جو صفحۂ زمین پر گرتا ہے، اور دوسرا یہ ہے کہ یہ "سورج" کی طرف لوٹتی ہے، کیونکہ رات ایک پردہ کی مانند ہے جو سورج کے چہرے پر پڑتا ہے، البتہ اس صورت میں اس کا مفہوم مجازی ہوگا، کیونکہ رات حقیقت میں سورج پر پردہ نہیں ڈالتی۔ بلکہ سورج کے غروب ہونے کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔ حقیقت میں اگر گزشتہ آیت میں ضمیر "ارض" کی طرف لوٹے تو یہاں بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے اور اگر "شمس" کی طرف لوٹے تو پھر یہاں بھی اسی طرح ہوگا۔

ذکر کیا گیا ہو، تاکہ بعد میں غور و تحقیق اور مطالعہ کے ساتھ اس کے علم و حکمت سے آشنا ہوں' اور "جس چیز" "اس ذات" کے ساتھ تبدیل ہو جائے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

پھر آٹھویں اور نویں قسم میں "زمین" اور "زمین کے خالق" کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے'؛ "قسم ہے زمین کی اور اس کی جس نے زمین کو بچھایا" (والارض وما طحاھا)۔

زمین جو انسان اور تمام زندہ موجودات کی زندگی کا گہوارہ ہے۔

زمین جو اپنی تمام حیرت انگیز چیزوں: پہاڑوں، سمندروں، دروں، جنگلوں، چشموں، دریاؤں، معدنوں اور اس کے گرانبہا منابع کے ساتھ، کہ ان میں سے ہر ایک اکیلا بھی حق تعالیٰ کی آیات میں سے ایک آیت اور اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

اور اس سے برتر و بالاتر اس زمین کا خالق اور وہ ذات ہے کہ جس نے اُسے بچھایا ہے۔

"طحاھا" "طحو" (بروزن محو) کے مادہ سے بچھانے اور پھیلانے کے معنی میں بھی آیا ہے اور دھکیلنے، اور دُور کرنے اور ختم کرنے کے معنی میں بھی، اور یہاں بچھانے کے معنی میں ہے، کیونکہ اولاً زمین ابتدا میں پانی کے نیچے غرق تھی۔ بتدریج آہستہ آہستہ پانی زمین کے گڑھوں میں قرار پایا اور خشکیوں نے سر نکال لیا اور زمین پھیلتی چلی گئی اور اس کو "دحو الارض" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

ثانیاً زمین ابتدا میں پستیوں اور بلندیوں اور ناقابلِ سکونت گڑھوں کی صورت میں تھی جس پر مسلسل موسلا دھار بارشیں برسیں جنہوں نے زمین کی بلندیوں کو دھو دیا اور گھاٹیوں میں پھیلا دیا۔ اور آہستہ آہستہ انسانی زندگی اور زراعت کے لیے قابلِ استفادہ ہموار زمینیں وجود میں آگئیں۔

بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ اس تعبیر میں زمین کی حرکت کی طرف ایک اجمالی اشارہ موجود ہے، کیونکہ "طحو" کے معانی میں سے ایک معنی دھکیلنا بھی ہے، جو سورج کے گرد زمین کی انتقالی حرکت کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے، یا اس کی محوری حرکت، یا دونوں قسم کی حرکت بھی ہو سکتی ہے۔

اور آخر میں "دسویں" اور "گیارہویں" قسم کو پیش کرتے ہوئے جو اس سلسلہ کی آخری قسم ہے' فرماتا ہے: "قسم ہے انسان کے نفس کی، اور اس ذات کی، جس نے اُسے مرتب و منظم کیا ہے" (ونفس وما سوّاھا)۔

وہی انسان جو عالمِ خلقت کا خلاصہ، جہانِ ملک و ملکوت کا نچوڑ اور عالمِ آفرینش کا گُل سر سبد ہے:

یہ عجیب مخلوق جو عجائبات اور اسرار سے پُر ہے اس قدر اہم ہے کہ خدا نے خود اس کی اور اس کے خالق کی ایک ہی جگہ قسم کھائی ہے۔

اس بارے میں کہ یہاں "نفس" سے مُراد انسان کی رُوح ہے یا جسم و رُوح دونوں؛ مفسرین نے کئی احتمال دیے ہیں۔

اگر مُراد رُوح ہو تو پھر "سوّاھا" سے مُراد (جو تسویہ کے مادہ سے ہے) انسان کے روحی قوتی اور استعدادوں کی، حواس ظاہری سے لے کر ادراک، حافظہ، انتقال، تخیل، ابتکار، عشق، ارادہ، تصمیم اور اسی قسم کے قوائ جو "علم النفس" کے مباحث میں بیان ہوتے ہیں، تنظیم و تعدیل ہے۔

اور اگر رُوح و جسم دونوں مُراد ہوں تو پھر بدن کے تمام حیرت انگیز نظاموں اور اس کے مختلف کارخانوں کو۔ جن کے بارے میں علم "تشریح الاعضاء" اور "فزیالوجی" (افعال الاعضاء) میں تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ شامل ہو گا۔

البتہ قرآن مجید میں نفس کا دونوں معانی پر اطلاق ہوا ہے،

رُوح کے بارے میں سُورہ زمر کی آیہ ۴۲ میں آیا ہے: اللّٰہ یتوفی الانفس حین موتھا: "خدا موت کے وقت ارواح کو لے لیتا ہے"۔

اور جسم کے بارے میں سورۂ قصص کی آیہ ۳۳ میں آیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں: قال رب انی قتلت منھم نفسا فاخاف ان یقتلون: موسیٰ علیہ السلام نے کہا، میں نے ان (ظالم فرعونیوں) میں سے ایک کو قتل کر دیا ہے، مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔

لیکن یہاں مناسب یہ ہے کہ دونوں کو شامل ہو، کیونکہ خدا کی قدرت کی حیرت انگیزیاں جسم میں بھی موجود ہیں اور رُوح میں بھی، اور ان میں سے کسی ایک کے ساتھ اختصاص نہیں رکھتیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہاں "نفس" نکرہ کی صُورت میں بیان ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بات نفسِ انسانی کی اہمیت و عظمت کی طرف اشارہ ہو، ایسی عظمت جو تصور سے مافوق اور ابہام سے ملی ہوئی ہو، جو اس کے اَنجانے موجود کی صُورت میں تعارف کراتی ہے جیسا کہ موجودہ زمانہ کے ایک عظیم ترین عالم نے انسان کو اسی عنوان سے تعبیر کیا ہے، اور انسان کا "موجودِ ناشناختہ" نام رکھا ہے۔

بعد والی آیت میں انسان کی خلقت سے مربوط ایک اہم ترین مسئلہ کو پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "انسان کے قویٰ اور جسم و رُوح کی تنظیم کرنے کے بعد اُسے "فجور" و "تقویٰ" کا الہام کیا" (فالھمھا فجورھا وتقواھا)۔

ہاں! جب اس کی خلقت کی تکمیل ہوگئی اور اس کی "ہستی" وجود میں آگئی تو خدا نے اُسے "بایدھا و نبایدھا" (جو کام کرنے چاہئیں اور جو کام نہیں کرنے چاہئیں) کی تعلیم دی۔ اور اس طرح سے وہ ایک ایسا وجود بن گیا جو خلقت کے لحاظ سے "سڑی ہوئی گیلی مٹی اور رُوحِ الٰہی" کا مجموعہ ہے، تعلیمات کے لحاظ سے "فجور و تقویٰ سے آگاہ ہے" اور نتیجہ کے لحاظ سے وہ ایک ایسا وجود ہے جو قوسِ صعودی میں فرشتوں سے برتر ہو سکتا ہے، فرشتوں سے بھی آگے پرواز کر سکتا ہے، اور جو بات وہم میں بھی نہ آئے وہ بن سکتا ہے جبکہ قوسِ نزولی میں درندہ جانوروں سے بھی پست تر ہو جائے اور "بل ھم اضل" کے مرحلہ تک جا پہنچے، اور یہ چیز اس بات پر موقوف ہے کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ کون سی راہ اختیار کرتا ہے۔

"الھمھا" "الھام" کے مادہ سے اصل میں تو کسی چیز کے نگلنے یا پینے کے معنی میں ہے، اور اس کے بعد پروردگار کی طرف سے انسان کی رُوح میں کسی مطلب کے القا کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ گویا انسان کی رُوح اس مطلب کو اس کے سارے وجود کے ساتھ پی لیتی ہے اور نگل جاتی ہے۔ اور کبھی وحی کے معنی میں بھی آیا ہے۔ لیکن بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ "الہام" اور "وحی" میں فرق یہ ہے کہ وہ شخص جسے الہام ہوتا ہے وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ مطلب اُسے کہاں سے حاصل ہوا ہے، جب کہ وحی کے وقت وہ جانتا ہوتا ہے کہ یہ اُسے کہاں سے اور کس ذریعے سے پہنچی ہے۔

"فجور" "فجر" کے مادہ سے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے۔ وسیع شگاف کرنے کے معنی میں ہے۔ اور چونکہ صبح کی سفیدی رات کے پردہ کو چاک کر دیتی ہے، لہٰذا اسے "فجر" کہا گیا ہے۔ اور چونکہ گناہوں کا ارتکاب بھی دیانت کے پردہ کو چاک کر دیتا ہے لہٰذا اس پر "فجور" کا اطلاق ہوا ہے۔

البتہ زیرِ بحث آیت میں "فجور" سے مُراد وہی اس کے اسباب، عوامل اور طریقے ہیں۔

اور " تقوٰی " سے مراد ، جو " وقایہ " کے مادہ سے نگہداری کے معنی میں ہے ، یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو قباحتوں برائیوں ، آلودگیوں اور گناہوں سے محفوظ اور دُور رکھے ۔

یہ بات بھی یاد دلانا ضروری ہے کہ اس آیہ (فالھمہا فجورھا و تقواھا) کے معنی یہ نہیں ہیں ، کہ خدا نے فجور و تقوٰی کے عوامل انسان کی رُوح کے اندر ایجاد کر دیے ہیں ، ایسے عوامل جو اُسے فجور و آلودگی اور حیا کے پردوں کو چاک کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور ایسے عوامل جو اُسے خیرات اور نیکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں ، جیسا کہ بعض نے خیال کیا ہے اور آیت کو انسان کے وجود میں تضاد کے موجود ہونے کی دلیل سمجھا ہے ۔

بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ اس نے ان دو حقیقتوں کا اُسے الہام کیا اور تعلیم دی ، یا زیادہ سادہ اور آسان زبان میں اُس کو راہ اور چاہ کی نشان دہی کر دی ، جیسا کہ سُورۂ بلد کی آیہ ۱۰ میں آیا ہے : وھدیناہ النجدین : " ہم نے انسان کو خیر و شر کی ہدایت کر دی ہے " اور دُوسرے لفظوں میں خدا نے اسے تشخیص کی ایسی قدرت اور بیدار عقل و وجدان عطا کیا ہے کہ وہ " فجور " و " تقوٰی " کو " عقل " و " فطرت " کے طریق سے معلوم کر لیتا ہے ۔

اسی لیے بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت حقیقت میں " حسن و قبح عقلی " کے مسئلہ کی طرف ایک اشارہ ہے کہ خدا نے ادراک کی توانائی انسانوں کی عطا کی ہے ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ خدا نے انسان کو بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں ، لیکن ان تمام نعمتوں میں سے یہاں مسئلہ فجور و تقوٰی اور حُسن و قبح کے ادراک پر تکیہ کیا ہے کیونکہ یہ مسئلہ انسان کی زندگی کے مسائل میں سے زیادہ قسمت کو بنانے یا بگاڑنے والا مسئلہ ہے ۔

انجام کار ان تمام اہم اور پے در پے قسموں کے بعد ان کے نتیجہ کو پیش کرتے ہُوئے فرماتا ہے : " ان چیزوں کی قسم ہے کہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا وہ نجات پائے گا " (قد افلح من زکّٰھا) ۔

" زکّٰھا " " تزکیۃ " کے مادہ سے اصل میں ، جیسا کہ راغب نے مفردات میں بیان کیا ہے ، رشد و نمو کے معنی میں ہے اور زکات بھی اصل میں نشو و نما اور رشد کے معنی میں ہے ۔ اسی لیے ایک روایت میں حضرت علی علیہ السلام سے آیا ہے :

" المال تنقصہ النفقۃ والعلم یزکوا علی الانفاق " ۔

" مال تو خرچ کرنے سے کم ہوتا ہے لیکن علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے اور نشو و نما پاتا ہے "[1]

اس کے بعد یہ لفظ طہارت اور پاک کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے ، شاید اس مناسبت سے کہ آلودگیوں سے پاک کرنا رشد و نمو کا سبب ہوتا ہے ، اور زیرِ بحث آیت میں دونوں معانی کا امکان ہے ۔

ہاں ! رستگاری اور نجات اس شخص کے لیے ہے جو اپنے نفس کی تربیت اور نشو و نما کرے اور اسے شیطانی اخلاق و عادات ، گناہ و عصیان اور کفر سے پاک رکھے ۔

حقیقت میں انسان کی زندگی کا اصلی مسئلہ بھی یہی " تزکیہ " ہی ہے کہ اگر یہ ہو تو وہ سعادت مند ہے ورنہ بدبخت ہے ۔ اس کے بعد گروہِ مخالف کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے : ناامید و بدبخت ہوا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو معصیت و گناہ سے

---

[1] نہج البلاغہ کلماتِ قصار کلمہ ۱۴۷ ۔

آلودہ کیا: (وقد خاب من دسّاھا)۔

"خاب" "خیبۃ" کے مادہ سے ہے، مطلوب تک نہ پہنچنے، محروم ہونے، اور نقصان اُٹھانے کے معنی میں ہے۔[1]

"دسّاھا" "دس" کے مادہ سے، اصل میں کسی چیز کو کراہت و ناپسندیدگی کے ساتھ داخل کرنے کے معنی میں ہے، جیسا کہ قرآن مجید عرب جاہلوں کے اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کے بارے میں فرماتا ہے: ام یدسہ فی التراب: "اسے کراہت و نفرت سے مٹی میں پنہاں کر دیتا ہے"۔ (نحل - ۵۹) اور "دسیسۃ" نقصان دہ مخفی کاموں کے لیے بولا جاتا ہے۔

زیر بحث آیت کے ساتھ اس معنی کی مناسبت کے بارے میں مفسرین نے مختلف بیان دیے ہیں۔

کبھی تو یہ کہا گیا کہ یہ تعبیر گناہ اور فسق سے کنایہ ہے، کیونکہ اہل تقویٰ و صلاح خود کو آشکار کرتے ہیں، جب کہ آلودہ اور گنہگار لوگ خود کو چھپاتے ہیں، جیسا کہ نقل ہوا ہے کہ عربوں میں جو لوگ زیادہ سخی ہوتے تھے وہ اپنے خیمے اونچی جگہ پر نصب کرتے تھے اور رات کو آگ جلا دیا کرتے تھے تاکہ حاجت مند دن رات میں جب چاہیں ان کے پاس آسکیں اور ان سے مانوس ہو سکیں، لیکن بخیل اور کنجوس لوگ نشیبی زمینوں میں خیمے لگاتے تھے تاکہ کوئی شخص ان کے پاس نہ آسکے۔

اور کبھی یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ گنہگار خود کو صالح لوگوں میں پنہاں کر لیتے ہیں۔

یا اپنے نفس یا اپنی ہیئت انسانی کو معاصی و گناہ میں چھپا لیتے ہیں۔

یا معاصی و گناہ کو اپنے نفس کے اندر چھپا لیتے ہیں۔

بہر حال یہ گناہ و معصیت اور شیطانی عادات سے آلودگی سے ایک کنایہ ہے، اور یہ ٹھیک تزکیہ کا نقطۂ مقابل ہے۔

اس آیت کے وسیع مفہوم میں ان تمام معانی کو جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

اس طرح سے دُنیاوی زندگی کے میدان میں کامیاب ہونے والے اور شکست کھانے والے مشخص ہو جاتے ہیں اور ان دونوں گروہوں کی قدر و قیمت کا معیار "تزکیہ نفس اور اوجِ تقویٰ و اطاعتِ خداوندی نمو و رشد" یا "انواع و اقسام کے معاصی اور گناہوں سے آلودگی" کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اور اس سے وہ بات واضح ہو جاتی ہے، جو امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں نقل ہوئی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"قد افلح من اطاع وخاب من عصیٰ":

"جس نے اطاعت کی وہ نجات پا گیا اور جس نے نافرمانی کی وہ نا اُمید اور محروم ہو گیا"۔[2]

یہ حقیقت میں نتیجہ کا بیان اور مقصود کا ماحصل ہے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس وقت آیہ "قد افلح من زکّاھا" کی تلاوت کی تو توقف فرمایا اور اس طرح دُعا کی،

---

[1] "مفردات" راغب و "قاموس اللغۃ"

[2] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۹۸

" اللهــم آت نفسی تقواها ، انت ولیها و مولاها ، وزکها انت خیر من زکاها "

" خداوندا! میرے نفس کو اس کا تقویٰ عطا فرما، تو اس کا ولی و مولا ہے، اور اس کا تزکیہ فرما کیونکہ تو بہترین تزکیہ کرنے والا ہے"۔ [1]

یہ گفتگو اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ اس پُر پیچ و خم راہ کو عبور کرنا اور اس دشوار گزار گھاٹی سے گزرنا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کے لیے بھی توفیق الٰہی کے بغیر ممکن نہیں ہے، یعنی بندوں کی طرف سے قدم اٹھانے اور خدا کی طرف سے تائیدات کے ذریعے لہٰذا ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دو آیات کی تفسیر میں فرمایا:

" افلحت نفس زکاها الله ، وخابت نفس خيبها الله من كل خير! " :

" جس نفس کا خدا نے تزکیہ کیا وہ نجات پا گیا، اور جس نفس کو خدا نے خیر سے محروم کر دیا وہ نا امید و محروم ہو گیا"۔ [2]

چند نکات

۱۔ قرآنی قسموں کا ان کے نتائج کے ساتھ ربط

ان گیارہ انتہائی اہم قسموں کا، اس حقیقت کے ساتھ جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے، کیا رابطہ ہے؟

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے اس حقیقت کو بیان کرنا مقصود ہے کہ میں نے تم انسانوں کی سعادت و خوش بختی کے لیے تمام مادی و معنوی وسائل فراہم کیے ہیں۔

ایک طرف تو سورج اور چاند کے نور اور روشنی سے تمہاری زندگی کے میدان کو روشن کر دیا ہے۔ اور تمہارے رات دن کے حرکت و سکون کے نظام کو منظم کر کے زمین کو تمہاری زندگی کے لیے ہر جہت سے آمادہ کیا ہے۔

دوسری طرف تمہاری روح کو تمام صلاحیتوں کے ساتھ خلق کیا ہے۔ بیدار وجدان تمہیں عطا کیا ہے، اور اشیاء کے حُسن و قبح کا تمہیں الہام کیا ہے۔ اس بناء پر سعادت کی راہ کو طے کرنے کے لیے تمہارے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ اس حال میں تم اپنے نفس کا تزکیہ کیوں نہیں کرتے؟ اور شیطان کے بہکائے میں کیوں آتے ہو؟

۲۔ سورج کا عالم حیات میں نقش و اثر

سورج کے بارے میں، جو نظام شمسی کا مرکز ہے اور اس کے کواکب کا رہبر و سالار ہے، دو مباحث ہیں، ایک تو اس کے عظیم

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۹۸

[2] در المنثور جلد ۶ ص ۳۵۷

ہونے کی بحث جس کے بارے میں ہم پہلے بحث کر چکے ہیں، اور دُوسری بحث اس کی برکتوں اور آثار کے بارے میں ہے، جس کے لیے خلاصہ کے طور پر اس طرح کہا جا سکتا ہے۔

۱۔ انسان اور دوسرے تمام زندہ موجودات کی زندگی کے لیے پہلے مرحلہ میں حرارت اور روشنی کی ضرورت ہے، زندگی کے یہ دونوں امور اس آتشیں کُرہ کے ذریعے کامل طور پر اعتدال کے ساتھ مہیا ہوئے ہیں۔

۲۔ تمام غذائی اشیاء سُورج کی روشنی کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ موجودات جو سمندروں کی گہرائیوں میں زندگی بسر کرتے ہیں ایسی نباتات سے استفادہ کرتے ہیں، جو سمندروں کی سطح پر نور آفتاب کے سایہ میں اور پانی کی موجوں کے درمیان پرورش پاتے ہیں اور نیچے بیٹھ جاتے ہیں۔ یا اگر زندہ موجودات ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں تو پھر بھی ان میں سے ایک گروہ کی غذا نباتات ہی ہے، جو سُورج کی روشنی کے بغیر پرورش نہیں پاتی۔

۳۔ وہ تمام رنگ، زیبائیاں اور جلوے، جنہیں ہم عالم طبیعات میں دیکھتے ہیں، ایک طرح سے سُورج کی چمک کے ساتھ ارتباط رکھتے ہیں اور یہ معنی مختلف علوم کے ذریعے خصوصاً فزکس میں ثابت ہو چکے ہیں۔

۴۔ حیات بخش بارشیں بادلوں سے برستی ہیں اور بادل وہی بخارات ہیں جو سمندروں کی سطح پر سُورج کے چمکنے سے وجود میں آتے ہیں۔ اس بناء پر پانی کے تمام منابع جو بارش سے غذا حاصل کرتے ہیں، چاہے وہ دریا ہوں یا چشمے، نہریں ہوں یا کھال، یا گہرے کنوئیں، سب سُورج کی روشنی کی برکات سے ہیں۔

۵۔ وہ ہوائیں جن کا کام فضا کو معتدل کرنا، بادلوں کو مختلف جگہوں تک پہنچانا، نباتات کی تلقیح اور پیوند لگانا، اور گرمی اور سردی کو گرم علاقوں سے سرد علاقوں کی طرف، اور سرد علاقوں سے گرم علاقوں کی طرف منتقل کرنا ہے۔ آفتاب کے نور اور روشنی کے زیر اثر رُوئے زمین کے مختلف منطقوں کے درجہ حرارت کے بدلنے سے وجود میں آتی ہیں۔ اور اس طرح سے وُہ بھی سُورج سے سرمایہ حاصل کرتی ہیں۔

۶۔ انرجی پیدا کرنے والے مادے اور منابع، چاہے وہ آبشاریں ہوں، یا وہ بڑے بڑے بند ہوں جنہیں کوہستانی علاقوں میں بنایا جاتا ہے، پیٹرول اور تیل کے منابع، اور پتھر کے کوئلے کی کانیں، یہ سب کے سب ایک طرح سے سُورج کے ساتھ پیوند رکھتے ہیں، کہ اگر وہ نہ ہوتا تو ان منابع میں سے کوئی بھی موجود نہ ہوتا اور صفحۂ زمین میں تمام حرکتیں سکوت میں بدل جاتیں۔

۷۔ نظامِ شمسی کی بقاء، جاذبہ و دافعہ کے اعتدال کی بناء پر ہے، جو ایک طرف تو کُرۂ آفتاب کے درمیان اور دوسرے ان سیاروں کے درمیان، جو اس کے گرد گردش کرتے ہیں، وجود رکھتا ہے۔ اس طرح سے سُورج ان سیاروں کے اپنے مداروں میں محفوظ رہنے میں بہت ہی مؤثر نقش و اثر رکھتا ہے۔

اِس ساری گفتگو سے معلوم ہو جاتا ہے، کہ اگر خدا نے پہلی قسم کی ابتداء سُورج سے کی ہے، تو اس کی کیا وجہ تھی؟

اسی طرح سے چاند اور دن کی روشنی، اور رات کی تاریکی کُرۂ زمین میں سے ہر ایک انسان اور غیر انسان کی زندگی میں ایک اہم نقش و اثر رکھتے ہیں اسی بناء پر ان کی قسم کھائی گئی ہے اور ان سب سے بڑھ کر انسان کی رُوح اور اس کا جسم ہے، جو ان سب سے زیادہ اسرار آمیز اور حیرت انگیز ہے۔ تہذیب نفس کے بارے میں ہم اس سُورہ کے آخر میں ایک بحث کریں گے۔

۱۱۔ كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوٰىهَآ ۝

۱۲۔ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۝

۱۳۔ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۝

۱۴۔ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۙ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝

۱۵۔ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝

ترجمہ

۱۱۔ قوم ثمود نے سرکشی کی وجہ سے (اپنے پیغمبر کی) تکذیب کی۔

۱۲۔ جب کہ ان کا ایک شقی ترین آدمی اُٹھ کھڑا ہوا۔

۱۳۔ اور خدا کے بھیجے ہوئے رسُول (صالح) نے ان سے کہا: اللہ کے ناقے کو اس کے پانی پینے کے لیے چھوڑ دو (اور اس کی مزاحمت نہ کرو)۔

۱۴۔ لیکن اُنھوں نے اس کی تکذیب کی، اور ناقہ کی کونچیں کاٹ دیں، اور اُسے ہلاک کر دیا، لہٰذا ان کے خُدا نے انہیں اس گناہ کی بنا پر جس کے وُہ مرتکب ہوئے تھے تباہ کر دیا، اور ان کی زمین کو ہموار کر دیا۔

۱۵۔ اور وُہ ہرگز اس کام کے انجام دینے سے نہیں ڈرتا۔

تفسیر

سرکشوں کا ہلاکت خیز انجام

اس تنبیہ کے بعد، جو گزشتہ آیات میں ان لوگوں کے انجام کے بارے میں آئی تھی، جو اپنے نفس کو آلودہ کرتے ہیں، ان آیات میں نمونہ کے طور پر اس مطلب کی ایک واضح تاریخی مثال کو پیش کیا ہے اور سرکش قوم (ثمود) کی سرنوشت کو قاطع اور پُرمعنی عبارتوں کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "قوم ثمود نے سرکشی کی وجہ سے (اپنے پیغمبر کی) تکذیب کی"۔ (کذبت ثمود بطغواھا)۔

"طغویٰ" اور "طغیان" دونوں ایک ہی معنی میں ہیں، اور وہ حد اور سرحد سے تجاوز کرنا ہے اور یہاں حدودِ الٰہی سے تجاوز کرنا اور اس کے فرامین کے مقابلہ میں سرکشی کرنا مراد ہے۔[1]

قوم ثمود، جن کے پیغمبر کا نام "صالح" تھا قدیم ترین اقوام میں سے ہے، جو "حجاز" اور "شام" کے درمیان ایک کوہستانی علاقے میں رہتی تھی۔ ان کی زندگی مرفہ الحال تھی، زمینیں آباد، ہموار میدان اور زراعت کے لیے عمدہ مٹی، شان و شوکت والے محلات اور مضبوط و مستحکم گھر رکھتے تھے لیکن نہ صرف یہ کہ ان سب نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے تھے، بلکہ سرکشی کرتے ہوئے اپنے پیغمبر صالح علیہ السلام کی تکذیب کے لیے کھڑے ہوگئے، آیاتِ الٰہی کا مذاق اُڑایا اور آخر کار خدا نے انہیں ایک آسمانی بجلی کے ذریعے نابود کر دیا۔

اس کے بعد اس قوم کی ایک ظاہری سرکشی کا نمونہ پیش کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: جب کہ ان کا ایک شقی ترین آدمی اُٹھ کھڑا ہوا۔ (اذ انبعث اشقاھا)۔

"اشقیٰ" اس قوم کے شقی ترین اور سنگ دل ترین آدمی کے معنی میں ہے جو اس شخص کی طرف اشارہ ہے جس نے ناقۂ صالح کو ہلاک کیا تھا، وہی اونٹنی (ناقہ) جو ایک معجزہ کے طور پر اس قوم کے درمیان ظاہر ہوئی تھی اور اس کو ہلاک کرنا اس پیغمبرِ الٰہی کے ساتھ اعلانِ جنگ تھا۔

مفسرین اور مورخین کے قول کے مطابق اس شخص کا نام "قدار بن سالف" تھا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ اکرم نے علیؑ سے فرمایا: "من اشقی الاولین"؟

"پہلی قوموں میں سب سے زیادہ شقی اور سنگ دل کون تھا"

علی علیہ السلام نے جواب میں عرض کیا:

"عاقر الناقة"

"وہ شخص جس نے ناقۂ ثمود کی کونچیں کاٹ کر ہلاک کر دیا تھا!

پیغمبرؐ نے فرمایا:

---

[1] بعض علماء لغت کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ "طغیان" ناقص واوی کی صورت میں بھی آیا ہے اور اور ناقص یائی کی صورت میں بھی۔ "طغویٰ" ناقص واوی کے مادہ سے لیا گیا ہے، اور "طغیان" ناقص یائی سے (غور کیجئے)

" صدقت ، فمن اشقی الاٰخرین " ؟ :

" تم نے سچ کہا ۔ آخری اقوام کا شقی ترین آدمی کون ہے ؟

علی علیہ السلام کہتے ہیں : میں نے کہا اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے معلوم نہیں ہے ، تو پیغمبرؐ نے فرمایا :

" الذی یضربك علی هذه ، و اشار الی یافوخه "

" جو شخص تیرے سر کے اس مقام پر تلوار کی ضرب لگائے گا" ، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کی پیشانی کے اُوپر والے حصّہ کی طرف اشارہ کیا" [۱، ۲]

بعد والی آیت میں قوم ثمود کی سرکشی کے بارے میں مزید تشریح پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے : " اللہ کے رسول (حضرت صالحؑ) نے ان سے کہا : خدا کے ناقہ کو اس کا پانی پینے کے لیے آزاد چھوڑ دو اور اس کی مزاحمت نہ کرو"۔ (فقال لهم رسول الله ناقة الله وسقیاها) [۳]

یہاں " رسول اللہ " سے مراد قوم ثمود کے پیغمبر ، حضرت صالحؑ ہیں ، اور ناقة الله (وہ اونٹنی جو خدا کی طرف منسوب ہے) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اُونٹنی کوئی معمولی اُونٹنی نہیں تھی بلکہ صالح علیہ السلام کے دعویٰ کی صداقت کی ایک گویا و ناطق سند اور معجزہ کے عنوان سے بھیجی گئی تھی ۔ مشہور روایت کے مطابق اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ مذکورہ اونٹنی پہاڑ کے ایک پتھر کے اندر سے نکلی تھی تاکہ وہ ہٹ دھرم منکرین کے لیے ایک گویا و ناطق معجزہ ہو ۔

قرآن مجید کی دوسری آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں یہ خبر دی تھی کہ بستی کے پینے کا پانی ان کے اور ناقہ کے درمیان تقسیم ہو ۔ ایک دن تو ناقہ کے لیے ہوگا اور ایک دن بستی والوں کے لیے ہوگا ، اور ان میں سے ہر ایک اپنی باری پر پانی سے فائدہ اُٹھائے گا ، اور ایک دوسرے کے لیے مزاحم نہیں ہوگا :

" ونبئهم ان الماء قسمة بینهم کل شرب محتضر " (قمر ۔ ۲۸)

اور انہیں خصوصیت کے ساتھ بتلا دیا گیا : اگر تم نے اس ناقہ کو ہاتھ لگایا تو عذابِ الٰہی تمہارے دامن گیر ہو جائے گا" :

ولا تمسوها بسوء فیأخذکم عذاب یوم عظیم " (شعرا ۔ ۱۵۶)

اور بعد والی آیت میں فرماتا ہے : اس سرکش قوم نے اس عظیم پیغمبر کے کلمات اور اس کی تنبیہات کی کوئی پرواہ نہ کی ، اس کی تکذیب کی اور ناقہ کو ہلاک کر دیا" (فکذبوه فعقروها) ۔

" عقروها " " عقر " کے مادہ سے (جو ظلم کے وزن پر ہے) کسی چیز کی اصل اور جڑ بنیاد کے معنی میں ہے ، اور عقر ناقہ کا

---

[۱] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۹۹ ، یہی معنی کچھ مختصر صورت میں تفسیر قرطبی میں بھی آیا ہے ، جلد ۶ ص ۷۱۶۸

[۲] " یا فوخ " سر کے اس اگلے حصّہ کو کہا جاتا ہے ، جو بچوں میں بالکل نرم ہوتا ہے ، اور آہستہ آہستہ ہڈی کی صورت اختیار کرتا ہے اور مضبوط ہوتا ہے ، اور وہ سر کا حساس ترین مقام ہے ۔

[۳] " ناقة الله " منصوب ہے ، ایک فعل محذوف سے اور تقدیر میں اس طرح ہے ، ذروا ناقة الله وسقیاها ، اس کے مشابہ کہ جو سورۂ اعراف کی آیہ ۷۳ ، اور سورہ ھُود کی آیہ ۶۴ میں آیا ہے ۔

معنی اس کی جڑ کاٹنے اور ہلاک کرنے کے معنی میں ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد اس کی کونچیں یعنی اس جانور کے پاؤں کے نچلے حصّہ کو کاٹنا اور اُسے زمین پر پھینکنا ہے کہ اس کا نتیجہ بھی اس حیوان کی موت ہی ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ جس شخص نے ناقہ کو ہلاک کیا تھا وہ صرف ایک ہی تھا جسے قرآن نے "اشقی" سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن اُوپر والی آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس عمل کی قوم ثمود کے تمام سرکشوں اور طغیان گروں کی طرف نسبت دی گئی ہے، اور "عقروھا" جمع کے صیغہ کی صورت میں آیا ہے: اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے لوگ بھی اسی طرح سے اس کام میں حصہ دار تھے، کیونکہ اولاً اس قسم کی سازشیں عموماً گروہ اور جمعیت کے توسط سے پیش ہوتی ہیں۔ اس کے بعد معین آدمی یا چند افراد کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہیں۔ ثانیاً چونکہ دوسروں کی رضا اور خوشنودی سے انجام پاتی ہیں تو وہ ان کی اس کام میں شرکت کا سبب بن جاتا ہے، یعنی رضامندی نتیجہ میں شرکت کا سبب بنتی ہے۔

اسی لیے امیرالمومنین علی علیہ السلام کے فصیح و بلیغ کلام میں آیا ہے:

> "انما عقر ناقة ثمود رجل واحد فعمهم الله بالعذاب، لما عموه بالرضی،
> فقال سبحانه،:
> فعقروها فاصبحوا نادمین:
> "ناقہ ثمود کو صرف ایک ہی شخص نے ہلاک کیا تھا، لیکن خدا نے عذاب میں سب کو شامل کیا ہے کیونکہ وہ سب اس امر پر راضی تھے، اسی لیے فرماتا ہے:
> "ان (سب نے) ناقہ کو ہلاک کیا، اور اس کے بعد وہ سب سے سب اپنے کیے پر نادم ہوئے"۔ (لیکن اس وقت جب پشیمانی کا کوئی فائدہ نہیں تھا)۔[1]

اس تکذیب اور شدید مخالفت کے بعد خدا نے انہیں ایسی سزا دی کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا، جیسا کہ اسی آیت کو جاری رکھتے ہوئے فرماتا ہے: "ان کے پروردگار نے ان کے اس گناہ کی بنا پر جس کے وہ مرتکب ہوئے تھے سب کو نابود کر دیا، اور ان کی سرزمین کو صاف اور ہموار بنا دیا"۔ (فدمدم علیهم ربهم بذنبهم فسوٰاها)۔

صاعقہ یعنی اسی عظیم آسمانی چیخ نے چند ہی لمحے کے اندر ان کی سرزمین کو ہلا کر رکھ دیا اور ایسا زلزلہ پیدا کیا کہ ان کے سارے کے سارے مکانات زمیں بوس ہو گئے، اور ان کے گھروں کو ان کی قبروں میں بدل کر رکھ دیا۔

"دمدم" "دمدمة" کے مادہ سے، کبھی تو ہلاک کرنے کے معنی میں آیا ہے، اور کبھی عذاب اور مکمل سزا کے معنی میں، بعض اوقات کوٹنے اور نرم کرنے کے معنی میں آیا ہے، اور کبھی جڑ سے اکھاڑنے کے معنی میں، اور کبھی غضب ناک ہونے کے معنی میں یا احاطہ کرنے اور گھیر لینے کے معنی میں[2] اور زیرِ بحث آیت میں یہ سب معانی صادق آتے ہیں کیونکہ اس وسیع عذاب کا سرچشمہ

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۲۰۱۔

[2] مفرداتِ راغب، لسان العرب، مجمع البیان اور تفسیر کی دوسری کتابیں۔

غضب الٰہی ہے، اور ان سب کی اس نے سرکوبی کی، انہیں کمزور کیا اور انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔

"سوّاھا" "تسویہ" کے مادہ سے، ممکن ہے کہ صیحہ عظیم اور صاعقہ و زلزلہ کی وجہ سے ان کے گھروں کا صفایا کرنے اور ان کی زمینوں کو صاف کرنے کے معنی میں ہو، یا اس گروہ کو ایک طرف ٹھکانے لگانے کے معنی میں ہو، یا ان سب کی سزا و عذاب میں مساوات کے لیے ہو اس طرح سے کہ ان میں سے کوئی بھی اس ماجرے سے صحیح و سالم نہ بچا۔

ان معانی کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

"سوّاھا" میں ضمیر "قبیلہ" ثمود کی طرف لوٹتی ہے، یا ان کے شہروں اور آبادیوں کی طرف، جنہیں خدا نے مٹی میں ملاکر یکساں کر دیا۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ "دمدم" کی طرف لوٹتی ہے جو بعد والے جملہ سے معلوم ہوتی ہے، یعنی خدا نے اس خشم و غضب و ہلاکت کو ان کے درمیان یکساں قرار دیا، اس طرح سے کہ تمام کو اس نے گھیر لیا۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

ضمنی طور پر اس آیت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سزا اور عذاب ان کے گناہ کا نتیجہ اور اس کے ساتھ مناسبت رکھتا تھا اور یہ عین عدالت و حکمت ہے۔

بہت سی اقوام کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ وہ آثارِ عذاب کے ظہور کے وقت پشیمان ہوگئیں، اور توبہ کی راہ اختیار کر لی، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ جس وقت صالح علیہ السلام کی قوم نے عذاب کی نشانیاں دیکھیں تو وہ صالح علیہ السلام کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے کہ جہاں کہیں بھی وہ مل جائیں انہیں ہلاک کر دیں[1] اور یہ خدا و پیغمبر کے مقابلہ میں ان کے عصیان و سرکشی کے شدید ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن خدا نے صالح علیہ السلام کو نجات دی اور اس قوم کو ہلاک کر دیا، اور ان کی زندگی کے دفتر کو کلی طور پر لپیٹ دیا۔

انجام کار آخری آیت میں ان تمام لوگوں کو جو اسی راستہ پر چلتے ہیں، سخت تنبیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور خدا کو اس کام کے انجام کا کوئی خوف نہیں ہے۔" (ولا یخاف عقباھا)۔

بہت سے ایسے حاکم ہیں جو سزا دینے پر قدرت رکھتے ہیں، لیکن وہ ہمیشہ اس کے نتیجہ اور انجام سے ڈرتے رہتے ہیں، ان کے ردِّ عمل اور عکس العمل سے خوف زدہ رہتے ہیں اور اسی بنا پر اپنی قدرت سے فائدہ نہیں اٹھاتے، اور زیادہ صحیح تعبیر میں ان کی قدرت ضعف و ناتوانی کے ساتھ اور ان کا علم جہالت کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے کیونکہ وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ان میں اس کے بُرے نتائج کے مقابلہ کی طاقت نہ ہو۔

لیکن خداوند قادر و متعال جس کا علم ان تمام امور اور ان کے عواقب و آثار پر احاطہ رکھتا ہے، اور اس کی قدرت میں حوادث کے بُرے نتائج کے مقابلہ میں کسی قسم کے ضعف و ناتوانی کی آمیزش نہیں ہوتی۔ اور اسی بنا پر انتہائی قدرت اور قاطعیت کے ساتھ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اُسے انجام دے دیتا ہے۔

سرکشوں کو بھی اپنے کیے کی سزا بھگتنی پڑے گی، لہٰذا انہیں اپنے اعمال کی وجہ سے خدا کے خشم و غضب کا مشمول ہونے سے

---

[1] روح البیان جلد ۱۰ ص ۴۴۶

خود کو بچانا چاہیئے۔

"عقبٰی" اختتام، انتہا اور انجام کار کے معنی میں ہے اور "عقباھا" کی ضمیر "دمدمہ" اور ہلاکت کی طرف لوٹتی ہے۔

چند نکات

۱۔ قوم ثمود کی سرگزشت کا خلاصہ

قوم "ثمود" جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، مدینہ اور شام کی درمیانی سرزمین میں (جس کا نام وادی القریٰ ہے) زندگی بسر کرتی تھی۔ ان کا دین و مذہب بت پرستی تھا اور وہ انواع و اقسام کے گناہوں میں ملوث تھے۔ خدا کے عظیم پیغمبر صالح ان میں مبعوث ہوئے اور ان کی ہدایت اور نجات کے لیے کمر ہمت باندھی، لیکن نہ تو یہ لوگ بت پرستی سے دست بردار ہوئے اور نہ ہی انہوں نے سرکشی اور گناہ کے بارے میں اپنا نظریہ بدلا۔

جب انہوں نے معجزہ کا تقاضا کیا تو خدا نے ایک ناقہ (اونٹنی) اعجاز آمیز اور خارق العادۃ طریقے سے پہاڑ کے اندر سے نکالی لیکن اس بنا پر کہ اس بارے میں ان کی آزمائش کرے یہ حکم دیا کہ اس بستی کا ایک دن کا سارا پانی اس اونٹنی کے لیے رہے گا اور دوسرے دن کا پانی وہ خود استعمال کریں گے، یہاں تک کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ جس دن وہ پانی سے محروم ہوتے تھے تو اس اونٹنی کے دودھ سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ لیکن یہ عظیم معجزہ بھی ان کی ہٹ دھرمی اور فسق و فجور میں کمی نہ کر سکا۔ لہٰذا انہوں نے ناقہ کو نابود کرنے کا منصوبہ بنایا اور حضرت صالح علیہ السلام کو قتل کرنے کا بھی، کیونکہ وہ انہیں اپنی خواہشات اور ہوا و ہوس میں مزاحم سمجھتے تھے۔

ناقہ کی نابودی کا منصوبہ ایک بہت ہی بے رحم اور شقی آدمی "قدار بن سالف" کے ذریعے عمل میں آیا اور اس نے کئی ضربوں کے ساتھ ناقہ کو زمین پر ڈھیر کر دیا۔

یہ بات حقیقت میں خدا کے ساتھ اعلانِ جنگ تھی، کیونکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ ناقہ کو ختم کر دینے سے، جو صالح علیہ السلام کا معجزہ تھی، نورِ ہدایت کو خاموش کر دیں گے۔ اس موقع پر حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں آگاہ کیا کہ وہ تین دن تک اپنے گھروں میں جس نعمت سے لذت حاصل کرنا چاہیں کر لیں، لیکن وہ اچھی طرح جان لیں کہ تین دن کے بعد عذاب الٰہی سب کو گھیر لے گا۔ (سورہ ہود)

یہ تین دن آخری غور و فکر کے لیے ایک مہلت تھی، اور توبہ و بازگشت کے لیے ایک آخری فرصت۔ لیکن انہوں نے نہ صرف یہ کہ تجدید نظر نہیں کی، بلکہ ان کے طغیان و سرکشی میں اضافہ ہو گیا۔ اس موقع پر عذاب الٰہی ان پر نازل ہوا اور "صیحہ آسمانی"[۱] نے ان کی سرزمین کو درہم و برہم کر کے رکھ دیا اور وہ سب کے سب اپنے گھروں میں زمین پر اوندھے گر پڑے اور مر گئے" "و اخذ الذین ظلموا الصیحۃ فاصبحوا فی دیارھم جاثمین" (ھود - ۶۷)۔

۱۔ صیحہ آسمانی جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے "صاعقہ" کے معنی میں ہے جو ایک عظیم آواز بھی رکھتی ہے اور سخت قسم کا زلزلہ بھی پیدا کرتی ہے، اور آگ اور جلانے کے ساتھ توام ہوتی ہے اور علمی نظریہ کے مطابق ایک عظیم برقی شعلہ ہے، جو بادلوں کے درمیان جو مثبت برقی بار کے حامل ہوتے ہیں اور زمین جو منفی بار رکھتی ہے، وجود میں آتا ہے۔

وُہ ایسے نابُود ہوئے، اور ان کی سرزمین اس طرح خاموش ہوئی کہ گویا ہرگز ان گھروں میں کوئی رہتا ہی نہیں تھا۔ لیکن خدا نے صالح اور ان کے مومن اصحاب کو اس مہلکہ سے نجات بخشی"۔ (ھود - ۶۶)۔

قوم ثمود کی سرگزشت کی مزید تفصیل کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۵ ص ۳۱۲ سے آگے مطالعہ کریں۔

۲۔ "اشقی الاولین" و "اشقی الاٰخرین"

شیعہ و سُنّی بزرگ علماء کی ایک جماعت منجملہ ثعلبی، واحدی، ابن مردویہ، خطیب بغدادی، طبری موصلی اور احمد حنبلؒ وغیرہ نے اپنی اپنی اسناد کے ساتھ عمار یاسرؓ، جابرؓ بن سمرہ اور عثمانؓ بن صہیب کی وساطت سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس طرح نقل کیا ہے کہ آپؐ نے علی علیہ السلام سے فرمایا:

"یا علی! اشقی الاولین عاقر الناقۃ، واشقی الاٰخرین قاتلك، وفی روایۃ من یخضب ھذہ من ھذا:

"اے علی! پہلے لوگوں میں سے بدبخت ترین شخص وہ تھا جس نے ناقۂ صالح کو قتل کیا، اور پچھلے لوگوں میں سے بدبخت ترین آدمی تیرا قاتل ہے اور ایک روایت میں آیا ہے کہ جو اس کو اس سے رنگین کرے گا، (جو اس طرف اشارہ ہے کہ تیری داڑھی کو تیرے سر کے خُون سے خضاب کرے گا)"۔[1]

حقیقت میں ناقۂ صالحؑ کی کونچیں کاٹنے والے "قدار بن یوسف" اور امیرالمومنین کے قاتل "عبدالرحمٰن بن ملجم مرادی" کے درمیان ایک شباہت موجود تھی، ان دونوں میں سے کسی کو بھی ذاتی رنجش نہیں تھی۔ بلکہ دونوں ہی یہ چاہتے تھے کہ نورِ حق کو خاموش کر دیں۔ اور جس طرح ناقہ صالحؑ کے ماجرے کے بعد اس طاغی اور سرکش قوم کو عذابِ الٰہی نے گھیر لیا تھا، مسلمان بھی امیرالمومنین علیؑ کی مظلومانہ شہادت کے بعد جابر اور بیدادگر بنی اُمیہ کی حکومت کے زیر تسلط دردناک ترین عذابوں کے شاہد ہوئے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "حاکم حسکانی" نے "شواھد التنزیل" میں اس سلسلے میں بہت زیادہ روایات نقل کی ہیں، جو مضمون و مطالب کے لحاظ سے اُوپر والی روایت کے مشابہ ہیں۔[2]

۳۔ تہذیب نفس ایک عظیم خدائی وظیفہ ہے

جس قدر قرآنی قسمیں کسی چیز کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں اور زیادہ محکم ہوں وہ اس موضوع کی اہمیت کی دلیل ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ زیادہ طولانی اور زیادہ تاکیدی قسمیں اسی سُورہ میں ہیں، خصوصاً خدا کی ذاتِ پاک کی قسم کا اس میں تین مرتبہ تکرار ہوا ہے۔ اور انجام کار اس مسئلہ پر تکیہ ہوا ہے کہ فلاح و رستگاری تزکیہ نفس میں ہے۔ اور محرومیت اور شکست و بدبختی تزکیہ کے ترک کر دینے میں ہے۔

حقیقت میں انسانی زندگی کا اہم ترین مسئلہ بھی یہی مسئلہ ہے، اور حقیقتاً قرآن نے اُوپر والے معنی کے ساتھ مفہوم کو واضح کر دیا ہے کہ

---

[1] "تفسیر نور الثقلین" جلد ۵ ص ۵۸۷

[2] "شواہد التنزیل" جلد ۲ ص ۳۳۵ تا ۳۴۳

انسان کی نجات وِرستگاری تصورات اور خیالوں کی مرہونِ منت نہیں ہے، نہ ہی مال و ثروت اور مقام و منصب کے سایہ میں اور نہ ہی دوسرے اشخاص کے اعمال کے ساتھ وابستہ ہے۔ (جیسا کہ عیسائی خیال کرتے ہیں کہ ہر شخص کی نجات عیسٰی مسیح کی فداکاری کی مرہونِ منت ہے) اور نہ ہی اس قسم کی دوسری باتوں میں۔

بلکہ نجاتِ انسانی ایمان وعملِ صالح کے سایہ میں رُوح و جان کی پاکیزگی اور بلندی کی مرہونِ منت ہے۔

انسان کی بدبختی اور شکست بھی نہ تو اجباری قضا و قدر میں ہے، اور نہ ہی الزامی سرنوشتوں میں' اور نہ ہی دوسروں کے کیے ہوئے کاموں میں، بلکہ وہ صرف اور صرف گناہ کی آلودگی سے بچے رہنے میں ہے اور تقویٰ کی راہ اختیار کرنے میں ہے۔

تاریخوں میں آیا ہے کہ عزیزِ مصر کی بیوی (زلیخا) نے، جب یوسفؑ خزانوں کے مالک اور سرزمینِ مصر کے حاکم بن گئے، ان سے ملاقات کی اور کہا:

" ان الحرص والشهوة تصير الملوك عبيدًا ، وان الصبر والتقوى يصير العبيد ملوكًا ، فقال يوسف قال الله تعالىٰ : انه من يتق ويصبر فان الله لا يضيع اجر المحسنين ":

" حرص و شہوت بادشاہوں کو غلام بنا دیتے ہیں اور صبر و تقویٰ غلاموں کو بادشاہ بنا دیتے ہیں"

یوسف نے اس کی بات کی تصدیق کی، اور یہ کلامِ الٰہی اُسے یاد دلایا: " جو شخص تقویٰ اور صبر و شکیبائی اختیار کرے گا تو خدا نیکوکاروں کے اُجر کو ضائع نہیں کرتا"[1]

یہی مطلب ایک دوسری عبارت میں نقل ہوا ہے کہ عزیزِ مصر کی بیوی ایک راہ گزر میں بیٹھی ہوئی تھی کہ یوسفؑ کی سواری وہاں سے گزری، تو زلیخا نے کہا:

" الحمد لله الذى جعل الملوك بمعصيتهم عبيدًا ، وجعل العبيد بطاعتهم ملوكًا ":

" سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں کہ جس نے بادشاہوں کو معصیت اور نافرمانی کی بناء پر غلام بنا دیا، اور غلاموں کو اطاعت و فرماں برداری کی وجہ سے بادشاہ"[2]

ہاں نفس کی بندگی انسان کی غلامی کا سبب ہے، اور تقویٰ و تہذیبِ نفس عالمِ ہستی پر حکومت کرنے کا سبب ہے۔

ایسے افراد کتنے زیادہ ہیں جو خدا کی بندگی اور اطاعت کی وجہ سے ایسے بلند مقام تک پہنچے ہیں کہ ولایتِ تکوینی کے مالک بن گئے' خدا کے اِذن سے اس عالم کے حوادث میں اثرانداز ہو سکتے ہیں اور کرامات و خوارقِ عادات پر دسترس رکھ سکتے ہیں۔

خداوندا! ہوائے نفس کے ساتھ مبارزہ کرنے میں تو ہماری مدد اور نصرت فرما۔

پروردگارا! تُو نے ہمیں " فجور " و " تقویٰ " کا الہام کیا ہے۔ ہمیں اس الہام سے فائدہ اُٹھانے کی توفیق عنایت فرما۔

---

[1] " محجۃ البیضاء " جلد ۵ ص ۱۱۶

[2] گزشتہ ماخذ ص ۱۱۷

بارِ الٰہا ! شیطان کے مکر و فریب انسان کے نفس میں مخفی و پوشیدہ ہیں ، ہمیں ان مکروں کی شناخت سے آشنا کر دے !

آمین یا رب العالمین

سورہ "الشمس" کا اختتام

اختتام ترجمہ قسم منزل خود

۸، رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ ، ۸ بجے صبح

سُورَۃُ اللیل

- یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔
- اِس کی ۲۱ آیات ہیں۔

سُورۃ "اللیل" کے مضامین اور اس کی فضیلت

یہ سُورہ جو مکّی سُورتوں میں سے ہے اور مکّی سُورتوں کی خصوصیات کا حامل ہے، مختصر آیات کے ٹکڑوں میں ہے، لیکن ان کے مضامین گرماگرم اور تیز ہیں، اور زیادہ تر قیامت، خدائی جزا و سزا اور اس کے عوامل و اسباب کے بارے میں ہیں۔

ابتداً میں تین قسموں کو ذکر کرنے کے بعد لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے ؛

۱۔ تقویٰ کے ساتھ انفاق کرنے والے۔

۲۔ وہ بخیل جو قیامت کے اَجر و پاداش کے منکر ہیں۔ پہلے گروہ کا انجام کار خوش بختی اور راحت و آرام ہے جب کہ دُوسرے گروہ کا انجام کار سختی، تنگی اور بدبختی ہے۔

اس سُورہ کے دوسرے حصّہ میں اس معنی کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہ بندوں کو ہدایت کرنا خدا کا کام ہے، سب لوگوں کو دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ سے ڈرایا ہے۔

اور آخری حصّہ میں، ان لوگوں کے، جو اس آگ میں جلیں گے، اور اس گروہ کے، جو اس سے نجات پائیں گے، اوصاف بیان کرتے ہُوئے تعارف کرایا ہے۔

اِس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

"من قرأها اعطاه الله حتی یرضی، وعافاه من العسر ویسر له الیسر" :

" جو شخص اس سُورہ کی تلاوت کرے گا خدا اُسے اس قدر عطا کرے گا کہ وہ راضی اور خوش ہو جائے گا، اور اُسے سختیوں سے نجات دے گا اور زندگی کی راہوں کو اس کے لیے آسان کر دے گا۔

۔ "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۹۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ ۝

۲۔ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ ۝

۳۔ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۝

۴۔ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ۝

۵۔ فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۝

۶۔ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ۝

۷۔ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ۝

۸۔ وَأَمَّا مَن بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ۝

۹۔ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ۝

۱۰۔ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ ۝

۱۱۔ وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّىٰ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ قسم ہے رات کی جب کہ وُہ عالم کو ڈھانپ لے۔
۲۔ اور قسم ہے دن کی جب کہ وہ تجلی کرے۔
۳۔ اور قسم ہے اس کی جس نے مذکر و مؤنث پیدا کیے۔
۴۔ کہ تمہاری سعی و کوشش مختلف ہے۔
۵۔ پس وُہ شخص کہ جو (راہِ خُدا میں انفاق کرے اور پرہیزگاری اختیار کرے۔
۶۔ اور (خدا کی) نیک جزا کی تصدیق کرے۔
۷۔ ہم اس کی راہوں کو آسان بنا دیں گے۔
۸۔ لیکن جو شخص بُخل کرے، اور اس طریقہ سے بے نیاز ہونا چاہے۔
۹۔ اور (خُدا کی) اچھی جزاؤں کی تکذیب کرے۔
۱۰۔ ہم عنقریب اس کی راہوں کو دُشوار بنا دیں گے۔
۱۱۔ اور جس وقت وہ (جہنم یا قبر میں) گرے گا تو اس کے اموال اس کی حالت کے لیے مُفید نہیں ہوں گے۔

سُورۃ "اللیل" کا شانِ نزول

مفسّرین نے اس سالم سُورہ کے لیے ابنِ عباسؓ سے ایک شانِ نزول نقل کی ہے۔ ہم اس شانِ نزول کو مرحوم طبرسی کی "مجمع البیان" سے نقل کرتے ہیں:

مسلمانوں میں سے ایک شخص کے کھجور کے درخت کی ایک شاخ ایک فقیر عیال دار کے گھر کے اُوپر پہنچی ہوئی تھی۔ کھجور والا جب

خرمے اتارنے کے لیے درخت پر چڑھتا تو بعض اوقات خرمے کے کچھ دانے اس فقیر آدمی کے گھر میں جاگرتے، اور اس کے بچے انہیں اُٹھا لیتے. وہ شخص کھجور کے درخت سے اُتر کر خرمے ان سے چھین لیتا، (اور وہ اتنا بخیل اور سنگدل تھا کہ) اگر ان میں سے کسی کے مُنہ میں بھی خرمہ کا دانہ دیکھتا تو اس کے منہ میں انگلی ڈال کر نکال لیتا۔ اس مرد فقیر نے پیغمبرؐ کی خدمت میں شکایت کی۔ حضورؐ نے فرمایا: تم جاؤ میں تمہارا یہ کام کرتا ہوں۔ اس کے بعد آپ نے کھجور والے سے ملاقات کی اور فرمایا یہ درخت جس کی شاخیں فلاں گھر کے اوپر پہنچی ہوئی ہیں، مجھے دے دے تاکہ اس کے مقابلہ میں جنت میں ایک درخت ہو۔ اس نے کہا میرے پاس کھجور کے بہت سے درخت ہیں لیکن کسی کے خرمے اس درخت جیسے اچھے نہیں ہیں۔ (لہٰذا میں یہ سودا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں)

اصحاب پیغمبر میں سے کسی نے یہ گفتگو سُن لی۔ اس نے عرض کیا: اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر میں جاکر یہ درخت اس شخص سے خرید لوں اور آپ کو دے دوں تو آپ وہی چیز جو اس کو دے رہے تھے مجھے عطا فرمائیں گے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں!

اس شخص نے جاکر درخت والے سے ملاقات کی اور اس سے اس سلسلہ میں بات کی۔ کھجور کے مالک نے کہا: کیا تجھے معلوم ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے بدلے میں جنت میں کھجور کا ایک درخت مجھے دینے کے لیے تیار تھے۔ (لیکن میں نے قبول نہیں کیا) اور میں نے انہیں یہ کہہ دیا کہ میں اس کے خرموں سے بہت لذت اندوز ہوتا ہوں، میرے پاس بہت سے کھجور کے درخت ہیں لیکن کسی کے خرمے اتنے اچھے نہیں ہیں۔

خریدار نے کہا: کیا تو اسے بیچنا چاہتا ہے یا نہیں؟ اس نے کہا: میں اسے نہیں بیچوں گا، مگر صرف اس صورت میں کہ تو اتنی رقم مجھے دے کہ کوئی بھی اتنی رقم نہیں دے گا۔ اس نے کہا: تو کتنی رقم لینا چاہتا ہے؟ اس نے کہا چالیس درخت۔

خریدار نے تعجب کرتے ہوئے کہا: تو ایسے کھجور کے درخت کی جو ٹیڑھا ہو چکا ہے بہت ہی بھاری قیمت مانگتا ہے۔ چالیس کھجور کے درخت!

پھر تھوڑے سے سکوت کے بعد اس نے کہا: بہت اچھا، میں خرمے کے چالیس درخت تجھے دیتا ہوں۔

بیچنے والے (لالچی) نے کہا: اگر تو سچ کہتا ہے تو کچھ آدمیوں کو گواہی کے لیے بُلا لے! اتفاقاً کچھ لوگ وہاں سے گزر رہے تھے اس نے انہیں آواز دی اور انہیں اس معاملہ پر گواہ بنایا۔

اس کے بعد وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: "اے رسولِ خداؐ! وہ کھجور کا درخت میری ملکیت میں آگیا ہے، اور میں اُسے (آپ کی بارگاہِ مُبارک میں) پیش کرتا ہوں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقیر کے گھر والوں کے پاس گئے اور صاحب خانہ سے کہا: "یہ کھجور کا درخت تیرا اور تیرے بچوں کا ہے" اِس موقع پر سُورۂ "واللیل" نازل ہوئی۔ (اور بخیلوں اور سخیوں کے بارے میں ان کے لائق باتیں کہیں)۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ اس خریدار کا نام "ابوالاحداح" تھا۔[1]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۰۱۔

تفسیر

تقویٰ اور خدائی امدادیں

اس سُورہ کے آغاز میں ہم پھر تین فکر انگیز (مخلوقات اور خالق عالم کی) قسموں کا سامنا کر رہے ہیں، فرماتا ہے:

"قسم ہے رات کی جب کہ وہ سارے جہان کو ڈھانپ لے": (واللیل اذا یغشٰی).

"یغشٰی" کی تعبیر ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ رات کی تاریکی پردہ کی طرح آدھے کرۂ زمین پر پڑتی ہے، اور اُسے اپنے نیچے ڈھانپ لیتی ہے۔ یا اس بنا پر ہے کہ دن کا چہرہ یا آفتابِ عالمتاب کا چہرہ اس کے پہنچ جانے سے ڈھک جاتا ہے۔ بہرحال یہ رات کی اہمیت اور انسانوں کی زندگی میں اس کے اثرات کی طرف سُورج کے اعتدال سے لے کر، اس کے سائے میں تمام زندہ موجودات کے آرام و سکون اور شب زندہ دار، بیدار دل اور آگاہ افراد کے مسئلہ تک ایک اشارہ ہے۔

اس کے بعد دُوسری قسم کو بیان کرتا ہے اور مزید کہتا ہے: "اور قسم ہے دن کی جب کہ وہ آشکار و ظاہر ہو": (والنھار اذا تجلّٰی)[1]

اور یہ اس لمحہ کی بات ہے جب سپیدۂ صبح رات کے ظلمانی پردہ کو چیر دیتا ہے اور تاریکیوں کو پیچھے دھکیل کر سارے صفحۂ آسمانی پر حاکم بن جاتا ہے۔ اور ہر چیز کو نُور اور روشنی میں نہلا دیتا ہے۔ وہی نور و روشنی جو حرکت و حیات کی رمز اور تمام زندہ موجودات کی پرورش کا سبب ہے۔

قرآن مجید میں "نور" و "ظلمت" کے نظام کے مسئلہ اور ان کی انسانی زندگی پر تاثیر کی طرف بہت زیادہ توجہ دی گئی ہے، کیونکہ یہ دو عظیم دائمی نعمتیں پروردگار کی اہم آیات میں سے دو آیتیں ہیں۔

اس کے بعد آخری قسم کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور قسم ہے اس ذات کی جس نے مذکر و مؤنث کو جنس کو پیدا کیا": (وما خلق الذکر والانثٰی).

کیونکہ عالمِ "انسان" و "حیوان" اور "نبات" میں ان دونوں جنسوں کا وجود، اور وہ تغیرات جو انعقاد نطفہ سے لے کر تولد تک رُونما ہوتی ہیں، اور وہ خصوصیات و صفات جو دونوں جنسوں میں ان کی فعالیتوں اور پروگراموں کی نسبت سے پائی جاتی ہیں اور وہ بہت سے اسرار جو جنسیت کے مفہوم میں چھپے ہوئے ہیں، یہ سب عظیم عالم آفرینش کی نشانیاں اور آیات ہیں جن کے ذریعے ان کے پیدا کرنے والے سے واقفیت حاصل کی جا سکتی ہے۔

---

[1] قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "یغشٰی" فعل مضارع کی صُورت میں ذکر ہوا ہے، لیکن "تجلّٰی" فعل ماضی کی صُورت میں ہے۔ بعض نے کہا ہے: یہ اس بنا پر ہے کہ اس زمانہ میں جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کا آغاز تھا تو جاہلیت کی تاریکی نے ہر جگہ کو گھیر رکھا تھا۔ لیکن اس صُورت میں ایسی ظلمت و تاریکی کی قسم کھانا کچھ اچھا دکھائی نہیں دیتا۔ بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ فعل ماضی چونکہ "اذا" شرطیہ کے بعد واقع ہوا ہے، لہٰذا فعل مضارع کا معنی دیتا ہے، یا یہ کہ اصل میں "تتجلّٰی" تھا اور اس کی ایک "تاء" حذف ہو گئی ہے، لیکن اس صُورت میں فعل مؤنث ہو جائے گا، اور پھر "نھار" (دن) اس کا فاعل نہیں ہو سکتا بلکہ پھر تقدیر میں اس طرح ہونا چاہیئے۔ "اذا تتجلّی الشمس فیہ" (جب اس میں سُورج آشکار و ظاہر ہو)۔

" ما " (وہ چیز) کی تعبیر یہاں خدا کے بارے میں اس کی ذات پاک کی حد سے زیادہ عظمت سے کنایہ ہے، اور یہ وُہ ابہام ہے جو اس لحاظ سے یہاں اس طرح حکم فرما ہے کہ وُہ اُسے خیال و قیاس و گمان و وہم سے برتر کر دیتا ہے۔
بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ " ما " یہاں مصدریہ ہے، تو اس بنا پر اس جملہ کا معنی یہ ہوگا: قسم ہے مذکر و مؤنث کی خلقت کی لیکن یہ احتمال بہت ضعیف نظر آتا ہے۔
حقیقت میں پہلی اور دُوسری دو قسمیں آیاتِ آفاقی کی طرف اشارہ ہیں، اور تیسری قسم آیات انفسی کی طرف اشارہ ہے۔
آخر کار ان قسموں کے ہدف کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: " زندگی کے لیے تمہاری سعی و کوشش مختلف اور گوناں گوں ہے۔"
(ان سعیکم لشتّٰی)۔
ان کوششوں کی سمت، اور ان کے نتائج بھی مکمل طور پر مختلف اور متفاوت ہیں، جو اس طرف اشارہ ہے کہ تم بہرحال زندگی میں سکون و آرام سے نہیں رہو گے، اور یقینی طور پر سعی و کوشش کے لیے ہاتھ پاؤں مارو گے، اور خداداد قوتوں اور توانائیوں کو، جو تمہارے وجود کا سرمایہ ہیں، کسی نہ کسی راستے میں خرچ کرو گے۔ لہٰذا اب تم خود دیکھو گے کہ تمہاری سعی و کوشش کس راستے، کس سمت اور کس نتیجہ کی حامل ہے؛ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اپنے تمام سرمایوں اور صلاحیتوں کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ ڈالو، یا فضول مُفت میں ضائع کر بیٹھو۔
" شتّی " " شتیت " کی جمع ہے جو " شت " (بروزن شط) کے مادہ سے جمعیت کو پراگندہ کرنے کے معنی میں ہے۔ اور یہاں کیفیت مقصد کے حصول اور ان کے نتیجہ کے لحاظ سے لوگوں کی کوششوں کے اختلاف کی طرف اشارہ ہے۔
اس کے بعد لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر کے ہر ایک کی خصوصیات کو شمار کرتے ہوئے فرماتا ہے: " پس وہ شخص جو راہِ خدا میں بخشش کرے اور پرہیزگاری اختیار کرے۔" (فاما من اعطٰی واتقٰی)۔
" اور خدا کی اچھی جزا پر ایمان رکھتا ہو" (وصدق بالحسنٰی)۔
" ہم اس کے لیے راستے کو آسان بنا دیں گے اور بہشتِ جاوداں کی طرف ہدایت کریں گے۔" (فسنیسرہ للیسرٰی)۔
" اعطٰی " سے مُراد وہی راہِ خدا میں خرچ کرنا اور حاجت مندوں کی مدد کرنا ہے۔
اور اس کے بعد تقویٰ کے لیے تاکید ممکن ہے کہ پاک نیت، اور خرچ کرتے وقت قصدِ خالص، اور مشروع طریقہ سے اموال کا حصُول اور انہیں مشروع و جائز طریقہ سے خرچ کرنا، اور ہر قسم کا احسان جتانے اور اذیت و آزار پہنچانے سے خالی ہونے کے لزوم کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ان اوصاف کا مجموعہ تقویٰ کے عنوان میں جمع ہے۔
بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ " اعطٰی " مالی عبادتوں کی طرف اشارہ ہے، اور " اتقٰی " باقی تمام عبادتوں کی طرف، اور واجبات کو انجام دینے اور محرمات کو چھوڑنے کی طرف، لیکن پہلی تفسیر ظاہر آیت کے ساتھ بھی سازگار ہے، اور اس شانِ نزول کے ساتھ بھی جو ہم نے اوپر بیان کی ہے۔
" حسنٰی " کی تصدیق کرنا۔ (" حسنٰی " " احسن " کی مؤنث ہے جو زیادہ اچھے کے معنی میں ہے)۔
یہ خُدا کی اچھی جزاؤں پر ایمان رکھنے کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ شانِ نزول میں بیان ہوا ہے کہ " ابوالدحداح " نے خدا کی جزاؤں پر ایمان رکھتے ہوئے اپنے اموال خرچ کیے۔ سُورۂ نساء کی آیہ ۹۵ میں آیا ہے؛ وکلاً وعد اللہ الحسنٰی: " خدا نے ان میں سے

ہر ایک کو اچھے اجر اور جزاؤں کا وعدہ دیا ہے۔ (اس آیت میں بھی حسنیٰ اچھی جزا کے معنی میں ہے)۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد "شریعت حسنیٰ" یعنی دینِ اسلام پر ایمان ہے، جو بہترین دین ہے۔

اور بعض نے اس کی کلمہ لا الٰہ الّا اللہ یا شہادتین کے ساتھ تفسیر کی ہے۔

لیکن سیاقِ آیات، شانِ نزول، اور بہت سی آیاتِ قرآنی میں حسنیٰ کا اچھی جزا کے معنی میں ہونے کے ذکر کی طرف توجہ کرتے ہوئے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

"فسنیسرہ للیسریٰ" کا جملہ ممکن ہے توفیقِ الٰہی، اور ایسے اشخاص پر امرِ اطاعت کے آسان کرنے کی طرف اشارہ ہو، یا ان کی طرف جنّت کی راہ کھولنے اور تحیت و سلام کے ساتھ ملائکہ اور فرشتوں کے استقبال کرنے، یا ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ ہو۔

یہ بات یقینی ہے کہ جو لوگ انفاق و تقویٰ کی راہ اختیار کرتے ہیں اور عظیم خدائی جزاؤں پر گرم جوشی کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں، ان کے لیے مشکلات آسان ہو جاتی ہیں اور وہ دنیا و آخرت میں ایک خاص قسم کے سکون و آرام کے حامل ہوتے ہیں۔

ان سب سے قطع نظر ممکن ہے کہ مالی انفاق ابتداً میں انسان کی طبیعت و مزاج کے لیے شاق اور مشکل ہو، لیکن تکرار کرنے اور مسلسل جاری رکھنے سے اس پر راستہ اس طرح آسان ہو جاتا ہے کہ وہ اس سے لذت اُٹھاتا ہے۔

کتنے ہی سخی لوگ ایسے ہیں جو اپنے دستر خوان پر مہمان کی موجودگی سے خوش ہوتے ہیں، لیکن اس کے برعکس اگر کسی دن ان کے پاس مہمان نہ آئے تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں اور یہ بھی مشکلات کے ان کے لیے آسان کرنے کی ایک قسم ہے۔

اور اس نکتہ سے بھی غافل نہیں ہونا چاہیئے کہ اصلی طور پر خدائی عظیم جزاؤں پر ایمان، انسان کے لیے انواع و اقسام کی مشکلات کی برداشت کو آسان اور سہل بنا دیتا ہے، نہ صرف مال بلکہ وہ اپنی جان کو بھی اخلاص کے مطابق گزارتا ہے اور عشقِ شہادت میں میدانِ جہاد میں شرکت کرتا ہے، اور اپنی اس قربانی اور ایثار سے لذت حاصل کرتا ہے۔

"یسریٰ" "یسر" کے مادہ سے اصل میں گھوڑے پر زین کسنے، اُسے لگام دینے اور سواری کے لیے آمادہ و تیار کرنے کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد اس کا ہر سہل اور آسان کام کے لیے اطلاق ہوا ہے۔[1]

بعد والی آیات میں اس گروہ کے نقطۂ مقابل کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "لیکن وہ شخص جو بُخل کرے اور اس طریقے سے بے نیازی چاہے": (واما من بخل واستغنیٰ)۔

"اور خدا کی اچھی جزاؤں کی تکذیب کرے" (وکذب بالحسنیٰ)۔

"ہم عنقریب راستوں کو اس پر دُشوار اور مُشکل بنا دیں گے": (فسنیسرہ للعسریٰ)۔

"بخل" یہاں "اعطاء" کا نقطۂ مقابل ہے، جو پہلے گروہ (سعادت مند سخیوں کے گروہ) میں بیان ہوا ہے۔ "واستغنیٰ" (بے نیازی چاہی) یا تو بُخل کرنے کے لیے ایک بہانہ ہے، یا مال جمع کرنے کے لیے ایک وسیلہ ہے، اور یا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ خدائی جزاؤں سے اپنے آپ کو بے نیاز شمار کرتا ہے، پہلے گروہ کے برعکس، جن کی آنکھ ہمیشہ لطفِ خدا پر لگی رہتی ہے یا وہ اپنے آپ کو خُدا کی اطاعت سے بے نیاز سمجھتا ہے، اور ہمیشہ گناہ میں آلودہ رہتا ہے۔

---

[1] "تفسیر کشاف" جلد ۴ ص ۷۶۲۔

ان تینوں تفاسیر میں سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ اگرچہ تینوں تفاسیر کے درمیان جمع کرنا بھی ممکن ہے۔

"حسنٰی" کی تکذیب سے مراد وہی قیامت کی جزاؤں کا انکار ہے، یا پیغمبروں کے دین و آئین اور نیک روش کا انکار ہے۔

"فسنیسرہ للعسرٰی" کی تعبیر جو ذاتی طور پر دو ظاہراً متضاد تعبیریں ہیں (ہم ان کی راہ کو مشکلات کی طرف آسان کر دیں گے)۔

"فسنیسرہ للیسرٰی" کا نقطہ مقابل ہے، اس طرح سے کہ خدا پہلے گروہ کو تو اپنی توفیقات کا مشمول قرار دے گا اور ان کے لیے اطاعت و انفاق کی راہ کو طے کرنا آسان بنا دے گا تاکہ وہ زندگی کی مشکلات سے رہائی حاصل کر لیں۔ لیکن دوسرے گروہ کی توفیقات سلب ہو گئی ہیں، لہٰذا ان کے لیے راستہ کو طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے، اور انہیں دنیا و آخرت میں سختیوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور اصولی طور پر ان بے ایمان بخیلوں کے لیے نیک اعمال کو انجام دینا، خصوصاً راہِ خدا میں انفاق کرنا سخت اور دشوار کام ہے، جب کہ پہلے گروہ کے لیے نشاط آور اور رُوح افزا ہے۔[1]

اور آخری زیرِ بحث آیت میں ان دل کے اندھے بخیلوں کو خبردار کرتے ہوئے فرماتا ہے: "جب وہ قبر یا جہنم میں جا گرے گا، تو اس کے اموال اس کے کچھ کام نہ آئیں گے۔" (ومایغنی عنه ماله اذا تردّٰی)۔

نہ تو وہ ان اموال کو دنیا سے اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے اور اگر وہ لے بھی جائے تو وہ اس کے جہنم کی آگ میں جلنے سے مانع نہیں ہوں گے۔

"ما" اس آیت کے آغاز میں ممکن ہے "نافیہ" ہو (جیسا کہ ہم نے اُوپر بیان کیا ہے) یا استفہام انکاری کے لیے ہو، یعنی اس کے اموال قبر یا دوزخ میں جانے یا گرنے کے وقت اس کو کیا فائدہ دیں گے؟

"تردّٰی" "ردائت" اور "ردٰی" کے مادہ سے ہلاکت کے معنی میں ہے اور بلندی سے گرنے کے معنی میں بھی آیا ہے جو ہلاکت کا سبب ہو۔ بلکہ بعض تو اس کی اصل ہی سقوط کے معنی میں سمجھتے ہیں، اور چونکہ بلند جگہ سے گرنا ہلاکت کا سبب ہوتا ہے، لہٰذا ہلاکت کے معنی میں بھی آیا ہے اور زیرِ بحث آیت میں ممکن ہے کہ قبر یا دوزخ میں گرنے کے معنی میں ہو یا ہلاکت عذاب کے معنی میں ہو۔

اس طرح قرآن ان آیات میں دو گروہوں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، ایک گروہ مومن، متقی اور سخی، اور دوسرا گروہ بے ایمان، بے تقویٰ اور بخیل، اور ان دونوں گروہوں کا نمونہ شانِ نزول میں وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

پہلا گروہ توفیقاتِ الٰہی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے، اپنی راہ کو سہولت کے ساتھ طے کرتا ہے، اور جنت اور اس کی نعمتوں کی طرف بڑھا چلا جاتا ہے۔ جب کہ دوسرا گروہ زندگی میں بے شمار مشکلات میں گھرا ہوا ہوتا ہے، بہت سا مال جمع کرتا ہے اور یہیں پر چھوڑ کر آگے چلا جاتا ہے، اور سوائے حسرت، اندوہ وبال اور خدائی عذاب کے انہیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، اور وہ اس سے کوئی چیز نہیں خریدتے۔

❖ ❖ ❖

---

[1] "یسرٰی" و "عسرٰی" دونوں مؤنث کے صیغہ ہیں (ان کا مذکر "ایسر" و "اعسر" ہے) اور ان دونوں کا مؤنث کے صیغہ کی صورت میں ذکر کرنا یا تو اس بنا پر ہے کہ ان کا موصوف (اعمال کا مجموعہ) ہے اور تقدیر میں اس طرح ہوگا۔ فسنیسرہ الاعمال لیسرٰی - اور - لاعمال عسرٰی یا تمام مسائل اور زندگی میں پیش آنے والے واقعات ہیں اور اگر اس کا موصوف مفرد ہو تو ممکن ہے کہ "طریقۃ" یا "خلّۃ" یا اس قسم کا کوئی لفظ ہو۔

۱۲۔ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۞

۱۳۔ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ۞

۱۴۔ فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ۞

۱۵۔ لَا يَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ۞

۱۶۔ الَّذِىْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۞

۱۷۔ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۞

۱۸۔ الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۞

۱۹۔ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۞

۲۰۔ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۞

۲۱۔ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۞

ترجمہ

۱۲۔ یقیناً ہدایت کرنا ہمارے ذمّہ ہے۔

۱۳۔ اور دُنیا و آخرت ہمارے لیے ہے۔

۱۴۔ اور میں تمہیں شعلہ نکالنے والی آگ سے ڈراتا ہوں۔

۱۵۔ بدبخت ترین لوگوں کے سوا کوئی شخص اس میں داخل نہیں ہوگا۔

۱۶۔ وہی شخص جس نے آیاتِ (خدا کی) تکذیب کی اور پیٹھ پھیر لی۔

۱۷۔ اور زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والے عنقریب اس سے دُور رہیں گے۔

۱۸۔ وہی شخص جو اپنے مال کو (خدا کی راہ میں) بخش دیتا ہے تاکہ اپنے نفس کا تزکیہ کرے۔

۱۹۔ اور کسی شخص کا اس کے پاس کوئی حقِ نعمت نہیں ہے تاکہ وُہ (اس انفاق کے ذریعے) اس کا بدلہ دے۔ ۲۰: سوائے اپنے بلند و برتر پروردگار کی رضامندی چاہنے کے۔

۲۱۔ اور وُہ عنقریب راضی و خوشنود ہو جائے گا۔

تفسیر

انفاق اور جہنّم کی آگ سے دُوری

گزشتہ آیات میں لوگوں کی دو گروہوں: مومنِ سخاوت مند اور بے ایمان بخیل، میں تقسیم کرنے، اور ان میں سے ہر ایک کی سَرنوشت بیان کرنے کے بعد زیرِ بحث آیات میں، پہلے اس بات کو بیان کرتا ہے کہ ہمارا کام ہدایت کرنا ہے کسی کو مجبور کرنا نہیں ہے۔ اَب یہ تمہاری ذمّہ داری ہے کہ اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ مردانہ وار راستہ پر گامزن ہو جاؤ۔ علاوہ ازیں اس راستہ کو طے کرنا خُود تمہارے ہی نفع میں ہے اور ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

فرماتا ہے! "یقیناً ہدایت کرنا ہمارے ہی ذمّہ ہے"۔ (ان علینا للھدٰی)۔

چاہے تکوین (فطرت و عقل) کے طریق سے ہدایت ہو، اور چاہے تشریع (کتاب و سُنّت) کے طریق سے ہو، اس سلسلہ میں جو کچھ ضروری تھا وہ ہم نے بیان کر دیا ہے اور اس کا حق ادا کر دیا ہے۔

"اور یقینی طور پر آخرت اور دنیا ہماری ہی ملکیت ہے"۔ (وان لنا للاٰخرۃ والاولیٰ)[1]

---

[1] "للاٰخرۃ" کا "لام" اور اسی طرح (گزشتہ آیت میں) "للھدٰی" کا "لام" ظاہراً لام تاکید ہے جو یہاں "اسم انّ" کے اُوپر آئی ہے، اگرچہ عام طور پر خبر کے اُوپر داخل ہوا کرتی ہے، یہ اس بنا پر ہے کہ بعض اَدب کی کتابوں کی تصریح کے مطابق جب "انّ" کی خبر مقدم ہو تو اس کے اسم پر لام داخل ہوتی ہے۔

ہمیں تمہارے ایمان و اطاعت کی کوئی ضرورت نہیں ہے، نہ تمہاری اطاعت ہمیں کوئی فائدہ پہنچاتی ہے اور نہ ہی تمہاری نافرمانی ہمیں کوئی نقصان پہنچاتی ہے۔ یہ تمام پروگرام تمہارے فائدے کے لیے ہیں اور خود تمہارے لیے ہیں۔

اس تفسیر کے مطابق یہاں ہدایت" ارائہ طریق "کے معنی میں ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ ان دو آیات کا ہدف سعادت کرنے والے مومنین کو شوق دلانا اور اس معنی پر تاکید ہو کہ ہم انہیں مزید ہدایت کا مشمول قرار دیں گے، اور اس جہان میں بھی اور دوسرے جہان میں بھی راستہ کو ان پر آسان کر دیں گے، اور چونکہ دنیا و آخرت ہماری ہی ملکیت ہے لہٰذا ہم اس کام کو انجام دینے کی قدرت رکھتے ہیں یہ ٹھیک ہے کہ زمانہ کے لحاظ سے دُنیا آخرت پر مقدم ہے، لیکن اہمیت اور ہدف اصلی کے لحاظ سے مقصودِ اصلی آخرت ہے اور اسی بنا پر اُسے مقدم رکھا گیا ہے۔

اور چونکہ ہدایت کے شعبوں میں سے ایک خبردار کرنا اور ڈرانا ہے، لہٰذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: اب جب کہ یہ بات ہے تو میں تمہیں اس آگ سے ڈراتا ہوں جو شعلہ ور ہوگی " (فانذرتکم نارًا تلظّٰی)۔

" تلظّٰی" " لظی" (بروزن قضا) کے مادہ سے، خالص شعلہ کے معنی میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ خالص شعلوں میں جو ہر قسم کے دھوئیں سے خالی ہوں زیادہ گرمی اور حرارت ہوتی ہے۔ اور بعض اوقات لفظ "لظی" کا خود جہنم پر بھی اطلاق ہوتا ہے[1]

اس کے بعد اس گروہ کی طرف، جو اس بھڑکتی ہوئی اور جلانے والی آگ میں داخل ہوں گے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "بدبخت ترین آدمی کے سوا اس میں کوئی بھی داخل نہیں ہوگا۔ (لا یصلاھا الّا الاشقی)۔

اور اشقی کی توصیف میں فرماتا ہے: " وہی شخص جو آیات خدا کی تکذیب کرتا ہے اور ان سے پیٹھ پھیر لیتا ہے:" (الّذی کذّب وتولّٰی)۔

اس بنا پر خوش بختی اور بدبختی کا معیار وہی کفر و ایمان ہے یا وہ عملی نتائج جو ان دونوں کے ہوتے ہیں، اور وہ واقعاً جو شخص ہدایت کی ان تمام نشانیوں، اور ایمان و تقویٰ کے امکانات و وسائل کو نظر انداز کر دے، تو وہ " اشقی " کا مصداق، اور بدبخت ترین شخص ہے۔

" الّذی کذّب وتولّٰی " کے جملہ میں ممکن ہے کہ " تکذیب " تو کفر کی طرف اشارہ ہو، اور " تولی " اعمالِ صالح کے ترک کرنے کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ کفر کا لازمہ یہی ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں ہی ترکِ ایمان کی طرف اشارہ ہوں۔ اس طرح سے کہ پہلے تو پیغمبرِ خدا کی تکذیب کرتے ہیں، اور اس کے بعد پیٹھ پھیر کر ہمیشہ کے لیے اس سے دُور ہو جاتے ہیں۔

بہت سے مفسرین نے یہاں ایک اعتراض پیش کیا ہے اور اس کا جواب دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اُوپر والی آیات اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ جہنم کی آگ کفار کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ بات اس چیز کے مخالف ہے جو قرآن کی دوسری آیات اور مجموعہ روایات اسلامی سے معلوم ہوتی ہے کہ گنہگار مومن بھی جہنم کی آگ میں حصہ دار بنیں گے، لہٰذا منحرف گروہوں میں سے بعض نے جو یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ ایمان کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ ضرر نہیں پہنچاتا اُنہوں نے اپنے مقصود پر ان آیات سے استدلال کیا ہے۔ (اس گروہ کا نام مرجئہ ہے)

اس کے جواب میں دو نکتوں کی طرف توجہ کرنا چاہیئے: پہلا یہ کہ یہاں جہنم میں ورود سے مراد وہی "خلود" یعنی ہمیشہ رہنا ہے۔

---

[1] " تلظی" اصل میں " تتلظی " تھا، دو " تا " میں سے ایک " تا " تخفیف کے لیے گر گئی ہے۔

اور ہم جانتے ہیں کہ خلود کفار کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ اس بات کا قرینہ وہ آیات ہیں جو اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ غیر کفار بھی جہنم میں وارد ہوں گے۔

دوسرا یہ کہ اُوپر والی آیات اور بعد والی آیات یہ کہتی ہیں کہ جہنم کی آگ سے دُوری "اتقی" (زیادہ متقی افراد) سے مخصوص ہے، یعنی مجموعی طور پر وہ یہ چاہتا ہے کہ صرف دو گروہوں کی حالت بیان کرے: (۱) بے ایمان بخیل گروہ اور (۲) زیادہ تقویٰ رکھنے والے سعادت مند مومن۔ ان دونوں گروہوں میں سے صرف پہلا گروہ جہنم میں وارد ہوگا، اور دُوسرا گروہ بہشت میں داخل ہوگا، اور اس طرح سے تیسرے گروہ یعنی گنہگار مومنین کے بارے میں تو اصلاً کوئی بات ہی نہیں ہوئی ہے۔

دُوسرے لفظوں میں یہاں "حصر" "حصر اضافی" ہے گویا جنّت صرف دوسرے گروہ کے لیے، اور جہنّم صرف پہلے گروہ کے لیے پیدا کی گئی ہے، اس بیان سے ایک دوسرے اعتراض کا جواب بھی، جو زیر بحث آیات اور ان آیندہ آنے والی آیات کے رابطہ سے ہوا ہے، جو نجات کو "اتقی" سے مخصوص کرتی ہیں، واضح ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اس گروہ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے جو اس جلانے والی شعلہ بار آگ سے دُور ہے، فرماتا ہے: "عنقریب سب سے زیادہ تقویٰ کرنے والا آدمی اس بھڑکتی ہوئی آگ سے دُور رکھا جائے گا"۔ (وسیجنبها الاتقی)۔

وہی آدمی جو اپنے مال کو راہِ خدا میں انفاق کرتا ہے اور اس کا مقصد رضائے خدا کا حصول، تزکیۂ نفس، اور اموال کو پاک کرنا ہوتا ہے، (الذی یؤتی ماله یتزکّٰی)۔

"یتزکّٰی" کی تعبیر حقیقت میں قصدِ قربت اور نیتِ خالص کی طرف اشارہ ہے، چاہے یہ جملہ معنوی و رُوحانی رشد و نمو کے حصول کے معنی میں ہو یا اموال کی پاکیزگی کے حاصل کرنے کے معنی میں، کیونکہ "تزکیہ" "نمو دینے" کے معنی میں بھی آیا ہے، اور "پاک کرنے" کے معنی میں بھی۔ سورہ توبہ کی آیہ ۱۰۳ میں آیا ہے: خذ من اموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها وصل عليهم ان صلاتك سكن لهم: "ان کے اموال میں سے زکوٰۃ وصول کرلے تاکہ اس کے ذریعے تو انہیں پاک کرے اور ان کی پرورش کرے، اور (زکوٰۃ لیتے وقت) ان کے لیے دُعا کر کیونکہ تیری دعا ان کے سکون و آرام کا باعث ہے"۔

اس کے بعد ان کے خلوصِ نیت کے مسئلہ پر، جو وہ خرچ کرنے میں رکھتے ہیں، تاکید کے لیے مزید فرماتا ہے: "کسی شخص کا اس کے اُوپر حق نعمت نہیں ہے کہ اس انفاق کے ذریعے اس کی جزا دی جائے" : (وما لاحد عنده من نعمة تجزٰی)۔

بلکہ اس کا مقصد تو اپنے بزرگ و برتر پروردگار کی رضا حاصل کرنا ہے۔ (الا ابتغاء وجه ربه الاعلٰی)۔

دُوسرے لفظوں میں لوگوں کے درمیان بہت سے انفاق ایسے ہوتے ہیں جو ویسے ہی انفاقوں کا جواب ہوتے ہیں جو طرف مقابل کی طرف سے پہلے سے کیے ہوئے ہوتے ہیں، البتہ حق شناسی اور احسان کا احسان کے ساتھ جواب دینا ایک اچھا کام ہے، لیکن اس کا حساب پرہیزگاروں کے مخلصانہ انفاق سے جُدا ہے۔ اُوپر والی آیات کہتی ہیں کہ پرہیزگار مومنوں کا دُوسروں پر خرچ کرنا نہ تو ریاکاری کی وجہ سے ہوتا ہے، اور نہ ہی ان کی سابقہ خدمات کے جواب کے طور پر، بلکہ اس کا سبب صرف اور صرف خدا کی رضا کا حاصل کرنا ہوتا ہے اور یہی چیز ان انفاقوں کو حد سے زیادہ قدر و منزلت عطا کرتی ہے۔

"وجہ" کی تعبیر یہاں "ذات" کے معنی میں ہے اور اس سے مراد اس کی پاک ذات کی رضا و خوشنودی ہے۔

" ربہ الاعلیٰ " کی تعبیر اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ یہ انفاق پوری معرفت کے ساتھ صورت پذیر ہوتا ہے، اور اس حالت میں ہوتا ہے کہ وہ پروردگار کی ربوبیت سے بھی آشنا ہوتا ہے، اور اس کے مقام اعلیٰ سے بھی باخبر ہوتا ہے۔

ضمنی طور پر یہ استثناء ہر قسم کی انحرافی نیتوں کی بھی نفی کرتا ہے، مثلاً نیک نامی، لوگوں کی توجہ مبذول کرنے، اور معاشرے میں مقام و حیثیت وغیرہ حاصل کرنے کے لیے خرچ کرنا، کیونکہ اس کا مفہوم ان اموال کے انفاق کا محرک، پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے میں ہے۔[1]

انجام کار اس سورہ کی آخری آیت میں اس گروہ کی عظیم و بے نظیر جزاؤں کو پیش کرتے ہوئے ایک مختصر سے جملہ میں فرماتا ہے:

" اور ایسا آدمی عنقریب راضی و خوشنود ہو جائے گا۔ " (ولسوف یرضٰی)۔

ہاں! جس طرح سے وہ رضائے خدا کے لیے کام کرتا ہے، خدا بھی اس کو راضی کرے گا، ایسی رضا جو مطلق اور بے قید و شرط ہوگی، ایسی رضا جو وسیع و غیر محدود ہوگی، ایسی پُر معنی رضا جس میں تمام نعمتیں جمع ہوں گی، ایسی رضا جس کا تصور کرنا بھی آج ہمارے لیے غیر ممکن ہے اور وہ کون سی نعمت ہوگی جو اس سے برتر و بالاتر ہوگی۔

بعض مفسرین نے بھی یہی احتمال دیا ہے کہ " یرضٰی " میں ضمیر خدا کی طرف لوٹتی ہے، یعنی عنقریب خدا اس گروہ سے راضی ہو جائے گا کہ وہ بھی ایک عظیم و بے نظیر انعام ہے کہ خدائے بزرگ اور پروردگار برتر اس قسم کے بندے سے راضی و خوشنود ہو جائے۔ وہ بھی ایسی رضا جو مطلق اور بے قید و شرط ہو، اور یقینی طور پر اس رضائے الٰہی کے پیچھے اس باایمان اور باتقویٰ بندہ کی رضایت ہے، کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں جیسا کہ سورہ بینہ کی آیہ ۸ میں آیا ہے، رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ، یا سورہ فجر کی آیہ ۲۸ میں آیا ہے راضیۃ مرضیۃ، لیکن تفسیر اول زیادہ مناسب ہے۔

ایک نکتہ

سورۂ واللیل کے شانِ نزول کے بارے میں ایک بات

فخر رازی کہتا ہے: " مفسرینِ اہلِ سنت عموماً یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ " سیجنبھا الاتقی " میں " اتقی " سے مراد حضرت ابوبکرؓ ہیں، اور شیعہ عام طور پر اس بات کا انکار کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ حضرت علی بن ابی طالبؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔"[2]

اس کے بعد وہ اپنے مخصوص انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے، اُمتِ اسلامی (عام اس سے کہ اہلِ سنت ہوں یا شیعہ) اس چیز پر اتفاق رکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد افضل ترین شخص یا ابوبکرؓ ہے یا علیؑ، اور اس آیت کو علیؑ پر منطبق

---

[1] " الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ " کے جملہ میں استثناء، استثنا منقطع ہے، البتہ پہلی آیت میں ایک تقدیر ہے جو اس طرح ہے۔ وما لاحد عندہ من نعمۃ تجزیٰ فلا ینفق مالہ لنعمۃ الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ، کسی کا اس پر کوئی احسان نہیں ہے کہ اس کا بدلہ دیا جائے لہٰذا وہ اپنا مال کسی احسان کے بدلے میں خرچ نہیں کرتا مگر اپنے بزرگ و برتر پروردگار کی خوشنودی کے لیے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ استثنا متصل ہو، ایک محذوف کو نظر میں رکھتے ہوئے اور تقدیر میں اس طرح ہو: لا ینفق لنعمۃ عندہ ولا لغیر ذالک الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ (غور کیجئے)۔

[2] " تفسیر فخر رازی " جلد ۳۱ صفحہ ۲۰۴۔

نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ قرآن اس فرد اتقیٰ کے بارے میں کہتا ہے: وما لاحد عندہ من نعمۃ تجزٰی کوئی شخص اس پرکوئی حق اور احسان نہیں رکھتا، کہ جس کی جزا دی جائے اور یہ صفت علی علیہ السلام پر تطبیق نہیں کرتی کیونکہ پیغمبرؐ ان پر حق نعمت رکھتے تھے، لیکن پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ صرف یہ کہ ابوبکرؓ پر کوئی مادّی حقِ نعمت نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر انفاق کرتے تھے اور حقِ نعمت رکھتے تھے [1]

اس کا نتیجہ یہ بنتا ہے کہ "اتقیٰ" کا مصداق ابوبکرؓ ہے، اور چونکہ اتقی کا معنی سب لوگوں سے زیادہ پرہیزگار ہے، لہٰذا اس کی افضلیت ثابت ہے [2]

اگرچہ ہم اس تفسیر کے مباحث میں، اس قسم کے مسائل میں، وارد ہونے کی طرف زیادہ مائل نہیں ہیں لیکن بعض مفسرین کا اپنے پہلے سے کیے ہوئے فیصلہ کو قرآن کی آیات کے ذریعے ثابت کرنے پر اصرار اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ وہ ایسی تعبیریں کرنے لگے ہیں جو پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرتبہ اور بلند مقام کے لائق نہیں ہے۔ لہٰذا اسی سبب سے ہم بھی یہاں چند نکات کا ذکر کرتے ہیں۔

اولاً: یہ جو فخر رازی کہتا ہے کہ اہلِ سُنّت کا اس بات پر اجماع و اتفاق ہے کہ یہ آیت ابوبکرؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس چیز کے برخلاف ہے جسے اہلِ سنّت کے مشہور و معروف مفسرین نے صراحت کے ساتھ نقل کیا ہے، منجملہ "قرطبی" اپنی تفسیر میں ابنِ عباسؓ سے ایک روایت میں نقل کرتا ہے کہ یہ سارا سورہ (سورۃ اللیل) "ابوالدحداح" کی شان میں نازل ہوا ہے۔ (جس کی داستان ہم نے سورہ کے آغاز میں بیان کر دی ہے) [3]

خاص طور پر جب وہ آیہ وسیجنبھا الاتقی پر پہنچتا ہے تو پھر دوبارہ کہتا ہے کہ اس سے مراد "ابوالدحداح" ہے۔ اگرچہ اکثر مفسرین سے اس نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ (ان کے نزدیک) یہ ابوبکرؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن خود اس نے اس نظریہ کو قبول نہیں کیا۔

ثانیاً: یہ جو اس نے کہا ہے کہ شیعوں کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے، ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ بہت سے مفسرین نے یہاں ابوالدحداح کی داستان ہی بیان کی ہے اور اُسے قبول کیا ہے۔ البتہ بعض روایات میں امام جعفر علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ "اتقی" سے مراد ان کے پیروکار اور شیعہ ہیں اور الذی یؤتی مالہ یتزکّٰی سے مراد امیرالمومنین علیؑ ہیں، لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ باتیں شانِ نزول کا پہلو نہیں رکھتیں، بلکہ یہ واضح اور روشن مصداق کی تطبیق کی قبیل سے ہیں۔

ثالثاً: اس میں شک نہیں کہ اوپر والی آیت میں لفظ "اتقی" "لوگوں میں سے زیادہ تقویٰ رکھنے والے کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس کا مفہوم وہی متقی ہوتا ہے، اور اس بات کا واضح گواہ یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں "اشقی" "لوگوں میں سے بدبخت ترین کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد وہ کافر ہیں جو انفاق سے بُخل کرتے تھے۔ علاوہ ازیں یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ تھے، تو کیا ابوبکرؓ کو پیغمبرؐ سے بھی مقدم رکھا جا سکتا ہے؟ ہم پہلے سے کیے ہوئے فیصلوں اور ذہنیتوں کی بنا پر ایسی تعبیریں کیوں کریں، جو پیغمبرؐ تک کے مقامِ بلند کو بھی ضرب لگائیں۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ پیغمبرؐ کا معاملہ الگ ہے، تو پھر ہم کہتے ہیں کہ آیہ وما لاحد عندہ من نعمۃ تجزٰی میں ان کے حوالے

---

[3] "تفسیر قرطبی" جلد ۱۰ ص ۷۱۸۰

کو کیوں الگ نہیں رکھا گیا اور علی علیہ السلام کو آیت کے مورد سے خارج کرنے کے لیے کیوں کہا گیا کہ چونکہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مادی نعمتوں کے مشمول ہیں لہٰذا وہ اس آیت میں داخل نہیں ہیں۔

رابعاً : ایسا کون سا آدمی ہے جس سے اس کی زندگی میں کسی نے محبت کی ہی نہ ہو اور کسی نے بھی اُسے نہ ہدیہ دیا ہو نہ کبھی دعوت کی ہو۔ کیا واقعاً ایسا ہوا ہے کہ ابوبکرؓ اپنی ساری عمر میں نہ تو کسی کی مہمانی پر گئے اور نہ ہی کبھی کسی کا کوئی ہدیہ قبول کیا اور نہ ہی کوئی اور دُوسری مادی خدمت کس سے قبول کی کیا یہ چیز باور کرنے کے لائق ہے؟ نتیجہ یہ ہے کہ آیہ وما لاحد عندہ من نعمۃ تجزیٰ سے مُراد یہ نہیں ہے کہ کسی بھی شخص کا اس پر کوئی حق نعمت ہے ہی نہیں، بلکہ اس سے مُراد یہ ہے کہ ان کا انفاق کرنا کسی حق نعمت کی بنا پر نہیں ہے۔

یعنی اگر وہ کسی پر انفاق کرتے ہیں تو وہ صرف خدا کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ وہ کسی خدمت کی بنا پر اسے اجر و پاداش دینا چاہتے ہیں۔

خامساً : اس سُورہ کی آیات اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ یہ سُورہ ایک ایسے ماجرے کے بارے میں، جس کے دو قطب ہیں، نازل ہوا ہے، ایک "اتقی" کے قطب میں تھا اور دُوسرا "اشقی" کے قطب میں۔ اگر ہم "ابوالدحداح" کی داستان کو شانِ نزول سمجھیں تو مسئلہ حل شدہ ہے، لیکن اگر ہم کہیں کہ مُراد ابوبکرؓ تھے تو "اشقی" کی مشکل باقی رہ جاتی ہے کہ اس سے مُراد کون شخص ہے؟

شیعوں کو اس بات پر کوئی اصرار نہیں ہے کہ یہ آیت خصوصیت کے ساتھ علیؑ ہی کے بارے میں ہے۔ ان کی شان میں آیات بہت زیادہ ہیں، لیکن اگر اس کی تطبیق علیؑ پر کی جائے تو "اشقی" کی مشکل حل ہے، کیونکہ سُورۂ شمس کی آیہ ۱۲ (اذ انبعث اشقاھا) کے ذیل میں اہلِ سُنّت کے طرق سے کافی روایات نقل ہوئی ہیں کہ "اشقی" سے مراد علی بن ابی طالبؑ کا قاتل ہے۔ (ان روایات کو، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، حاکم حسکانی نے شواہد التنزیل میں جمع کیا ہے)۔

خلاصہ یہ ہے کہ فخر رازی کی گفتگو اور اس آیت کے بارے میں اس کی تحلیل بہت ہی کمزور اور بہت سے اشتباہات پر مشتمل ہے۔ اسی لیے اہلِ سُنّت کے بعض مشہور مفسرین مثلاً آلوسی تک نے بھی رُوح المعانی میں اس تجزیہ کو پسند نہیں کیا، اور اس پر اعتراض کیا ہے، جیسا کہ وہ کہتا ہے:

"واستدل بذالك الامام على انه (ابوبکر) افضل الامة وذكر ان في الأيات ما يأبي قول الشيعة انها في علي وأطال الكلام في ذالك وأتى بما لا يخلو عن قيل
وقال :

"امام فخر رازی نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ ابوبکرؓ افضل اُمت ہیں، اور مزید کہا ہے کہ آیات میں بعض قرائن ایسے ہیں جو شیعوں کے قول کے ساتھ سازگار نہیں ہیں۔ اور یہاں گفتگو کو طول دیا ہے اور ایسے مطالب بیان کیے ہیں جو قیل وقال (اور اشکال) سے خالی نہیں ہیں[1]۔

۲۔ انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت

راہِ خدا میں انفاق اور بخشش کرنا، اور محروم، خصوصاً آبرومند لوگوں کی مالی امداد کرنا، جو خلوصِ نیت سے ملی ہوئی ہو، ایسے امور میں سے ہے

[1] رُوح المعانی جلد ۳۰ ص ۱۵۲

جس کا قرآن مجید کی آیات میں بار بار ذکر ہوا ہے، اور اس کو ایمان کی نشانیوں میں سے کہا گیا ہے۔

اس بارے میں اسلامی روایات بھی تاکید سے بھری ہوئی ہیں، یہاں تک کہ وہ اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ اسلامی معاشرے اور تمدن میں مالی انفاق کرنا، بشرطیکہ اس کا محرک پروردگار کی رضا کے علاوہ اور کچھ نہ ہو، اور وہ ہر قسم کی ریاکاری، احسان جتانے اور آزار سے خالی ہو، تو بہترین اعمال میں سے ہے۔

ہم اس بحث کو چند معنی خیز احادیث کے ذکر کے ساتھ مکمل کرتے ہیں۔

۱۔ ایک روایت میں امام باقر علیہ السلام سے آیا ہے:

"ان احب الاعمال الی اللّٰہ ادخال السرور علی المؤمن، شبعة مسلم او قضاء دینہ"

"خدا کے نزدیک محبوب ترین عمل ضرورت مند مومن کے دل کو خوش کرنا ہے، اس طرح سے کہ اُسے سیر کیا جائے یا اس کا قرض ادا کیا جائے"۔[۱]

۲۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"من الایمان حسن الخلق، واطعام الطعام، و اراقة الدماء":

"حسن خلق، کھانا کھلانا، اور خون بہانا (راہِ خدا میں قربانی دینا) ایمان کے اجزا میں سے ہیں"۔[۲]

۳۔ ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ماارٰی شیئًا یعدل زیارة المؤمن الا اطعامہ، وحق علی اللّٰہ ان یطعم من اطعم مؤمنًا من طعام الجنة":

"میرے نزدیک کوئی چیز مومن کے دیدار اور زیارت کے برابر نہیں ہے سوائے اس کو کھانا کھلانے کے۔ اور جو شخص کسی مومن کو کھانا کھلائے خدا پر لازم ہے کہ وہ اُسے جنّت کے کھانوں میں سے کھانا کھلائے"۔[۳]

۴۔ ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سواری کی مہار پکڑ لی اور عرض کیا، اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ای الاعمال افضل؟ تمام اعمال میں کون سا عمل افضل ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اطعام الطعام، واطیاب الکلام":

"لوگوں کو کھانا کھلانا اور خوش کلام ہونا"۔[۴]

۱۔ "بحار الانوار" جلد ۷۴، حدیث ۳۵ ص ۳۶۵

۲۔ "وہی مدرک" حدیث ۳۸

۳۔ "اصول کافی" جلد ۲ باب اطعام المؤمن حدیث ۱۷

۴۔ "بحار الانوار" جلد ۷۴، ص ۳۸۸ حدیث ۱۱۳

۵۔ اور آخر میں ایک حدیث میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے :

"من عال اهل بيت من المسلمين يومهم و ليلتهم غفر الله ذنوبه".

"جو شخص مسلمانوں کے کسی گھرانے کی ایک رات دن پذیرائی کرے تو خدا اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے"۔ [1]

خداوندا ! ہم سب کو توفیق دے تاکہ ہم اس عظیم کارِ خیر میں قدم رکھیں ۔

پروردگارا ! تمام اعمال میں ہمارے خلوص نیت میں اضافہ فرما ۔

بارالٰہا ! ہم تجھ سے دعا کرتے ہیں کہ تو ہمیں اپنی نعمت و رحمت کا اس طرح سے مشمول قرار دے کہ تو بھی ہم سے خوش ہو اور ہم بھی خوش اور راضی ہوں۔

آمین یا ربّ العالمین

اختتام سورۂ اللیل

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۷۴ ص ۳۸۹ حدیث ۲

سورہ ضحیٰ

* یہ سورہ مکّہ میں نازل ہوا۔
* اس میں ۱۱ آیات ہیں۔

سورہ "الضحیٰ" کے مضامین اور اس کی فضیلت

یہ سورہ جو مکی سورتوں میں سے ہے، اور بعض روایات کے مطابق اس وقت نازل ہوا جب پیغمبر وحی کے وقتی طور پر منقطع ہو جانے اور تاخیر سے پریشان تھے، اور دشمنوں کی زبان کھلی ہوئی تھی، تو یہ سورہ نازل ہوا، اور بارانِ رحمت کی طرح پیغمبر کے قلب پاک پر اُترا، اور انہیں نئی تاب و توان بخشی اور بدزبانوں کی زبان کو بند کر دیا۔

اس سورہ کی دو قسموں کے ساتھ ابتدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد پیغمبر کو بشارت دیتا ہے کہ خدا نے آپ کو ہرگز نہیں چھوڑا۔

اس کے بعد آپ کو یہ خوش خبری دیتا ہے کہ خدا آپ کو اس قدر عطا کرے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔

اور آخری مرحلہ میں، پیغمبر کی گزشتہ زندگی کو آپ کی نظر میں مجسم کرتا ہے کہ خدا نے ہمیشہ آپ کو کس طرح سے اپنی انواع و اقسام کی نعمات کا مشمول قرار دیا ہے، اور زندگی کے سخت ترین لمحات میں اُس نے آپ کی حمایت کی ہے۔

اور اسی لیے آخری آیات میں آپ کو حکم دیتا ہے کہ (خدا کی ان عظیم نعمتوں کے شکرانہ کے طور پر) یتیموں اور حاجت مندوں پر مہربانی کریں اور خدا کی نعمت کو یاد کرتے رہیں۔

اس سورہ کی فضیلت میں یہی بات کافی ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے:

"من قرأها كان ممن يرضاه الله، ولمحمد (ص) ان يشفع له وله عشر حسنات بعدد كل يتيم وسائل!"

"جو شخص اس کی تلاوت کرے گا وہ ایسے لوگوں میں سے ہو گا جن سے خدا راضی ہو گا، اور وہ اس لائق ہو گا کہ محمدؐ اس کی شفاعت کریں، اور ہر یتیم اور سوال کرنے والے مسکین کے برابر دس دس حسنات اس کے لیے ہوں گے"[1]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۰۲

اور یہ سب فضائل اس کے لیے ہیں جو اُسے پڑھے اور اس پر عمل کرے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ متعدد روایات کے مطابق یہ سُورہ اور اس کے بعد والا سُورہ (سورۂ الم نشرح) ایک ہی سورہ ہیں اور چونکہ ہر رکعت میں الحمد کے بعد ایک مکمل سُورہ پڑھنا چاہیئے، لہٰذا ان دونوں سُورتوں کو اکٹھا ملا کر پڑھنا چاہیئے، (یہی بات سورۂ "فیل" اور "لایلاف" کے بارے میں بھی کہی گئی ہے)۔

اور اگر ہم صحیح طور پر ان دونوں سُورتوں کے مطالب میں غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ان دونوں کے مطالب ایک دوسرے سے اتنے ملتے جُلتے ہیں کہ یقینی طور پر ایک کا دُوسرے کے ساتھ تسلسل قائم ہے، اگرچہ ان دونوں کے درمیان "بسم اللہ" کا فاصلہ ہے۔

اس بارے میں کہ کیا یہ دونوں سُورتیں ہر لحاظ سے ایک ہی ہیں؟ یا انہیں خصوصیت کے ساتھ نماز میں ایک سُورہ کے حکم میں شمار کرنا چاہیئے؟ اس میں اختلاف ہے، جس کی تفصیل کا فقہ کی کتابوں میں (قراءتِ نماز کی بحث میں) مطالعہ کرنا چاہیئے، لیکن بہرحال علماء کا اجماع اس بات پر ہے کہ قراءتِ نماز میں ان میں سے ایک سُورہ پر قناعت نہیں کرنا چاہیئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ وَالضُّحٰى ۙ

۲۔ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ

۳۔ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۗ

۴۔ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۗ

۵۔ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۗ

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ قسم ہے دن کی جب کہ سورج نکل آئے (اور ہر جگہ کو گھیر لے)۔

۲۔ اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ ساکن ہو جائے۔

۳۔ کہ ہرگز نہ تو خدا نے تجھے چھوڑا ہے اور نہ ہی تجھ سے غصّہ ہوا ہے۔

۴۔ اور یقینی طور پر تیرے لیے آخرت دُنیا سے بہتر ہے۔

۵۔ اور عنقریب تیرا ربّ تجھے اس قدر دے گا کہ تو راضی ہو جائے گا۔

شانِ نزول

اِس سُورہ کے شانِ نزول کے بارے میں بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں، جن میں سب سے زیادہ واضح ذیل کی روایت ہے۔

"ابن عباسؓ کہتے ہیں: پندرہ دن گزر گئے اور پیغمبرؐ پر وحی نازل نہ ہوئی۔ مشرکین نے کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پروردگار نے اُسے چھوڑ دیا ہے اور اس کا دشمن ہو گیا ہے۔ اگر اُس کی یہ بات سچ ہے کہ اس کی ماموریت خدا کی جانب سے ہے تو پھر اس پر مسلسل وحی نازل ہوتی۔ اس موقع پر اُوپر والی سُورت نازل ہوئی (اور ان کی باتوں کا جواب دیا)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث کے مطابق جب یہ سُورہ نازل ہوا تو پیغمبرؐ نے جبرئیل سے فرمایا،

"تُو نے دیر لگا دی حالانکہ مَیں شدت سے تیرا مشتاق تھا" تو جبرئیل نے کہا:

وانا کنت اشد الیک شوقا: "مَیں تو خود آپؐ کا بہت زیادہ مشتاق تھا، لیکن مَیں بندۂ مامور ہوں اور پروردگار کے حکم کے بغیر نازل نہیں ہوتا"۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں آئی اور "ذی القرنین" و "اصحابِ کہف" اور "رُوح" کی خلقت کے بارے میں سوال کیا: پیغمبرؐ نے فرمایا:

"مَیں کل تمہیں بتاؤں گا"، اور انشاء اللہ نہ کہا، لہٰذا اسی وجہ سے وحیٔ الٰہی کئی دن تک منقطع رہی

اور دشمنوں کی زبانِ شماتت سے کھل گئی، اور اسی بناء پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غمگین ہو گئے۔ تو یہ سُورہ نازل ہوا تاکہ پیغمبرؐ کے دل کی تسلی کا باعث ہو (لیکن یہ شانِ نزول بعید نظر آتی ہے، کیونکہ یہودیوں کا پیغمبرؐ سے آکر ملنا اور اس قسم کے سوالات کرنا عام طور پر مدینہ میں تھا نہ کہ مکہ میں)۔

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت نے عرض کیا، اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ پر وحی کیوں نازل نہیں ہوتی؟ آپؐ نے فرمایا،

"کیف ینزل علیّ الوحی وانتم لا تنقون براجمکم ولا تقلمون اظفارکم"

"مجھ پر وحی کیسے نازل ہو جب کہ تم اپنی اُنگلیوں کے جوڑوں کو پاک و صاف نہیں رکھتے اور ناخن نہیں کترواتے!؟"[1]

اس بارے میں کہ انقطاعِ وحی کی مدت کس قدر تھی؛ مختلف روایات ہیں۔ بعض نے بارہ دن، بعض نے پندرہ دن، بعض نے پچیس دن اور بعض نے چالیس دن تک نقل کیے ہیں، اور ایک روایت میں صرف دو تین شب و روز بھی نقل ہوئے ہیں۔

تفسیر

تجھے اس قدر عطا کرے گا کہ تو خوش ہو جائے گا

اس سُورہ کے آغاز میں بھی دو قسمیں کھائی گئی ہیں:

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۰۴، (تھوڑی سی تلخیص اور اقتباس کے ساتھ)۔

۱۔ "نور" (روشنی) کی قسم
۲۔ "ظلمت" (تاریکی) کی قسم، فرماتا ہے:
"قسم ہے دن کی جب کہ سورج نکل آئے اور ہر جگہ کو گھیر لے" (والضحٰی)۔
"اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ ساکن ہو جائے اور ہر جگہ کو سکون و آرام میں غرق کر دے" (واللیل اذا سجٰی)۔
"ضحٰی" دن کے پہلے حصّہ کے معنی میں ہے جب کہ سورج آسمان پر اونچا ہو جائے، اور اس کی روشنی ہر جگہ مسلط ہو جائے اور یہ درحقیقت دن کا بہترین وقت ہوتا ہے۔

اور بعض کی تعبیر کے مطابق یہ فصل جوانی کے حکم میں ہے، جب کہ گرمیوں کی ہوا ابھی گرم نہیں ہوتی، اور سردیوں میں ہوا کی سردی ٹوٹی ہوئی ہوتی ہے اور انسان کی روح و جان اس موقع پر ہر قسم کی فعالیت کے لیے آمادہ ہوتی ہے۔

"سجٰی" "سجو" (بروزن سرو، اور بروزن غلو) کے مادہ سے اصل میں سکون و آرام کے معنی میں ہے، اور "چھپانے اور تاریک ہونے" کے معنی میں بھی آیا ہے، اسی لیے جب "میت" کو کفن میں لپیٹ دیتے ہیں تو اُسے "مسجی" کہا جاتا ہے۔ لیکن یہاں یہ وہی اصلی معنی دیتا ہے جو سکون و آرام ہے۔ اسی وجہ سے ان راتوں کو جن میں ہوا نہ چلے "لیلۃ ساجیۃ" (آرام و سکون کی رات) کہتے ہیں، اور طوفان اور امواجِ خروشاں سے خالی سمندر کو "بحر ساج" (پُرسکون سمندر) کہا جاتا ہے۔

بہرحال جو چیز رات کے سلسلہ میں اہم ہے وہی سکون و آرام ہے جو اس پر حکم فرما ہے، اور طبعاً انسان کے اعصاب اور روح کو سکون و آرام میں ڈبو دیتی ہے اور کل اور آئندہ آنے والے دنوں میں سعی اور کوشش کے لیے آمادہ و تیار کرتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ بہت ہی اہم نعمت ہے اور اس لائق ہے کہ اس کی قسم کھائی جائے۔

ان دونوں قسموں اور آیت کے مضمون کے درمیان شباہت اور ایک قریبی ربط موجود ہے۔ دن تو پیغمبرؐ کے پاک دل پر وحی کے نور کے نزول کی مانند ہے اور رات وقتی طور پر وحی کے انقطاع کے مانند ہے جو بعض مقاطع اور اوقات میں ضروری ہے۔

ان دونوں عظیم قسموں کے بعد نتیجہ اور جوابِ قسم کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "تیرے پروردگار نے ہرگز تجھے چھوڑا نہیں ہے اور نہ ہی تجھ سے غصّہ ہوا ہے" (ما ودعك ربك وما قلٰی)۔

"ودع" "تودیع" کے مادہ سے، چھوڑنے اور وداع کر دینے کے معنی میں ہے۔

"قلٰی" "قلا" (بروزن صدا) کے مادہ سے شدتِ بغض و عداوت کے معنی میں ہے، اور مادہ "قلو" (بروزن سرو) پھینکنے اور دھکا دینے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

راغب کا نظریہ یہ ہے کہ یہ دونوں ایک ہی معنی کی طرف لوٹتے ہیں، کیونکہ جو شخص کسی سے دشمنی کرتا ہے تو گویا دل اسے دھکا دے دیتا ہے، اور اُسے قبول نہیں کرتا۔[1]

بہرحال یہ تعبیر پیغمبرؐ کی ذات کے لیے ایک دلداری اور تسلّی کے طور پر ہے کہ وہ اچھی طرح یہ جان لیں کہ اگر کبھی نزولِ وحی میں تاخیر

---

[1] یہ مادہ "ناقص یائی" کی صورت میں بھی آیا ہے اور "ناقص واوی" کی صورت میں بھی، پہلی صورت میں بغض و عداوت کے معنی میں ہے اور دوسری صورت میں پھینکنے اور دھکا دینے کے معنی میں ہے اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے دونوں معنی ایک ہی جڑ اور ریشہ کی طرف لوٹتے ہیں۔

ہو جائے تو وہ کچھ مصالح کی بنا پر ہوتی ہے جسے خدا ہی جانتا ہے، اور ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ دشمنوں کے قول کے مطابق خدا اس سے خشمگیں اور غصہ ہو گیا ہے، یا اس کو چھوڑ دیا ہے۔ وہ ہمیشہ ہی خدا کے خاص لطف و کرم اور عنایات کے مشمول ہوتے ہیں اور ہمیشہ اس کی خاص حمایت کے زیرِ سایہ رہتے ہیں۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "بے شک عالمِ آخرت تیرے لیے اس دنیا سے بہتر ہے": (وللاٰخرة خيرلك من الاولىٰ)۔ اور تو اس دنیا میں بھی اس کے الطاف کا مشمول ہے، اور آخرت میں اس سے بیشتر و بہتر ہو گا۔ نہ تو تجھ پر یہاں کی مختصر مدت میں پروردگار کا غضب ہو گا اور نہ ہی آخرت کی دراز مدت میں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تُو دنیا میں بھی محترم ہے اور آخرت میں بھی محترم ہے، البتہ دُنیا میں عزیز و محترم ہے اور آخرت میں عزیز تر و محترم تر ہے۔

بعض مفسرین نے "آخرت" اور "اولیٰ" کو پیغمبرؐ کی عمر کے آغاز و انجام کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تو اپنی آخری عمر میں زیادہ موافق اور زیادہ کامیاب ہو گا۔ اور یہ اسلام کی وسعت اور پھیلاؤ اور مسلمانوں کی دشمنوں پر بار بار کی کامیابیوں اور جنگوں میں ان کی فتوحات اور اسلام کے پودے بارور ہونے اور شرک و بُت پرستی کے آثار کے مٹ جانے کی طرف اشارہ ہے۔

ان دونوں تفاسیر کے درمیان جمع میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

اور آخری زیرِ بحث آیت میں پیغمبرؐ کو افضل و برتر خوش خبری دیتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "عنقریب تیرا پروردگار تجھے اس قدر عطا کرے گا کہ تو خوش ہو جائے گا": (ولسوف يعطيك ربك فترضىٰ)۔

یہ خدا کا اپنے بندۂ خاص محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بالاترین احترام و اکرام ہے کہ فرماتا ہے: اس قدر تجھے بخشوں گا کہ تو راضی ہو جائے گا۔ دنیا میں تو دشمنوں پر کامیاب ہو جائے گا اور تیرا دین عالمگیر ہو جائے گا، اور آخرت میں بھی تو عظیم ترین نعمتوں کا مشمول ہو گا۔

اِس میں شک نہیں کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، خاتم انبیاء اور عالمِ بشریت کا رہبر ہونے کی حیثیت سے، صرف اپنی ہی نجات پر خوش نہیں ہو سکتے، بلکہ آپ اس وقت راضی اور خوش ہوں گے جب آپ کی شفاعت آپ کی اُمت کے بارے میں بھی قبول ہو جائے گی، اس بنا پر روایات میں آیا ہے کہ یہ آیت اُمید بخش ترین آیت ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کے قبول ہونے کی دلیل ہے۔

ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے کہ اُنہوں نے اپنے باپ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے، انہوں نے اپنے چچا "محمد بن حنفیہ" سے، انہوں نے اپنے باپ امیرالمومنین علیہ السلام سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

> "قیامت کے دن میں موقف شفاعت میں کھڑا ہو جاؤں گا اور گناہ گاروں کی اس قدر شفاعت کروں گا، کہ خدا فرمائے گا:
>
> ارضيت يا محمد؟! "اے محمد کیا تم راضی ہو گئے"؟!

تو مَیں کہوں گا، رضیت، رضیت: " مَیں راضی ہوگیا، مَیں راضی ہوگیا " !

اس کے بعد امیرالمومنین علیہ السلام نے اہلِ کوفہ کی ایک جماعت کی طرف رُخ کیا اور مزید فرمایا، تمہارا یہ نظریہ ہے کہ قرآنی آیات میں سب سے زیادہ اُمید بخش آیت " قل یا عبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لا تقنطوا من رحمة اللہ " ہے (یعنی اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنے اُوپر زیادتی کی ہے خدا کی رحمت سے نااُمید نہ ہو).

اس جماعت نے کہا: جی ہاں! ہم اسی طرح کہتے ہیں:

آپ نے فرمایا: " لیکن ہم اہلِ بیت یہ کہتے ہیں کہ آیاتِ قرآنی میں سب سے زیادہ اُمید بخش آیت " ولسوف یعطیك ربك فترضٰی " ہے [1]

یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ پیغمبرؐ کی شفاعت کے لیے کچھ شرائط ہیں، نہ تو آپ ہر شخص کے لیے شفاعت کریں گے اور نہ ہی ہر گنہگار اس کی توقع رکھ سکتا ہے۔ (اس بحث کی تفصیل جلد اول سورہ بقرہ کی آیت ۴۸ میں مطالعہ فرمائیے).

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے:

" رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فاطمہؑ کے گھر میں داخل ہوئے، جب کہ آپؐ کی بیٹی اُونٹ کی اُون کا سخت لباس پہنے ہوئے تھیں، ایک ہاتھ سے چکی پیس رہی تھیں، اور دوسرے ہاتھ سے اپنے فرزند کو دودھ پلا رہی تھیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور فرمایا، بیٹی! دنیا کی تلخی کو آخرت کی شیرینی کے مقابلہ میں برداشت کر، کیونکہ خدا نے مجھ پر یہ نازل کیا ہے کہ تیرا پروردگار اس قدر تجھے دے گا کہ تو راضی ہو جائے گا۔" (ولسوف یعطیك ربك فترضٰی)[2]

ایک نکتہ

انقطاعِ وحی کا فلسفہ

اُوپر والی آیات کے مجموعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ پیغمبرؐ کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ خدا کی جانب سے ہے، یہاں تک کہ نزولِ وحی میں بھی آپ اپنی طرف سے کوئی اختیار نہیں رکھتے، جس وقت خدا چاہے وحی کو منقطع کر دے، اور جس وقت چاہے برقرار کرے اور شاید انقطاعِ وحی بھی اسی مقصد کے لیے تھا، تاکہ ان لوگوں کا جواب ہو جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے من مانتے اور اپنے میلان کے مطابق معجزوں کا تقاضا کرتے تھے، یا آپ سے فرمائش کرتے تھے کہ فلاں حکم یا فلاں آیت کو بدل دیجئے، اور آپ ان سے یہ فرماتے کہ مَیں ان امور میں اپنی طرف سے کوئی اختیار نہیں رکھتا، (جیسا کہ سُورہ یونس کی آیہ ۱۵ میں آیا ہے).

---

[1] " ابوالفتوح رازی " جلد ۱۲، صفحہ ۱۱۰

[2] " مجمع البیان " جلد ۱۰، ص ۵۰۵

۶۔ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ○

۷۔ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ○

۸۔ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ○

۹۔ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ○

۱۰۔ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ○

۱۱۔ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ○

ترجمہ

۶۔ کیا تجھے یتیم نہیں پایا تو پھر پناہ دی ؟

۷۔ اور تجھے گمشدہ پایا تو رہنمائی کی ۔

۸۔ اور تجھے فقیر پایا تو بے نیاز کیا ۔

۹۔ اَب جب کہ یہ بات ہے تو یتیم کو حقیر نہ سمجھ ۔

۱۰۔ اور سوال کرنے والے کو نہ دھتکار ۔

۱۱۔ اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کو یاد کر ۔

تفسیر

اِن تمام نعمتوں کے شکرانے میں جو خدا نے تجھے دی ہیں ....

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس سُورہ میں ہدف اور مقصد پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تسلّی و دلداری اور آنحضرتؐ کے لیے الطافِ الٰہی کا بیان ہے۔ لہٰذا گزشتہ آیات کو جاری رکھتے ہوئے، جن میں اس مطلب کو بیان کیا گیا تھا، زیرِ بحث آیات میں پہلے تو پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر خدا کی تین خاص نعمتوں کا ذکر کرتا ہے، اور اس کے بعد انہی سے مربوط تین اہم حکم انہیں دیتا ہے۔

فرماتا ہے: کیا خُدا نے تجھے یتیم نہیں پایا تو تجھے اس نے پناہ دی؟ (الم یجدک یتیمًا فاٰوٰی)۔

تو ابھی شکمِ مادر میں ہی تھا کہ تیرا باپ عبداللہ اس دنیا سے چل بسا، تو مَیں نے تجھے تیرے جد عبدالمطلبؑ (سردارِ مکّہ) کی آغوش میں پرورش کرائی۔

تو چھ سال کا تھا کہ تیری ماں دُنیا سے چل بسی اور اس لحاظ سے بھی تو اکیلا رہ گیا، لیکن ہم نے تیرے عشق و محبت کو عبدالمطلبؑ کے دل میں زیادہ کر دیا۔

تو آٹھ سال کا ہوا تو تیرا دادا "عبدالمطلب بھی دُنیا سے رُخصت ہو گیا"، تو ہم نے تیرے چچا "ابوطالبؑ" کو تیری خدمت و حمایت کے لیے مقرر کر دیا، تاکہ تجھے جانِ شیریں کی طرح رکھے اور تیری حفاظت کرے۔

ہاں! تو یتیم تھا اور مَیں نے تجھے پناہ دی۔

بعض مفسرین نے اس آیت کے کچھ اور دوسرے معنی بیان کیے ہیں جو اس کے ظاہر کے ساتھ سازگار نہیں ہیں، منجملہ ان کے یہ ہے کہ یتیم سے مُراد وہ شخص ہے جو شرافت و فضیلت میں اپنا مثل و نظیر نہ رکھتا ہو، جیسا کہ بے نظیر موتی کو "دُرِّ یتیم" کہتے ہیں، لہٰذا اس جملہ کا معنی یہ ہوگا کہ خدا نے تجھے شرافت و فضیلت میں بے نظیر پایا اس لیے تجھے انتخاب کیا اور مقامِ نبوّت بخشا۔

دُوسرا یہ ہے کہ تو خُود ایک دن یتیم تھا لیکن آخرکار تو یتیموں کی پناہ گاہ اور انسانوں کا رہبر ہو گیا۔

اِس میں شک نہیں کہ پہلا معنی ہر لحاظ سے زیادہ مناسب ہے اور ظاہرِ آیت کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔

اِس کے بعد دُوسری نعمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور تجھے گُم شدہ پایا تو تیری رہنمائی کی"۔ (ووجدک ضالًّا فھدٰی)

ہاں! تُو ہرگز نبوّت و رسالت سے آگاہ نہیں تھا، اور ہم نے یہ نُور تیرے دل میں ڈالا، تاکہ تو اس کے ذریعہ انسانوں کو ہدایت کرے، جیسا کہ ایک دُوسری جگہ فرماتا ہے: ماکنت تدری ماالکتاب ولاالایمان ولٰکن جعلناہ نورًا نھدی بہ من نشاء من عبادنا: "نہ تو تو کتاب ہی کو جانتا تھا اور نہ ہی ایمان کو" (یعنی نزولِ وحی سے پہلے تو اسلام و قرآن کے مطالب سے آگاہ نہیں تھا) لیکن ہم نے اس کو ایک ایسا نور قرار دیا ہے کہ جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں ہدایت کرتے ہیں" (شوریٰ - ۵۲)

یہ بات واضح ہے کہ پیغمبرؐ کے پاس مقامِ نبوّت و رسالت تک پہنچنے سے پہلے یہ الٰہی فیض نہیں تھا: خدا نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر ہدایت فرمائی اور اس مقام تک پہنچا دیا، جیسا کہ سُورہ یوسف کی آیہ ۳ میں آیا ہے: نحن نقص علیک احسن القصص بما اوحینا

الیك هٰذا القرآن وان كنت من قبله لمن الغافلین : " ہم نے قرآن کی وحی کے ذریعے ایک بہترین داستان تیرے لیے بیان کی ہے ، اگرچہ تو اس سے پہلے اس سے آگاہ نہیں تھا ۔

یقیناً اگر ہدایتِ الٰہی اور غیبی امدادیں پیغمبرؐ کے ہاتھ کو نہ پکڑتیں تو وہ ہرگز منزلِ مقصود کا راستہ نہ پاتے ۔

اس بنا پر یہاں " ضلالت " سے مُراد ایمان ، توحید ، پاکیزگی اور تقویٰ کی نفی نہیں ہے ، بلکہ ان آیات کے قرینہ سے جن کی طرف اُوپر اشارہ ہوا ہے ، اسرارِ نبوت اور قوانینِ اسلام سے آگاہی کی نفی ، اور ان حقائق سے عدم آشنائی تھی ، جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے لیکن بعثت کے بعد پروردگار کی مدد سے ان تمام امور سے واقف ہو گئے اور ہدایت پائی ، (غور کیجیے) ۔

سورہ بقرہ کی آیہ ۲۸۲ میں قرضوں کی سند لکھنے کے مسئلہ میں متعدد گواہوں کے فلسفہ کو ذکر کرتے وقت فرماتا ہے ، ان تضل احداهما فتذكر احداهما الاخرى : " یہ اس بنا پر ہے کہ اگر ان دونوں میں سے ایک گمراہ ہو جائے اور بھول جائے تو دُوسری اسے یاد دلا دے " ۔

اس آیت میں " ضلالت " صرف بھول جانے کے معنی میں آیا ہے " فتذکر " کے جملہ کے قرینہ سے ۔

یہاں اس آیت کے لیے اور کئی دوسری تفاسیر بھی بیان ہوئی ہیں ، منجملہ ان کے یہ ہے کہ اس سے مُراد یہ ہے کہ تو بے نام نشان تھا ، خدا نے تجھے اس قدر بے نظیر نعمتیں عطا کیں کہ تو ہر جگہ پہچانا جانے لگا ۔

یا اس سے مُراد یہ ہے کہ تو اپنے بچپنے میں کئی مرتبہ گم ہوا ۔ (ایک دفعہ مکّہ کے درّوں میں جب کہ تو عبدالمطلب کی پناہ میں تھا ، اور دوسری مرتبہ اس وقت جب تیری رضاعی ماں " حلیمہ سعدیہ " دُودھ پلانے کی مدّت کے اختتام پر تجھے مکّہ کی طرف لا رہی تھی تاکہ تجھے عبدالمطلب کے سپرد کرے تو تو راستہ میں گم ہو گیا ، اور تیسری مرتبہ اس وقت جب تو اپنے چچا ابوطالبؑ کے ساتھ اس قافلہ میں جو شام کی طرف جا رہا تھا ، ایک تاریک اور اندھیری رات میں گم ہو گیا تھا) اور خدا نے ان تمام موارد میں تیری رہنمائی کی ، اور تجھے تیرے جد یا چچا کی محبت بھری آغوش تک پہنچا دیا ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ " ضال " لغت کے لحاظ سے دو معانی کے لیے آیا ہے ، ۱۔ " گم شدہ " اور ۲۔ " گمراہ " مثلاً کہا جاتا ہے کہ : الحكمة ضالة المؤمن : " حکمت و دانش مومن کی گم شدہ چیز ہے " ۔

اور اسی مناسبت سے مخفی اور غائب کے معنی میں بھی آیا ہے جیسا کہ سُورہ سجدہ کی آیہ ۱۰ میں آیا ہے : منکرینِ معاد کہا کرتے تھے ءاذا ضللنا فی الارض ءانا لفی خلق جدید : " کہ جب ہم زمین میں پنہاں اور غائب ہو جائیں گے تو پھر ایک نئی خلقت اختیار کریں گے " ؟ ۔

اگر زیرِ بحث آیت میں " ضال " " گم شدہ " کے معنی میں ہو تو پھر کوئی مشکل پیش نہیں آتی ، (یعنی تو گم شدہ تھا لوگ تیری عظمت و شرافت سے ناواقف تھے ، پس ہم نے انہیں تیری طرف ہدایت کی ، - مترجم)

اور اگر یہ " گمراہ " کے معنی میں ہو تو اس سے مراد بعثت سے پہلے راہِ نبوت و رسالت تک دسترس نہ رکھنا ہوگی ، یا دوسرے لفظوں میں پیغمبر اپنی ذات میں کوئی چیز نہیں رکھتے تھے ، جو کچھ تھا وہ خدا کی طرف سے تھا ، اس بنا پر دونوں ہی صورتوں میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی ۔

اس کے بعد تیسری نعمت کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے : خدا نے تجھے فقیر پایا تو غنی و بے نیاز کر دیا : (ووجدك عائلًا فاغنیٰ)[1]

جناب " خدیجہؓ " جیسی مخلص و باوفا خاتون کی توجہ تیری طرف مبذول کی، تاکہ وہ اپنی عظیم ثروت و دولت کو تیرے اختیار میں دے دے اور تیرے عظیم اہداف و مقاصد کے لیے وقف کر دے۔ اور اسلام کے غلبہ کے بعد جنگوں میں بکثرت مال ہائے غنیمت تجھے عطا کیے، اس طرح سے کہ تو اپنے عظیم مقاصد تک پہنچنے کے لیے بے نیاز ہو گیا۔

ایک روایت میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے ان آیات کی تفسیر میں اس طرح فرمایا ،

"الم یجدك یتیماً فاٰوی قال: فرداً لا مثل لك فی المخلوقین، فاٰوی الناس الیك ،
ووجدك ضالاً ای ضالة فی قوم لا یعرفون فضلك فهداهم الیك ،
ووجدك عائلاً تعول اقواماً بالعلم فاغناهم بك ":

" کیا ہم نے تجھے اپنی مخلوق کے اندر یتیم یعنی بے نظیر فرد نہیں پایا تو ہم نے لوگوں کو تیری پناہ میں دے دیا، اور تجھے اپنی قوم کے درمیان گمشدہ اور نا پہچانا ہوا پایا ، جو تیرے مقام فضل کو نہیں پہچانتے تھے، تو خدا نے انہیں تیری طرف ہدایت کی اور تجھے علم و دانش میں اقوام عالم کا سرپرست قرار دیا اور انہیں تیرے ذریعے بے نیاز کر دیا ۔"[2]

البتہ یہ حدیث آیت کے بطون کو بیان کرتی ہے ورنہ آیت کا ظاہر وہی ہے، جو اوپر بیان کیا گیا۔

لیکن یہ تصور نہیں ہونا چاہیئے کہ یہ امور جو آیت کے ظاہر میں بیان ہوئے ہیں پیغمبرؐ کے مقام بلند میں کمی اور نقص کا سبب ہیں، یا آپ کے بارے میں پروردگار کی طرف سے منفی توصیف ہے۔ بلکہ یہ تو حقیقت میں الطاف الٰہی اور اس عظیم پیغمبرؐ کے بارے میں اس کے اکرام و احترام کا بیان ہے، جب محبوب دلباختہ عاشق کے بارے میں اپنے لطف و کرم کی بات کرتا ہے تو یہ خود ایک لطف و محبت ہے اور اس کے لطف خاص کی دلیل ہے اور اسی بنا پر محبوب کی طرف سے ان الفاظ کے سننے سے اس کی روح تازہ ہو جاتی ہے، اور اس کی جان میں صفا پیدا ہوتی ہے، اور اس کے دل کو آرام و سکون حاصل ہوتا ہے۔

بعد والی آیات میں گزشتہ آیات سے نتیجہ نکالتے ہوئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تین احکام دیتا ہے، اگرچہ ان میں مخاطب رسول اللہؐ کی ذات گرامی ہے، لیکن یقیناً وہ سب کو شامل ہیں، پہلے فرماتا ہے، " جب معاملہ یہ ہے تو پھر یتیم کی تحقیر و تذلیل نہ کر "۔ (فاما الیتیم فلا تقهر)۔

" تقهر " " قهر " کے مادہ سے " مفردات " میں " راغب " کے قول کے مطابق ، اس غلبہ کے معنی میں ہے جس کے ساتھ

---

[1] " عائل " اصل میں عیال دار شخص کے معنی میں ہے، چاہے وہ غنی و تونگر ہو، لیکن یہ لفظ فقیر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور زیر بحث آیت میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔ راغب " کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر " عال " اجوف یائی ہو تو فقیر کے معنی میں ہے اور اجوف واوی ہو تو کثیر العیال کے معنی میں ہوتا ہے۔ (لیکن ان دونوں کا لازم و ملزوم ہونا بعید نہیں ہے)۔

[2] مجمع البیان ، جلد ۱۰ ص ۵۰۶

تحقیر ہو، لیکن ان دو معانی میں سے ہر ایک کے لیے علیحدہ بھی استعمال ہوتا ہے، اور یہاں مناسب وہی "تحقیر" ہی ہے۔

یہ چیز اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ یتیموں کے بارے میں اگرچہ اطعام و انفاق کا مسئلہ بھی اہم ہے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم دل جوئی و نوازش اور شفقت کی کمی کو رفع کرنا ہے۔ اسی لیے ایک مشہور حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"من مسح علی رأس یتیم کان له بکل شعرة تمر علی یده نور یوم القیامة":

"جو شخص نوازش و مہربانی کے ساتھ یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرے تو ہر بال کی تعداد کے مطابق جس پر اس کا ہاتھ پھرے گا قیامت میں ایک نور ہوگا"۔[1]

گویا خدا پیغمبرؐ سے فرماتا ہے، تو خود بھی یتیم تھا، اور تو نے بھی یتیمی کا رنج اور تکلیف اٹھائی ہے، تو اب تو دل وجان سے یتیموں کی نگہبانی کر، اور ان کی پیاسی روح کو محبت کے ساتھ سیراب کر۔

بعد والی آیت میں دوسرے حکم کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اور سوال کرنے والے کو نہ دھتکار" (واما السائل فلا تنھر)۔

"لا تنھر" "نھر" کے مادہ سے "سختی کے ساتھ دھتکارنے" کے معنی میں ہے۔ اور بعید نہیں ہے کہ اس کی اصل "نھر" ہو اور جاری پانی کی نہر کے معنی کے ساتھ ایک ہو، کیونکہ وہ بھی پانی کو شدت کے ساتھ دھکیلتی ہے۔

اس بارے میں کہ یہاں "سائل" سے کون مراد ہے؟ چند تفسیریں موجود ہیں، پہلی یہ کہ اس سے ایسے افراد مراد ہیں جو علمی، اعتقادی اور دینی مسائل میں سوالات رکھتے ہیں، اور قرینہ اس کا یہ ہے کہ یہ حکم اس چیز پر جو گزشتہ آیات میں آیا ہے متفرع ہے، "ووجدک ضالا فھدی" "خدا نے تجھے گم شدہ پایا تو تجھے ہدایت کی، پس اس ہدایتِ الٰہی کے شکرانے کے طور پر تو بھی ہدایت کے نیازمندوں کے لیے کوشاں رہ، اور کسی ہدایت کا تقاضا کرنے والے کو اپنے پاس سے نہ دھتکار۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جو مادی لحاظ سے فقیر ہیں اور وہ تیرے پاس آتے ہیں، تو جتنی تجھ میں طاقت ہے اس کے مطابق عمل کر اور انہیں مایوس نہ کر اور اپنے پاس سے نہ دھتکار۔

تیسری تفسیر یہ ہے کہ یہ فقرِ علمی اور فقرِ مادی دونوں کو بیان کر رہی ہے، اور اس کا حکم یہ ہے کہ ہر قسم کا سوال کرنے والے کو مثبت جواب دے، یہ معنی پیغمبرؐ کے لیے خدا کی ہدایت کے ساتھ بھی مناسبت رکھتا ہے، اور ان کی یتیمی کے زمانے میں ان کی سرپرستی سے بھی مناسبت رکھتا ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ سائل سے مراد یہاں صرف علمی مسائل کے بارے میں سوال کرنے والا ہے، یہ کہا ہے کہ "سائل کی تعبیر قرآن مجید میں ہرگز مالی تقاضا کرنے والوں کے لیے نہیں آئی۔[2]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۰۶

[2] "تفسیر عبدہ، جزء عم ص ۱۱۳"

حالانکہ یہ قرآن میں بارہا اس معنی میں استعمال ہوا ہے، چنانچہ سورہ ذاریات کی آیہ ۱۹ میں آیا ہے: وفی اموالھم حق للسائل والمحروم: "ان کے مالوں میں سائل اور محروم کے لیے حق ہے اور یہی معنی سورہ معارج کی آیہ ۲۵ اور سورہ بقرہ کی آیہ ۱۷۷ میں بھی آیا ہے۔

اور آخر میں تیسرے اور آخری حکم میں فرماتا ہے: اور باقی رہیں تیرے پروردگار کی نعمتیں تو تُو ان کو بیان کر" (واما بنعمة ربك فحدث)۔

نعمت کو بیان کرنا کبھی تو زبان سے ہوتا ہے اور ایسی تعبیروں سے جو انتہائی شکر و سپاس کی ترجمان ہوتی ہیں، نہ کہ غرور و تکبر اور برتری کے خیال سے، اور کبھی عمل سے بھی ہوتا ہے، اس طرح کہ اس سے راہِ خدا میں انفاق و بخشش کرے، ایسی بخشش جو اس بات کی نشان دہی ہو کہ خدا نے اُسے فراواں نعمت عطا کی ہے۔

یہ سخی اور کریم لوگوں کی سُنّت ہے کہ جب انہیں کوئی نعمت ملتی ہے تو وہ اُسے بیان کرتے ہیں اور خدا کا شکر بجا لاتے ہیں۔ اور ان کا عمل بھی اس حقیقت کی تائید و تاکید کرتا ہے۔ پست ہمت بخیلوں کے برعکس جو ہمیشہ نالہ و فریاد کرتے ہیں، اور اگر ساری دنیا بھی انہیں دے دیں، تو بھی نعمتوں پر پردہ پوشی ہی کرتے رہتے ہیں۔ ان کا چہرہ فقیرانہ اور ان کی باتیں آہ و زاری کے ساتھ، اور ان کا عمل بھی فقر و فاقہ کو بیان کرنے والا ہوتا ہے۔

یہ اس حالت میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

" ان اللہ تعالیٰ اذا انعم علی عبد نعمة یحب ان یری اثر النعمة علیه":

" خداوندِ عالم جب کسی بندے کو کوئی نعمت عطا کرتا ہے، تو وہ اس بات کو دوست رکھتا ہے کہ اس پر نعمت کے آثار دیکھے"[1]

اس بناء پر آیت کے معنی کا ماحصل اس طرح ہے: اس بات کے شکرانے میں کہ تو فقیر تھا اور خدا نے تجھے بے نیاز کیا ہے، تُو بھی نعمت کے آثار کو آشکار کر، اور گفتار و عمل سے اس خدائی نعمت کو بیان کر۔

لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں "نعمت" سے مُراد صرف معنوی نعمتیں ہیں، منجملہ ان کے نبوت یا قرآن مجید ہے کہ پیغمبرؐ اس کی تبلیغ کے ذمہ دار تھے، اور نعمت کو بیان کرنے سے مُراد یہی ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تمام مادی و معنوی نعمتوں کو شامل ہو۔

لہٰذا ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا: کہ آیت کا معنی اس طرح ہے:

حدث بما اعطاك الله، وفضلك، ورزقك، واحسن اليك وهداك:

"جو کچھ خدا نے تجھے بخشا ہے، برتری دی ہے، روزی عطا کی ہے، اور تیرے ساتھ نیکی اور احسان کیا ہے اور تجھے ہدایت کی ہے، ان سب کو بیان کر"[2]

---

[1] "نہج الفصاحۃ" حدیث ۶۸۳

[2] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۰۷

اور بالآخر ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک دستور کلی کے عنوان سے آیا ہے:

"من اعطی خیرًا فلم یر علیہ، سمی بغیض اللہ معادیًا لنعم اللہ"

"جس شخص کو کوئی خیر و نعمت دی جائے، لیکن اس کی شخصیت میں اس کے آثار نظر نہ آئیں تو اُسے خدا کا دشمن اور اس کی نعمتوں کا مخالف شمار کرنا چاہیئے"[1]

ہم اس گفتگو کو امیر المومنینؑ کی ایک دوسری حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں، آپؑ نے فرمایا:

"ان اللہ جمیل یحب الجمال، و یحب ان یری اثر النعمۃ علی عبدہ"

"خدا جمیل ہے اور وہ جمال و زیبائی کو دوست رکھتا ہے، اور اسی طرح سے وہ اس بات کو دوست رکھتا ہے کہ اپنے بندے پر اپنی نعمت کے آثار دیکھے"[2]

چند نکات

۱۔ مصائب و آلام کے درمیان سے مبعوث ہونے والا پیغمبر

اُوپر والی آیات جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر خدا کی نعمتوں کی تشریح و تفصیل کو بیان کرتی ہیں، ضمنی طور پر اس نکتہ کو بھی بیان کرتی ہیں کہ آپ بچپن کے آغاز سے ہی یتیم تھے، مادی لحاظ سے سخت و شدید حالات میں زندگی بسر کر رہے تھے، مصائب و آلام میں گھرے ہوئے تھے اور اُنہیں مصائب میں مبعوث ہوئے تھے اور ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

ایک خدائی اور انسانی رہبر کو زندگی کی تلخیوں کو چکھنا، پریشانیوں کو ذاتی طور پر لمس کرنا، اور اپنے سارے وجود کے ساتھ تلخیوں کا احساس کرنا چاہیئے تاکہ معاشرے کے محروم طبقات کی صحیح طور سے قدر کر سکے، اور ایسے لوگوں کے حالات سے جو مصائب و آلام میں مبتلا ہیں باخبر ہو سکے۔

پھر بچپن میں ہی باپ (کی شفقت) سے محروم ہو جائے، تاکہ اپنے یتیم بچوں کی مصیبت سے باخبر رہے، دن اس کے بھوک میں گزریں، اور راتوں کو بھوکا سوئے تاکہ بھوکوں کے درد اور تکلیف کو اپنے سارے وجود کے ساتھ محسوس کرے۔

یہی وجہ ہے کہ جب آپ کسی یتیم کو دیکھتے تھے تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ اُسے اپنی گود میں بٹھاتے تھے، اس پر نوازش و شفقت کرتے تھے، اور اپنی جان شیریں کی طرح اپنی آغوش میں لے لیتے تھے۔

اور پھر اس نے معاشرے کے تمدن میں فقر کو اچھی طرح سے درک کیا ہو، تاکہ جو لوگ علم و دانش کے حصول کے لیے اس کی خدمت میں آئیں ان کا احترام کرے، اور کھلی آغوش کے ساتھ اُن کی پذیرائی کرے۔

نہ صرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلکہ شاید تمام کے تمام انبیاء مصائب اور محرومیوں کے پروردہ تھے، اور نہ صرف انبیاء بلکہ تمام سچے اور موفق رہبر ایسے ہی ہوئے ہیں اور انہیں ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

---

[1] "تفسیر قرطبی" جلد ۱۰ ص ۷۱۹۲، اسی معنی کے قریب قریب کافی جلد ۶ ـ کتاب الزی والتجمل حدیث ۲ میں بھی آیا ہے۔

[2] فروع کافی جلد ۶ ص ۴۳۸ حدیث

جس شخص نے ناز و نعمت کے درمیان پرورش پائی ہو ، شان و شوکت والے محلوں میں زندگی بسر کی ہو ، اس نے جب بھی کوئی خواہش کی ہو وہ پوری ہوگئی ہو ، وہ محروم لوگوں کے درد و تکلیف کو کس طرح سے درک کر سکتا ہے ، اور فقرا و مساکین کے کاشانوں اور یتیموں کے گھروں کا منظر اس کی نظروں میں کیسے مجسم ہو سکتا ہے اور وہ ان کی کمک اور مدد کے لیے بے تابی کے ساتھ کیسے آگے بڑھ سکتا ہے ؟!

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے آیا ہے :

" ما بعث اللّٰہ نبیا قط حتی یسترعیہ الغنم یعلمہ بذالک رعیۃ الناس "

" خدا نے ہرگز کسی پیغمبر کو مبعوث نہیں کیا جب تک اس سے بھیڑ بکریوں کی چوپانی کا کام نہیں کرایا ، تاکہ وہ اس طریقہ سے انسانوں کی نگہبانی کا طریقہ سیکھ سکیں ۔ [1]

یعنی ایک تو رنج و تکلیف برداشت کیا ، دوسرے کم شعور افراد کے مقابلہ میں صبر و تحمل کا تجربہ کیا اور کوہ و صحرا اور فطرت و مادّہ کی آغوش میں توحید و عرفان کے عظیم سبق حاصل کیے ۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ " موسیٰ بن عمران " نے اپنے خدا سے سوال کیا کہ میں کس بنا پر اس مقام تک پہنچا ؟ خطاب قدرت ہوا ، کیا تجھے وہ دن یاد ہے جب گوسفند کا ایک بچہ تیرے گلہ سے بھاگ گیا تھا ، تو اس کے پیچھے گیا اور اس کو پکڑ لیا ، اور اس سے کہا ، اے حیوان ! تو نے اپنے آپ کو کیوں تھکا لیا ؟ پھر تو اس کو دوش پر اٹھا کر گوسفندوں کے گلہ میں واپس لے آیا ، میں نے اسی بنا پر تجھے مخلوق کا سرپرست بنا دیا ہے ۔ (ایک جانور کے مقابلہ میں تیرا یہ عجیب و غریب تحمل و حوصلہ ، تیری عظیم روحی قدرت کی دلیل ہے ۔ لہٰذا تو اس عظیم مقام کے لائق ہے) ۔

۲۔ یتیموں پر نوازش و شفقت

چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں کا وجود ، جو بچپنے میں اپنے باپ (کی شفقت) سے محروم ہو چکے ہوں ، ہر معاشرے میں اجتناب ناپذیر ہے ۔ ان چھوٹے چھوٹے بچوں کی کئی جہات سے حمایت ہونی چاہیئے ۔

شفقت و مہربانی کے لحاظ سے بہت سی محرومیاں ہوتی ہیں ۔ اگر ان کے وجود کا خلا اس لحاظ سے پر نہ ہو تو غیر صحیح غیر سالم اور بہت سے مواقع پر سنگ دل ، مجرم اور خطرناک بچے پروان چڑھتے ہیں ۔ علاوہ ازیں عواطف انسانی کا تقاضا یہ ہے کہ تمام لوگ ان کی طرف معاشرے کے تمام بچوں کی طرح توجہ اور حمایت کریں ۔ اور ان تمام باتوں سے قطع نظر لوگ اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں ، جو ممکن ہے انہیں حالات سے دوچار ہو جائیں ، مطمئن ہوں ۔

بہت سے موارد میں یتیم بچے ایسے مال کے مالک ہوتے ہیں جسے دقت و امانت کے ساتھ ان کے مستقبل کے لیے محفوظ رکھنا چاہیئے ۔ اور بہت سے موارد میں ان کے ہاں مالی امکانات و وسائل کا فقدان ہوتا ہے ۔ لہٰذا انہیں اس لحاظ سے بھی مورد توجہ ہونا چاہیئے اور دوسرے لوگوں کو ، مہربان ماں باپ کی طرح ، ان کی روح سے یتیمی کے رنج اور تکلیف کو دور کرنا چاہیئے اور تنہائی کے گرد و غبار کو ان کے

---

[1] " بحار الانوار " جلد ۱۱ ص ۶۴ حدیث ۷

چہرے سے ہٹا دینا چاہیئے۔

اسی لیے قرآن مجید کی آیات، اور بہت سی اسلامی روایات میں اس مسئلہ پر تکیہ ہوا ہے جس میں اخلاقی پہلو بھی ہے اور معاشرتی اور انسانی پہلو بھی۔

یہ حدیث پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معروف ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"ان الیتیم اذا بکی اھتز لبکائہ عرش الرحمٰن"!:

"جب یتیم روتا ہے تو خدائے رحمان کا عرش لرز اٹھتا ہے"۔

"خدا اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے: اے میرے فرشتو! اس یتیم کو جس کا باپ مٹی میں روپوش ہو گیا ہے، کس نے رلا دیا؟ فرشتے کہتے ہیں: خدایا تو زیادہ بہتر طور سے جانتا ہے۔ خدا فرماتا ہے: اے میرے فرشتو! میں تمہیں گواہ بناکر کہتا ہوں کہ جو شخص اس کو رونے سے خاموش کرے گا، اور اس کے دل کو خوش کرے گا میں قیامت کے دن اسے خوش کروں گا"۔[1]

اس سے بالاتر ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"اذا بکی الیتیم وقعت دموعہ فی کف الرحمٰن"۔

"جب یتیم روتا ہے تو اس کے آنسو خدائے رحمٰن کے ہاتھ میں پڑتے ہیں"۔[2]

ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بھی آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"انا وکافل الیتیم کھاتین فی الجنۃ اذا اتقی اللہ عزوجل واشار بالسبابۃ والوسطی":

"میں اور یتیم کا سرپرست ان دو کی طرح جنت میں ہوں گے، بشرطیکہ وہ خوف خدا اور تقویٰ رکھتا ہو۔ پھر آپؐ نے انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ کیا"۔[3]

اس موضوع کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ امیر المومنین علی علیہ السلام نے اپنے مشہور وصیت نامہ میں یتیموں کی طرف توجہ اور دھیان دینے کو نماز و قرآن کی طرف توجہ کرنے کے ساتھ قرار دیا ہے، فرماتے ہیں:

"اللہ اللہ فی الایتام فلا تغبوا افواھھم ولا یضیعوا بحضرتکم"۔

"خدا کو یاد رکھو، خدا کو یاد رکھو! یتیموں کو کبھی سیر اور کبھی بھوکا نہ رکھو، اور تمہارے سامنے وہ ضائع نہ ہوں"۔[4]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۰۶۔

[2] "تفسیر فخر رازی" جلد ۳۱ ص ۲۱۹۔

[3] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۵۹۰، حدیث ۲۳۔

[4] "نہج البلاغہ" خط نمبر ۴۷ حصہ خطوط۔

ایک حدیث میں پیغمبرؐ کے ایک صحابی سے آیا ہے، وہ کہتا ہے کہ ہم رسولِ خدا کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک بچہ آپؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: "میں ایک یتیم بچہ ہوں، میری ایک یتیم بہن ہے، اور ایک بیوہ ماں ہے، جو کچھ خدا نے آپ کو کھانے کے لیے دیا ہے اس میں سے ہمیں بھی کھلائیے تاکہ خدا کے پاس جو کچھ ہے اس میں سے وہ آپؐ کو اس قدر دے کہ آپؐ راضی اور خوش ہو جائیں"!

پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

"بیٹا تم نے کتنی اچھی بات کہی ہے! پھر آپؐ نے حضرت بلالؓ کی طرف رُخ کرکے فرمایا: جاؤ اور جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ لے آؤ۔ بلال اکیس خرمے کے دانے لے آئے پیغمبرؐ نے فرمایا: سات دانے تیرے لیے، سات دانے تیری بہن کے لیے اور سات دانے تیری ماں کے لیے۔"

"معاذ بن جبلؓ" اُٹھے اور یتیم کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا: خدا تیری یتیمی کی تلافی کرے اور تجھے اپنے باپ کا اچھا جانشین بنائے۔ (یتیم بچہ مہاجرین کی اولاد میں سے تھا)۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے "معاذ" کی طرف رُخ کرکے فرمایا:

"تیرے اس کام کا کیا سبب تھا؟" اس نے عرض کیا: محبت اور رحمت تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص تم میں سے کسی یتیم کی سرپرستی اپنے ذمہ لے، اور اس کا حق ادا کرے، اور یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرے تو خدا ہر بال کی تعداد میں اس کے لیے ایک نیکی تحریر کرے گا اور ہر بال کی تعداد میں اس کی برائیوں کو محو کر دے گا، اور ہر بال کے بدلے اس کو ایک درجہ عطا کرے گا۔"[1]

البتہ ایسے وسیع معاشروں میں جیسا کہ آج کے معاشرے ہیں، مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اس سلسلے میں انفرادی کاموں پر قناعت نہ کریں، بلکہ انہیں چاہیئے کہ اپنی توانائیوں کو یکجا طور پر استعمال کرتے ہوئے یتیموں کو اقتصادی، علمی اور تربیتی پروگراموں کے ذریعے کا آمد بنائیں اور انہیں اسلامی معاشرے کے لائق افراد بنائیں۔ اور یہ اہم کام عمومی تعاون کا محتاج ہے۔

۴۔ نعمتوں کو بیان کرنا

وہ حکم جو اس سلسلہ میں اوپر والی آیات میں بیان ہوا ہے، اگر وہ خدا کے شکر و سپاس کے عنوان سے ہو، اور خود کو بڑا کرکے دکھانے اور فخر کے عنوان سے نہ ہو، تو وہ نہ صرف انسان کو پروردگار کے مقام عبودیت میں تکامل و ارتقاء بخشتا ہے اور اجتماعی مثبت اثرات رکھتا ہے، بلکہ خود انسان کی روح و جان میں بھی آرام بخش اثر چھوڑتا ہے۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۰۶

خدا کی نعمتوں کے ذکر کرنے سے انسان اپنے پاس کسی چیز کے کم ہونے کا احساس ہی نہیں کرتا، بیماری کا شکوہ نہ کرنے سے دوسرے اعضاء کی سلامتی پر شکرگزار ہوتا ہے، کسی چیز کے کھوئے جانے پر جزع و فزع نہ کرنے سے وہ اپنے باقی امکانات و وسائل کو بیان کرتا ہے۔

اس قسم کے افراد زندگی کی سختیوں اور طوفانوں میں یاس و نا امیدی میں گرفتار نہیں ہوتے اور نہ ہی مضطرب و پریشان ہوتے ہیں۔ ان کی رُوح سکون و آرام میں، اور دل مطمئن ہوتا ہے۔ اور مشکلات سے مقابلہ کرنے میں ان میں زیادہ توانائی ہوتی ہے۔

خداوندا! تیری نعمتیں اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ انہیں بیان کیا جا سکے، ان کو ہم سے سلب نہ کرنا، اور اپنے فضل و کرم سے ان میں اضافہ فرمانا۔

پروردگارا! ہم اس دنیا میں تیرے احسان میں غرق ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ اُس جہان میں بھی اسی طرح ہوں۔
بارالٰہا! ہمیں توفیق مرحمت فرما کہ ہم ہمیشہ محروم لوگوں کے پشتیبان اور یتیموں کے حقوق کے محافظ ہوں۔

آمین یا رب العالمین

سورہ "والضحیٰ" کا اختتام

اختتام ترجمہ
قم مقدس برمکان حقیر
۱۳ رمضان ۱۴۰۸ھ بروز ہفتہ
گیارہ بج کر اکتالیس منٹ صبح

سُورہ اَلَم نَشرَح

* یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا
* اس میں ۸ آیات ہیں

سورہ "الم نشرح" کے مضامین اور اس کی فضیلت

مشہور یہ ہے کہ یہ سورہ ، سورہ والضحٰی کے بعد نازل ہوا ہے اور اس کے مضامین بھی اسی مطلب کی تائید کرتے ہیں، کیونکہ اس سورہ میں بھی پھر سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر خدا کی نعمتوں کے ایک حصہ کو شمار کیا گیا ہے۔ حقیقت میں تین قسم کی عظیم نعمتیں سورہ والضحٰی میں آئی تھیں، اور تین ہی عظیم نعمتیں سورہ الم نشرح میں آئی ہیں۔ گزشتہ نعمتوں میں تو بعض مادی اور بعض معنوی تھیں، لیکن اس سورہ کی تمام نعمتیں معنوی پہلو رکھتی ہیں اور یہ سورہ خصوصیت کے ساتھ تین محوروں کے گرد گردش کرتا ہے :

ایک تو انہی تینوں نعمتوں کا بیان ہے ، دوسرا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مستقبل میں ان کی دعوت کی مشکلات کے برطرف ہونے کے لحاظ سے بشارت ہے ، اور تیسرا خداوند یگانہ کی طرف توجہ اور اس کی عبادت و بندگی کی طرف تحریص و ترغیب۔

اسی بناء پر روایات اہل بیت میں ـــ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے۔ یہ دونوں ایک ہی سورہ شمار ہوئی ہیں۔ اسی لیے قرأت نماز میں اس بناء پر کہ ایک مکمل سورت پڑھی جائے ، دونوں کو اکٹھا پڑھتے ہیں۔

اہل سنت میں بھی بعض حضرات اسی نظریہ کے طرف دار ہیں جیسا کہ فخر رازی نے طاؤس اور عمر بن عبدالعزیز سے نقل کیا ہے کہ وہ بھی یہی کہا کرتے تھے کہ یہ دونوں سورتیں ایک ہی سورت ہیں اور وہ ایک رکعت میں دونوں کو تلاوت کیا کرتے تھے ، البتہ وہ ان دونوں کے درمیان بسم اللہ کو حذف کر دیتے تھے۔ (لیکن ہمارے فقہا کے مطابق بسم اللہ دونوں میں ہونا چاہیئے، اور یہ جو مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں نقل کیا ہے کہ ہمارے فقہا بسم اللہ کو حذف کرتے ہیں درست نظر نہیں آتا)۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ فخر رازی ان لوگوں کا قول نقل کرنے کے بعد جو ان دونوں کو ایک سورہ کہتے ہیں، کہتا ہے کہ یہ بات ٹھیک نہیں ہے کیونکہ ان دونوں کے مضامین ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ سورہ والضحٰی اس وقت نازل ہوا جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کفار کی اذیت رسانی سے پریشان تھے اور سختی اور غم و اندوہ میں بسر کر رہے تھے، حالانکہ دوسری سورت اس وقت نازل ہوئی جب کہ پیغمبر

خوش حال و شادمان تھے ، تو یہ دونوں چیزیں ایک دُوسرے کے ساتھ کیسے جمع ہو سکتی ہیں ؟[1]

لیکن یہ استدلال عجیب ہے کیونکہ دونوں سورتیں پیغمبر کی گزشتہ زندگی کی بات کر رہی ہیں ، اور یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ آپ بہت سی مشکلات کو پیچھے چھوڑ چکے تھے ، اور آپ کا پاک دل اُمید و سرور میں غرق تھا۔ یہ دونوں سورتیں خدا کی نعمتوں کی بات کر رہی ہیں، اور سختی اور مشکلات سے پُر ماضی کی یاد دلا رہی ہیں ، تاکہ پیغمبرؐ کے دل کی تسلی اور زیادہ سے زیادہ کامل اُمید کا باعث ہو۔

بہرحال ان دونوں سورتوں کے مضامین کا قریبی تعلق ایسی چیز نہیں ہے جو شک اور تردید کے قابل ہو، اسی معنی کی نظیر سورہ فیل اور سورہ قریش میں بھی آئے گی۔ انشاءاللہ۔

اس بارے میں کہ یہ سورہ (الم نشرح) مکہ میں نازل ہوا ہے یا مدینہ میں، اُوپر والے بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ مکہ میں نازل ہوا ہے ، لیکن آیہ ورفعنالك ذكرك "ہم نے تیرے ذکر کو بلند کیا" کی طرف توجہ کرتے ہوئے بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوا ہے، اس وقت جب کہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ دلیل اطمینان بخش نہیں ہے کیونکہ پیغمبرؐ کی شہرت، ان تمام مشکلات کے باوجود ، جو آپ کو مکہ میں درپیش تھیں، ہر طرف پھیل چکی تھی ، اور تمام محفلوں میں آپ کے قیام ، رسالت اور دعوت کے بارے میں چرچے ہو رہے تھے اور حج کے سالانہ اجتماع کے ذریعے یہ شہرت حجاز کے دوسرے علاقوں خصوصاً مدینہ میں پہنچ چکی تھی۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے سلسلے میں ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

" من قرأها اعطی من الاجر كمن لقی محمدًا ص مغتما ففرج عنه "

" جو شخص اس سورہ کو پڑھے اس کو اس شخص کا اجر ملے گا ، جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو غمگین دیکھا اور آپؐ کے قلب مبارک سے غم و اندوہ کو دُور کیا ہو"[2]

---

[1] "تفسیر فخر رازی" جلد ۳۲ ص ۲

[2] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۰۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝

۲۔ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝

۳۔ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝

۴۔ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝

۵۔ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝

۶۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝

۷۔ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝

۸۔ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ کیا ہم نے تیرے سینہ کو کشادہ نہیں کیا؟

۲۔ اور تجھ سے بھاری بوجھ برطرف نہیں کیا؟

۳۔ وہی بوجھ جو تیری پشت کو جھکائے دے رہا تھا۔

۴۔ اور تیرے ذکر کو ہم نے بلند کیا۔

۵۔ اس بناء پر یقینی طور پر سختی کے ساتھ آسانی ہے۔

۶۔ اور یقیناً سختی کے ساتھ آسانی ہے۔

۷۔ پس جب تو ایک اہم کام سے فارغ ہو جائے تو دوسری مہم کو شروع کر دے۔

۸۔ اور اپنے پروردگار کی طرف توجہ اور رغبت کر۔

تفسیر

ہم نے تجھے انواع و اقسام کی نعمتیں عطا کی ہیں:

آیات کا لب و لہجہ پروردگار کے حد سے زیادہ لطف و محبت، اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی و دلداری کے پہلو رکھتا ہے۔

پہلی آیت میں خدا کی اہم ترین نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کیا ہم نے تیرے سینہ کو کشادہ نہیں کیا" (الم نشرح لك صدرك)۔

"نشرح" "شرح" کے مادہ سے، مفردات میں راغب کے قول کے مطابق اصل میں گوشت کے ٹکڑوں کو کشادہ کرنے اور زیادہ نازک اور پتلے ورق بنانے کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ شرح صدر سے مراد نور الٰہی اور خداداد سکون و آرام کے ذریعے اس کو وسیع کرنا ہے، اور اس کے بعد کہتا ہے: گفتگو اور کلام کی مشکلات کی شرح کرنا، اس کو پھیلانے اور اس کے مخفی معانی کی وضاحت کرنے کے معنی میں ہے۔ بہرحال اس میں شک نہیں ہے کہ یہاں شرح صدر سے مراد اس کا کنائی معنی ہے۔ اور وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح و فکر کو وسعت دینا ہے، اور یہ وسعت ممکن ہے کہ ایک وسیع مفہوم رکھتی ہو جو وحی و رسالت کے طریق سے پیغمبر کے وسعتِ علم کو بھی شامل رکھتا ہو اور دشمنوں اور مخالفین کی ہٹ دھرمیوں اور کارشکنیوں کے مقابلہ میں آپ کے تحمل و استقامت میں وسعت و کشادگی کو بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہو۔

اسی لیے جب موسیٰ علیہ السلام بن عمران، فرعون جیسے سرکش کی دعوت پر مامور ہوئے، اذھب الی فرعون انه طغی "فرعون کے پاس جا، وہ سرکش ہو گیا ہے"، تو بلا فاصلہ عرض کرتے ہیں: ربّ اشرح لی صدری ویسّر لی امری۔ "پروردگار میرے سینہ کو کشادہ کر دے اور میرے کام کو آسان کر دے": (طٰہٰ۔ ۲۵۔ ۲۶)

دوسرے مقام پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہے فاصبر لحکم ربک ولا تکن کصاحب الحوت

اب جب کہ یہ حال ہے تو اپنے پروردگار کے حکم کا منتظر رہ، اور استقامت اور صبر و شکیبائی اختیار کر اور یونس کی طرح نہ ہو (جو ضروری و لازمی صبر و شکیبائی کو ترک کرنے کی بنا پر ان تمام مشکلات اور تلخیوں میں گرفتار ہوا)۔ (قلم - ۴۸)

شرح صدر حقیقت میں ضیق صدر کا نقطۂ مقابل ہے جیسا کہ سورہ حجر کی آیہ ۹۷ میں آیا ہے۔ ولقد نعلم انک یضیق صدرک بما یقولون: "ہم جانتے ہیں کہ تیرا سینہ ان کی (مغرضانہ) باتوں سے تنگ ہو جاتا ہے"۔ اصولی طور پر کوئی عظیم رہبر شرح صدر کے بغیر مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اور وہ شخص جس کی رسالت سب سے زیادہ عظیم ہے۔ (جیسا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تھی) تو اس کا شرح صدر سب سے زیادہ ہونا چاہیئے۔ ابتلاؤں کے طوفان اس کی رُوح کے سمندر کے سکون و آرام کو درہم و برہم نہ کریں، اور مشکلات سے اس کے گھٹنے نہ ٹیک جائیں، دشمنوں کی کارشکنیاں اسے مایوس نہ کریں، پیچیدہ مسائل کے سوالات اُسے ہر طرف سے مجبور کر کے لاجواب نہ کر دیں، اور یہ خدا کا رسول اللہ کے لیے ایک عظیم ترین ہدیہ تھا۔

اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"میں نے اپنے پروردگار سے ایک درخواست کی، حالانکہ میں چاہتا تھا کہ یہ درخواست نہ کرتا - میں نے عرض کیا مجھ سے پہلے پیغمبروں میں سے بعض کو ہوا کے چلنے پر اختیار دیا، بعض مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ خدا نے مجھ سے فرمایا، کیا تو یتیم نہیں تھا تو میں نے تجھے پناہ دی؟ میں نے عرض کیا، ہاں! فرمایا: کیا تو گمشدہ نہیں تھا، میں نے تجھے ہدایت کی؟ میں نے عرض کیا، ہاں! اے پروردگار! فرمایا، کیا میں نے تیرے سینہ کو گشادہ اور تیری پُشت کے بوجھ کو ہلکا نہیں کیا؟ میں نے عرض کیا، ہاں! اے پروردگار![1]

یہ چیز اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ "شرح صدر" کی نعمت انبیاء کے معجزات سے مافوق تھی، اور واقعاً اگر کوئی شخص پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات کا باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کرے اور آپ کے شرح صدر کا اندازہ آپ کی زندگی کے دَور کے سخت اور پیچیدہ حوادث سے لگائے، تو وہ یقین کرے گا کہ یہ چیز عام طریقہ سے ممکن نہیں ہے، بلکہ یہ ایک تائید الٰہی اور توفیق ربانی ہے۔

اس مقام پر بعض نے یہ کہا ہے کہ اس شرح صدر سے مُراد وہی حادثہ ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بچپن یا جوانی میں پیش آیا تھا کہ آسمان سے فرشتے اُترے، آپ کا سینہ شگافتہ کیا، آپ کے دل کو باہر نکال کر اُسے پاک و صاف کیا، اور اس کو علم و دانش اور رافت و رحمت سے بھر دیا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اس حدیث سے مراد یہ جسمانی دل نہیں ہے، بلکہ یہ رُوحانی اور پیغمبر کے عزم و ارادہ کی تقویت اور اس کی ہر قسم کے اخلاقی نقائص، اور وسوسۂ شیطانی سے پاکسازی کے لحاظ سے، خدائی امدادوں کی طرف، ایک کنایہ اور اشارہ ہے۔

لیکن بہرحال ہمارے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ زیر بحث آیت خاص طور پر اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے، بلکہ

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۱۸

اس کا ایک وسیع مفہوم ہے کہ یہ داستان بھی اس کا ایک مصداق شمار ہو سکتی ہے۔

اسی شرح صدر کی بنا پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رسالت کی مشکلات کو اعلیٰ ترین صورت میں برداشت کیا اور اس طریقہ میں اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سے نبھایا۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "کیا ہم نے تیرے سنگین بوجھ کو اٹھا نہیں لیا!؟ (ووضعنا عنك وزرك)۔

"وہی بوجھ جو تیری پشت پر سخت گرانی کر رہا تھا" (الذی انقض ظهرك)۔

"وزر" لغت میں بوجھ کے معنی میں ہے۔ "وزیر" کا لفظ بھی اسی معنی سے مشتق ہوا ہے چونکہ وہ حکومت کے سنگین بوجھ اپنے کندھے پر اٹھاتا ہے۔ اور گناہوں کو بھی اسی بنا پر "وزر" کہتے ہیں، کیونکہ وہ گنہگار کے دوش پر ایک سنگین بوجھ ہوتا ہے۔

"انقض" "نقض" کے مادہ سے، رسی کی گرہ کو کھولنے کے معنی میں ہے، یا کسی عمارت کے ایک دوسرے میں گھسے ہوئے حصّوں کو الگ کرنے کے معنی میں ہے، اور "انقاض" اس آواز کو کہا جاتا ہے جو کسی عمارت کے ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتے وقت کان میں پڑتی ہے۔ یا کمر کے مہروں کی اس آواز کو کہتے ہیں جو سنگین بوجھ کے زیر بار آنے کے وقت آتی ہے۔

یہ لفظ عہد وپیمان اور معاہدوں کو توڑنے کے موقع پر بھی استعمال ہوتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے نقض عہد کیا۔

اس طرح اوپر والی آیت یہ کہتی ہے کہ: "خدا نے وہ سنگین اور کمر کو توڑنے والا بوجھ تجھ سے اُٹھا لیا"۔

یہ کون سا بوجھ تھا جو خدا نے پیغمبرؐ کی پشت سے اُٹھا لیا؟ آیات کے قرائن اس بات کی اچھی طرح نشان دہی کرتے ہیں کہ اس سے مراد وہی رسالت و نبوت اور توحید ویکتا پرستی کی طرف دعوت کی مشکلات، اور اس آلودہ ماحول سے فساد کے آثار کو ختم کرنا ہے، نہ صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلکہ سارے کے سارے انبیاءؑ کا دعوت کے آغاز میں اس قسم کی عظیم مشکلات سے سامنا رہا، اور وہ صرف خدائی امدادوں سے ہی ان پر کامیاب ہوتے تھے، البتہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماحول اور زمانہ کے حالات کئی جہات سے زیادہ سخت اور زیادہ سنگین تھے۔

بعض نے "وزر" کی تفسیر آغاز نزول میں "وحی" کے بار سنگین کے معنی میں بھی کی ہے۔

بعض نے مشرکین کی ضلالت وگمراہی اور عناد اور ہٹ دھرمی کے ساتھ بھی۔

اور بعض نے ان کی حد سے زیادہ اذیت و آزار سے۔

اور بعض نے اس غم و اندوہ سے جو آپ کے چچا حضرت ابوطالبؑ اور آپؐ کی زوجہ حضرت خدیجہؑ کی وفات سے پیدا ہوا تھا۔

اور بعض نے گناہ سے عصمت و پاکیزگی کے مسئلہ سے تفسیر کی ہے۔

لیکن ظاہراً وہی پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے اور یہ سب اس کے شاخ و برگ ہیں۔

اور تیسری نعمت کے بارے میں فرماتا ہے: "ہم نے تیرے ذکر کو بلند کیا"۔ (ورفعنا لك ذكرك)[1]

---

[1] "رفع" کی تعبیر "وضع" کے بعد اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ایک دوسرے کی ضد ہیں، یہاں ایک خاص لطف دیتی ہے۔

تیرا نام اسلام اور قرآن کے نام کے ساتھ ہر جگہ پہنچا، اور اس سے بہتر یہ ہے کہ تیرا نام ہر صبح وشام اذان کے گلدستوں پر اور اذان کے وقت اللہ کے نام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اور تیری رسالت کی شہادت خدا کی توحید و یگانگت کی شہادت کے ساتھ اسلام کا نشان اور اس پاک دین کے قبول ہونے کی دلیل ہے۔

اس سے بڑھ کر فخر کی بات اور رفعت مقام کا اس سے بالاتر تصور اور کیا ہوگا ؟!

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس آیت کی تفسیر میں آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

"جبرئیل نے مجھ سے کہا ہے کہ خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے : جس وقت میرا نام لیا جاتا ہے تو اس وقت تیرا نام بھی میرے ہی ساتھ لیا جاتا ہے" (اور تیرے مقام کی عظمت کے لیے یہی کافی ہے)

"لک" (تیرے لیے) کی تعبیر اس بات کی تاکید کے لیے ہے۔ کہ ہم نے تیرے نام اور شہرت کو ان تمام کارشکنیوں اور دشمنیوں کے باوجود بلند کیا۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا ہے، جب کہ اسلام کا پھیلنا اور پیغمبرؐ کے کاندھے سے رسالت کے بوجھ کا ہلکا ہونا اور اطراف عالم میں آپ کے نام کا بلند ہونا مدینہ میں ہوا ہے۔

اس سوال کے جواب میں بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مُراد یہ ہے کہ اس کی بشارت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہلے سے دے دی گئی تھی، اور اسی چیز نے آپ کے دل سے غم و اندوہ کا بوجھ ہٹا دیا تھا۔

اور کبھی یہ کہا ہے کہ یہاں فعل "ماضی" "مستقبل" کا معنی دیتا ہے، اور یہ آئندہ کے لیے ایک خوشخبری ہے۔

لیکن حق بات یہ ہے کہ ان امور میں سے بعض، مکہ میں ہی، خصوصاً پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تیرہ سالہ دَور کے آخری حصہ میں ہی، جب کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں لوگوں کو دعوت دینے میں مشغول تھے، پورے ہو چکے تھے۔ بہت سے لوگوں کے دلوں میں ایمان و اسلام نفوذ کر چکا تھا اور مشکلات نسبتاً کم ہو چکی تھیں، اور پیغمبرؐ اکرم کا نام اور کام ہر جگہ پہنچ چکا تھا، اور آئندہ کی عظیم کامیابیوں کی تمہید فراہم ہو چکی تھی۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "حسان بن ثابت" پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشہور شاعر، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں اس آیت کے مضمون کی طرف بڑے خوبصورت انداز میں اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے :

" وضم الالٰہ اسم النبی الی اسمه

اذا قال فی الخمس المؤذن اشهد

و شق له من اسمه ليجله

فذو العرش محمود و هٰذا محمد "

" خدا نے پیغمبرؐ کا نام اپنے نام کے ساتھ ضم کر دیا ہے "

جب کہ مؤذن پانچ مرتبہ اشهد ... کہتا ہے۔

اس نے اپنے نام سے اس کے نام کو مشتق کیا ہے تاکہ اس کا احترام برقرار رکھے۔
لہٰذا صاحب عرش خدا تو "محمود" ہے اور وہ "محمد" ہے۔

"سیمرغ فہم ہیچکس از انبیاء نرفت
آنجا کہ تو بہ بال کرامت پریدہ ای"
"ہر یک بقدر خویش بجائی رسیدہ اند
آنجا کہ جائے نیست بجائی رسیدہ ای"

انبیاء میں کسی کا بھی طائر فکر و فہم وہاں تک نہیں پہنچا
جہاں آپ کرامت و بزرگی کے پر و بال سے پہنچے ہیں
ان میں سے ہر ایک اپنی قدر و منزلت کے ایک مقام تک پہنچا ہے
جہاں کسی کے لیے کوئی مقام نہیں ہے آپؐ اس مقام پر پہنچے ہیں

بعد والی آیت میں اپنے پیغمبرؐ کو اہم ترین بشارت دیتا ہے اور آپؐ کے قلب پاک میں اُمید کے انوار کی روشنی پیدا کرتا ہے اور فرماتا ہے: "یقیناً سختی کے ساتھ آسانی ہے": (فان مع العسر یسرًا)۔

اس کے بعد پھر تاکید کرتا ہے، یقیناً سختی کے ساتھ آسانی ہے: (ان مع العسر یسرًا)۔

غم نہ کھاؤ یہ مشکلات اور سختیاں ایسی شکل میں باقی نہیں رہیں گی، دشمنوں کی کارشکنیاں ہمیشہ کے لیے جاری نہیں رہیں گی اور مادّی محرومیاں، اقتصادی مشکلات اور مسلمانوں کا فقر و فاقہ اس صورت میں باقی نہیں رہے گا۔

جو شخص مشکلات کو برداشت کرتا ہے، اور طوفانوں کے مقابلہ میں ڈٹ جاتا ہے، وہ ایک دن اس کا میٹھا پھل بھی کھاتا ہے۔
جس دن دشمنوں کی چیخ و پکار بند ہو جائے گی، اور ان کی کارشکنیاں ختم ہو جائیں گی، ترقی و تکامل کے راستے صاف ہو جائیں گے، اور راہِ حق کو طے کرنا آسان ہو جائے گا۔

اگرچہ بعض مفسرین نے ان آیات کو ظہورِ اسلام کے آغاز میں مسلمانوں کے عمومی فقر و فاقہ کی طرف اشارہ شمار کیا ہے لیکن آیات کے مفہوم کی وسعت تمام مشکلات کو شامل ہے۔ یہ دونوں آیات اس طرح سے پیش کی گئی ہیں کہ نہ تو پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ اختصاص رکھتی ہیں اور نہ ہی آپؐ کے زمانہ سے، بلکہ یہ ایک قاعدہ کلی کی صورت میں اور سابقہ مباحث کی ایک علت کے طور پر پیش کی گئی ہیں اور یہ تمام مخلص مومن اور سعی و کوشش کرنے والے انسانوں کو نوید اور خوش خبری دیتی ہیں کہ ہمیشہ سختیوں کے ساتھ آسانیاں ہوتی ہیں، یہاں تک کہ "بعد" کی تعبیر نہیں کرتا بلکہ "مع" (ساتھ) کی تعبیر کرتا ہے، جو ہمراہ ہونے کی علامت ہے۔

ہاں! اسی طرح ہے، ہر مشکل کے ساتھ آسانی ملی ہوئی ہے اور ہر سختی کے ساتھ سہولت ہے، یہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہیں اور رہیں گے۔

یہ ایسی نوید اور وعدہ الٰہی ہے، جو دل کو نور و صفا بخشتا ہے، اور کامیابیوں کا اُمیدوار بناتا ہے، اور یاس و نااُمیدی کے گرد و غبار کو انسان کے صفحۂ رُوح سے صاف کر دیتا ہے[1]

حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"واعلم ان مع العسر یسراً، وان مع الصبر النصر، وان الفرج مع الکرب":

"جان لو کہ سختیوں کے ساتھ آسانی ہے، اور صبر کے ساتھ کامیابی ہے، اور غم و اندوہ کے ساتھ کشائش و خوش حالی ہے۔"[1]

ایک حدیث میں امیرالمومنین علی علیہ السلام سے آیا ہے:

"ایک عورت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے شوہر کی شکایت کی کہ وہ مجھے کوئی خرچہ نہیں دیتا، جب کہ اس کا شوہر واقعاً تنگ دست تھا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس کے شوہر کو زنداں میں ڈالنے کی بجائے اس کے جواب میں فرمایا: ان مع العسر یسرا!

(اور اُسے صبر کی تلقین کی)"[2]

ہاں!

صبر و ظفر ہر دو دوستان قدیمند

بر اثر صبر نوبت ظفر آید

"صبر اور کامیابی دونوں قدیمی دوست ہیں

صبر کے بعد ہی کامیابی کی نوبت آتی ہے"

اس کے بعد اس سورہ کی آخری آیت میں فرماتا ہے: "پس جب تم کسی اہم کام سے فارغ ہو جاؤ تو دوسرے کام میں لگ جاؤ" (فاذا فرغت فانصب)۔

ہرگز بھی بیکار نہ رہو، تلاش و کوشش کو نہ چھوڑو، ہمیشہ جدوجہد میں مشغول رہو، اور ہر اہم کام کو ختم کرنے کے ساتھ ہی دوسرے اہم کام کو شروع کر دیا کرو۔

اور ان تمام حالات میں خدا پر بھروسہ رکھو" اور اپنے پروردگار کی طرف توجہ رکھو"۔ (والی ربک فارغب)۔

اس کی رضا و خوشنودی طلب کر اور اس کے قرب و جوار کی طرف جلدی کر۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے جو ہر مہم سے فارغ ہونے اور دوسری مہم کو شروع کرنے کو شامل ہے، اور تمام کوششوں کا رُخ پروردگار کی طرف کرنے کا حکم دیتی ہے، لیکن بہت سے مفسرین نے اس آیت کے لیے محدود معانی ذکر کیے ہیں، جن میں سے ہر ایک کو اس کے ایک مصداق کے عنوان سے قبول کیا جا سکتا ہے۔

حاشیہ صفحہ گزشتہ: جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے واضح ہو گیا کہ "العسر" میں الف ولام جنس کے لیے ہے، اور عہد کے لیے نہیں ہے اور "یسر" کا لفظ اگرچہ نکرہ کی صورت میں ذکر ہوا ہے لیکن وہ بھی جنس کے معنی دیتا ہے، اور ایسے مقام پر نکرہ ہونا عظمت کے بیان کے لیے ہوتا ہے۔

حاشیہ صفحہ ہذا

[1] تفسیر نورالثقلین، صفحہ ۶۰۴ حدیث ۱۱، ۱۳

[2] تفسیر نورالثقلین، ص ۶۰۴ حدیث ۱۱، ۱۳

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مُراد یہ ہے کہ جب تو واجب نماز سے فارغ ہو جائے تو دُعا میں مشغول ہو جا، اور خدا سے درخواست کر کہ وہ تیری حاجت کو پُورا کر دے۔

یا یہ کہا ہے کہ جب تُو فرائض سے فارغ ہو جائے تو نافلۂ شب کے لیے کھڑا ہو جا۔

یا یہ کہا ہے کہ جب تُو دُنیا کے کاموں سے فارغ ہو جائے تو آخرت کے امور، عبادت اور اپنے پروردگار کی نماز میں مشغول ہو جا۔

یا یہ کہا ہے کہ جب تُو واجبات سے فارغ ہو جائے، تو ان مستحبات کی طرف توجہ کر جن کا خدا نے حکم دیا ہے۔

یا یہ کہا ہے کہ جب تُو دشمن سے جہاد کرنے سے فارغ ہو جائے تو جہاد نفس کے لیے کھڑا ہو جا۔

یا یہ کہا ہے کہ جب تُو ادائے رسالت سے فارغ ہو جائے تو شفاعت کی درخواست کرنے کے لیے کھڑا ہو جا۔

متعدد روایات میں، جنہیں اہل سنت کے مشہور عالم حافظ "حاکم حسکانی" نے "شواہد التنزیل" میں نقل کیا ہے، امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس طرح آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

یعنی: "جب تو فارغ ہو جائے تو علیؑ کی ولایت کے لیے نصب کر دے"[1]۔

قرطبی نے بھی اپنی تفسیر میں بعض سے یہ نقل کیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ جب تُو فارغ ہو جائے تو اس امام کو جو تیرا جانشین ہے نصب کر دے، (اگرچہ مفسّر مذکور نے خود اس معنی کو قبول نہیں کیا)[2]۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ آیہ شریفہ میں فراغت کا موضوع معیّن نہیں ہوا ہے، اور "فانصب" "نصب" کے مادہ سے (نسب کے وزن پر) تعب اور زحمت کے معنی میں ہے، یہ آیت ایک ہمہ گیر اصل کلی کو بیان کرتی ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ پیغمبرؐ کو کسی امر مہم کے ختم ہونے کے بعد آرام سے بیٹھ جانے سے روکے اور انہیں ایک نمونہ اور مثال کے طور پر زندگی میں ہمیشہ مسلسل طور پر سعی و کوشش میں مصروف رہنے کی تلقین کرے۔

اس معنی کی طرف توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ اُوپر والی تمام تفاسیر صحیح ہیں، لیکن ان میں سے ہر ایک اس وسیع اور عام معنی کے ایک مصداق کے عنوان سے ہے۔

اور کیا ہی اصلاحی اور مؤثر پروگرام ہے، جس میں کامیابی اور تکامل و ارتقا کی رمز چھپی ہوئی ہے۔ اصولی طور پر بیکار رہنا اور مکمل طور پر فارغ ہو کر بیٹھ رہنا تھکاوٹ، خوشی کے کم ہونے اور سستی و فرسودگی کا سبب ہوتا ہے، اور بہت سے مواقع میں فساد و تباہی اور انواع و اقسام کے گناہوں کا باعث بنتا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اعداد و شمار اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ تعلیمی اداروں کی تعطیلات کے زمانے میں بعض اوقات فتنہ و فساد کی تعداد سات گنا تک پہنچ جاتی ہے۔

بہرحال یہ سُورہ مجموعی طور پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر خدا کی خاص عنایت اور مصائب و آلام میں تسلی اور رسالت کے

---

[1] شواہد التنزیل جلد ۲ ص ۳۴۹ (احادیث ۱۱۱۶ تا ۱۱۱۹)۔

[2] قرطبی جلد ۱۰ ص ۷۱۹۹

کام کی مشکلات اور نشیب و فراز کا مقابلہ کرنے کے لیے آپ کی تائید و نصرت کا وعدہ ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ تمام انسانی اور راہِ حق پر چلنے والوں کے لیے ایک اُمید بخش، اصلاحی اور حیات آفرین مجموعہ ہے۔

چند نکات

جیسا کہ ہم نے اُوپر اشارہ کیا ہے، متعدد روایات میں آیا ہے کہ (ایک اہم مصداق کے بیان کے عنوان سے)" فاذا فرغت فانصب" کی آیت سے مراد کارِ رسالت کی انجام دہی کے بعد امیر المومنین علی علیہ السلام کو خلافت کے لیے نصب کرنا ہے

" آلوسی" "رُوح المعانی" میں بعض امامیہ (شیعہ) کی گفتگو کو نقل کرنے کے بعد کہتا ہے، انہوں نے " فانصب " کو "ص" کی زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ بالفرض اگر ایسا ہو بھی تو وہ اس بات کی دلیل نہیں بنتا کہ اس سے علی ابن ابی طالبؑ کو نصب کرنا مُراد ہو۔ اس کے بعد وہ زمخشری کی کشاف سے نقل کرتا ہے کہ اگر شیعوں کے لیے اس قسم کی تفسیر ممکن ہو تو " ناصبی " (دُشمنانِ علیؑ) بھی اس کی نصب کے دستور کے عنوان سے (بغضِ علی بن ابی طالبؑ کے معنی میں) تفسیر کر سکتے ہیں۔[1]

کیونکہ " انصب " (ص کی زبر کے ساتھ) خود کو مشقت میں ڈالنے اور جدوجہد کرنے کے معنی میں آیا ہے، جب کہ" انصب" (ص کی زیر کے ساتھ) نصب کرنے، اُوپر لے جانے اور قائم کرنے کا حکم دینے کے معنی میں ہے۔

ان مفسرین نے یہ خیال کر لیا ہے کہ شیعہ مسئلہ ولایت پر استدلال کرنے کے لیے آیت کی قرأت کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کی تبدیلی کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ مذکورہ تفسیر کے لیے وہی مشہور اور جانی پہچانی قرأت ہی کافی ہے کیونکہ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ رسالت کے اہم امر سے فارغ ہو جانے کے بعد دوسرے اہم اُمر کے لیے جیسا کہ ولایت ہے، سعی و کوشش کر اور یہ ایک اعتبار سے مکمل طور پر قابلِ قبول ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ پیغمبرؐ مشہور حدیثِ غدیر اور دوسری بہت سی احادیث کے مطابق، جو تمام علماء اسلام کی کتابوں میں آئی ہیں، ہمیشہ مسلسل طور پر کوشش کرتے رہتے تھے، لیکن کتنی قابلِ افسوس اور دُکھ دینے والی بات ہے کہ زمخشری جیسا عالم جو علی علیہ السلام کو پیغمبرؐ کا چوتھا جانشین اور اسلام کا عظیم پیشوا سمجھتا ہے، یہ کہنے کے لیے تیار ہو گیا کہ ناصبی بھی یہ حق رکھتے ہیں کہ آیت کو علی بن ابی طالبؑ کے بغض کے ساتھ تفسیر کریں، یہ کتنی رکیک اور چبھنے والی تعبیر ہے؛ وہ بھی ایسے مفسر سے؛

واقعاً تعصب بھی کیسے کیسے گل کھلاتا ہے؛

۲۔ مشہور معتزلی عالم " ابن ابی الحدید" نے نہج البلاغہ " کی شرح میں " زبیر بن بکار سے جو اس کے قول کے مطابق نہ شیعہ تھا اور نہ ہی معاویہ سے دشمنی رکھتا تھا، بلکہ علیؑ سے جُدا ہو کر گوشہ گیر ہو گیا تھا، اور آپ کے مخالفین سے جا ملا تھا، روایت کی ہے کہ وہ مغیرہ بن شعبہ کے بیٹے سے نقل کرتا ہے کہ میرا باپ " مغیرہ" معاویہ کی عقل اور سمجھ کے بارے میں بہت باتیں کیا کرتا تھا اور اس کے طرزِ فکر پر حیران ہوا کرتا تھا، لیکن ایک رات وہ اس کے پاس سے بہت ہی غمگین اور پریشانی کی حالت میں آیا، مَیں سمجھ گیا کہ کوئی اہم مسئلہ پیش آ گیا ہے، مَیں نے اس سے سوال کیا تو اس نے معاویہ کو سخت بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا جب مَیں نے اس کا سبب پوچھا تو اس نے کہا

---

[1] " روح المعانی" جلد ۳ ص ۱۷۲۔ " تفسیر کشاف" جلد ۴ ص ۷۷۲

آج رات جب میں اور وہ خلوت میں بیٹھے تو میں نے اس سے کہا، تو جس مقام اور مرتبہ کا خواہش مند تھا وہ تُو نے حاصل کر لیا ہے اب تو عدل و انصاف اور نیکی کرنے میں کوشش کر، کیونکہ تیری عمر بھی اب بہت زیادہ ہو گئی ہے لہٰذا بنی ہاشم کے بارے میں بھی نیکی کر کیونکہ اب تجھے ان سے کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔ اور یہ بات تیرے لیے نیک نامی کا سبب بن جائے گی۔

تو اس نے جواب میں کہا، ہیہات اب میرے لیے کون سی نیک نامی باقی رہ جائے گی، خلیفہ اوّل و دوم نے کتنے کام کیے تو ان کا کون سا نام باقی رہ گیا، لیکن تم "ابن ابی کبشہ" (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھو کہ لوگ اس کا نام ہر روز پانچ مرتبہ گلدستۂ اذان پر "اشهد ان محمّداً رسول الله" کی صورت میں لیتے ہیں، اسے بیچارے! اب اس کے بعد کون سا کام باقی رہ گیا ہے اور ہمارا کون سا نام باقی رہ جائے گا، نہیں خدا کی قسم نہیں، سوائے اس صورت کے کہ یہ حالت بدل جائے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام دفن ہو جائے۔[1]

لیکن ورفعنا لك ذكرك کے مقتضیٰ کے مطابق خدا نے چاہا کہ یہ مبارک نام ساری دُنیائے تاریخ اور تمام عالم بشریت میں بلند اور مشہور رہے، چاہے دُوسرے لوگ پسند کریں یا پسند نہ کریں؛ خوش ہوں یا ناخوش؛ اگر ہم ان تعبیرات کو کھول کر دیکھیں تو ان کا کیا معنی ہوگا؛ لاحول ولا قوة الا بالله!

خداوندا! ہمارے دل کو حبِ ذات سے خالی کر دے اور اپنے عشق و محبت سے پُر کر دے۔

پروردگارا! تُو نے خود وعدہ دیا ہے کہ ہر مشکل کے ساتھ راحت اور آسُودگی ہے، اس زمانہ کے مسلمانوں کو ان عظیم اور سخت مشکلات سے جو دشمنوں کی طرف سے انہیں پہنچ رہی ہیں، آسُودہ کر دے۔

بارِ الٰہا! تیری نعمتیں اور مواہب ہم پر بہت زیادہ ہیں، ہمیں ان کی شکر گزاری کی توفیق مرحمت فرما۔

آمین یا ربّ العالمین

سُورہ "الم نشرح" کا اختتام

اختتام ترجمہ قم مقدسہ بر مکان حقیر
پونے چھ بجے شام چودہ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ
احقر صفدر حسین نجفی

---

[1] شرح نہج البلاغہ جلد ۵ ص ۱۲۹۔ (ابن ابی الحدید) کی عبارت یہاں اس طرح ہے: "فای عمل يبقى ؛ وای ذکر يدوم بعد هذا لا ابالك ، لا والله الا دفنا دفنا"!

سورۃ التّین

- یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا
- اس میں ۸ آیات ہیں

سورہ "التین" کے مطالب اور فضیلت

یہ سورہ حقیقت میں انسان کی خلقتِ زیبا، اور اس کے تکامل و ارتقا اور انحطاط و پستی کے گرد گھومتا ہے اور یہ مطلب سورہ کے شروع میں پُرمعنی قسموں کے ساتھ شروع ہوا ہے، اور انسان کی نجات اور کامیابی کے عوامل کو شمار کرنے کے بعد آخر میں مسئلہ معاد اور خدا کی حاکمیتِ مطلقہ کی تاکید پر ختم ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"من قرأها اعطاه الله خصلتين: العافية واليقين ما دام في دار الدنيا، فاذا مات اعطاه الله من الاجر بعدد من قرأ هذه السورة صيام يوم"۔

"جو شخص اس سورہ کو پڑھے گا جب تک وہ دنیا میں رہے گا خدا اس کو دو نعمتیں عطا کرے گا: سلامتی اور یقین، اور جب دُنیا سے رُخصت ہو جائے گا، تو ان تمام لوگوں کی تعداد کے برابر جنہوں نے اس سورہ کو پڑھا ہے، اُن سب کے ایک دن کے روزہ کا ثواب اجر کے طور پر اُسے عطا کرے گا۔"[1]

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا ہے اور آیۂ "وهذا البلد الامين"، جس میں اسم اشارہ قریب کے ساتھ مکہ کے شہر کی قسم کھائی گئی ہے، اس کی دلیل ہے۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۱۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ ۝

۲۔ وَطُورِ سِينِينَ ۝

۳۔ وَهَٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ۝

۴۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝

۵۔ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝

۶۔ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝

۷۔ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ ۝

۸۔ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ انجیر اور زیتون کی قسم (یا سرزمین شام اور بیت المقدس کی قسم)۔

۲۔ اور طور سینین کی قسم۔

۳۔ اور اس امن والے شہر (مکہ) کی قسم۔

۴۔ کہ ہم نے انسان کو بہترین صورت اور بہترین نظام میں پیدا کیا ہے۔

۵۔ پھر ہم نے اُسے پست ترین مرحلہ کی طرف لوٹا دیا۔

۶۔ سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لے آئے اور عملِ صالح بجا لائے، تو ان کے لیے ایسا اجرو ثواب ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگا۔

۷۔ پس ان تمام چیزوں کے باوجود تیرے روزِ جزا کے تکذیب کرنے کا کیا سبب ہے؟!

۸۔ کیا خدا بہترین حکم کرنے والا نہیں ہے؟

تفسیر

ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے۔

اس سُورہ کے آغاز میں بھی چار پُرمعنی قسمیں بیان کی گئی ہیں جو بہت ہی اہم معنی کے بیان کا مقدمہ ہیں۔

فرماتا ہے: "انجیر اور زیتون کی قسم" (والتّین والزیتون)۔

"اور طُورِ سینین کی قسم" (وطور سینین)[1]

اور اس امن وامان والے شہر کی قسم (وھٰذا البلد الامین)۔

"تین" لُغت میں انجیر کے معنی میں ہے اور "زیتون" وہی معروف زیتون ہے جس سے ایک مفید روغنی مادہ حاصل کیا جاتا ہے۔

اس بارے میں کہ کیا اس سے انہیں دو مشہور پھلوں کی قسم مُراد ہے یا کسی اور چیز کی، مفسّرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

اگرچہ بعض اس سے انہیں دو مشہور پھلوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، جو حد سے زیادہ غذائی اور دوائی خواص کے حامل ہیں، لیکن بعض کا نظریہ یہ ہے کہ اس سے مُراد وہ دو پہاڑ ہیں جن پر شہرِ دمشق اور بیت المقدس واقع ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں مقامات بہت سے انبیاء اور خدا کے بزرگ پیغمبروں کے قیام کی سرزمین ہیں، اور یہ دونوں قسمیں، تیسری اور چوتھی قسموں کے ساتھ، جو مقدس سرزمینوں کی قسمیں ہیں،

---

[1] بعض نے "سینین" کو "سینہ" کی جمع سمجھا ہے جو درخت کے معنی میں ہے، اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "طور" "پہاڑ" کے معنی میں ہے، تو اس کا معنی درختوں سے پُر پہاڑ ہوگا، بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "سینین" ایک زمین کا نام ہے کہ جس پر وہ پہاڑ واقع ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ "سینین" پُربرکت اور خوبصورت کے معنی میں ہے، اور یہ اہل حبشہ کی زبان کا لفظ ہے۔ (رُوح المعانی جلد ۳۰ ص ۱۷۲)

ہم آہنگ ہیں۔

اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ان دونوں پہاڑوں کو تین اور زیتون اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ ان میں سے ایک پر انجیر کے درخت اُگتے ہیں اور دُوسرے پر زیتون کے درخت۔

اور بعض نے تین کو آدم علیہ السلام کے زمانہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے، کیونکہ وہ لباس جو آدم علیہ السلام اور حوا نے جنت میں پہنا تھا وہ انجیر کے درختوں کے پتوں کا تھا، اور زیتون کو نوحؑ کے زمانہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے، کیونکہ طوفان کے آخری مراحل میں نوحؑ نے ایک کبوتر اس مقصد سے چھوڑا تھا۔ تاکہ پانی کے نیچے سے خشکی کے ظاہر ہونے کو معلوم کرے وہ (کبوتر) زیتون کی ایک شاخ لے کر واپس آیا تو نوحؑ سمجھ گئے کہ طوفان ختم گیا ہے، اور خشکی پانی کے نیچے سے ظاہر ہو گئی ہے۔ (اس لیے زیتون صلح و امنیت کی رمز ہے)۔

بعض "تین" کو اس مسجد نوحؑ کی طرف بھی اشارہ سمجھتے ہیں جو کوہ جودی پر تعمیر کی گئی تھی۔ اور زیتون کو بیت المقدس کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔

ابتدائی نظر میں تو آیت کا ظاہر وہی دو مشہور پھل ہیں، لیکن بعد والی قسموں کی طرف توجہ کرتے ہوئے دو پہاڑ یا مورد احترام دو مقدس مراکز ہی مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

اسی لیے ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ خدا نے شہروں میں سے چار شہروں کو منتخب کیا ہے اور ان کے بارے میں فرمایا ہے: والتین والزیتون وطور سینین وھٰذا البلد الامین:

"تین" مدینہ ہے، اور "زیتون" بیت المقدس، "طور سینین" کوفہ ہے اور

"ھٰذا البلد الامین" مکہ۔[1]

"طور سینین" سے مراد ظاہراً وہی "طور سینا" ہے جسے مفسرین نے اسی مشہور کوہ "طور" کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو صحرائے سینا میں ہے، اور وہاں زیتوں کے پُربار درخت موجود ہیں۔

"سینا" کو برکتوں والا یا درختوں سے پُر یا خوبصورت پہاڑ سمجھتے ہیں، اور یہ وہی پہاڑ ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام مناجات کے وقت گئے تھے۔

بعض نے اسے کوفہ کے نزدیک سرزمین نجف کا ایک پہاڑ بھی سمجھا ہے۔

اور بعض نے تصریح کی ہے کہ "سینین" اور "سینا" ایک ہی چیز ہے، اور اس کا معنی پُر برکت ہے۔

باقی رہا "ھٰذا البلد الامین" تو یہ یقیناً سرزمین مکہ کی طرف اشارہ ہے، وہ سرزمین جو زمانۂ جاہلیت میں بھی منطقۂ امن اور حرم خدا سمجھی جاتی تھی، اور کوئی شخص وہاں دوسرے پر تعرض کا حق نہیں رکھتا تھا، یہاں تک کہ مجرم اور قاتل بھی جب اس سرزمین میں

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۶۰۹ حدیث ۴۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس زمانہ میں کوفہ ایک بڑا شہر نہیں تھا، لیکن اس سرزمین سے دریائے فرات کے گزرنے کی وجہ سے یقینی طور پر بہت سی آبادیاں اس زمانہ میں بھی وہاں بھی موجود تھیں۔ (تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے بھی وہاں پر ایک شہر آباد تھا)۔ (دائرۃ المعارف مصاحب جلد ۲ مادۂ کوفہ)۔

پہنچ جاتے تھے تو وہ بھی امن میں ہوتے تھے۔

یہ سرزمین اسلام میں حد سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، اور انسان تو رہے ایک طرف اس کے جانور، درخت اور پرندے بھی خصوصیت کے ساتھ امن سے رہنے چاہئیں۔[1]

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ قرآن مجید میں لفظ "تین" صرف اسی جگہ استعمال ہوا ہے۔ جب کہ لفظ زیتون قرآن مجید میں چھ مرتبہ صراحت کے ساتھ آیا ہے، اور ایک دفعہ اشارہ کی صورت میں جہاں فرماتا ہے: وشجرة تخرج من طور سيناء تنبت بالدهن وصبغ للاٰكلين، اور وہ درخت جو طور سینا میں اُگتا ہے، اس سے کھانے والوں کے لیے روغن اور سالن فراہم ہوتا ہے۔ (مومنون - ۲۰)

اب اگر ان دونوں قسموں (تین و زیتون) کو ان کے ابتدائی معنی پر محمول کریں، یعنی معروف انجیر و زیتون پر، تو پھر بھی یہ ایک پُر معنی قسم ہے، کیونکہ:

"انجیر" بہت زیادہ غذائی قدر و قیمت کا حامل ہے، اور ہر سن و سال کے لیے ایک مقوی اور غذا سے بھرپور نوالہ ہے، جس میں چھلکا، گٹھلی اور کوئی زائد چیز نہیں ہوتی۔

غذا کے ماہرین کہتے ہیں کہ:

انجیر کو بچوں کے لیے طبیعی شکر کے طور پر استعمال کرایا جا سکتا ہے اور ورزش یا محنت مشقت کرنے والے اور بڑھاپے اور کمزوری میں مبتلا لوگ اپنی غذا کے لیے انجیر سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ "افلاطون" انجیر کو اس قدر دوست رکھتا تھا کہ بعض نے اس کا نام ہی فلسفیوں کا دوست رکھ دیا ہے۔ اور "سقراط" اس پھل کو فائدہ مند اجزاء کو جذب کرنے والا اور نقصان دہ مادوں کو دفع کرنے والا سمجھتا تھا۔

"جالینوس" نے انجیر سے پہلوانوں کے لیے ایک خاص قسم کی غذا تیار کی تھی، روم اور قدیم یونان کے پہلوانوں کو بھی انجیر دیے جاتے تھے۔

غذا شناس ماہرین کہتے ہیں کہ انجیر میں مختلف قسم کے بہت سے وٹامن اور شکر موجود ہے۔ اور بہت سی بیماریوں میں اس سے ایک دوا کے طور پر فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر جب انجیر اور شہد کو مساوی طور سے مخلوط کر دیں تو زخم معدہ کے لیے بہت ہی مفید ہے۔ خشک انجیر کا کھانا دماغ کو تقویت دیتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ انجیر میں معدنی عناصر کے وجود کی بنا پر جو قوائے بدن اور خون میں اعتدال کا سبب بنتے ہیں انجیر ہر سن و سال اور ہر قسم کے حالات میں غذا کے طور پر بہترین پھل ہے۔

ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے آیا ہے:

"التين يذهب بالبخر ويشد الفم والعظم، و ينبت الشعر و يذهب بالداء ولا يحتاج معه الى دواء وقال عليه السلام: التين اشبه شيء

---

[1] لفظ "امین" ممکن ہے کہ یہاں "فعیل" بمعنی "فاعل" ہو اور اس کا معنی "ذوالامانۃ" ہو اور یا "فعیل" بمعنی "مفعول" ہو، یعنی وہ سرزمین جس میں لوگ امن میں ہیں۔

بنبات الجنة :

" انجیر منہ کی بدبُو کو دُور کرتا ہے، مسُوڑھوں اور ہڈیوں کو مضبُوط بناتا ہے، بالوں کو اُگاتا ہے درد اور تکلیف کو برطرف کرتا ہے۔ اور اس کے ہوتے ہوئے کسی دوا کی ضرورت نہیں ہے۔
اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ انجیر جنت کے پھلوں سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے[1]، [2]

باقی رہا " زیتون" تو اس کے بارے میں غذا شناس اور بڑے بڑے ماہرین جنہوں نے سالہا سال تک پھلوں کے مختلف خواص کا مطالعہ کرنے میں اپنی عمریں صرف کی تھیں، زیتون اور اس کے تیل کی حد سے زیادہ اہمیت کے قائل ہیں، اور وہ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ جو لوگ ہمیشہ صحیح و سالم رہنا چاہیں انہیں اس حیاتی اکسیر سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔

روغن زیتون انسان کے جگر کا پکا اور مخلص دوست ہے۔ اور گُردوں کی بیماریوں، صفراوی پتھریوں اور دردِ گردہ اور دردِ جگر کو دُور کرنے اور خشکی کو رفع کرنے کے لیے بہت ہی مؤثر ہے۔

اسی بنا پر زیتون کے درخت کو قرآن مجید میں شجرۂ مبارکہ کہا گیا ہے۔

روغن زیتون بھی انواع واقسام کے وٹامن سے سرشار ہے اور اس میں فاسفورس، سلفر، کیلشیم، فیرم، پوٹاشیم اور مگنیز بھی پائی جاتی ہے۔

وُہ مرہم جو روغن زیتون اور لہسن کے ساتھ بنائی جاتی ہے گٹھیا کے دردوں کے لیے مفید بتائی جاتی ہے، پتّہ کی پتھری روغنِ زیتون کے کھانے سے ختم ہو جاتی ہے[3]

ایک روایت میں امیرالمؤمنین علی علیہ السلام سے آیا ہے:

" ما افتقر بيت يأتدمون بالخل والزيت وذالك ادام الانبياء "

" وہ گھر جس میں سرکہ اور زیتون سالن کے طور پر استعمال ہوتا ہے، وہ کبھی کھانے سے خالی نہ ہوگا اور یہ پیغمبروں کی غذا ہے"

اور ایک حدیث میں امام علی بن موسٰی رضا علیہ السلام سے آیا ہے[4]

" نعم الطعام الزيت : يطيب النكهة، و يذهب بالبلغم، و يصفى اللون ، و يشد العصب و يذهب الوصب، و يطفىء الغضب " :

" روغن زیتون ایک اچھی غذا ہے، منہ کو خوشبودار کرتا ہے، بلغم کو دُور کرتا ہے، چہرے

---

[1] " کافی " جلد ۶ ص ۳۵۸ - مرحوم علامہ مجلسی نے بحارالانوار جلد ۶۶ ص ۱۸۴ میں انجیر کے خواص کے بارے میں متعدد روایات نقل کی ہیں۔

[2] " اوّلین دانشگاہ و آخرین پیغمبر " جلد ۹ ص ۹۰ سے آگے۔

[3] " اوّلین دانشگاہ و آخرین پیغمبر " جلد ۹ ص ۱۳۰ کے بعد۔

[4] " بحارالانوار " جلد ۶۶ ص ۱۸۰ حدیث ۶

کے رنگ کو صاف کرتا ہے۔ اور تر و تازہ بناتا ہے، اعصاب کو تقویت دیتا ہے،
بیماری، درد اور ضعف کو دُور کرتا ہے، اور غصہ کی آگ کو بجھاتا ہے۔ [۱]

ہم اس بحث کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:

"کلوا الزیت وادھنوا بہ فانہ من شجرۃ مبارکۃ"۔

"روغن زیتون کھاؤ اور بدن پر اس کی مالش کرو کیونکہ یہ ایک مبارک درخت سے ہے۔" [۲]

ان چاروں پُرمعنی قسموں کو ذکر کرنے کے بعد جواب قسم پیش کرتے ہوئے اس طرح فرماتا ہے: "یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صُورت اور نظام میں پیدا کیا ہے۔"

(لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم)۔

"تقویم" کا معنی کسی چیز کو مناسب صُورت، معتدل نظام اور شائستہ کیفیت میں لانا ہے۔ اور اس کے مفہوم کی وسعت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نے انسان کو ہر لحاظ سے موزوں اور شائستہ پیدا کیا ہے، جسم کے لحاظ سے بھی، اور رُوحانی و عقلی لحاظ سے بھی، کیونکہ اس کے وجود میں ہر قسم کی استعداد رکھی گئی ہے اور اُسے ایک بہت ہی عظیم قوس صعودی کو طے کرنے کے لیے آمادہ کیا گیا ہے، اور اس کے باوجود کہ انسان ایک "جرم صغیر" ہے، "عالم کبیر" کو اس میں جگہ دی گئی ہے، اور اُسے اس قدر استعدادیں اور شائستگیاں بخشی ہیں کہ وہ ولقد کرمنا بنی ادم "ہم نے بنی آدم کو کرامت و عظمت بخشی ہے۔" (سُورۂ اسرا آیہ ۷۰) کی خلعت کے لائق ہو گیا ہے۔ وہی انسان جس کی خلقت کی تکمیل پر فرماتا ہے: فتبارک اللہ احسن الخالقین "پس وہ خدا بہت ہی بزرگ و برتر اور برکتوں والا ہے جو بہترین خلق کرنے والا ہے"!

لیکن یہی انسان ان تمام امتیازات و اعزازات کے ہوتے ہوئے اگر حق کے راستے سے منحرف ہو جائے تو اس طرح سقوط کرتا ہے کہ "اسفل السافلین" میں جا پہنچتا ہے، اس لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "پھر ہم اُسے پست ترین مراحل میں لوٹا دیتے ہیں۔" (ثم رددناہ اسفل سافلین)۔

کہتے ہیں کہ ہمیشہ بلند پہاڑوں کے ساتھ بہت ہی گہری گھاٹیاں ہوتی ہیں اور انسان کی اس تکامل وارتقاء کی قوس صعودی کے ساتھ ہی ایک وحشت ناک قوس نزولی بھی نظر آتی ہے ایسا کیوں نہ ہو کیونکہ وہ ایک ایسا موجود ہے جو ہر قسم کی استعدادیں رکھتا ہے۔ اگر وہ ان سے صلاح و درستی کے لیے فائدہ اُٹھائے تو افتخار کی بلند ترین چوٹی پر پہنچ جاتا ہے اور اگر ان تمام استعدادوں کو فساد اور خرابی کی رو پر ڈال دے تو اس سے عظیم ترین مفسدہ پیدا کر دیتا ہے، اور طبیعی طور پر وہ "اسفل السافلین" کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔

لیکن بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "مگر وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اعمال صالح انجام دیے ہیں وہ اس سے مستثنٰی ہیں، کیونکہ ان کے لیے ایسا اجر و ثواب ہے جو ختم ہونے والا نہیں ہے۔" (الا الذین امنوا وعملوا الصالحات فلھم اجر غیر ممنون)۔

---

[۱] "بحار الانوار" جلد ۶۶ ص ۱۸۳ حدیث ۲۲

[۲] وہی مأخذ ص ۱۸۲ حدیث ۱۶

"ممنون" "من" کے مادہ سے یہاں ختم ہونے یا کم ہونے کے معنی میں ہے۔ اسی بنا پر "غیر ممنون" دائمی اور ہر قسم کے نقص سے خالی اجر و ثواب کے معنی میں ہے۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ منت و احسان سے خالی مراد ہے، لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

بعض نے "ثم رددناہ اسفل سافلین" کے جملہ کی بڑھاپے کے دور کے ضعف و ناتوانی اور حد سے زیادہ ہوش کی کمی کے معنی میں تفسیر کی ہے، لیکن اس صورت میں یہ بعد والی آیت کے استثناء کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ اس بنا پر قبل و بعد کی آیات کے مجموعہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے وہی پہلی تفسیر ہی درست نظر آتی ہے۔

بعد والی آیت میں اس ناشکرے اور معاد کے دلائل اور نشانیوں سے بے اعتناء انسان کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: کیا سبب ہے کہ تو ان تمام دلائل کے باوجود روزِ جزا کی تکذیب کرتا ہے؟! (فما یکذبک بعد بالدین)۔

ایک طرف تو خود تیرے وجود کی ساخت اور دوسری طرف اس وسیع و عریض عالم کی عمارت اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ دنیا کی چند روزہ زندگی تیری خلقت اور اس عظیم جہان کی خلقت کا اصل ہدف نہیں ہو سکتی۔

یہ سب کچھ وسیع تر اور کامل تر جہان کے لیے ایک مقدمہ ہے اور قرآن کی تعبیر میں "نشأۃ اولیٰ" خود "نشأۃ اخریٰ" کی خبر دیتی ہے۔ تو پھر انسان متذکر کیوں نہیں ہوتا۔ ولقد علمتم النشأۃ الاولیٰ فلولا تذکرون۔ (واقعہ ۶۲)[1]

عالمِ نباتات ہمیشہ اور ہر سال نئے سرے سے موت و حیات کے منظر کو انسان کی آنکھ کے سامنے مجسم کرتا ہے اور جنینی دور کی پے در پے خلقتیں ہر ایک معاد اور ایک نئی زندگی شمار ہوتی ہے۔ ان تمام چیزوں کے باوجود یہ انسان روزِ جزا کا کس طرح انکار کرتا ہے۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں مخاطب نوعِ انسان ہے، اور یہ احتمال کہ یہاں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مخاطب ہے اور مراد یہ ہے کہ معاد کے دلائل کے باوجود کون شخص یا کون سی چیز تیری تکذیب کر سکتی ہے، بعید نظر آتا ہے۔

اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ "دین" سے مراد یہاں آئین و شریعت نہیں ہے، بلکہ وہی جزا اور روزِ جزا ہے۔ اس کے بعد والی آیت بھی اسی معنی کی گواہ ہے۔

جیسا کہ فرماتا ہے: "کیا خدا بہترین حکم کرنے والا اور فیصلہ کرنے والا نہیں ہے": (الیس اللہ باحکم الحاکمین)۔

اور اگر ہم دین کو کل شریعت اور آئین کے معنی میں لیں تو پھر آیت کا مفہوم و معنی اس طرح ہوگا، "کیا خدا کے احکام و فرامین سب سے زیادہ حکیمانہ اور قابلِ یقین نہیں ہیں"؟ یا یہ کہ انسان کے لیے خدا کی خلقت ہر لحاظ سے حکمت، علم اور تدبیر کے ساتھ آمیختہ ہے۔

---

[1] جلد ۱۳ ص ۳۰۶ سے آگے سورۂ واقعہ کی آیات سے استفادہ کرتے ہوئے سات دلیلیں بیان کی گئی ہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سورۂ "والتین" کی تلاوت فرماتے تھے تو جیسے ہی آیہ "الیس اللہ باحکم الحاکمین" پر پہنچتے تھے تو فرماتے تھے:

"بلی وانا علی ذالک من الشاھدین"

"ہاں، خدا احکم الحاکمین ہے، اور میں اس بات کا گواہ ہوں"۔[1]

خداوندا! ہم بھی گواہی دیتے ہیں کہ تو احکم الحاکمین ہے۔

پروردگارا! تو نے ہماری خلقت کو بہترین صورت میں قرار دیا ہے۔ ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہمارا عمل اور ہمارے اخلاق بھی بہترین صورت میں ہوں۔

بارالہا! ایمان و عمل صالح کی راہ کو طے کرنا تیرے لطف و کرم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ہم پر اس راہ میں اپنا لطف و کرم فرما۔

آمین یا رب العالمین

سورہ التین کا اختتام

اختتام ترجمہ

۱۶ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ

قم مقدس بر مکان حقیر

بروز منگل بوقت بارہ بج کر اکتالیس منٹ

احقر: صفدر حسین نجفی

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۱۲۔ یہی مضمون تفسیر "روح البیان" و "قرطبی" اور "فی ظلال" میں بھی زیر بحث آیت کے ذیل میں آیا ہے۔

سُورَۃُ اَلعَلَق

❁ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔

❁ اس میں ۱۹ آیات ہیں۔

سورہ علق کے مطالب اور فضیلت

مفسرین کے درمیان مشہور ہے کہ یہ سورہ وہ پہلا سورہ ہے جو پیغمبر گرامی اسلامؐ پر نازل ہوا اور اس کے مطالب بھی اسی بات کی تائید کرتے ہیں اور یہ بات جو بعض نے کہی ہے کہ پہلا سورہ، سورۂ "حمد" یا سورۂ "مدثر" ہے، یہ بات قطعی مشہور نہیں ہے۔

یہ سورہ پہلے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرأت و تلاوت کا حکم دیتا ہے اور اس کے بعد اس باعظمت انسان کی ایک بے قدر و قیمت قطرۂ خون سے خلقت کی بات کرتا ہے۔

اور بعد کے مرحلہ میں پروردگار کے لطف و کرم کے سائے میں انسان کے تکامل و ارتقا اور اس کی علم و دانش اور قلم سے آشنائی کے بارے میں بحث ہوتی ہے۔

اور اس کے بعد کے مرحلہ میں ان ناشکرے انسانوں کے بارے میں، جو ان تمام خدائی نعمتوں اور الطاف الٰہی کے باوجود سرکشی کی راہ اختیار کرتے ہیں، گفتگو کرتا ہے۔

اور آخر میں ان لوگوں کی دردناک سزا کی طرف اشارہ کرتا ہے جو لوگوں کو ہدایت اور نیک اعمال سے روکتے ہیں۔

اور سورہ کو "سجدہ" اور بارگاہِ پروردگار میں تقرب حاصل کرنے کے حکم پر ختم کرتا ہے۔

اس سورہ کی قرأت کی فضیلت کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"من قرأ فی یومہ اولیلتہ اقرأ باسم ربك ثم مات فی یومہ اولیلتہ مات شهیدا و بعثہ اللہ شهیدًا، و احیاہ کمن ضرب بسیفہ فی سبیل اللہ مع رسول اللہ"

جو شخص دن میں یا رات کو سورۂ اقرأ باسم ربک پڑھے گا اور وہ اس رات یا دن کو مر جائے گا تو وہ دنیا سے شہید جائے گا اور خدا اُسے شہید مبعوث کرے گا اور شہیدوں کی صف میں اُسے جگہ دے گا۔ اور وہ قیامت میں اس شخص کی مانند ہوگا جس نے راہِ خدا میں

پیغمبر اکرم نورِ مجسّم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں شمشیر سے جہاد کیا ہو۔
یہ سورہ اُن مختلف تعبیروں کی مناسبت سے جو اس سورہ کے آغاز میں آئی ہیں سورۂ "علق" یا سورہ "اقرأ" یا سورہ "قلم" کے نام سے موسوم ہوا ہے۔[1]

---

[1] تفسیر برہان، جلد ۴ ص ۴۷۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ

۲۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ

۳۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ

۴۔ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ

۵۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۗ

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے جس نے جہان کو پیدا کیا۔

۲۔ وہی جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔

۳۔ پڑھ کہ تیرا پروردگار سب سے زیادہ مکرم و باعزت ہے۔

۴۔ وہی جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی۔

۵۔ اور انسان کو وہ سب کچھ سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

شان نزول

جیسا کہ ہم نے سورہ کے مطالب کی تشریح میں بھی اشارہ کیا ہے کہ اکثر مفسرین کے نظریہ کے مطابق یہ پہلا سورہ ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا ہے، بلکہ بعض کے قول کے مطابق تو اس پر وائی پانچ آیات سب ہی مفسرین کے نزدیک آغاز وحی میں ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی تھیں اور ان کا مضمون بھی اس معنی کی تائید کرتا ہے۔

روایات میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوہ حرا پر گئے ہوئے تھے کہ جبرئیل آئے اور کہا: اے محمدؐ پڑھ: پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔

جبرئیل نے انہیں آغوش میں لے کر دبایا اور پھر دوبارہ کہا: پڑھ، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر اسی جواب کو دہرایا۔ اس کے بعد جبرئیل نے پھر وہی کام کیا اور وہی جواب سنا، اور تیسری بار کہا: اقرأ باسم ربك الذی خلق ...۔ پانچوں آیات کے آخر تک۔

جبرئیل یہ بات کہہ کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظروں سے غائب ہوگئے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو وحی کی پہلی شعاع کو حاصل کرنے کے بعد بہت تھکے ہوئے تھے خدیجہ کے پاس آئے اور فرمایا: "زملونی و دثرونی": مجھے اڑھا دو اور کوئی کپڑا میرے اوپر ڈال دو تاکہ میں آرام کروں۔[1]

"طبرسی" بھی مجمع البیان میں یہ نقل کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدیجہ سے فرمایا:

"جب میں تنہا ہوتا ہوں تو ایک آواز سن کر پریشان ہو جاتا ہوں"۔

حضرت خدیجہؓ نے عرض کیا: خدا آپ کے بارے میں خیر اور بھلائی کے سوا کچھ نہیں کرے گا کیونکہ خدا کی قسم آپ امانت کو ادا کرتے ہیں اور صلۂ رحم بجالاتے ہیں، اور جو بات کرتے ہیں اس میں سچ بولتے ہیں۔

"خدیجہؓ" کہتی ہیں: اس واقعہ کے بعد ہم ورقہ بن نوفل کے پاس گئے (نوفل خدیجہؓ کا چچا زاد بھائی اور عرب کے علماء میں سے تھا)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا وہ "ورقہ" سے بیان کیا۔ "ورقہ" نے کہا: جس وقت وہ پکارنے والا آپ کے پاس آئے تو غور سے سنو کہ وہ کیا کہتا ہے؟ اس کے بعد مجھ سے بیان کرنا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی خلوت گاہ میں سنا کہ وہ کہہ رہا ہے:

اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہو: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الحمد للہ رب العالمین الرحمٰن الرحیم مالك یوم الدین ایاك نعبد وایاك نستعین اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم ولا الضالین۔

---

[1] "ابوالفتوح رازی" جلد ۱۲ ص ۹۶، (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ، اسی مطلب کو بہت سے مفسرین عامہ و خاصہ نے بہت سے شاخ و برگ اور پھول بوٹے لگا کر نقل کیا ہے، جن میں سے بعض بالکل قابل قبول نہیں ہے۔)

اور کہو لا الٰہ الا اللہ ، اس کے بعد آپؐ ورقہ کے پاس آئے اور اس ماجرے کو
بیان کیا۔

"ورقہ نے کہا : آپؐ کو بشارت ہو ، پھر بھی آپؐ کو بشارت ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ وہی ہیں جن کی عیسٰی بن مریمؑ نے بشارت دی ہے، آپؐ موسٰی علیہ السلام کی طرح صاحب شریعت ہیں اور پیغمبر مرسل (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ آج کے بعد بہت جلد جہاد کے لیے مامور ہوں گے اور اگر میں اس دن تک زندہ رہا تو آپ کے ساتھ ہو کر جہاد کروں گا"

جب "ورقہ" دنیا سے رخصت ہو گیا تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

"میں نے اس روحانی شخص کو بہشت (برزخی جنت) میں دیکھا ہے کہ وہ جسم پر ریشمی لباس پہنے ہوئے تھا، کیونکہ وہ مجھ پر ایمان لایا تھا اور میری تصدیق کی تھی۔"[1]

یقینی طور پر مفسرین کے بعض کلمات یا تاریخ کی کتابوں میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کی اس فصل کے بارے میں ایسے ناموزوں مطالب نظر آتے ہیں جو مسلّم طور پر جعلی، وضعی، گھڑی ہوئی روایات اور اسرائیلیات سے ہیں، مثلاً یہ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نزولِ وحی کے پہلے واقعہ کے بعد بہت ہی ناراحت ہوئے اور ڈر گئے کہ کہیں یہ شیطانی القاآت نہ ہوں' یا آپ نے کئی مرتبہ اس بات کا پختہ ارادہ کر لیا کہ خود کو پہاڑ سے گرا دیں' اور اسی قسم کے فضول اور بے ہودہ باتیں جو نہ تو نبوت کے بلند مقام کے ساتھ سازگار ہیں اور نہ ہی پیغمبرؐ کی اس عقل اور حد سے زیادہ دانش مندی، مدبریت، صبر و تحمل و شکیبائی، نفس پر تسلط اور اس اعتماد کو ظاہر کرتی ہیں جو تاریخوں میں ثبت ہے۔

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اس قسم کی ضعیف و رکیک روایات دشمنانِ اسلام کی ساختہ و پرداختہ ہیں جن کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کو بھی موردِ اعتراض قرار دے دیں اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو بھی۔ جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے آیات کی تفسیر پیش کرتے ہیں۔

تفسیر

اپنے پروردگار کے نام سے پڑھ

پہلی آیت میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے : " اپنے اس پروردگار کے نام سے پڑھ جس نے سارے جہان کو خلق کیا ہے" (اقرأ باسم ربك الذی خلق)[2]

بعض نے یہ کہا ہے کہ اوپر والے جملہ میں مفعول محذوف ہے اور اصل میں اس طرح تھا اقرأ القراٰن باسم ربك اپنے

---

[1] "تفسیر مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۱۴

[2] "راغب" "مفردات" کتاب ہے "قرات" حروف و کلمات کو ایک دوسرے میں ملانے اور ضم کرنے کے معنی میں ہے، اسی لیے ایک حرف کو قرأت نہیں کہتے۔

پروردگار کے نام سے قرآن مجید پڑھو، اور اسی بناء پر بعض علماء نے اس آیت کو اس پر دلیل بنایا ہے کہ بسم اللہ قرآن کی سورتوں کا جزو ہے۔ اور بعض نے "باء" کو زائد سمجھا ہے اور یہ کہا ہے کہ اپنے پروردگار کے نام کو پڑھو ہے، لیکن یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے، کیونکہ مناسب یہ ہے کہ کہا جائے اپنے پروردگار کے نام کو یاد کر۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہاں سب سے پہلے پروردگار کی "ربوبیت" کے مسئلہ پر تکیہ ہوا ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ "رب" "مالک مصلح" کے معنی میں ہے، یعنی وہ ہستی جو کسی چیز کی مالک بھی ہے اور اس کی اصلاح و تربیت بھی کرتی ہو۔

اس کے بعد پروردگار کی ربوبیت کو ثابت کرنے کے لیے عالمِ ہستی کی خلقت و آفرینش پر تکیہ ہوا ہے، کیونکہ اس کی ربوبیت کی بہترین دلیل اس کی خالقیت ہے، اور عالم کی تدبیر وہی کر سکتا ہے جس نے اس کو خلق کیا ہے۔

یہ حقیقت میں عرب کے مشرکوں کا جواب ہے جو خدا کی خالقیت کو تو قبول کرتے تھے لیکن ربوبیت اور تدبیر کے ضمن میں بتوں کے قائل تھے۔ اس کے علاوہ نظامِ ہستی میں خدا کی ربوبیت اور اس کی تدبیر اس کی ذاتِ مقدس کو ثابت کرنے کی بہترین دلیل ہے۔

اس کے بعد تمام مخلوقات میں سے عالمِ خلقت کے اہم ترین موجود اور آفرینش کے گل سرسبد یعنی انسان پر تکیہ کرتا ہے اور اس کی آفرینش کو ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہی خدا جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا"۔ (خلق الانسان من علق)۔

"من علق" اصل میں کسی چیز کے چپک جانے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے جمے ہوئے خون کو اور اسی طرح "جونک" کو جو خون چوسنے کے لیے بدن سے چپک جاتی ہے "علق" کہتے ہیں، اور چونکہ نطفہ عالمِ جنین کا پہلا دور گزارنے کے بعد جمے ہوئے اور چپکے ہوئے خون کے ٹکڑے کی صورت اختیار کر لیتا ہے، جو ظاہر میں بہت ہی کم قدر و قیمت رکھتا ہے لہٰذا اس آیت میں انسان کی خلقت کا مبداء اسی ناچیز موجود کو شمار کرتا ہے تاکہ پروردگار کی عظیم قدرت نمائی واضح ہو جائے جس نے اس قسم کی بے قدر و قیمت موجود سے ایسی قابلِ قدر اور قیمتی مخلوق پیدا کر دی ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ علق سے مراد یہاں آدم علیہ السلام کی مٹی ہے جو چپکنے کی حالت بھی رکھتی تھی، اور یہ بات واضح ہے کہ وہ خدا جو اس عجیب مخلوق کو اس "چپکی ہوئی مٹی" کے ایک ٹکڑے سے وجود میں لایا ہے، وہی ہر قسم کی حمد و ستائش کے لائق ہے۔

کبھی "علق" کو "صاحبِ عَلاقہ" وجود کے معنی میں لیا ہے، جو انسان کی اجتماعی رُوح اور ان کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلق کی طرف ایک اشارہ ہے، اور یہ حقیقت میں تکامل بشر اور تمدنوں کی پیش رفت کا پایہ اصلی ہے۔

بعض "علق" کو نر کے نطفہ (سپرم) کی طرف بھی اشارہ سمجھتے ہیں جو "جونک" کے ساتھ بہت زیادہ مناسبت رکھتا ہے یہ خورد بینی موجود نطفہ کے پانی میں تیرتا ہے، رحم میں عورت کے نطفہ کی طرف بڑھتا ہے، اس کے ساتھ چپک جاتا ہے اور ان دونوں کی ترکیب سے انسان کا کامل و مکمل نطفہ وجود میں آتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس زمانہ میں یہ مسائل تحقیق و دریافت نہیں ہوئے تھے، لیکن قرآن مجید نے ہمیشہ اعجاز کے طریق سے اس سے پردہ اُٹھایا ہے۔ ان چاروں تفاسیر میں سے پہلی تفسیر زیادہ واضح معلوم ہوتی ہے، اگرچہ چاروں تفسیروں کے درمیان جمع کرنے میں

۱۔ اس صورت میں "باء" ملابست کے لیے ہے۔

بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ " انسان " ایک تفسیر کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کے معنی میں ہے اور دوسری تین تفاسیر کے مطابق مطلق انسانوں کے معنی میں ہے۔

دوبارہ تاکید کے لیے مزید کہتا ہے : " پڑھ کہ تیرا پروردگار ہر کریم سے زیادہ کریم اور ہر بزرگوار اور باعزت سے بڑھ کر بزرگوار اور باعزت ہے " : (اقرأ و ربك الاكرم)[1]

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ دوسرا " اقرأ " اسی " اقرأ " کی ایک تاکید ہے جو اس سے پہلی آیات میں ہے۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ اُس سے مختلف ہے۔ پہلے جملہ میں پیغمبرؐ کا اپنے لیے پڑھنا مراد ہے، اور دوسرے جملہ میں لوگوں کے لیے پڑھنا۔ لیکن تاکید زیادہ مناسب نظر آتی ہے کیونکہ اس فرق پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

بہرحال اس آیت کی تعبیر حقیقت میں پیغمبرؐ کی اس گفتگو کا جواب ہے جو جبرئیل کے جواب میں آپ نے کہی تھی کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ یعنی پروردگار کی برکت سے جو خود سے زیادہ کریم و بزرگوار ہے تو قرأت و تلاوت کی طاقت و توانائی رکھتا ہے۔

اس کے بعد اس خدا کی توصیف کرتے ہوئے جو سب کریموں سے بڑھ کر کریم و بزرگوار ہے، فرماتا ہے :

" وہی ہستی جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی " : (الذی علم بالقلم) ۔

" اور انسان کو وہ سب کچھ سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا " (علم الانسان مالم یعلم) ۔

یہ آیات بھی درحقیقت پیغمبرؐ کی اُسی گفتگو کا جواب ہیں جس میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ :

" میں قرأت کرنے والا نہیں ہوں " یعنی وہی خدا جس نے انسان کو قلم کے ذریعے تعلیم دی ہے اور جو کچھ انسان نہیں جانتا تھا اُسے سکھایا ہے، وہ اِس بندے کو بھی جس نے کسی سے سبق نہیں پڑھا ہے قرأت و تلاوت سکھانے کی قدرت رکھتا ہے۔

" الذی علم بالقلم " کے جملہ کے دو معنی نکلتے ہیں، ایک یہ کہ : خدا نے انسان کو لکھنا اور کتابت کرنا سکھایا، اور اس عظیم کام کی قدرت و توانائی، جو تاریخ بشر کا مبدء اور تمام علوم و فنون اور تمدنوں کا سرچشمہ ہے، اس میں ایجاد کی۔

دوسرا یہ کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کو اس طریق سے اور اس وسیلہ سے علوم و فنون سکھائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک تفسیر کے مطابق تو لکھنے کی تعلیم مراد ہے، اور دوسری تفسیر کے مطابق وہ علوم مراد ہیں جو کتابت کے ذریعہ انسان تک پہنچے ہیں۔

بہرحال یہ ایک ایسی پُرمعنی تعبیر ہے، جو نزولِ وحی کے ان حساس لمحات میں ان عظیم اور پُرمعنی آیات میں منعکس ہوگئی ہے

---

[1] " وربك الاكرم " کا جملہ، جملہ اسمیہ استینافیہ ہے اور " مبتدا " اور " خبر " سے مرکب ہے۔

چند نکات

۱۔ وحی کا آغاز ایک حرکت علمی کے آغاز کے ساتھ ہوا

یہ آیات ، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ، اکثر مفسرین یا تمام کے تمام مفسرین کے نظریہ کے مطابق وہ سب سے پہلی آیات ہیں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب پاک پر نازل ہوئی تھیں اور وحی کی پہلی شعاعوں کی روشنی سے تاریخ بشریت میں ایک نئی فصل کا آغاز ہوا ، اور نوع انسانی ایک عظیم ترین الطاف الٰہی کی مشمول ہوئی ، اور خدا کا وہ اکمل ترین دین جو سارے دینوں کا نقطۂ اختتام تھا ، نازل ہوا ، اور تمام احکام اور اسلامی تعلیمات کے نزول کے بعد الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا ۔ (مائدہ ۔۳) کے مطابق دین الٰہی کی تکمیل ہوئی اور اس کی نعمت حد کمال کو پہنچ گئی اور اسلام خدا کا پسندیدہ دین قرار پایا ۔

یہاں ایک بہت ہی عمدہ موضوع ہے اور وہ یہ ہے ، کہ باوجود اس بات کے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم " اُمّی " تھے اور آپ نے کسی سے درس نہیں لیا تھا ، اور حجاز کے ماحول کو سراسر جہالت و نادانی کے ماحول نے گھیر رکھا تھا ، وحی کی پہلی آیات میں " علم " اور " قلم " کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی ، جو ان آیات میں خلقت و آفرینش جیسی عظیم نعمت کے فوراً بعد بلا فاصلہ ذکر ہوا ہے ۔

حقیقت میں یہ آیات پہلے انسانی جسم کی ایک بے قدر و قیمت لوتھڑے " علقہ " جیسے موجود سے تکامل و ارتقاء کی خبر دیتی ہیں ، اور دوسری طرف سے رُوح کے تکامل کی ، تعلیم و تعلّم کے ذریعے ، خصوصاً قلم کے ذریعے بات کرتی ہیں ۔

جس دن یہ آیات نازل ہو رہی تھیں اس دن نہ صرف حجاز کے ماحول میں ، جو جہالت کا ماحول تھا ، کوئی شخص قلم کی قدر و منزلت کا قائل نہ تھا بلکہ اس زمانہ کی متمدن دُنیا میں بھی قلم کی کم ہی قدر کی جاتی تھی ۔

لیکن آج کے زمانہ میں ہم جانتے ہیں کہ وہ تمام تمدن ، علوم و فنون اور ترقیاں جو ہر میدان میں نوع بشر کو نصیب ہوئی ہیں ، قلم کے محور کے گرد ہی گردش کرتی ہیں ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ " مداد علماء " (علماء کے قلم کی سیاہی) " دماء شہداء " (شہداء کے خون) پر سبقت لے چکی ہے کیونکہ شہید کے خون کی بُنیاد اور اس کی پشتیبان علماء کے قلموں کی سیاہی ہی ہے ، اور اصولی طور پر انسانی معاشروں کی سرنوشت پہلے درجہ میں قلم کی نوک سے ہی لکھی گئی ہے ۔

انسانی معاشروں کی اصلاحی باتیں مؤمن و متعہد قلموں سے لکھی جاتی ہیں ، اور معاشروں کے فساد اور تباہیوں کی باتیں بھی مسموم اور فاسد قلموں سے ہی تحریر میں آتی ہیں ۔

یہ بات بلا وجہ نہیں ہے کہ قرآن مجید نے قلم کی اور جو کچھ قلم سے لکھتے ہیں ، اس کی قسم کھائی ہے ۔ یعنی " آلہ " کی قسم بھی کھاتا ہے اور جو کچھ اس سے حاصل ہوتا ہے اس کی قسم بھی ، جیسا کہ فرماتا ہے : " نٓ والقلم وما یسطرون " (قلم ۔۱)

ہم جانتے ہیں کہ بشر کی زندگی کے ادوار کو دو ادوار میں تقسیم کرتے ہیں ۔

۱۔ تاریخ کا دور

۲۔ قبل از تاریخ کا دور

تاریخ کا دور وہ ہے جس میں قلم، پڑھنے اور لکھنے کا زمانہ شروع ہوا، اور انسان اس قابل ہوگیا کہ قلم کے ذریعے اپنی زندگی کی کوئی چیز لکھ سکے، اور آنے والے لوگوں کے لیے بطور یادگار چھوڑ جاتے۔ اس طرح تاریخ بشر قلم اور خط کی تاریخ کے برابر ہے۔

ہم نے انسانوں کی زندگی میں قلم کے اثرات کے بارے میں تفسیر نمونہ کی جلد ۱۴ میں سورہ قلم سے آغاز میں ایک مفصل اور مبسوط تشریح پیش کی ہے۔

اسی بنا پر ابتدا سے ہی اسلام کی بنیاد علم و قلم پر رکھی گئی ہے، اور یہ بات بلا وجہ نہیں ہے کہ اس قسم کی پس ماندہ قوم علوم و فنون میں اس قدر ترقی کرگئی کہ، دوست و دشمن کے اعتراف کے مطابق، انہوں نے ساری دنیا میں علم و دانش کو پھیلا دیا اور یورپ کے مورخین کے اعتراف کے مطابق یہ مسلمانوں کا نور علم و دانش ہی تھا جو قرون وسطیٰ میں تاریک یورپ کے صفحہ پر چمکا اور انہیں تمدن عصر میں داخل کرگیا۔

اور اس سلسلہ میں خود انہیں کی طرف سے بہت سی کتابیں "تاریخ تمدن اسلام" یا "میراث اسلام" کے عنوان سے لکھی گئی ہیں۔

کس قدر نامناسب بات ہے کہ اس قسم کی ملت اور ایسا دین علم و دانش کے میدان میں پیچھے رہ جائے اور دوسروں کا محتاج ہو جائے، یہاں تک کہ ان سے وابستہ ہو جائے۔

۲۔ ہر حال میں ذکرِ خدا

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کا آغاز خدا کے نام کے ذکر سے شروع ہوا "اقرأ باسم ربك" اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ آپ کی بھرپور زندگی ذکرِ خدا اور یادِ خدا سے ملی ہوئی تھی۔

آپ کا ہر سانس ذکرِ خدا کے ساتھ وابستہ تھا۔ کھڑے ہوتے، بیٹھتے، سوتے، چلتے، سوار ہوتے، پیادہ چلتے یا توقف کرتے سب یادِ خدا کے ساتھ اور "اللہ" کے نام کے ساتھ تھا۔

جب آپ نیند سے بیدار ہوتے تھے تو فرماتے تھے،

"الحمد لله الذی احیانا بعد ما اماتنا والیه النشور"

"حمد کے لائق وہی ہے جس نے ہمیں موت کے بعد زندگی بخشی اور اسی کی جانب ہم سب نے لوٹ کر جانا ہے":

"ابن عباس کہتے ہیں کہ ایک رات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہاں سویا ہوا تھا۔ جب آپ بیدار ہوئے تو آپ نے آسمان کی طرف سر کو بلند کیا اور سورۂ آل عمران کی آخری دس آیات کی تلاوت فرمائی۔ ان فی خلق السماوات والارض واختلاف اللیل والنهار ۔۔۔

پھر عرض کیا،

اللّٰھم لك الحمد انت نور السّمٰوات والارض و من فیھن ۔ ۔ ۔ ۔ اللّٰھم لك اسلمت و بك اٰمنت وعلیك توکلت والیك انبت ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔

" خدایا سب تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں، تو ہی آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے، سب کا نور ہے ۔ ۔ ۔ ۔ خدایا میں تیرے سامنے سرِ تسلیم خم کر چکا ہوں، تجھ پر ایمان لا چکا ہوں ، تجھ پر توکل کر چکا ہوں، اور تیری طرف لوٹ چکا ہوں "۔

جس وقت آپ گھر سے نکلتے تو فرماتے :

" بسم اللہ، توکلت علی اللہ، اللّٰھم انی اعوذ بك ان اضل او اضل، او ازل، او اظلم، او اظلم، او اجھل، او یجھل علیّ "۔

" اللہ کے نام سے، میں اللہ پر توکل کرتا ہوں، خدایا میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں گمراہ ہو جاؤں ، یا کسی کی گمراہی کا سبب بنوں، یا میں پھسل جاؤں ، یا کسی پر ظلم کروں یا ظلم کیا جاؤں ، یا جہالت سے کام لوں ، یا مجھ سے جہالت کا برتاؤ کیا جائے "۔

جب آپ مسجد میں داخل ہوتے تو فرماتے :

" اعوذ باللہ العظیم ، و بوجھہ الکریم و سلطانہ القدیم من الشیطان الرجیم "

" میں عظیم خدا سے اور اس کی کریم ذات سے اور اس کی قدیم سلطنت کے ذریعہ راندۂ درگاہ شیطان سے پناہ مانگتا ہوں "۔

اور جس وقت آپ نیا لباس زیبِ تن کرتے تو فرماتے :

" اللّٰھم لك الحمد انت کسوتنیہ اسئلك خیرہ و خیر ما صنع لہ و اعوذ بك من شرہ و شر ما صنع لہ "

" خدایا سب تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں۔ تو نے ہی یہ لباس مجھے پہنایا ہے۔ میں تجھ سے اس کی خیر چاہتا ہوں اور جس خیر کے لیے یہ بنا ہے اور تجھ سے اس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں اور جس شر کے لیے یہ بنا ہے "۔

اور جب گھر کی طرف لوٹتے تو فرماتے :

" الحمد للہ الذی کفانی و اٰوانی والحمد للہ الذی اطعمنی واسقانی ۔

" حمد ہے اس اللہ کی جس نے میری کفایت کی اور مجھے پناہ دی اور حمد ہے اس اللہ کی جس نے مجھے کھلایا اور پلایا ۔

اور اسی طرح آپ کی تمام زندگی یادِ خدا ، نامِ خدا اور الطافِ خدا کے تقاضوں سے گوندھی ہوئی اور ملی ہوئی تھی [1]

[1] فی ظلال القرآن جلد ۸ ص ۶۱۹ سے آگے (بہت زیادہ تلخیص کے ساتھ)۔

۶۔ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۙ

۷۔ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۭ

۸ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۭ

۹۔ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۙ

۱۰۔ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۭ

۱۱۔ اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى ۙ

۱۲۔ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ۭ

۱۳۔ اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۭ

۱۴۔ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ۭ

ترجمہ

۶۔ ایسا نہیں ہے کہ انسان حق شناس ہو، یقیناً وہ سرکشی کرتا ہے۔

۷۔ اس وجہ سے کہ وُہ خود کو بے نیاز سمجھتا ہے۔

۸۔ یقینی طور پر سب کی بازگشت تیرے پروردگار کی طرف ہے۔

۹۔ مجھے بتا کیا وہ شخص جو نہی کرتا ہے۔

۱۰۔ بندہ کو جب وہ نماز پڑھتا ہے (کیا وہ مستحق عذاب الٰہی نہیں؟)

۱۱۔ مجھے بتا اگر یہ بندہ طریقِ ہدایت پر ہو۔

۱۲۔ یا لوگوں کو تقویٰ کا حکم دے (کیا اُسے نہیں کرنا مناسب ہے؟)

۱۳۔ مجھے بتا اگر (یہ سرکش) حق کی تکذیب کرے اور اس کی طرف سے پُشت پھیر لے (تو اس کی کیسی دردناک سرنوشت ہوگی؟)

۱۴۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ خدا اس کے تمام اعمال کو دیکھتا ہے؟

تفسیر

کیا تجھے معلوم نہیں کہ خدا تیرے تمام اعمال کو دیکھتا ہے؟

گزشتہ آیات کے بعد، جن میں انسان کے لیے پروردگار کی مادّی و معنوی نعمتوں کی طرف اشارہ ہوا تھا، اور ایسی وسیع نعمتوں کا لازمہ یہ ہے کہ انسان شکر ادا کرے اور خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ لہٰذا زیرِ بحث آیات میں فرماتا ہے: ایسا نہیں ہے کہ خدائی نعمتیں ہمیشہ ہی انسان میں شکرگزاری کی رُوح بیدار کرتی ہوں، بلکہ وہ یقینی طور پر طغیان و سرکشی کرتا ہے۔" (کلآ ان الانسان لیطغیٰ)[1]

"اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز سمجھنے لگ جاتا ہے": (ان راٰہ استغنیٰ)[2]

یہ عام لوگوں کی فطرت ہے، ان لوگوں کی فطرت اور عادت جنہوں نے عقل و وحی کے مکتب میں پرورش نہ پائی ہو، چنانچہ جب وہ اپنے آپ کو بے نیاز سمجھنے لگ جاتے ہیں تو سرکشی و طغیان شروع کر دیتے ہیں۔

نہ تو وہ خدا کا بندہ بنتے ہیں، نہ اس کے احکام کو قبول کرتے ہیں، نہ وجدان کی پکار پر کان دھرتے ہیں اور نہ ہی حق و

---

[1] جو کچھ ہم نے اُوپر بیان کیا ہے "کلا" اس چیز کو روکنے کے لیے ہے جو گزشتہ آیات کے مضمون کا لازمہ ہے، اور بعض نے "حقاً" کے معنی میں بھی لیا ہے جو تاکید کے لیے ہے۔

[2] "ان راٰہ استغنیٰ" کا جملہ مفعول لاجلہ ہے اور تقدیر میں "لان ... ہے، اور رؤیت یہاں علم کے معنی میں ہے، لہٰذا اس کے دو مفعول ہوئے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ رؤیت حس کے معنی میں ہو اور "استغنیٰ" بمنزلہ "حال" کے ہو۔

عدالت کا خیال کرتے ہیں۔

انسان اور کوئی بھی دوسری مخلوق ہرگز بے نیاز اور مستغنی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ تمام ممکن موجودات ہمیشہ خدا کے لطف اور نعمتوں کے محتاج اور نیاز مند رہتے ہیں۔ اور اگر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا فیض و کرم منقطع ہو جائے تو ٹھیک اسی لمحہ سب کے سب نابود و فنا ہو جائیں۔ البتہ انسان بعض اوقات غلطی سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھنے لگ جاتا ہے، اور آیت کی تعبیر لطیف بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے، جو یہ کہتی ہے کہ: "وہ خود کو بے نیاز سمجھنے لگ جاتا ہے" یہ نہیں کہتی کہ وہ بے نیاز ہو جاتا ہے:

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں "انسان" سے مراد خصوصیت کے ساتھ "ابوجہل" ہے۔ جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے آغاز ہی سے مخالفت کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔ لیکن مسلمہ طور پر یہاں "انسان" ایک مفہوم کلی رکھتا ہے، اور "ابوجہل" جیسے افراد اس کے مصادیق ہیں۔

بہر حال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا ہدف اور مقصد یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ لوگ فوراً ہی ان کی دعوت کو قبول کر لیں گے۔ بلکہ انہیں چاہیئے کہ وہ خود کو سرکش متکبرین کے انکار اور مخالفت کے لیے آمادہ و تیار رکھیں اور یہ جان لیں کہ ایک نشیب و فراز سے بھرا ہوا راستہ ان کے سامنے ہے۔

اس کے بعد ان متکبر سرکشوں کو تہدید کرتے ہوئے فرماتا ہے: "یقیناً سب کی بازگشت تیرے پروردگار کی طرف ہے": (ان الی ربک الرجعٰی)۔

اور وہی سرکشوں کو ان کے کیفر کردار تک پہنچاتا ہے۔

اصولی طور پر جس طرح کہ ہر چیز کی بازگشت اس کی طرف ہے اور سب مر جائیں گے، اور آسمان و زمین کی میراث اس کی پاک ذات کے لیے رہ جائے گی: وللہ میراث السماوات والارض (آل عمران ۔۔۱۸۰) ابتدا میں بھی تمام چیزیں اسی کی طرف سے تھیں، اور اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ انسان خود کو بے نیاز سمجھنے لگ جائے، اور مغرور ہو کر سرکش بن جائے۔

اس کے بعد مغرور سرکشوں کے کاموں کے ایک حصہ، یعنی راہ حق پر چلنے اور ہدایت و تقویٰ کے طریق کو طے کرنے سے روکنے کو بیان کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "مجھے بتا کیا وہ شخص جو منع کرتا ہے"۔ (ارءیت الذی ینھٰی)۔

"بندہ کو جب کہ وہ نماز پڑھتا ہے"۔ (عبدًا اذا صلّٰی)

کیا ایسا آدمی عذاب الٰہی کا مستحق نہیں ہے؟!

احادیث میں آیا ہے کہ "ابوجہل" نے اپنے اطرافیوں سے سوال کیا! کیا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے سامنے بھی (سجدہ کرتے ہوئے) مٹی پر چہرے کو رکھتا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! اس نے کہا: قسم ہے اس کی جس کی ہم قسم کھاتے ہیں، اگر میں اُسے اس حالت میں دیکھوں گا تو اپنے پاؤں سے اس کی گردن کو کچل کر رکھ دوں گا۔ انہوں نے اس سے کہا: وہ دیکھو! وہ اس جگہ نماز پڑھنے میں مشغول ہے۔ ابوجہل چلا تاکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گردن کو اپنے پاؤں کے نیچے کچلے۔ لیکن جب وہ قریب پہنچا تو پیچھے ہٹ گیا اور ایسا معلوم دیتا تھا جیسے کہ وہ کسی چیز کو اپنے ہاتھ سے ہٹا رہا ہے۔ ان لوگوں نے اس سے کہا، ہم تیری یہ کیا حالت دیکھ رہے ہیں؟ اس نے کہا: میں نے اچانک اپنے اور اس کے درمیان آگ کی ایک خندق دیکھی ہے، اور ایک وحشت ناک منظر اور کچھ پر و بال مشاہدہ

کیسے ہیں!

اس موقع پر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "قسم ہے اس کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر وہ میرے قریب آجاتا تو خدا کے فرشتے اس کے بدن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے اور اس کے ایک ایک عضو کو اچک کر لے جاتے"!

اس موقع پر اُوپر والی آیات نازل ہوئیں۔[1]

ان روایات کے مطابق اُوپر والی آیات آغازِ بعثت میں نازل نہیں ہوئیں، بلکہ اس وقت نازل ہوئیں جب اسلام کی دعوت برملا ہو چکی تھی۔ اسی لیے ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ اس سورت کی صرف پہلی پانچ آیات ہی آغازِ بعثت میں نازل ہوئی تھیں، اور باقی کافی مدت کے بعد نازل ہوئیں۔

لیکن بہرحال یہ شانِ نزول آیت کے مفہوم کی وسعت سے مانع نہیں ہے۔

بعد والی آیت میں اور زیادہ تاکید کے لیے مزید کہتا ہے: "مجھے بتا اگر یہ نماز گزار بندہ طریق ہدایت پر ہو" (ارءیت ان کان علی الھدیٰ)۔

"یا لوگوں کو تقویٰ کا حکم دے"۔ (او امر بالتقویٰ)۔ کیا اس کو منع کرنا مناسب ہے، اور کیا اس قسم کے شخص کی سزا جہنم کی آگ کے علاوہ کچھ اور ہو سکتی ہے!؟

"مجھے بتا اگر یہ سرکش آدمی جو راہِ حق کے راہ رو افراد کو نماز، ہدایت اور تقویٰ سے روکتا ہے اگر حق کی تکذیب کرے، اور اس سے رُوگردانی کرے، تو اس کی کیسی دردناک سرنوشت ہوگی"!؟ (ارءیت ان کذب و تولّٰی)[2]

"کیا وہ نہیں جانتا کہ خدا اس کے تمام اعمال کو دیکھتا ہے، اور ان سب کو حساب و کتاب اور جزا و سزا کے لیے ثبت و ضبط کر رہا ہے"۔ (الم یعلم بان اللّٰہ یریٰ)۔

اُوپر والی آیات میں قضیہ شرطیہ کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس مغرور سرکش کو کم از کم یہ احتمال تو دینا چاہیئے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طریقِ ہدایت پر ہیں، اور اُن کی دعوت تقویٰ کی طرف دعوت ہے، یہی احتمال اس کی سرکشی کو روکنے کے لیے کافی ہے۔

اس بنا پر ان آیات کا مفہوم، پیغمبرؐ کی تقویٰ کی طرف دعوت، اور ہدایت میں تردید نہیں ہوگا، بلکہ یہ اُوپر والے باریک نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔

بعض مفسرین نے "کان" و "امر" کی ضمیر کو اسی نہی کرنے والے شخص کی طرف لوٹایا ہے، جیسا کہ "ابوجہل" تھا۔ اس بنا پر آیات کا مفہوم اس طرح ہو جائے گا، اگر وہ ہدایت کو قبول کر لے اور نماز سے منع کرنے کی بجائے تقویٰ کی دعوت کرے تو اس کی حالت کے لیے یہ کتنا مفید ہوگا؟

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

---

[1] تفسیر "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۱۵

[2] بہت سے مفسرین کے قول کے مطابق اُوپر والی تینوں آیات میں "رأیت" کے جملے "اخبرنی" کے معنی میں ہیں، جس کا ہم "مجھے بتاؤ" کے ساتھ ترجمہ کرتے ہیں اور ان آیات میں جو شرطیں آئی ہیں ان کے جواب محذوف ہیں اور تقدیر میں اس طرح ہے کیف یکون حالہ و مجازاتہ وعذابہ؟: ایسے انسان کی سرنوشت اور سزا و عذاب کیسا ہوگا؟

ایک نکتہ

عالم ہستی محضرِ خدا میں ہے

اس واقعیت کی طرف توجہ کہ انسان جو کام بھی انجام دیتا ہے وہ خدا کے سامنے ہے، اور اصولاً " تمام عالم ہستی محضرِ خدا میں ہے" اور انسان کے اعمال میں سے کوئی بھی چیز، یہاں تک کہ اس کی نیات بھی خدا سے پنہاں نہیں ہیں، انسان کی زندگی کے پروگرام پر زیادہ اثر انداز ہو سکتی ہے، اور اس کو غلط کاریوں سے روک سکتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ واقعی اس مطلب پر ایمان رکھتا ہو اور اس نے ایک قطعی یقین کی صورت اختیار کر لی ہو۔

ایک حدیث میں آیا ہے:

" اعبدالله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك۔"

" خدا کی اس طرح عبادت کر گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے، اور اگر تو اسے نہیں دیکھ سکتا تو وہ تجھے اچھی طرح سے دیکھ رہا ہے۔"

کہتے ہیں کہ ایک بیدار دل نے گناہ کے بعد توبہ کر لی تھی، لیکن ہمیشہ روتا رہتا تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ تو اتنا کیوں روتا ہے؟ کیا تو نہیں جانتا کہ خداوند تعالیٰ بخشنے والا ہے؟ اس نے کہا، ہاں! ممکن ہے کہ وہ معاف کر دے، لیکن یہ خجالت و شرمساری کہ اس نے مجھے گناہ کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے، اس کو اپنے سے کیسے دور کروں!!

گیرم کہ تو از سرِ گنہ در گزری

زان شرم کہ دیدی کہ چہ کردم چکنم؟

میں نے مانا کہ تو میرے گناہ کو ضرور معاف کر دے گا۔

لیکن اس شرم کا کیا کروں کہ تو نے یہ دیکھ لیا ہے کہ میں نے کیا کیا ہے؟

۱۵۔ كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ ۬ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۙ

۱۶۔ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۚ

۱۷۔ فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۙ

۱۸۔ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۙ

۱۹۔ كَلَّا ۭ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۩ السجدۃ

ترجمہ

۱۵۔ جیسا کہ وُہ خیال کرتا ہے ایسا نہیں ہے ، اگر وُہ اپنے کام سے دستبردار نہ ہوگا تو ہم اس کی ناصیہ (اس کے سر کے اگلے حصّہ کے بال) پکڑ کر (عذاب کی طرف کھینچ لے جائیں گے)

۱۶۔ وہی دروغ گو اور خطا کار ناصیہ (پیشانی)

۱۷۔ پھر وُہ جسے چاہے پُکارتا رہے (کہ وہ اس کی مدد کرے)

۱۸۔ ہم بھی عنقریب دوزخ کے مامورین کو پکاریں گے۔

۱۹۔ جیسا کہ وُہ سمجھتا ہے ، ایسا نہیں ہے ، ہرگز اس کی اطاعت نہ کر ، اور سجدہ کر ، اور خدا کا تقرب حاصل کر۔

تفسیر

سجدہ کر اور تقرب حاصل کر!

اس بحث کے بعد، جو گزشتہ آیات میں کافر سرکشوں، اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور نماز گزاروں کے لیے ان کی مزاحمت کے بارے میں آئی تھی، ان آیات میں اُن پر سخت دھمکیوں کی بارش کرتے ہوئے فرماتا ہے، "جیسا کہ وہ خیال کرتا ہے ایسا نہیں ہے (وہ یہ گمان کرتا ہے کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گردن پر ان کے سجدہ کے وقت پاؤں رکھ سکتا ہے، اور انہیں اس عبادتِ خُدا سے روک سکتا ہے)" (کلا)۔

"اگر وہ اپنے اس غرور اور جہالت سے دستبردار نہ ہوگا تو ہم اس کے سر کے اگلے حصّہ کے بالوں کو پکڑ کر اُسے عذاب کی طرف کھینچ لے جائیں گے۔" (لئن لم ینتہ لنسفعًا بالناصیۃ)۔

"وہی دروغ گو اور خطا کار کے سر کا اگلا حصّہ (پیشانی)" (ناصیۃ کاذبۃ خاطئۃ)۔

"لنسفعًا" "سفع" (بروزن عفو) کے مادہ سے بعض مفسرین کے قول کے مطابق مختلف معنی رکھتا ہے: پکڑنا، اور سختی کے ساتھ کھینچنا، منہ پر طمانچہ مارنا، منہ کو کالا کرنا۔ (ان تین پتھروں کو بھی، جو دیگ کو آگ پر رکھتے وقت دیگ کے پایے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، سفع کہا جاتا ہے کیونکہ وہ سیاہ اور دھوئیں سے آلودہ ہوتے ہیں)۔ اور آخری بات نشان زدہ کرنے اور ذلیل کرنے کے لیے آتا ہے۔[1]

اور یہاں سب سے زیادہ مناسب وہی پہلا معنی ہے۔ اگرچہ زیر بحث آیت میں دوسرے معانی کا احتمال بھی ہے۔

بہرحال کیا اس سے مراد یہ ہے کہ یہ ماجرا قیامت میں واقع ہوگا کہ ابوجہل جیسے افراد کے سر کے اگلے حصّہ کے بالوں کو پکڑیں گے اور جہنم کی طرف کھینچ کر جائیں گے، یا دنیا میں پورا ہوجائے گا، یا دونوں باتیں ہوں گی؟ یہ بات بعید نہیں ہے کہ دونوں ہی مُراد ہوں، اور اس کا گواہ ذیل کی روایت ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے:

"جس وقت سورۂ الرحمٰن نازل ہوا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

"تم میں سے کون ہے؛ جو اس سُورہ کو رؤسائے قریش کے سامنے جا کر پڑھے؟"

حاضرین کچھ دیر کے لیے خاموش رہے چونکہ وہ سردارانِ قریش کی ایذا رسانی سے ڈرتے تھے۔

"عبداللہ بن مسعود" کھڑے ہوگئے اور کہا: اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مَیں یہ کام کروں گا...... ابن مسعودؓ چھوٹے سے جُثّہ کے تھے اور جسمانی لحاظ سے کمزور بھی تھے، کھڑے ہوکر سردارانِ قریش کے پاس پہنچ گئے۔ انہیں دیکھا کہ وہ کعبہ کے گرد اکٹھے بیٹھے ہیں، لہٰذا (ابن مسعود نے) سُورہ الرحمٰن کی تلاوت شروع کردی۔

---

[1] "فخر رازی" جلد ۳۲ ص ۲۲

"ابوجہل نے کھڑے ہو کر ابن مسعودؓ کے منہ پر ایسا تھپیڑ مارا کہ ان کا کان پھٹ گیا اور خون جاری ہو گیا۔

ابن مسعودؓ روتے ہوئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، جب پیغمبرؐ کی نگاہ ان پر پڑی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دکھ ہوا۔ آپؐ نے سر نیچے کر لیا اور گہرے غم و اندوہ میں ڈوب گئے۔

اچانک جبرئیل نازل ہوئے جب کہ وہ خنداں اور مسرور تھے، آپ نے فرمایا: اے جبرئیل تم کس لیے ہنس رہے ہو جب کہ ابن مسعود رو رہا ہے؛ (جبرئیل نے) عرض کیا عنقریب آپؐ کو اس کی وجہ معلوم ہو جائے گی۔

یہ ماجرا گزر گیا۔ جب مسلمان جنگِ بدر کے دن کامیاب و کامران ہوئے تو ابن مسعود مشرکین کے مقتولین کے درمیان گردش کر رہے تھے ان کی نظر ابوجہل پر پڑی کہ وہ آخری سانس لے رہا تھا، ابن مسعود اس کے سینہ پر سوار ہو گئے، جب اس کی نگاہ ان پر پڑی تو کہا: اے حقیر چرواہے، تُو کتنے بلند مقام پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ ابن مسعود نے کہا: الاسلام یعلو ولا یعلیٰ علیہ: "اسلام برتری حاصل کرے گا اور کسی چیز کو اسلام پر برتری نہیں ہوگی۔"

ابوجہل نے ان سے کہا اپنے دوست محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہہ دے: نہ تو زندگی میں کوئی شخص میری نظر میں اس سے زیادہ مبغوض تھا اور نہ ہی موت کی حالت میں۔

جب یہ بات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کانوں تک پہنچی تو آپؐ نے فرمایا:

"میرے زمانے کا فرعون موسیٰؑ کے زمانے کے فرعون سے بدتر ہے۔ کیونکہ اس نے تو اپنی عمر کے آخری لمحات میں یہ کہا تھا: میں ایمان لے آیا ہوں، لیکن اس کی سرکشی اور بھی بڑھ گئی۔"

اس کے بعد ابوجہل نے ابن مسعودؓ کی طرف رُخ کر کے کہا: میرا سر اس تلوار سے قطع کر جو زیادہ تیز ہے۔ جب ابن مسعود نے اس کا سر قلم کیا تو وہ اس کو اُٹھا کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں نہ لا سکے۔ (لہٰذا اس کے سر کے بالوں کو پکڑ کر زمین پر کھینچتے ہوئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے کر پہنچے اور آیت کا مضمون اس دنیا میں پورا ہو گیا)۔[1]

"ناصیة" سر کے اگلے حصہ کے بالوں کو کہتے ہیں۔ اور ان بالوں کو پکڑنا ایسی جگہ بولا جاتا ہے جب کسی شخص کو کسی کام کے لیے ذلت و خواری کے ساتھ لے جائیں، کیونکہ جب کسی کے سر کے اگلے حصہ کے بالوں کو پکڑتے ہیں تو اس سے ہر قسم کی حرکت کی قدرت سلب ہو جاتی ہے اور اس کے لیے سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔

البتہ لفظ "ناصیة" افراد و اشخاص کے لیے بھی اور نفیس اشیاء کے بارے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ ہم فارسی (اور اُردو) زبان میں "جمعیت کی پیشانی" یا "عمارت کی پیشانی" سے تعبیر کرتے ہیں۔

"ناصیة کاذبة خاطئة" کی تعبیر ایسے شخص کی طرف اشارہ ہے، جو یہ ناصیہ رکھتا ہے، جو جھوٹا بھی تھا اور خطاکار بھی، جیسا کہ ابوجہل تھا۔

ایک روایت میں ابن عباسؓ سے آیا ہے کہ ایک دن ابوجہل رسولِ خدا صلی اللہ علیہ

---

[1] "تفسیر فخر رازی" جلد ۳۲ ص ۲۳ (تلخیص کے ساتھ)۔

و آلہ وسلم کے پاس آیا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقام ابراہیم کے پاس نماز میں مشغول تھے، اس نے پکار کر کہا کیا میں نے تجھے اس کام سے منع نہیں کیا تھا؟ حضرتؐ نے اس کو جھڑک کر دھتکار دیا۔

ابوجہل نے کہا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! تم مجھے جھڑکتے ہو اور مجھے دھتکارتے ہو؟ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اس سرزمین میں میری قوم اور قبیلہ سب سے زیادہ ہے۔[1]

اس موقع پر بعد والی آیت نازل ہوئی: "یہ جاہل و مغرور اپنی ساری قوم و قبیلہ کو پکارلے اور انہیں مدد کے لیے بلالے (فلیدع نادیہ)۔

"ہم بھی مامورینِ دوزخ کو پکارلیں گے": (سندع الزبانیۃ)۔

تاکہ اُسے معلوم ہو جائے کہ اس بے خبر غافل سے کوئی کام بھی نہیں ہو سکتا۔ اور وہ مامورینِ عذاب کے چنگل میں پرِکاہ کی طرح ایک خوفناک طوفان کے درمیان میں ہے۔

"نادی" "ندا" (پکارنا) کے مادے سے مجلس عمومی کے معنی میں ہے، اور بعض اوقات مرکزِ تفریح کو بھی نادی کہا جاتا ہے، چونکہ وہاں لوگ ایک دوسرے کو پکارتے اور ندا دیتے ہیں۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ "ندا" سے لیا گیا ہے جو بخشش کے معنی میں ہے۔ کیونکہ وہاں ایک دوسرے کی پذیرائی کرتے ہیں "دارالندوۃ" بھی جو قریش کی مشہور مجلس مشاورت کہی جاتی تھی اسی معنی سے لی گئی ہے۔

لیکن یہاں "نادی" سے مراد وہ جماعت ہے جو اس مجلس میں جمع ہوتی تھی۔ یا دوسرے لفظوں میں اس سے وہ قوم و قبیلہ اور دوست مراد ہیں جن کی قوت پر ابوجہل جیسے لوگ اپنے کاموں میں بھروسہ کرتے تھے۔

"زبانیۃ" جمع "زبنیہ" (زا کی زیر کے ساتھ) اصل میں انتظامی مامورین کے معنی میں ہے جو "زبن" (بروزن متن) کے مادہ سے دفع کرنے، ضرب لگانے اور دُور کرنے کے معنی میں ہے، اور یہاں فرشتگانِ عذاب اور دوزخ کے مامورین کے معنی میں ہے۔

اس سورہ کی آخری آیت میں جو آیۂ سجدہ ہے، فرماتا ہے: "اس طرح نہیں ہے جیسا کہ وہ خیال کرتا ہے اور تیرے سجدہ کے ترک کرنے پر اصرار کرتا ہے" "کلا"

"ہرگز اس کی اطاعت نہ کر، اپنے پروردگار کی بارگاہ میں سجدہ کر اور اس کا تقرب حاصل کر" (لا تطعہ واسجد واقترب)۔

دنیا زمانے کے ابوجہل اس سے کہیں زیادہ حقیر و ناچیز ہیں کہ تجھے سجدہ کرنے سے روک سکیں، یا تیرے دین و آئین کی ترقی میں روڑے اٹکا سکیں اور اس میں کوئی رکاوٹ ڈال سکیں۔ تو پروردگار پر توکل کرتے ہوئے اس کی عبادت و بندگی اور سجدہ کے ساتھ اس راستہ میں قدم بڑھاتے جا، اور ہر روز اپنے خدا سے نزدیک سے نزدیک تر ہوتا چلا جا۔

ضمنی طور پر اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ سجدہ انسان کے لیے بارگاہِ خدا کے قُرب اور نزدیکی کا باعث ہے۔ اور اسی لیے ایک حدیث میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

---

[1] "فی ظلال القرآن" جلد ۱۰ ص ۶۲۴

" اقرب مایکون العبد من اللہ اذاکان ساجدًا "

"بندے کی خدا سے سب سے زیادہ قُرب کی حالت اس وقت ہوتی ہے جب وہ سجدہ میں ہوتا ہے"۔

البتہ ہمیں معلوم ہے کہ اہلِ بیت عصمتؑ کی روایات کے مطابق قرآن مجید میں چار سجدے واجب ہیں "الم سجدہ" و "حٰم سجدہ" و "النجم" اور یہاں "سُورۂ علق" میں اور قرآن کے باقی سجدے مستحب ہیں۔

ایک نکتہ

سرکشی اور بے نیازی کا احساس

دُنیا کے اکثر مفاسد اور خرابیاں مرفہ الحال اور متکبر طبقوں سے قوت حاصل کرتی ہیں، اور انبیاء کے مقابلہ میں مخالفت کرنے والوں کی صفِ اوّل میں یہی لوگ ہوتے تھے، وہی لوگ جنہیں قرآن کبھی "ملأ" (اعراف۔ ۶۰) سے تعبیر کرتا ہے، اور کبھی "مترفین" (سبا۔ ۳۴) سے، اور کبھی "مستکبرین" (مؤمنون۔ ۶۷) کے ساتھ جن میں سے پہلا لفظ تو ان اشراف کی جمعیت کی طرف اشارہ ہے جن کا ظاہر آنکھوں کو بھلا لگتا ہے لیکن ان کا باطن خالی ہوتا ہے، اور دوسرا لفظ ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو ناز و نعمت میں زندگی بسر کرتے ہیں اور مست و مغرور ہو جاتے ہیں اور انہیں دُوسروں کے دُکھ درد کی کوئی خبر نہیں دیتی، اور تیسرا لفظ ایسے لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو کبر و غرور کی سواری پر سوار ہو کر خدا اور خلقِ خدا سے دُور ہو جاتے ہیں۔

اور ان سب کا سرچشمہ بے نیازی اور غنا کا احساس ہے، اور یہ کم ظرف لوگوں کی خصوصیات میں سے ہے کہ جب وہ کوئی نعمت، مال یا کوئی مرتبہ و مقام حاصل کر لیتے ہیں تو وہ ایسے مست ہو جاتے ہیں اور بے نیازی کا احساس کرنے لگ جاتے ہیں کہ جس سے خدا کو بھی بھول جاتے ہیں۔

حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ہوا کے ایک ذرا سے جھونکے سے دفتر بیام درہم و برہم ہو جاتا ہے اور انسان کا سارا مال و دولت ایک ساعت سے بھی کم وقت میں نابود ہو سکتا ہے، یا سیلاب و زلزلہ اور بجلی کی ایک کڑک سب کچھ برباد کر کے رکھ دیتی ہے اور انسان کی سلامتی بھی، پانی کے ایک گھونٹ کے گلے میں پھنس جانے سے، ایسی خطرے میں پڑ جاتی ہے کہ موت آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگتی ہے۔

یہ کیسی غفلت ہے جو کچھ لوگوں کو دامن گیر ہو جاتی ہے اور وہ اپنے آپ کو بے نیاز خیال کرنے لگ جاتے ہیں اور غرور کی سرکش سواری پر سوار ہو کر معاشرے کے میدان کو اپنی جولانگاہ بنا لیتے ہیں۔

- اس جہل و نادانی، اور اس بے خبری اور خیرہ سری سے خدا کی پناہ۔

ایسی حالت سے بچنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ انسان تھوڑا سا اپنے بے حساب ضعف و کمزوری اور پروردگار کی عظیم قدرت پر غور کرے، اور تھوڑا سا گزرے ہوئے لوگوں کی تاریخ کی ورق گردانی کرلے، اور ان اقوام کی سرگزشت کو جو اس سے زیادہ قوی اور طاقت ور تھے، دیکھ لے تاکہ غرور کی سواری سے نیچے اُتر آئے۔

خداوندا ! ہمیں کبر و غرور سے ، جو تجھ سے دُوری کا اصل سبب ہے ، محفوظ رکھ۔
پروردگارا ! ہمیں دُنیا و آخرت میں ایک لمحہ کے لیے بھی ہمارے اپنے سپُرد نہ کرنا۔
بارالہٰا ! ہمیں ایسی قدرت عطا فرما کہ ہم ان مغرور مستکبرین کی ناک کو ، جو تیرے سامنے سدِّ راہ بنے ہوئے ہیں ، رگڑ کر رکھ دیں اور ان کے تمام منصوبوں کو مٹا دیں۔

آمین یا ربّ العالمین

سُورۂ علق کا اختتام

سُورَہ اَلقَدرِ

* یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا
* اس میں ۵ آیات ہیں۔

سُورۂ "قدر" کے مطالب اور اس کی فضیلت

اِس سُورہ کا مضمون ، جیسا کہ اس کے نام سے بھی ظاہر ہے ، شبِ قدر میں قرآن کا نزول ہے ۔ اس کے بعد شب قدر کی اہمیت اور اس کے برکات و آثار کا بیان ہے ۔

اس بارے میں کہ یہ سُورہ " مکہ " میں نازل ہوا ہے یا " مدینہ " میں ، مفسرین کے درمیان مشہور اس کا " مکی " ہونا ہے لیکن بعض نے احتمال دیا ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوا ہے کیونکہ ایک روایت میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ " بنی اُمیہ " آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منبر پر چڑھ گئے ہیں ۔ یہ چیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر گراں گزری اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رنجیدہ ہوئے تو سُورہ قدر نازل ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی (لہٰذا بعض علماء " لیلۃ القدر خیر من الف شھر " کو بنی اُمیہ کی حکومت کی طرف ناظر سمجھتے ہیں جو تقریباً ایک ہزار ماہ رہی) اور ہم جانتے ہیں کہ مسجد اور منبر مدینہ میں بنائے گئے تھے [1]

اس سُورہ کی فضیلت میں یہی کافی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

" من قرأھا اعطی من الاجر کمن صام رمضان واحیا لیلۃ القدر "

" جو شخص اس کی تلاوت کرے گا تو وہ اس شخص کی طرح ہو گا جس نے ماہِ رمضان کے روزے رکھے اور شب قدر کو احیاء کیا ہو " [2]

---

[1] " رُوح المعانی " جلد ۳۰ ص ۱۸۸ و " درالمنثور " جلد ۶ ص ۳۷۱

[2] " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۵۱۶

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے :

"من قرأ انا انزلناہ بجھر کان کشاھر سیفہ فی سبیل اللّٰہ،
ومن قرأھا سرًّا کان کالمتشحط بدمہ فی سبیل اللّٰہ"

"جو شخص سورہ انا انزلناہ کو بلند آواز سے پڑھے وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے
راہِ خدا میں تلوار کھینچی اور جہاد کیا، اور جو شخص اسے آہستہ اور پنہاں طور سے پڑھے
وہ اس شخص کے مانند ہے جو راہِ خدا میں اپنے خون میں لت پت ہو۔"[1]

واضح ہے کہ یہ سب فضیلت اس شخص کے لیے نہیں ہے جو اسے پڑھے تو سہی لیکن اس کی حقیقت کو نہ سمجھے، بلکہ یہ اس شخص کے لیے ہے جو اسے پڑھنے کے ساتھ ساتھ سمجھتا بھی ہو، اور اس کے مضمون پر عمل کرتا ہو، قرآن کو عظیم سمجھتا ہو، اور اس کی آیات کو اپنی زندگی میں عملی شکل دیتا ہو۔

---

[1] وہی مدرک۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝

۲۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝

۳۔ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝

۴۔ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝

۵۔ سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کیا ہے۔

۲۔ اور تو کیا جانے کہ شب قدر کیا ہے ؟!

۳۔ شب قدر ہزار مہینہ سے بہتر ہے۔

۴۔ فرشتے اور رُوح اس رات میں اپنے پروردگار کے اذن سے ہر کام (کی تقدیر) کے لیے اُترتے ہیں۔

۵۔ یہ ایک ایسی رات ہے جو طلوعِ صبح تک سلامتی (اور برکت و رحمت) سے پُر ہے۔

تفسیر

شب قدر نزولِ قرآن کی رات

قرآن کی آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید ماہِ مبارک رمضان میں نازل ہوا ہے : شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن " (بقرہ - ۱۸۵) اور اس تعبیر کا ظاہر یہ ہے کہ سارا قرآن اسی ماہ میں نازل ہوا ہے۔

اور سُورہ قدر کی پہلی آیت میں مزید فرماتا ہے : ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا ہے ۔ (انّا انزلناہ فی لیلۃ القدر).

اگرچہ اس آیت میں صراحت کے ساتھ قرآن کا نام ذکر نہیں ہوا ، لیکن یہ بات مسلم ہے کہ " انّا انزلناہ " کی ضمیر قرآن کی طرف لوٹتی ہے اور اس کا ظاہری ابہام اس کی عظمت اور اہمیت کے بیان کے لیے ہے ۔

" انّا انزلناہ " (ہم نے اسے نازل کیا ہے) کی تعبیر بھی اس عظیم آسمانی کتاب کی عظمت کی طرف ایک اور اشارہ ہے جس کے نزول کی خدا نے اپنی طرف نسبت دی ہے مخصوصاً صیغہ متکلم مع الغیر کے ساتھ جو جمع کا مفہوم رکھتا ہے ، اور یہ عظمت کی دلیل ہے ۔

اس کا شبِ " قدر " میں نزول ، وہی شب جس میں انسانوں کی سرنوشت اور مقدرات کی تعیین ہوتی ہے ۔ یہ اس عظیم آسمانی کتاب کے سرنوشت ساز ہونے کی ایک اور دلیل ہے ۔

اس آیت کو سُورہ بقرہ کی آیت کے ساتھ ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شبِ قدر ماہِ مبارک رمضان میں ہے ، لیکن وہ کون سی رات ہے قرآن سے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا ۔ لیکن روایات میں اس سلسلہ میں بہت زیادہ بحث آئی ہے ۔ ہم انشاء اللہ اس سُورہ کے آخر میں اس سلسلہ میں بھی اور دوسرے مسائل کے بارے میں بھی گفتگو کریں گے ۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تاریخی لحاظ سے بھی اور قرآن کے مضمون کے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی سے ارتباط کے لحاظ سے بھی یہ مُسلّم ہے کہ یہ آسمانی کتاب تدریجی طور پر اور ۲۳ سال کے عرصہ میں نازل ہوئی ہے ۔ یہ بات اُوپر والی آیات سے جو یہ کہتی ہیں کہ ماہِ رمضان میں اور شب قدر میں نازل ہوئی ، کس طرح سازگار ہوگی ؟

اس سوال کا جواب ۔ جیسا کہ بہت سے محققین نے کہا ہے ۔ یہ ہے کہ قرآن کے دو نزول ہیں ۔

۱۔ نزول دفعی جو ایک ہی رات میں سارے کا سارا پیغمبر اکرمؐ کے پاک قلب پر یا بیت المعمور پر یا لوحِ محفوظ سے نچلے آسمان پر نازل ہوا ۔

۲۔ نزول تدریجی : جو تیئیس سال کے عرصہ میں نبوّت کے دوران انجام پایا ۔ (ہم سورہ دُخان کی آیہ ۳ جلد ۱۲ تفسیر نمونہ ص ۲۶ سے آگے اس مطلب کی تشریح کر چکے ہیں) ۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آغازِ نزولِ قرآن شبِ قدر میں ہوا تھا ، نہ کہ سارا قرآن ، لیکن یہ چیز آیت کے ظاہر کے خلاف ہے ، جو کہتی ہے کہ ہم نے قرآن کو شب قدر میں نازل کیا ہے ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کے نازل ہونے کے سلسلے میں بعض آیات میں " انزال " اور بعض میں " تنزیل " کی تعبیر ہوئی ہے ۔ اور لغت کے کچھ متنوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ " تنزیل " کا لفظ عام طور پر وہاں بولا جاتا ہے جہاں کوئی چیز تدریجاً نازل ہو لیکن " انزال " زیادہ

وسیع مفہوم رکھتا ہے جو نزولِ دفعی کو بھی شامل ہوتا ہے[1] تعبیر کا یہ فرق جو قرآن کی آیات میں آیا ہے ممکن ہے کہ اُوپر والے دو نزولوں کی طرف اشارہ ہو۔

بعد والی آیت میں شب قدر کی عظمت کے بیان کے لیے فرماتا ہے: "تُو کیا جانے کہ شب قدر کیا ہے"۔ (وما ادراك ما ليلة القدر)۔

اور بلا فاصلہ کہتا ہے: "شب قدر ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینے سے بہتر ہے"۔ (ليلة القدر خير من الف شهر)۔

یہ تعبیر اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ اس رات کی عظمت اس قدر ہے کہ پیغمبرِ اکرم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک بھی اپنے اس وسیع و عریض علم کے باوجود آیات کے نزول سے پہلے واقف نہیں تھے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہزار ماہ اسی (۸۰) سال سے زیادہ ہے۔ واقعاً کتنی باعظمت رات ہے جو ایک پُربرکت طولانی عمر کے برابر قدر و قیمت رکھتی ہے۔

بعض تفاسیر میں آیا ہے کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

> "بنی اسرائیل میں سے ایک شخص نے لباسِ جنگ زیب تن کر رکھا تھا، اور ہزار ماہ تک اُسے نہ اُتارا، وہ ہمیشہ جہاد فی سبیل اللہ میں مشغول (یا آمادہ) رہتا تھا۔ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب و انصار نے تعجب کیا، اور آرزو کی کہ کاش اس قسم کی فضیلت و افتخار انہیں بھی میسر آئے تو اُوپر والی آیات نازل ہوئیں۔ اور بیان کیا کہ شب قدر ہزار ماہ سے افضل ہے"[2]

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی اسرائیل کے چار افراد کا ذکر کیا جنہوں نے اسّی سال بغیر معصیت کیے خدا کی عبادت کی تھی۔ اصحاب نے آرزو کی کہ کاش وہ بھی اس قسم کی توفیق حاصل کرتے تو اس سلسلہ میں اُوپر والی آیات نازل ہوئیں۔

اس بارے میں کہ یہاں ہزار کا عدد "تعداد" کے لیے ہے یا "تکثیر" کے لیے بعض نے کہا ہے: یہ تکثیر کے لیے ہے اور شب قدر کی قدر و منزلت کئی ہزار ماہ سے بھی زیادہ ہے، لیکن وہ روایات جو ہم نے اُوپر نقل کی ہیں وہ اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ عددِ مذکور تعداد ہی کے لیے ہے۔ اور اصولی طور پر بھی عدد ہمیشہ تعداد کے لیے ہوتا ہے مگر یہ کہ تکثیر پر کوئی واضح قرینہ موجود ہو۔

اس کے بعد اس عظیم رات کی مزید تعریف و توصیف کرتے ہوئے اضافہ کرتا ہے: "اس رات میں فرشتے اور رُوح اپنے پروردگار کے اذن سے ہر کام کی تقدیر کے لیے نازل ہوتے ہیں"۔ (تنزل الملائكة والروح فيها باذن ربهم من كل امر)۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "تنزل" فعل مضارع ہے اور استمرار پر دلالت کرتا ہے (جو اصل میں "تتنزل" تھا)، واضح ہو جاتا ہے کہ شبِ قدر پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور نزولِ قرآن کے زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں تھی، بلکہ یہ ایک امر مستمر ہے، اور ایسی رات ہے

---

[1] مفردات راغب مادہ نزل۔

[2] "درالمنثور" جلد ۶ ص ۳۷۱

جو ہمیشہ آتی رہتی ہے اور ہر سال آتی ہے۔

اس بارے میں کہ رُوح سے کیا مُراد ہے بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مُراد "جبرئیل امین" ہے، جسے "رُوح الامین" بھی کہا جاتا ہے، اور بعض نے "رُوح" کی سُورہ شوریٰ کی آیہ ۵۲ "وكذالك اوحينا اليك روحًا من امرنا" جیسا کہ ہم نے گزشتہ انبیاء پر وحی کی تھی، اسی طرح سے تجھ پر بھی اپنے فرمان سے وحی کی ہے" کے قرینہ سے "وحی" کے معنی میں تفسیر کی ہے۔

اس بنا پر آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا "فرشتے وحی الٰہی کے ساتھ، مقدرات کی تعیین کے سلسلہ میں، اس رات میں نازل ہوتے ہیں"۔

یہاں ایک تیسری تفسیر بھی ہے جو سب سے زیادہ قریب نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ "رُوح ایک بہت بڑی مخلوق ہے جو فرشتوں سے مافوق ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے سوال کیا، کیا رُوح وہی جبرئیل ہے"؟ امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

"جبرئيل من الملائكة، والروح اعظم من الملائكة ان الله عزوجل يقول: تنزل الملائكة والروح"۔

"جبرئیل تو ملائکہ میں سے ہے، اور رُوح ملائکہ سے زیادہ عظیم ہے، کیا خداوند تعالیٰ یہ نہیں فرماتا: ملائکہ اور رُوح نازل ہوتے ہیں"؟[1]

یعنی مقابلہ کے قرینہ سے یہ دونوں آپس میں مختلف ہیں۔ لفظ "روح" کے لیے یہاں دوسری تفاسیر بھی ذکر ہوئی ہیں کیونکہ ان کے لیے کوئی دلیل نہیں تھی، لہٰذا ان سے صرفِ نظر کی گئی ہے۔

"من كل امر" سے مُراد یہ ہے کہ فرشتے سرنوشتوں کی تقدیر و تعیین کے لیے، اور ہر خیر و برکت لانے کے لیے اس رات میں نازل ہوتے ہیں، اور ان کے نزول کا مقصد ان امور کی انجام دہی ہے۔

یا یہ مُراد ہے کہ وہ ہر امرِ خیر اور ہر سرنوشت اور تقدیر کو اپنے ساتھ لاتے ہیں۔[2]

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ خدا کے امر و فرمان سے نازل ہوتے ہیں لیکن مناسب وہی پہلا معنی ہی ہے۔

"ربھم" کی تعبیر کو، جس میں ربوبیت اور تدبیرِ جہاں کے مسئلہ پر بات ہوئی ہے، ان فرشتوں کے کام کے ساتھ قریبی مناسبت ہے، کہ وہ امور کی تدبیر و تقدیر کے لیے نازل ہوتے ہیں، اور ان کا کام بھی پروردگار کی ربوبیت کا ایک گوشہ ہے۔

اور آخری آیت میں فرماتا ہے: "یہ ایک ایسی رات ہے، جو طلوعِ صبح تک سلامتی اور خیر و برکت و رحمت سے پُر رہتی ہے"۔

(سلام هي حتّٰى مطلع الفجر)۔

قرآن بھی اسی میں نازل ہوا، اس کا احیاء اور شب بیداری بھی ہزار ماہ کے برابر ہے، خدا کی خیرات و برکات بھی اسی شب میں نازل ہوتی ہیں اس کی رحمتِ خاص بھی بندوں کے شاملِ حال ہوتی ہے، اور فرشتے اور رُوح بھی اسی رات میں نازل ہوتے ہیں۔

---

[1] "تفسیر برھان" جلد ۴، ص ۴۸۱

[2] پہلی تفسیر کے مطابق "من" "لام" کے معنی میں ہے اور "من كل امر" کا مطلب "لاجل كل امر" ہے، اور دوسری تفسیر کے مطابق "من" "باء مصاحبت" کے معنی میں ہے۔

اسی بنا پر یہ ایک ایسی رات ہے جو آغاز سے اختتام تک سراسر سلامتی ہی سلامتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض روایات کے مطابق تو اس رات میں شیطان کو زنجیر میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس لحاظ سے بھی یہ ایک ایسی رات ہے جو سالم اور سلامتی سے توام ہے۔

اس بنا پر "سلام" کا اطلاق، جو سلامت کے معنی میں ہے۔ (سالم کے اطلاق کے بجائے) حقیقت میں ایک قسم کی تاکید ہے، جیسا کہ بعض اوقات ہم کہہ دیتے ہیں کہ فلاں آدمی عین عدالت ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس رات پر "سلام" کا اطلاق اس بنا پر ہے کہ فرشتے مسلسل ایک دوسرے پر یا مومنین پر سلام کرتے ہیں، یا پیغمبرؐ کے حضور میں اور آپ کے معصوم جانشین کے حضور میں جا کر سلام عرض کرتے ہیں۔

ان تفسیروں کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

بہر حال یہ ایک ایسی رات ہے جو ساری کی ساری نور و رحمت، خیر و برکت، سلامت و سعادت، اور ہر لحاظ سے بے نظیر ہے ایک حدیث میں آیا ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا گیا، کیا آپ جانتے ہیں کہ شبِ قدر کون سی رات ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا: "کیف لا نعرف والملائکۃ تطوف بنا فیھا"

"ہم کیسے نہ جانیں گے جب کہ فرشتے اس رات ہمارے گرد طواف کرتے ہیں"۔[1]

حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں آیا ہے کہ خدا کے کچھ فرشتے آپ کے پاس آئے، اور انہیں بیٹے کے تولد کی بشارت دی اور ان پر سلام کیا، (ھود - ۶۹)

کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو جو لذت ان فرشتوں کے سلام میں آئی، ساری دُنیا کی لذتیں بھی اس کے برابر نہیں تھیں، اب غور کرنا چاہیئے کہ جب شبِ قدر میں فرشتے گروہ در گروہ نازل ہو رہے ہوں، اور مومنین کو سلام کر رہے ہوں، تو اس میں کتنی لذت، لطف اور برکت ہوگی؟!

جب ابراہیمؑ کو آتشِ نمرود میں ڈالا گیا، تو فرشتوں نے آ کر آپ کو سلام کیا اور آگ ان پر گلزار بن گئی، تو کیا شبِ قدر میں مومنین پر فرشتوں کے سلام کی برکت سے آتشِ دوزخ "برد" و "سلام" نہیں ہوگی؟

ہاں! یہ اُمتِ محمدؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کی نشانی ہے کہ وہاں تو خلیل پر نازل ہوتے ہیں اور یہاں اسلام کی اس اُمت پر۔[2]

چند نکات

۱۔ شبِ قدر میں کون سے امور مقدر ہوتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں کہ اس رات کو "شبِ قدر" کا نام کیوں دیا گیا ہے، بہت کچھ کہا گیا ہے: منجملہ یہ کہ:

---

[1] "تفسیر برھان" جلد ۴ ص ۴۸۸ حدیث ۲۹

[2] "تفسیر فخر رازی" جلد ۳۲ ص ۳۶

۱۔ شب قدر کو شب قدر کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ بندوں کے تمام سال کے سارے مقدرات اسی رات میں تعیین ہوتے ہیں، اس معنی کی گواہ سورۂ دخان ہے جس میں آیا ہے کہ: انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ انا کنا منذرین فیھا یفرق کل امر حکیم: "ہم نے اس کتاب مبین کو ایک پُر برکت رات میں نازل کیا ہے، اور ہم ہمیشہ ہی انذار کرتے رہے ہیں، اس رات میں ہر امر خداوندِ عالم کی حکمت کے مطابق تنظیم و تعیین ہوتا ہے": (دخان - ۳،۴)

یہ بیان متعدد روایات کے ساتھ ہم آہنگ ہے جو کہتی ہیں کہ اس رات میں انسان کے ایک سال کے مقدرات کی تعیین ہوتی ہے اور رزق، عمریں اور دوسرے امور اسی مبارک رات میں تقسیم اور بیان کیے جاتے ہیں۔

البتہ یہ چیز انسان کے ارادہ اور مسئلہ اختیار کے ساتھ کسی قسم کا تضاد نہیں رکھتی کیونکہ فرشتوں کے ذریعے تقدیرِ الٰہی لوگوں کی شائستگیوں اور لیاقتوں، اور ان کے ایمان و تقویٰ اور نیتِ اعمال کی پاکیزگی کے مطابق ہوتی ہے۔

یعنی ہر شخص کے لیے وہی کچھ مقدر کرتے ہیں جو اس کے لائق ہے، یا دُوسرے لفظوں میں، اس کے مقدمات خود اسی کی طرف سے فراہم ہوتے ہیں اور یہ امر نہ صرف یہ کہ اختیار کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتا، بلکہ یہ اس پر ایک تاکید ہے۔

۲۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس رات کا اس وجہ سے شب قدر نام رکھا گیا ہے کہ وہ ایک عظیم قدر و شرافت کی حامل ہے (جس کی نظیر سورۂ حج کی آیہ ۷۴ میں آئی ہے) (ما قدروا اللہ حق قدرہ) انہوں نے حقیقت میں خدا کی قدر و عظمت کو نہیں پہچانا"

۳۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اپنی پوری قدر و منزلت کے ساتھ، قدر و منزلت والے رسولؐ پر اور صاحب قدر و منزلت فرشتے کے ذریعے اس میں نازل ہوا ہے۔

۴۔ یا یہ مطلب ہے کہ یہ ایک ایسی رات ہے جس میں قرآن کا نازل ہونا مقدر ہوا ہے۔

۵۔ یا یہ ہے کہ جو شخص اس رات کو بیدار رہے تو وہ صاحب قدر و مقام و منزلت ہو جاتا ہے۔

۶۔ یا یہ بات ہے کہ اس رات میں اس قدر فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ ان کے لیے عرصۂ زمین تنگ ہو جاتا ہے، کیونکہ تقدیر تنگ ہونے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ ومن قدر علیہ رزقہ (طلاق - ۷)

ان تمام تفاسیر کا "لیلۃ القدر" کے وسیع مفہوم میں جمع ہونا پُورے طور پر ممکن ہے اگرچہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب اور زیادہ مشہور ہے

۲۔ شب قدر کون سی رات ہے؟

اس بارے میں کہ "لیلۃ القدر" ماہِ رمضان میں ہوتی ہے، کوئی شک و شبہ نہیں ہے کیونکہ قرآن کی تمام کی تمام آیات اسی معنی کا اقتضا کرتی ہیں، ایک طرف تو وہ کہتی ہیں کہ قرآن ماہِ رمضان میں نازل ہوا ہے (بقرہ - ۱۸۵) اور دوسری طرف یہ کہتی ہیں کہ شب قدر میں نازل ہوا ہے۔ (آیات زیر بحث)۔

لیکن اس بارے میں، کہ ماہِ رمضان کی راتوں میں سے کون سی رات ہے، بہت اختلاف ہے، اور اس سلسلہ میں بہت سی تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔ منجملہ: پہلی رات، سترھویں رات، انیسویں رات، اکیسویں رات، تیئیسویں رات، ستائیسویں رات اور انتیسویں رات۔

لیکن روایات میں مشہور و معروف یہ ہے کہ ماہِ رمضان کی آخری دس راتوں میں سے اکیسویں یا تیئیسویں رات ہے اسی لیے ایک روایت

میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ماہِ مبارک کی آخری دس راتوں میں تمام راتوں کا احیاء فرماتے اور عبادت میں مشغول رہتے تھے۔

ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ شب قدر اکیسویں یا تئیسویں رات ہے، یہاں تک کہ جب راوی نے اصرار کیا کہ ان دونوں راتوں میں سے کون سی رات ہے اور یہ کہا کہ اگر میں ان دونوں راتوں میں عبادت نہ کر سکوں تو پھر کون سی رات کا انتخاب کروں" تو بھی امامؑ نے تعیین نہ فرمائی اور مزید کہا

"ما ایسر لیلتین فیما تطلب "

"اس چیز کے لیے جسے تُو چاہتا ہے دو راتیں کس قدر آسان ہیں؟"[1]

لیکن متعدد روایات میں جو اہل بیت کے طریقہ سے پہنچی ہیں، زیادہ تر تئیسویں رات پر تکیہ ہوا ہے۔ جب کہ اہل سنت کی زیادہ تر روایات ستائیسویں رات کے گرد گردش کرتی ہیں۔

ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہ بھی نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"التقدیر فی لیلۃ القدر تسعۃ عشر، والابرام فی لیلۃ احدی وعشرین، والامضاء فی لیلۃ ثلاث وعشرین"

"تقدیر مقدرات تو انیسویں کی شب کو ہوتی ہے، اور ان کا حکم اکیسویں رات کو، اور ان کی تصدیق اور منظوری تئیسویں رات کو۔"[2]

اور اس طرح سے روایات کے درمیان جمع ہو جاتی ہے۔

لیکن بہرحال، اس وجہ کی بناء پر جس کی طرف بعد میں اشارہ ہوگا، شب قدر کو ابہام کے ایک ہالے نے گھیر رکھا ہے۔

۳۔ شب قدر مخفی کیوں رکھی گئی؟

بہت سے علماء کا نظریہ یہ ہے کہ سال بھر کی راتوں یا ماہِ مبارک رمضان کی راتوں میں شبِ قدر کا مخفی ہونا اس بناء پر ہے کہ لوگ ان سب راتوں کو اہمیت دیں۔ جیسا کہ خدا نے اپنی رضا و خوشنودی کو مختلف قسم کی عبادتوں میں پنہاں کر رکھا ہے تاکہ لوگ سب عبادتوں اور اطاعتوں کی طرف رُخ کریں۔ اور اپنے غضب کو معاصی کے درمیان پنہاں کیا ہے، تاکہ لوگ سب گناہوں سے پرہیز کریں، اپنے دوستوں کو لوگوں سے مخفی رکھا ہے تاکہ سب کا احترام کریں اور دُعاؤں کی قبولیت کو مختلف دعاؤں میں پنہاں رکھا ہے تاکہ دُعاؤں کی طرف رُخ کریں۔ اسمِ اعظم کو اپنے اسماء میں مخفی رکھا ہے تاکہ تمام اسماء کو بزرگ و عظیم سمجھیں۔ اور موت کے وقت کو مخفی رکھا ہے تاکہ ہر حالت میں آمادہ و تیار رہیں۔ اور یہ فلسفہ مناسب نظر آتا ہے۔

۴۔ کیا گزشتہ اُمتوں میں بھی شب قدر تھی؟

اس سُورہ کی آیات کے ظاہر سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ شب قدر منزلِ قرآن اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے

---

[1] "نورالثقلین" جلد ۵ ص ۶۲۵ حدیث ۵۸

[2] "نورالثقلین" جلد ۵ ص ۶۲۶ حدیث ۶۲

ساتھ مخصوص نہیں تھی. بلکہ دنیا کے اختتام تک اس کا ہر سال تکرار ہوتا رہے گا۔

فعل مضارع (تنزل) کی تعبیر، جو استمرار پر دلالت کرتی ہے، اور اسی طرح جملہ اسمیہ "سلام ھی حتّٰی مطلع الفجر" کی تعبیر بھی، جو دوام کی نشانی ہے، اسی معنی کی گواہ ہے۔

اس کے علاوہ بہت سی روایات بھی، جو شاید حدِ تواتر میں ہیں، اس معنی کی تائید کرتی ہیں۔

لیکن یہ بات کہ کیا یہ گزشتہ اُمتوں میں بھی تھی یا نہیں؟ متعدد روایات کی تصریح یہ ہے کہ یہ اس اُمت پر مواہب الٰہیہ میں سے ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"ان اللہ وھب لامتی لیلۃ القدر لم یعطھا من کان قبلھم"

"خدا نے میری اُمت کو شبِ قدر عطا کی ہے، گزشتہ اُمتوں میں سے کسی کو بھی یہ نعمت نہیں ملی تھی۔"[۱]

اُوپر والی آیات کی تفسیر میں بھی بعض وارد شدہ روایات اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں۔

۵۔ شب قدر ہزار ماہ سے کیسے برتر ہے؟

ظاہر ہے کہ اس شب کا ہزار ماہ سے بہتر ہونا اس رات کو بیدار رہنے اور اس کی عبادت کی قدر و قیمت کی وجہ سے ہے، اور لیلۃ القدر کی فضیلت اور اس میں عبادت کی فضیلت کی روایات، جو شیعہ اور اہلِ سنّت کی کتابوں میں فراواں ہیں، اس مطلب کی کامل طور سے تائید کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ اس رات میں قرآن کا نزول اور اس میں برکات اور رحمتِ الٰہی کا نزول بھی اس بات کا سبب ہے کہ یہ ہزار ماہ سے برتر و بالاتر ہو۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے "علی بن ابی حمزہ ثمالی" سے فرمایا:

شبِ قدر کی فضیلت کو اکیسویں اور تیئسویں رات میں تلاش کرو، اور ان دونوں راتوں میں سے ہر ایک میں ایک سو رکعت نماز بجالاؤ، اور اگر تم سے ہو سکے تو ان دونوں راتوں کا طلوعِ صبح تک احیا کرو، اور اس رات کو غسل کرو۔"

"ابوحمزہ" کہتا ہے: میں نے عرض کیا، "اگر میں کھڑے ہوکر یہ سب نمازیں نہ پڑھ سکوں۔"

آپؑ نے فرمایا: پھر بیٹھ کر پڑھ لو۔ میں نے عرض کیا: اگر اس طرح بھی نہ پڑھ سکوں۔ آپؑ نے فرمایا: پھر بستر میں (لیٹ کر پڑھ لو) اور رات کے پہلے حصہ میں تھوڑا سا سو لینے میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے، اور اس کے بعد عبادت میں مشغول ہو جاؤ۔ ماہِ رمضان میں آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں اور شیاطین طوق و زنجیر میں جکڑے ہوتے ہیں اور مومنین کے اعمال مقبول ہوتے ہیں ماہِ رمضان کتنا اچھا مہینہ[۲]

۱۔ "درالمنثور" ج ۶ ص ۳۷۱

۲۔ "نورالثقلین" جلد ۵ ص ۶۲۶ حدیث ۵۸ کا ایک حصہ۔

۶۔ قرآن شب قدر میں کیوں نازل ہوا ؟

کیونکہ شب قدر میں ایک سال کے لیے انسانوں کی سرنوشت ان کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے مطابق مقدر کی جاتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ انسان اس رات بیدار رہے۔ اور توبہ اور اپنے آپ کو بہتر بنانے کی کوشش کرے اور خدا کی بارگاہ میں حاضر ہو کر خود میں اس کی رحمت کے لیے زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر لیاقت پیدا کرے۔

ہاں ! جن لمحات میں ہماری سرنوشت کی تعیین ہوتی ہے، ان میں انسان کو سویا ہوا نہیں ہونا چاہیئے، اور نہ ہی ہر چیز سے غافل اور بے خبر رہنا چاہیئے کیونکہ اس صورت میں ایک غم ناک سرنوشت ہو جائے گی۔

قرآن چونکہ ایک سرنوشت ساز کتاب ہے، اور اس میں انسانوں کی سعادت و خوش بختی اور ہدایت کی باتوں کی وضاحت کی گئی ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ سرنوشتوں کی تعیین کا پروگرام شب قدر میں نازل ہو۔ قرآن اور شب قدر کے درمیان کتنا خوبصورت رابطہ ہے، اور ان دونوں کا ایک دوسرے سے تعلق اور رشتہ کس قدر پُرمعنی ہے ؟

۷۔ کیا مختلف علاقوں میں ایک ہی شب قدر ہوتی ہے ؟

ہم جانتے ہیں کہ تمام شہروں میں قمری مہینوں کا آغاز یکساں نہیں ہوتا اور یہ ممکن ہے کہ ایک علاقہ میں تو آج اول ماہ ہو، اور دوسرے علاقہ میں دوسری تاریخ ہو۔ اس بناء پر شبِ قدر سال میں ایک معین رات نہیں ہوسکتی، کیونکہ مثال کے طور پر مکہ کی تئیسویں رات، ایران و عراق میں بائیسویں کی رات ہوسکتی ہے، اس طرح سے اصولی طور پر ہر ایک کی علیٰحدہ شب قدر ہوگی۔ کیا یہ بات اس چیز سے، جو آیات و روایات سے معلوم ہوتی ہے، کہ شب قدر ایک معین رات ہے، سازگار ہے ؟!

اس سوال کا جواب ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ رات وہی کرۂ زمین کے آدھے سایہ کو ہی کہتے ہیں، جو کرۂ زمین کے دوسرے حصہ پر پڑتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ سایہ گردش زمین کے ساتھ حرکت میں ہے، اور اس کا ایک مکمل دورہ چوبیس گھنٹوں میں انجام پاتا ہے، اس بناء پر ممکن ہے کہ شب قدر رات کا زمین کے گرد ایک مکمل دورہ ہو۔ یعنی تاریکی کی چوبیس گھنٹے کی مدت جو زمین کے تمام نقاط کو اپنے سایہ کے نیچے لے لے، وہ شب قدر ہے، جس کا آغاز ایک نقطہ سے ہوتا ہے، اور دوسرے نقطہ میں اختتام پذیر ہوتا ہے۔ (غور کیجئے)۔

خداوندا ! ہمیں اس قسم کی بیداری و آگاہی عطا فرما کہ لیلۃ القدر کی فضیلت سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھائیں۔

پروردگارا ! ہماری چشمِ اُمید تیرے لُطف و کرم پر لگی ہوئی ہے، ہمارے مقدرات کو اس کے موافق معین فرما۔

بارالٰہا ہمیں اس مہینہ کے محرومین میں سے قرار نہ دے کہ جس سے بالاتر کوئی محرومیت نہیں ہے۔

آمین یا رب العالمین

سُورہ "قدر" کا اختتام

آخر ماہ مبارک رمضان ۱۴۰۷ھ

اختتام ترجمہ

بروز جمعہ ایک بج کر پانچ منٹ

(عجیب اتفاق ہے)

بر مکان حقیر قم مقدس ۔ ایران

سُورَہ اَلبَــیِّنَۃ

- یہ سُورہ مکہ میں نازل ہوا
- اِس میں ۸ آیات ہیں۔

سورۂ بینہ کے مطالب اور اس کی فضیلت

مشہور یہ ہے کہ یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا ہے اور اس کے مطالب بھی اسی معنی کی گواہی دیتے ہیں، کیونکہ اس میں بار بار اہل کتاب کے بارے میں بحث ہوئی ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ اہل کتاب سے مسلمانوں کا زیادہ تر سروکار مدینہ میں ہی ہوا۔

اس سے قطع نظر نماز اور زکوٰۃ دونوں کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے، یہ ٹھیک ہے کہ زکوٰۃ کا شرعی حکم تو مکہ میں ہی ہو گیا تھا، لیکن اس کو قانونی صورت اور وسعت مدینہ میں دی گئی۔

بہر حال یہ سورہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے ہمہ گیر ہونے، اور اس کے روشن و واضح دلائل اور نشانیوں سے آمیختہ ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ایسی رسالت جس کے لیے پہلے سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ لیکن جب ان کے پاس یہ رسالت پہنچی تو ایک گروہ نے اس بنا پر کہ ان کے مادی منافع خطرے میں پڑ رہے تھے، اس کی طرف سے پشت پھیر لی۔

ضمنی طور پر یہ اس حقیقت کو بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہے کہ انبیاء کی دعوت کا اصول، مثلاً ایمان و توحید و نماز و روزہ، ایک ایسا اصول ہے جو ثابت اور جاودانی ہے اور یہ تمام آسمانی ادیان میں موجود رہا ہے۔

اس سورہ کے ایک دوسرے حصہ میں اہل کتاب اور مشرکین کے اسلام کے مقابلہ میں اعتراضات کو مشخص کرتا ہے کہ وہ گروہ جو ایمان لے آیا ہے اور اعمال صالح انجام دیتا ہے وہ تو بہترین مخلوق ہے۔ اور وہ گروہ جس نے کفر، شرک اور گناہ کی راہ اختیار کر لی ہے، وہ بدترین مخلوق شمار ہوتی ہے۔

اس سورہ کے مختلف نام ہیں، جو اس کے الفاظ کی مناسبت سے انتخاب ہوئے ہیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ مشہور سورہ "بینۃ" و "لم یکن" و "قیمۃ" ہیں۔

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت میں اس طرح نقل ہوا ہے:۔

" اگر لوگوں کو معلوم ہوتا کہ اس سورہ میں کون کون سی برکتیں ہیں تو وہ اپنے گھر والوں اور مال و منال کو چھوڑ کر اس کی طرف بڑھتے۔"

قبیلہ " خزاعہ " کے ایک شخص نے عرض کیا : اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ! اس کی تلاوت کا اجر و ثواب کیا ہے ؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

" کوئی منافق اور وہ لوگ جن کے دل میں شک و شبہ ہے، اس کی تلاوت نہیں کریں گے۔ خدا کی قسم مقرب فرشتے اس دن سے جب سے سارے آسمان اور زمین پیدا ہوئے ہیں اسے پڑھتے ہیں، اور اس کی تلاوت میں ایک لمحہ کے لیے بھی سستی نہیں کرتے جو شخص اسے رات کے وقت پڑھے گا، خدا ایسے فرشتوں کو مامور کرے گا، جو اس کے دین و دنیا کی حفاظت کریں گے، اور اس کے لیے بخشش اور رحمت طلب کریں گے، اور اگر دن کے وقت پڑھے گا تو اُن چیزوں کی مقدار میں جنہیں دن روشن کرتا ہے، اور رات انہیں تاریک بنا دیتی ہے، اُسے ثواب دیں گے۔"[1]

---

[1] " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۵۲۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ حَتّٰى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝

۲۔ رَسُولٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝

۳۔ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝

۴۔ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝

۵۔ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۝ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے کفار (کہتے تھے) جب تک ان کے لیے واضح دلیل نہ آ جائے وُہ اپنے دین سے دستبردار نہیں ہوں گے۔

۲۔ خدا کی طرف سے ایسا رسول جو پاکیزہ صحیفوں کی تلاوت کرے۔

۳۔ اور اُن میں صحیح اور قابلِ قدر تحریریں ہوں۔

۴۔ لیکن اہلِ کتاب نے (خدا کے دین میں) اختلاف نہیں کیا مگر اُن کے پاس واضح دلیل پہنچ جانے کے بعد۔

۵۔ حالانکہ انہیں کوئی حکم اس کے سوا نہیں دیا گیا تھا کہ وہ کمال اخلاص کے ساتھ خدا کی عبادت کریں، شرک سے توحید کی طرف لوٹیں، نماز کو قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، اور یہی مستقیم اور صحیح دین ہے۔

تفسیر

یہ جاودانی دین ہے

سورہ کے شروع میں ظہور اسلام سے پہلے اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) اور مشرکین عرب کی حالت کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ اس بات کا دعویٰ کیا کرتے تھے کہ جب تک کوئی واضح دلیل اور مسلّمہ پیغمبر ان کے پاس نہ آجائے، وہ اپنے دین سے دستبردار نہیں ہوں گے"۔ (لم یکن الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین منفکین حتّٰی تأتیھم البیّنۃ)۔

"ایسا پیغمبر جو خدا کی طرف سے ہو اور پاک و پاکیزہ صحیفوں کو ہمارے سامنے تلاوت کرے"۔ (رسول من اللّٰہ یتلوا صحفًا مطھرۃ)۔

ایسے صحیفے جن میں موزوں، ثابت اور قابلِ قدر تحریریں ہوں"۔ (فیھا کتب قیمۃ)۔

ہاں! وہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور سے پہلے اسی قسم کے دعوے کیا کرتے تھے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور اور آپ کی کتاب آسمانی کے نزول کے بعد میدان بدل گیا اور وہ خدا کے دین میں اختلاف کرنے لگ گئے۔ "اور اہلِ کتاب نے اختلاف نہیں کیا، مگر واضح دلیل اور سچا اور آشکار پیغمبر ان کے پاس آجانے کے بعد" (وما تفرق الذین اوتوا الکتاب الّا من بعد ما جاءتھم البیّنۃ)۔

اس طرح سے اوپر والی آیات اہلِ کتاب اور مشرکین کے دعووں کو بیان کر رہی ہیں کہ ابتداء میں تو انہیں یہ اصرار تھا کہ اگر کوئی پیغمبر واضح دلائل کے ساتھ ہمیں دعوت دینے کے لیے آئے گا تو ہم قبول کر لیں گے۔

لیکن اس کے آجانے کے بعد وہ اپنے اس قول سے پھر گئے اور اس کے مقابلہ میں جنگ و جدال کے لیے کھڑے ہوگئے سوائے اس گروہ کے جنہوں نے ایمان کی راہ اختیار کرلی۔

اس بنا پر اوپر والی آیت اسی چیز کے مشابہ ہے جو سورہ بقرہ کی آیہ ۸۹ : ولما جاءهم كتاب من عند الله مصدق لما معهم وكانوا من قبل يستفتحون على الذين كفروا فلما جاءهم ما عرفوا كفروا به فلعنة الله على الكافرين : میں آئی ہے۔ یعنی جب خدا کی طرف سے ان کے پاس کتاب آئی جو ان نشانیوں کے موافق تھی جو ان کے پاس تھیں؛ اور اس سے پہلے وہ خود کو فتح کی خوش خبری دیا کرتے تھے۔ لیکن جب یہ کتاب اور وہ پیغمبر جسے انہوں نے پہلے سے پہچانا ہوا تھا، ان کے پاس آیا تو وہ کافر ہوگئے، پس کافروں پر خدا کی لعنت ہو۔

ہم جانتے ہیں کہ اہل کتاب اس قسم کے ظہور کا انتظار کر رہے تھے، اور اصولی طور پر، مشرکین عرب بھی، جو اہل کتاب کو اپنے سے زیادہ عالم اور زیادہ آگاہ سمجھتے تھے، اس پروگرام میں ان کے ساتھ ہم آواز تھے۔ لیکن جب ان کی آرزوئیں پوری ہوگئیں تو انہوں نے اپنے راستہ کو بدل لیا اور مخالفین کی صفوں میں جاملے۔

مفسرین کی ایک جماعت کا ان آیات کی تفسیر کے بارے میں ایک دوسرا نظریہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ کفار وہ اپنے ادعا کے مطابق اپنے دین سے دستبردار نہیں ہوئے، اور اسے نہیں چھوڑا جب تک کہ واضح دلیل ان کے پاس نہ آگئی۔

لیکن اس بات کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس قسم کی واضح دلیل آجانے کے بعد وہ ایمان لے آئیں گے۔ حالانکہ بعد والی آیات اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ یہ مطلب اس طرح نہیں تھا۔ مگر اس صورت میں کہ یہ کہا جائے کہ اس سے مراد ان میں سے ایک گروہ کا ایمان لانا ہے، چاہے وہ بالکل قلیل تعداد میں ہی ہوں، اور اصطلاح کے مطابق یہ " موجبۂ جزئیہ " کی قبیل سے ہے۔

لیکن بہرحال یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے، اور شاید اسی بنا پر " فخر رازی " اپنی تفسیر میں پہلی آیت کو قرآنی آیات میں سب سے زیادہ پیچیدہ آیت شمار کرتا ہے، جو (اس کی نظر میں) بعد والی آیات سے تضاد رکھتی ہے۔ اس کے بعد وہ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے چند طریقے بیان کرتا ہے جن میں سے بہترین یہی ہے جو ہم نے اوپر نقل کیا ہے۔

یہاں ایک تیسری تفسیر بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا مشرکین اور اہل کتاب کو ان کی حالت پر نہیں چھوڑے گا، جب تک کہ ان پر اتمام حجت نہ کردے اور کوئی دلیل " بیّنہ " نہ بھیجے، اور انہیں راستہ نہ بتادے۔ اسی لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی ہدایت کے لیے بھیجا ہے۔

حقیقت میں یہ آیت قاعدۂ لطف کی طرف اشارہ ہے جو علم کلام میں بیان کیا جاتا ہے کہ خدا اتمام حجت کے لیے ہر قوم و ملت کے لیے واضح دلائل بھیجے گا۔[1]

بہرحال " بیّنہ " سے مراد یہاں واضح و روشن دلیل ہے جس کا مصداق دوسری آیت کے مطابق " رسول اللہ " صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے جب کہ آپ کی زبان پر قرآن مجید تھا۔

---

[1] اس بات پر توجہ کرنا چاہیئے کہ " منفکین " جو " منفک " کی جمع ہے، ممکن ہے کہ اسم فاعل ہو، یا اسم مفعول ہو، پہلی اور دوسری تفسیر کی بنا پر اسم فاعل کے معنی دیتا ہے اور تیسری تفسیر کی بنا پر اسم مفعول کا (غور کیجئے)

"صحف" "صحیفہ" کی جمع ہے، جو ایسے اوراق کے معنی میں ہے جن پر کوئی چیز لکھتے ہیں، اور یہاں اس سے مُراد ان اوراق کے مطالب ہیں، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرگز کوئی چیز اوراق سے نہیں پڑھتے تھے۔

اور "مطھرہ" سے مُراد، اس کا ہر قسم کے شرک، کذب، دروغ اور باطل سے پاک ہونا ہے اور شیاطین جن و انس کے اس میں دخل دینے سے پاک ہے۔

جیسا کہ سُورہ حٰم سجدۃ کی آیہ ۴۲ میں آیا ہے: لا یأتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ: "اس کے پاس کسی قسم کا باطل نہ اس کے سامنے سے آتا ہے اور نہ ہی اس کے پیچھے سے۔

"فیھا کتب قیمۃ" کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان صحفِ آسمانی میں ایسے مطالب لکھے ہوئے ہیں جن میں کسی قسم کا انحراف اور کجی نہیں ہے۔ اس بنا پر تو "کتب" "مکتوبات کے معنی میں ہے، یا یہ ان احکام و مقررات کے معنی میں ہے جو خدا کی طرف سے مقرر کیے گئے ہیں کیونکہ کتابت تعیین حکم کے معنی میں بھی آئی ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔ کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم۔ "روزہ تمہارے اوپر اسی طرح سے مقرر کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر مقرر کیا گیا تھا" (بقرہ-۱۸۳)

اور اس طرح "قیمۃ" "صاف و مستقیم، یا محکم و پائیدار، یا قدر و قیمت والا کے معنی میں ہے، یا یہ سب مفاہیم اس میں جمع ہیں۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ چونکہ قرآن میں تمام گزشتہ کتب کے مضامین و مطالب بہت سے اضافات کے ساتھ ہیں، لہٰذا یہ کہا گیا ہے کہ اس میں گزشتہ کتب قیمہ ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ پہلی آیت میں اہلِ کتاب کا "مشرکین" سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ اور چوتھی آیت میں صرف اہلِ کتاب کا بیان ہے اور مشرکین کے سلسلہ میں کوئی بات نہیں کی گئی، حالانکہ آیت دونوں کی طرف ناظر ہے۔

یہ تعبیرات ظاہراً اس وجہ سے ہیں کہ ان پروگراموں میں اہلِ کتاب اصل اور بنیادی حیثیت رکھتے تھے اور مشرکین ان کے تابع تھے۔

یا اس بنا پر ہے کہ اہلِ کتاب زیادہ لائقِ مذمت تھے کیونکہ ان میں بہت سے علماء اور دانشمند موجود تھے اور وہ اس لحاظ سے مشرکین کی نسبت بلند سطح پر تھے۔ اس بنا پر ان کی مخالفت زیادہ قبیح اور زیادہ ناپسندیدہ تھی، لہٰذا وہ زیادہ سرزنش کے لائق تھے۔

اس کے بعد "اہلِ کتاب" کو اور ان کے تابع "مشرکین" کو ملامت کرتے ہوئے فرماتا ہے: "انہوں نے اس جدید دین میں اختلاف کیوں کیا کہ بعض تو ایمان لے آئے اور بعض کافر ہو گئے حالانکہ اس دین میں انہیں اس کے سوا کوئی اور حکم نہیں دیا گیا ہے کہ خدا کی عبادت کریں، اور اس کی عبادت کو اس کے غیر کی عبادت سے خالص رکھیں، اور ہر قسم کے شرک سے باز رکھیں اور توحید کی طرف مائل رہیں، نماز کو قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں"۔ (وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء و یقیموا الصلوٰۃ و یؤتوا الزکاۃ) [1]

---

[1] "وما امروا" کا جملہ ممکن ہے کہ "جملہ حالیہ" ہو یا "استینافیہ" ہو اور "لیعبدوا" میں "لام" "لام غرض" ہو، اور یہاں اس سے مراد وہ مقصد اور نتیجہ ہو جو بندوں کی طرف لوٹتا ہے، نہ کہ وہ ہدف و نتیجہ جو خدا کی طرف لوٹے، جیسا کہ بعض مفسرین نے خیال کیا ہے۔ اور اسی وجہ سے انہوں نے لام غرض کا انکار کیا ہے۔ اصولی طور پر خدا کے تمام افعال کی کوئی نہ کوئی غرض اور علت ہوتی ہے، لیکن وہ اغراض ایسے ہوتے ہیں جو بندوں کی طرف لوٹتے ہیں اور بعض نے یہاں "لام" کو "ان" کے معنی میں سمجھا ہے جیسا کہ "یرید اللہ لیبین لکم" (نساء: ۲۶) میں ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے :

" اور یہ ایک مستقیم و پائیدار دین ہے " (وذالك دين القيمة) ۔

اس بارے میں کہ یہاں " وما امروا " سے کیا مراد ہے ؟ ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اہل کتاب کے اپنے دین میں مسئلہ توحید اور نماز و زکوٰۃ موجود تھا ، اور یہ ایسے مسائل ہیں جو ثابت ہیں ، لیکن وہ ان احکام کے بھی وفادار نہیں رہے تھے ۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ دینِ اسلام میں سوائے خالص توحید ، اور نماز و زکوٰۃ وغیرہ کے اور کوئی حکم نہیں آیا ۔ اور یہ ایسے امور ہیں جنہیں وہ سب جانتے تھے ۔ تو پھر وہ ان کو قبول کرنے سے رُوگردانی کیوں کرتے ہیں ؟ اور ان کو ماننے سے انکار کر رہے ہیں ۔

دوسرا معنی زیادہ نزدیک دکھائی دیتا ہے ، کیونکہ گزشتہ آیت کے بعد ، جو دینِ جدید کے قبول کرنے میں ان کے اختلاف کرنے کی بات کر رہی تھی ، مناسب یہی ہے کہ " امروا " جدید دین کی طرف ناظر ہو ۔

اس سے قطع نظر پہلا معنی صرف اہل کتاب کے بارے میں صادق آتا ہے ، اور مشرکین پر صادق نہیں آتا ، جب کہ دوسرا معنی سب کو شامل ہے ۔

بعض مفسرین کے نظریہ کے مطابق " دین " سے مراد جسے خدا کے لیے خالص کرنا چاہیئے وہی " عبادت " ہے ، اور " الا لیعبدوا اللہ " کا جملہ بھی ، جو اس سے پہلے ذکر ہوا ہے ، اسی معنی کی تائید کرتا ہے ۔

لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے دین و شریعت کا مجموعہ مراد ہو ، یعنی وہ اس بات پر مامور ہوئے تھے کہ خدا کی پرستش کریں اور ہر جہت سے اپنے دین و آئین کو خالص رکھیں ۔ یہ معنی " دین " کے وسیع مفہوم کے ساتھ زیادہ سازگار ہے ۔ اور بعد والا جملہ " وذالك دين القيمة " جو دین کو وسیع معنی میں پیش کرتا ہے اسی معنی کی تائید کرتا ہے ۔

" حنفاء " " حنیف " کی جمع ہے ، جو " حنف " (بروزن کنف) کے مادہ سے ہے ، اور " مفردات " میں " راغب " کے قول کے مطابق گمراہی سے راہِ مستقیم کی طرف مائل ہونے کے معنی میں ہے اور عرب ان تمام لوگوں کو جو " حج " بجا لاتے یا " ختنہ " کیا کرتے تھے ، " حنیف " کہا کرتے تھے (اور احنف) اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کا پاؤں ٹیڑھا ہو ۔

مجموعی طور سے لغت کی مختلف کتابوں سے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اصل میں انحراف اور ٹیڑھے پن کے معنی میں تھا ، البتہ قرآن ، اور اسلامی روایات میں شرک سے توحید و ہدایت کی طرف انحراف کے معنی میں استعمال ہوا ہے ۔

اس تعبیر کا انتخاب ممکن ہے اصل میں اس بنا پر ہو کہ بُت پرست معاشرے ہر اس شخص کو جو ان کے دین کو چھوڑ کر توحید کی طرف قدم بڑھاتا تھا ، اُسے " حنیف " (منحرف) شمار کرتے تھے ، اور پھر آہستہ آہستہ یہ تعبیر راہِ توحید کو طے کرنے والوں کے لیے ایک رائج تعبیر کے عنوان سے پہچانی گئی ، اور حقیقت میں اس کا مفہوم " ضلالت " سے ہدایت کی طرف انحراف تھا ۔ اور اس کا لازمہ ، وہی توحید خالص اور اعتدال کامل اور ہر قسم کے افراط و تفریط سے اجتناب ہے ، لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ یہ سب اس نقطہ کے ثانوی معنی ہیں ۔

" وذالك دين القيمة " کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اصول یعنی توحیدِ خالص اور نماز (خالق کی طرف توجہ) اور زکوٰۃ (مخلوق کی طرف توجہ) تمام ادیان کے ثابت اور پائیدار اصول ہیں ، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ انسان کی فطرت میں داخل ہیں ۔

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

کیونکہ ایک طرف تو انسان کی سرنوشت مسئلہ توحید پر ہے اور دوسری طرف سے اس کی فطرت منعم کا شکر ادا کرنے اور اس کی معرفت و شناخت کی دعوت دیتی ہے، اور تیسری طرف سے رُوح اجتماعی اور انسان کی مدنیت اُسے محروم افراد کی مدد کے لیے پکارتی ہے۔

اس بنا پر ان احکام و دستورات کی جڑ بنیاد کلی طور پر فطرت کی جملہ گہرائیوں میں موجود ہے۔ اسی لیے یہ تمام گزشتہ انبیاء اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات میں پائی جاتی ہے۔

گزشتہ صفحہ کا حاشیہ

لہ اس بات پر توجہ رکھنا چاہیئے کہ "دین القیمۃ" اضافت کی صورت میں ہے، وصف کی صورت میں نہیں ہے۔ اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ ایک ایسا دین ہے جو گزشتہ (مستقیم اور قابلِ قدر) کتب قیمہ میں آیا ہے، یا یہ ایک ایسا دین ہے جس میں اسلام کے مستقیم اور قابلِ قدر احکام بیان ہوئے ہیں۔ اس بنا پر قیمہ کا مؤنث ہونا اس وجہ سے ہے کہ وہ "کتب" یا ملت و شریعت کا وصف ہے (غور کیجئے)

۶۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ؕ

۷۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ؕ

۸۔ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ع

ترجمہ

۶۔ اہلِ کتاب اور مشرک کفّار دوزخ میں جائیں گے اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے، وہ بدترین مخلوق ہیں۔

۷۔ یقینی طور سے وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اعمالِ صالح انجام دیے ہیں، وہ (خدا کی) بہترین مخلوق ہیں۔

۸۔ ان کی جزا، ان کے پروردگار کے یہاں بہشتِ جاودانی کے باغات ہیں، جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے، خدا بھی ان سے راضی ہے اور

وہ بھی خدا سے راضی ہیں، اور یہ (بلند مقام) اس شخص کے لیے ہے، جو اپنے پروردگار سے ڈرے۔

تفسیر

بہترین اور بدترین مخلوق

گزشتہ آیات میں آیا تھا کہ کفار اہل کتاب اور مشرکین اس انتظار میں تھے کہ خدا کی طرف سے کوئی واضح و روشن دلیل ان کے پاس آئے، لیکن واضح و روشن دلیل "بینہ" کے آجانے کے بعد وہ متفرق اور پراگندہ ہوگئے اور ہر ایک نے الگ الگ راہ اختیار کرلی

زیر بحث آیات میں اس دعوتِ الٰہی کے مقابلہ میں "کفر کرنے والے" اور "ایمان لانے والے" دونوں گروہوں اور ان میں سے ہر ایک کے انجام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ اس جدید دین سے کافر ہوگئے ہیں وہ دوزخ کی آگ میں ہوں گے اور ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ وہ بدترین مخلوق ہیں": (ان الذین کفروا من اهل الکتاب والمشرکین فی نار جهنم خالدین فیها اولئك هم شر البریة)۔

"کفروا" کی تعبیر دینِ اسلام کے مقابلہ میں ان کے کفر کی طرف اشارہ ہے، ورنہ ان کا پہلے کا کفر و شرک کوئی نئی بات نہیں ہے

"اولئك هم شر البریة" (وہ بدترین مخلوق ہیں) کی تعبیر ایک لرزہ خیز تعبیر ہے، جو اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ تمام چلنے پھرنے والی مخلوق، اور نہ چلنے پھرنے والی مخلوق میں سے، ان لوگوں سے بڑھ کر مردود اور دھتکاری ہوئی مخلوق اور کوئی نہیں ہے: جنہوں نے حق کے واضح ہوتے ہوئے اور اتمامِ حجت کے بعد سیدھی راہ کو چھوڑ دیا اور ضلالت و گمراہی کی راہ اختیار کرلی۔ اور یہ بات حقیقت میں اسی چیز کے مشابہ ہے جو سورہ انفال کی آیہ ۲۲ میں بیان ہوئی ہے: ان شر الدواب عند الله الصم البكم الذین لا یعقلون: "خدا کے نزدیک بدترین جاندار وہ لوگ ہیں جو نہ سننے والے کان رکھتے ہیں، نہ گویا زبان اور نہ ہی بیدار فکر و اندیشہ"۔

یا جو کچھ سورۂ اعراف کی آیہ ۱۷۹ میں بیان ہوا ہے۔ جہاں دوزخیوں کے گروہ کو ان ہی اوصاف کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے، اولئك كالانعام بل هم اضل اولئك هم الغافلون: وہ چوپاؤں کی طرح ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ اور وہ غافل ہیں۔

زیر بحث آیت کا مطلب ان سے بھی کچھ آگے ہے کیونکہ یہ ان کا بدترین مخلوق ہونے کے ساتھ ان کا تعارف کراتی ہے اور حقیقت میں ان کے جہنم کی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے کی ایک دلیل کے طور پر ہے۔

وہ بدترین مخلوق کیوں نہ ہوں گے جب کہ سعادت کے تمام دروازے ان کے سامنے کھلے ہوتے تھے۔ لیکن وہ کبر و غرور اور عناد و ہٹ دھرمی کی وجہ سے جان بوجھ کر مخالفت کے لیے کھڑے ہوگئے۔

اس آیت میں بھی " اہل کتاب " کو مشرکین پر مقدم رکھنے کی وجہ بھی ممکن ہے یہ ہو کہ وہ کتاب آسمانی کے حامل اور دانشمند تھے۔ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نشانیاں ان کی کتابوں میں صراحت کے ساتھ آئی تھیں۔ اس بنا پر ان کا مخالفت کرنا زیادہ قبیح و بدتر تھا۔

بعد والی آیت میں دوسرے گروہ کی طرف جو ان کے مخالف نقطہ مقابل اور قوس صعودی میں واقع ہوئے ہیں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اعمال صالح انجام دیئے ہیں، وہ خدا کی بہترین مخلوق ہیں: (ان الذین امنوا وعملوا الصالحات اولئك هـم خیر البریة)۔

اس کے بعد ان کی جزا اور پاداش کو چند مختصر سے جملوں میں اس طرح بیان کرتا ہے: ان کی جزا ان کے پروردگار کے پاس بہشت کے جاودانی باغات ہیں، جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں، اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے" (جزاؤهـم عند ربهـم جنات عدن تجری من تحتها الانهار خالدین فیها ابدًا)۔

" خدا بھی ان سے خوش اور راضی ہے، اور وہ بھی خدا سے خوش اور راضی ہیں "۔ (رضی الله عنهـم و رضوا عنه)۔

" یہ بلند و والامقام اور اہم و بے نظیر جزائیں اس شخص کے لیے ہیں جو اپنے پروردگار سے ڈرے"۔ (ذالك لمن خشی ربه)۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ مومنین کے بارے میں اعمال صالح کی گفتگو بھی درمیان میں آئی ہے، جو حقیقت میں ایمان کے درخت کا پھل ہے۔ اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنا اکیلا کافی نہیں ہے، بلکہ انسان کے اعمال بھی اس کے ایمان پر گواہ ہونے چاہئیں، لیکن کفر اکیلا ہی، چاہے اس کے ساتھ غیر صالح اعمال نہ بھی ہوں، سقوط و بدبختی کا سبب ہے۔ اس سے قطع نظر کفر عام طور پر انواع و اقسام کے گناہوں، جرائم اور غلط اعمال کا مبداء بھی ہوتا ہے۔

" اولئك هـم خیر البریة " کی تعبیر اچھی طرح سے اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ مومن اور اعمال صالح بجالانے والے انسان، فرشتوں تک سے بھی برتر و بالاتر ہیں، کیونکہ آیت مطلق ہے، اور اس میں کسی قسم کا استثنا نہیں ہے۔ قرآن کی دوسری آیات بھی اسی معنی کی گواہ ہیں مثلاً: فرشتوں کے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کی آیات، اور آیہ ولقد كرمنا بنی آدم (اسراء - ۷۰)

بہر حال اس آیت میں پہلے تو ان کے مادی و جسمانی صلہ، جو جنت کے پر نعمت باغات ہیں، کا ذکر کرتا ہے، اور اس کے بعد ان کی معنوی و روحانی جزا کو بیان کرتا ہے کہ خدا بھی اُن سے راضی ہے اور وہ بھی خدا سے راضی اور خوش ہیں۔

وہ خدا سے راضی اور خوش ہیں کیونکہ جو کچھ وہ چاہتے تھے وہ اس نے انہیں دیا ہے، اور خدا اُن سے راضی اور خوش ہے کیونکہ وہ جو کچھ چاہتا تھا وہ انہوں نے انجام دے دیا، اور اگر ان سے کوئی لغزش ہو بھی گئی ہو تو اس نے اپنے لطف و کرم سے اس سے صرف نظر کی، اس سے بڑھ کر اور کون سی لذت ہو سکتی ہے کہ اُسے اس بات کا احساس ہو جائے کہ اس کے کاموں کو معبود نے قبول کر لیا ہے اور اس کا محبوب اس سے راضی اور خوش ہے۔ اور اُسے اس کی لقا حاصل ہو گئی ہے۔

دارند ہر کس از تو مرادے و مطلبے
مقصود ما ز دُنیا و عُقبیٰ لقائے تو است

" ہر شخص تجھ سے کوئی نہ کوئی خواہش اور مطلب رکھتا ہے
لیکن ہمارا مقصد دُنیا و آخرت میں تیری لقاء ہے"

ہاں! انسان کے جسم کی جنت تو اُس جہان کے جاودانی باغات ہیں، لیکن اس کی رُوح کی بہشت خدا کی رضا اور لقائے محبوب ہے
"ذالك لمن خشی ربه" کا جملہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ ان تمام برکات کا سرچشمہ خدا کا خوف، خشیت اور ڈر ہے، کیونکہ یہی خوف ہی ہر قسم کی اطاعت، تقویٰ اور اعمالِ صالح کی طرف حرکت کرنے کا سبب بنتا ہے۔
بعض مفسرین نے اس آیت کو سورۂ فاطر کی آیہ ۲۸ انما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلماء "صرف علما ہی خدا سے ڈرتے ہیں" کے ساتھ ملاکر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بہشت پر حقیقتاً علماء اور آگاہ دانش مند لوگوں کا مسلّمہ حق ہے۔
البتہ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ خشیت اور خوفِ خدا کے کئی درجے اور مرتبے ہوتے ہیں اور علم و دانش و آگاہی میں بھی کئی درجے اور مرتبے ہوتے ہیں اس بات کا مفہوم واضح اور روشن ہو جاتا ہے۔
ضمنی طور پر بعض کا نظریہ یہ ہے کہ "مقامِ خشیت" "مقامِ خوف" سے بالاتر ہوتا ہے، کیونکہ خوف تو ہر قسم کے ڈر پر بولا جاتا ہے، لیکن خشیت اس خوف کو کہتے ہیں جو تعظیم و احترام کے ساتھ ہو۔

چند نکات

۱۔ علیؑ اور ان کے شیعہ خیرالبریہ ہیں

بکثرت روایات ہیں جو اہلِ سنت کے طریقوں سے ان کی مشہور کتابوں میں اور اسی طرح شیعوں کی مشہور کتابوں میں نقل ہوئی ہیں آیہ "اولٰئك ھم خیر البریة" (وہ خدا کی بہترین مخلوق ہیں) کی علی علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے۔
"حاکم حسکانی" نیشاپوری نے، جو پانچویں صدی ہجری کے مشہور علماء اہل سنت میں سے ہیں، ان روایات کو اپنی مشہور کتاب "شواھد التنزیل" میں مختلف اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے، اور ان کی تعداد بیس روایات سے زیادہ ہے جن میں سے ہم چند روایات کو نمونہ کے طور پر آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔
۱۔ "ابن العباس" کہتے ہیں جس وقت آیہ "الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات اولٰئك ھم خیر البریة" نازل ہوئی تو پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام سے فرمایا،

"ھو انت و شیعتك تأتی انت و شیعتك یوم القیامة راضین مرضیین ویأتی عدوك غضبانا مقمحین"۔

"اس آیت سے مراد تو اور تیرے شیعہ ہیں جو روزِ قیامت عرصۂ محشر میں اس حال میں وارد ہوں گے کہ تم بھی خدا سے راضی ہوگے اور خدا بھی تم سے راضی ہوگا، اور تیرا دشمن غصہ کی حالت میں عرصۂ محشر میں وارد ہوگا اور زبردستی اس کو جہنم میں دھکیل دیا جائے گا۔" (حدیث کے بعض نسخوں میں مقمحین آیا ہے، جس کا معنی طوق و زنجیر کے ذریعہ سر کو اونچا رکھنا ہے)[1]

---

[1] "شواہد التنزیل" جلد ۲ ص ۳۵۷ حدیث ۱۱۲۶

۲۔ ایک دوسری حدیث میں " ابو برزہ" سے آیا ہے کہ جس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی تو فرمایا:

" ھم انت وشیعتك یا علی وميعاد ما بيني و بينك الحوض "

" اسے علیؑ! وہ تو اور تیرے شیعہ ہیں، اور تیری اور میری وعدہ گاہ حوض کوثر ہے"۔[1]

۴۔ ایک اور حدیث میں " جابر بن عبداللہ انصاری" سے آیا ہے کہ ہم خانۂ خدا کے پاس پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ علیؑ ہماری طرف آئے۔ جس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ ان پر پڑی تو فرمایا:

" قد اتاكم اخي "

" میرا بھائی تمہاری طرف آرہا ہے"۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خانۂ خدا کی طرف رُخ کیا اور فرمایا:

" فقال ورب هذه البنية ان هذا وشيعته هم الفائزون يوم القيامة "

" اس کعبہ کے خدا کی قسم یہ شخص اور اس کے شیعہ قیامت کے دن رستگار اور کامیاب ہوں گے"

اس کے بعد ہماری طرف رُخ کیا اور فرمایا:

" اما والله انه اولكم ايماناً بالله، واقومكم بامر الله، واوفاكم بعهد الله، واقضاكم بحكم الله، واقسمكم بالسوية، واعدلكم في الرعية، واعظمكم عند الله مزية "

قال " جابر" : فانزل الله : " ان الذين آمنوا وعملوا الصالحات اولٰئك هم خير البرية " فكان علي اذا اقبل قال اصحاب محمد (صلی الله عليه وآله وسلم) قد اتاكم خير البرية بعد رسول الله :

" خدا کی قسم یہ تم سب میں سے پہلے خدا پر ایمان لایا ہے اور اس نے خدا کے حکم سے تم سب میں سے پہلے قیام کیا ہے، خدا کے عہد کو تم سب سے زیادہ وفا کرنے والا ہے، اور وہ تم سب سے زیادہ اللہ کے حکم کے مطابق فیصلے کرنے والا ہے اور وہ (بیت المال کی تقسیم میں سب سے زیادہ مساوات کرنے والا ہے، اور رعیت میں سب سے زیادہ عدل کرنے والا ہے، اور اس کا مقام و مرتبہ خدا کے نزدیک تم سب سے زیادہ ہے"۔

جابر کہتے ہیں کہ اس موقع پر خدا نے آیہ ان الذين آمنوا و عملوا الصالحات اولٰئك هم خير البرية" نازل فرمائی۔ اس کے بعد جب بھی کبھی علی علیہ السلام آتے تو اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

[1] وہی مدرک ص ۳۵۹ حدیث ۱۱۳۰

انہیں آتا ہوا دیکھ کر کہتے :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خدا کی مخلوق میں جو سب سے زیادہ بہتر ہے وہ آرہا ہے۔[1]

اس آیت کا خانہ کعبہ کے پاس نزول اس سورہ کے مدنی ہونے کے ساتھ منافات نہیں رکھتا، کیونکہ ممکن ہے کہ یہ نزول مجدد کے قبیل سے ہو، یا تطبیق کے عنوان سے ہو، علاوہ ازیں بعید نہیں ہے کہ ان آیات کا نزول ان سفروں میں ہوا ہو جن میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ سے مکہ کی طرف آئے تھے۔ خصوصاً جب کہ اس روایت کا راوی "جابر بن عبداللہ انصاری" ہے، جو مدینہ میں آپ کے ساتھ ملحق ہوئے تھے، اور اس قسم کی آیات پر مدنی ہونے کا اطلاق بعید نہیں ہے۔

ان احادیث میں سے بعض کو "ابن حجر" نے کتاب "صواعق محرقہ" میں نقل کیا ہے۔ اور بعض کو شبلنجی نے "نور الابصار" میں ذکر کیا ہے۔[2]

"جلال الدین سیوطی" نے "در المنثور" میں بھی آخری روایت کا عمدہ حصّہ "ابن عساکر" سے جابر بن عبداللہ" سے نقل کیا ہے۔[3]

۴۔ "در المنثور" میں آیا ہے کہ جس وقت آیۂ "ان الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات اولٰئك هم خير البرية" نازل ہوئی، تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام سے فرمایا :

"هو انت وشيعتك يوم القيامة راضين مرضيين"

"وہ تو اور تیرے شیعہ ہیں، قیامت کے دن تم خدا سے راضی ہوگے اور خدا تم سے راضی ہوگا۔"[4]

۵۔ مذکورہ مؤلف نے ایک دوسری حدیث میں "ابن مردویہ" کے واسطے سے علی علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا :

"الم تسمع قول الله : ان الذين اٰمنوا وعملوا الصالحات اولٰئك هم خير البرية ؟ انت وشيعتك وموعدي وموعدكم الحوض، اذا جئت الامم للحساب تدعون غرا محجلين :[5]

"کیا تم نے خدا کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ فرماتا ہے : جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح انجام دیے وہ بہترین مخلوق ہیں ؟ یہ تم اور تمہارے شیعہ ہیں۔ اور میری اور تمہاری وعدہ گاہ حوضِ کوثر کا کنارہ ہے۔ جب میں اُمتوں کے حساب کے لیے آؤں گا تو تمہیں

---

[1] ذہبی مدرک ص ۳۶۲ حدیث ۱۱۳۹

[2] "صواعق المحرقہ" ص ۹۶ "نور الابصار" ص ۷۰، ۱۰۱

[3] "در المنثور" جلد ۶ ص ۳۷۹

[4] "در المنثور" جلد ۶ ص ۳۷۹

" غرا محجلین " (سفید پیشانیوں والے) کہہ کر پکارا جائے گا۔

اہلِ سنّت کے اور بھی بہت سے دوسرے علماء نے اسی مضمون کو اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، منجملہ "خطیب خوارزمی" نے "مناقب" میں "ابونعیم اصفہانی" نے "کفایت الخصام" میں "علامہ طبری" نے اپنی مشہور تفسیر" میں" ابن صباغ مالکی" نے "فصول المھمہ" میں" علامہ شوکانی" نے "فتح القدیر" میں" شیخ سلیمان قندوزی" نے "ینابیع المودۃ" اور" آلوسی" نے "رُوح المعانی" میں زیر بحث آیات کے ذیل میں، اور بہت سے دوسرے علماء نے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اُوپر والی حدیث بہت ہی مشہور و معروف احادیث میں سے ہے جسے اکثر دانش مندوں اور علماء اسلام نے قبول کیا ہے۔ اور یہ علی علیہ السّلام اور ان کے شیعوں کی ایک بہت بڑی فضیلت ہے۔

ضمنی طور پر اِن رِوایات سے یہ حقیقت اچھی طرح آشکار ہو جاتی ہے کہ لفظ " شیعہ " رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے ہی آنحضرتؐ کے ذریعے مسلمانوں کے درمیان نشر ہوا، اور یہ امیرالمومنین علی علیہ السّلام کے خاص پیروکاروں کی طرف اشارہ ہے لہٰذا وہ لوگ جو یہ گمان کرتے ہیں کہ "شیعہ" کی تعبیر صدیوں بعد وجود میں آئی ہے، بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

۲۔ عبادت میں خلوص نیّت لازم ہے

اصولِ فقہ کے بعض علماء نے آیہ " وما امروا الا لیعبدوا اللّٰہ مخلصین لہ الدین" سے عبادات میں قصدِ قربت کے لازم ہونے پر استدلال کیا ہے اور یہ کہ اوامر میں اصل ان کا تعبدی ہونا ہے نہ کہ توصلی ہونا۔ اور یہ اس سے وابستہ ہے کہ یہاں " دین" کا معنی عبادت ہو، تاکہ یہ عبادات میں خلوص کے لازم ہونے کی دلیل بنے، اور " امر " کو ہم اس آیت میں مطلق قرار دیں، تاکہ اس کا مفہوم تمام اوامر میں قصدِ قربت کا لازم ہونا ہے۔ (سوائے ان موارد کے جو دلیل کی وجہ سے خارج ہوں) حالانکہ آیت کا مفہوم، ظاہر کے اعتبار سے، ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے، بلکہ اس سے مقصود شرک کے مقابلہ میں توحید کا اثبات ہے۔ یعنی انہیں توحید کے سوا اور کسی چیز کی دعوت نہیں دی گئی ہے اور اس حال میں اس کا احکامِ فرعی کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے۔

۳۔ انسان کی عجیب قوسِ صعودی و نزولی

اِس سورہ کی آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ عالم میں کسی بھی مخلوق کے قوسِ صعودی و نزولی کا فاصلہ انسان کے قوسِ صعودی و نزولی کے برابر نہیں ہے۔ اگر انسان ایمان لے آئے اور اعمالِ صالح بجا لائے (اس بات پر توجہ رہے کہ " عملوا الصالحات " تمام اعمالِ صالح کو شامل ہے، نہ کہ بعض کو)، تو وہ خدا کی مخلوق میں سب سے زیادہ افضل اور برتر ہو جاتا ہے، لیکن اگر وہ کفر و ضلالت اور ہٹ دھرمی اور عناد کا راستہ اختیار کرلے، تو اتنا گر جاتا ہے کہ خدا کی مخلوق میں سب سے زیادہ بدترین جاتا ہے!

انسان کے " قوسِ صعودی " و " نزولی " کا یہ عظیم فاصلہ اگرچہ ایک حسّاس اور خطرناک مسئلہ ہے لیکن یہ نوعِ بشر کے مقام کی عظمت اور اس کے تکامل و ارتقاء کی قابلیت پر دلالت کرتا ہے، اور یہ ایک طبیعی و فطری چیز ہے کہ اس قسم کی حد سے زیادہ قابلیت و استعداد کے ہوتے ہوئے، تنزل و سقوط کا امکان بھی حد سے زیادہ ہو۔

خداوندا! ہم "خیر البریہ" کے بلند مقام تک پہنچنے کے لیے تیرے لطف و کرم سے مدد طلب کرتے ہیں۔

پروردگارا! ہمیں اس عظیم اور بزرگ ہستی کے شیعوں اور پیروکاروں میں سے قرار دے جو اس کے لیے سب سے زیادہ لائق اور شائستہ ہے۔

بارالٰہا! ہمیں اس قسم کا خلوص مرحمت فرما کہ ہم تیرے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور تیرے غیر سے محبت نہ کریں۔

آمین یا رب العالمین

اختتام سورہ "بینہ"

اختتام ترجمہ

بروز اتوار ۲۱ رمضان ۱۴۰۸ھ پونے گیارہ بجے

بر مکان حقیر قم المقدسہ

سُورَہ اَلزِّلزَال

* یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا
* اس میں ۸ آیات ہیں

سورہ "زلزلہ" کے مطالب اور فضیلت

اس بارے میں کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا ہے یا مدینہ میں، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بہت سے اسے مدنی سمجھتے ہیں جب کہ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ مکہ میں نازل ہوا ہے۔ اس کی آیات کا لب ولہجہ جو "معاد" اور "قیامت کی شرائط" کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں، مکی سورتوں سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے، لیکن ایک حدیث میں آیا ہے کہ جس وقت یہ سورہ نازل ہوا تو "ابوسعید خدری" نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیہ فمن یعمل مثقال ذرۃ ... کے بارے میں سوال کیا، اور ہم جانتے ہیں کہ "ابوسعید" مدینہ میں مسلمانوں سے ملحق ہوئے تھے۔[1]

لیکن اس سورہ کا مدنی یا مکی ہونا اس کے مفاہیم اور تفسیر پر اثرانداز نہیں ہوتا۔

بہرحال یہ سورہ خصوصیت کے ساتھ تین محوروں کے گرد گردش کرتا ہے۔

پہلے "اشراط الساعۃ" اور قیامت کے وقوع کی نشانیوں سے بحث کرتا ہے۔

اور اس کے بعد انسان کے تمام اعمال کے بارے میں زمین کی گواہی کی گفتگو ہے۔

اور تیسرے حصہ میں لوگوں کی دو گروہوں "نیکوکار" و "بدکار" میں تقسیم، اور ہر شخص کے اپنے اعمال کا نتیجہ پانے کی بات ہے۔

اس سورہ کی فضیلت میں اسلامی روایات میں اہم تعبیریں آئی ہیں۔ منجملہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"من قرأها فكأنما قرأ البقرة واعطى من الاجر كمن قرأ ربع القرآن:

"جو شخص اس کی تلاوت کرے گویا اس نے سورہ بقرہ کی قراءت کی، اور اس کا اجر و ثواب اس شخص کے برابر ہے جس نے قرآن کے چوتھے حصہ کی

---

[1] "روح المعانی" جلد ۳۰ ص ۲۰۸

قرائت کی ہو۔[1]

اور ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

سُورۃ " اذا زلزلت الارض " کی تلاوت کرنے سے ہرگز خستہ نہ ہونا، کیونکہ جو شخص اس کو نافلہ نمازوں میں پڑھے گا وہ ہرگز بھی زلزلہ میں گرفتار نہ ہو گا اور نہ ہی اس کی وجہ سے مرے گا۔ اور مرتے دم تک صاعقہ اور آفاتِ دُنیا میں سے کسی آفت میں گرفتار نہ ہو گا۔[2]

---

[1] " مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۲۴

[2] " اصول کافی" (مطابق نقل نورالثقلین جلد ۵ ص ۶۴۷)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝

۲۔ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝

۳۔ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا ۝

۴۔ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝

۵۔ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝

۶۔ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝

۷۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝

۸۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ جس وقت زمین شدت کے ساتھ لرزنے لگے گی۔

۲۔ اور زمین اپنے سنگین بوجھ کو باہر نکال کر رکھ دے گی۔

۳۔ اور انسان کہے گا کہ زمین کو کیا ہو گیا ہے۔ (کہ اس طرح لرز رہی ہے)

۴۔ اس دن زمین اپنی تمام خبروں کو بیان کر دے گی۔

۵۔ کیونکہ تیرے پروردگار نے اسے وحی کی ہے۔

۶۔ اس دن لوگ مختلف گروہوں کی صورت میں قبروں سے نکلیں گے، تاکہ ان کے اعمال انہیں دکھائے جائیں۔

۷۔ پس جس شخص نے ایک ذرہ کے وزن کے برابر بھی اچھا کام انجام دیا ہوگا وہ اسے دیکھے گا۔

۸۔ اور جس نے ایک ذرہ کے وزن کے برابر برا کام کیا ہوگا وہ اسے دیکھے گا۔

تفسیر

جس دن انسان اپنے تمام اعمال دیکھے گا

جس طرح سورہ کے مطالب کے بیان میں اشارہ ہوا ہے یہ سورہ اس جہان کے اختتام اور قیامت کے شروع کے بعض ہولناک اور وحشت ناک حوادث کے بیان کے ساتھ شروع ہوا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: "جس وقت زمین شدت کے ساتھ ہلنے لگے گی"۔ (اذا زلزلت الارض زلزالها)[1]

اور اس طرح زیر و زبر ہوگی کہ "وہ سارے سنگین بوجھ، جو اس کے اندر ہیں، باہر نکال کر رکھ دے گی"۔ (واخرجت الارض اثقالها)۔

"زلزالها" (اس کا زلزلہ) کی تعبیر یا تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس دن سارا کرۂ زمین لرزنے لگے گا (عام زلزلوں کے برخلاف جو سب کے سب کسی خاص موضع یا علاقہ میں ہوتے ہیں)۔ اور زلزلۂ معہود یعنی زلزلۂ قیامت کی طرف اشارہ ہے۔[2][3]

اس بارے میں کہ "اثقال" (سنگین بوجھ) سے کیا مراد ہے، مفسرین نے متعدد تفاسیر بیان کی ہیں، بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد وہ انسان ہیں جو قیامت کے زلزلہ سے قبروں کے اندر سے باہر اچھل پڑیں گے، جیسا کہ سورہ انشقاق کی آیہ ۴ میں آیا ہے

---

[1] "اذا" یہاں شرطیہ ہے، اور اس بارے میں کہ جزائے شرط کیا ہے کئی احتمال دیئے گئے ہیں، بعض اس کی جزا "یومئذ تحدث اخبارها" کو سمجھتے ہیں، بعض "یومئذ یصدر الناس اشتاتا" کو، اور بعض نے جزا کو محذوف جانا ہے۔ اس طرح کہ لوگ یہ سوال کرتے تھے کہ متی الساعة؟ قیامت کب واقع ہوگی؟ تو جواب میں فرمایا: جب وہ عظیم زلزلہ آئے گا یعنی اس وقت قیامت واقع ہوگی۔

[2] پہلی صورت میں اضافت عمومی معنی رکھتی ہے اور دوسری صورت میں عہد کے معنی دیتی ہے۔

[3] "زلزال" "زا" کی زیر کے ساتھ مصدری معنی دیتا ہے اور زلزال (زا کی زبر کے ساتھ) اسم مصدر کے معنی دیتا ہے اور یہ وزن عام طور پر ان افعال میں آتا ہے جو مضاعف کی صورت میں استعمال ہوتے ہیں، مثلاً "صلصال" اور "وسواس"۔

" والقت ما فیھا و تخلت "

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ وہ اپنے اندرونی خزانوں کو باہر پھینک دے گی۔ اور بے خبر دُنیا پرستوں کے لیے حسرت کا سبب بنے گی۔ ؎

یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد زمین کے اندر بہنے والے بھاری مواد کو باہر پھینکنا ہے جن کی کچھ مقدار عام طور پر آتش فشانی اور زلزلوں کے وقت باہر نکلتی ہے۔

عالم کے اختتام پر جو کچھ زمین کے اندر ہے وہ اس زلزلۂ عظیم کے بعد باہر آجائے گا۔

پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے، اگرچہ ان تفاسیر کے درمیان جمع بھی بعید نہیں ہے۔

بہر حال اس دن انسان اس اَن دیکھے منظر کو دیکھ کر سخت متوحش ہوگا، اور کہے گا: " یہ کیا ہو گیا ہے کہ زمین اس طرح لرز رہی ہے اور جو کچھ اس کے اندر تھا اُسے باہر پھینک دیا ہے۔" (وقال الانسان مالھا)۔

اگرچہ بعض نے یہاں انسان کی کافر انسانوں کے ساتھ تفسیر کی ہے، جو مسئلہ معاد و قیامت میں شک کرتے تھے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ انسان یہاں ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو سب کو شامل ہے، کیونکہ زمین کے اوضاع و احوال سے تعجب اُس دن کفار کے ساتھ مخصوص نہیں ہوگا۔

کیا یہ تعجب، اور اس سے پیدا ہونے والا سوال " نفخۂ اولیٰ " سے مربوط ہے یا " نفخۂ دوم " سے، ؟

ظاہر یہ ہے کہ یہ وہی پہلا نفخہ ہے جو اس عالم کے اختتام کا نفخہ ہے۔ کیونکہ یہ زلزلۂ عظیم اختتامِ جہان پر آئے گا۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس سے مراد نفخۂ قیامت اور مردوں کے زندہ ہونے اور ان کے زمین سے باہر پھینک دینے کا نفخہ ہے کیونکہ بعد والی آیات بھی سب کی سب نفخۂ دوم کے ساتھ مربوط ہیں۔

لیکن چونکہ قرآن کی آیات میں ان دونوں نفخوں کے حوادث بارہا اکٹھے ذکر ہوئے ہیں، لہٰذا اختتامِ جہان پر وحشت ناک زلزلہ کے بیان کی طرف توجہ کرتے ہوئے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے، اور اس صورت میں زمین کے " اثقال " سے مراد معدنیات، خزانے اور اس کے اندر موجود پگھلے ہوئے مواد ہیں۔

اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ " زمین اس دن اپنی ساری خبریں بیان کرے گی " (یومئذ تحدث اخبارھا)۔

جو خوبیاں اور بُرائیاں، اور خیر و شر کے اعمال رُوئے زمین پر واقع ہوئے ہیں، وہ ان سب کو ظاہر کر دے گی۔ اور اس دن انسان کے اعمال کے گواہوں میں سے اہم ترین گواہ یہی زمین ہوگی جس پر ہم اپنے اعمال انجام دیتے ہیں۔ اور جو ہماری شاہد و ناظر ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

" اتدرون ما اخبارھا "؟ :

" کیا تم جانتے ہو کہ زمین کے اخبار سے یہاں کیا مُراد ہے "؟

؎ " اثقال " جمع ہے " ثِقل " (بروزن فکر) کی جو " بار " کے معنی میں ہے، اور بعض نے اُسے " ثَقَل " (بروزن عمل) کی جمع سمجھا ہے جو وسائل خانہ یا وسائل مسافر کے معنی میں ہے، لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔

"قالوا : اللّٰہ و رسولہ اعلم" :

"انہوں نے کہا : خدا اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں"

آپ نے فرمایا :

"اخبارھا ان تشھد علی کل عبد و امۃ بما عملوا علی ظھرھا، تقول عمل کذا و کذا، یوم کذا، فھذا اخبارھا" :

"زمین کے خبر دینے سے مراد یہ ہے کہ زمین ہر مرد اور ہر عورت کے اعمال کی، جو انہوں نے رُوئے زمین پر انجام دیے ہیں، خبر دے گی، وہ کہے گی کہ فلاں شخص نے فلاں دن فلاں کام کیا ہے، یہ ہے زمین کا خبر دینا" [1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے :

"حافظوا علی الوضوء و خیر اعمالکم الصلٰوۃ فتحفظوا من الارض فانھا امکم، ولیس فیھا احد یعمل خیرًا او شرًّا الا و ھی مخبرۃ بہ" :

"وضوء اور اپنے اعمال میں سے بہترین عمل، نماز کی حفاظت کرو، اور زمین کی طرف دیکھتے رہو، کیونکہ وہ تمہاری ماں ہے۔ کوئی بھی انسان کوئی اچھا یا بُرا کام انجام نہیں دیتا مگر یہ کہ زمین اس کی خبر دیتی ہے" [2]

ابوسعید خدری سے نقل ہوا ہے کہ وہ یہ کہا کرتے تھے : جب کبھی تم بیابان میں ہو، تو بلند آواز کے ساتھ اذان دو، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے :

"لا یسمعہ جن ولا انس ولا حجر الا یشھد لہ"

"کوئی جنّ و انس، اور پتھر کا کوئی ٹکڑا اُسے نہیں سُنتا، مگر یہ کہ (قیامت میں) اس کے لیے گواہی دے گا" [3]

کیا واقعاً خدا کے حکم سے زمین کی زبان کھل جائے گی اور وہ بات کرے گی؟ یا اس سے مراد رُوئے زمین پر انسان کے اعمال کے آثار کا ظاہر ہونا ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان جو عمل بھی انجام دیتا ہے، وہ خواہ مخواہ اس کے اطراف میں کچھ آثار چھوڑتا ہے۔ چاہے وہ آج ہمارے لیے محسوس نہ ہوں۔ ٹھیک ایک دوست یا دشمن کی انگلیوں کے انہیں آثار کے مانند، جو دروازے کے قبضہ پر رہ

---

[1] "نورالثقلین" جلد ۵ ص ۶۴۹

[2] "مجمع البیان" جلد ۱ ص ۵۲۶

[3] وہی مدرک

جاتے ہیں، اور اس دن یہ سب کے سب آثار ظاہر ہو جائیں گے، اور زمین کا بات کرنا اس عظیم ظہور کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم کسی خواب آلود شخص سے کہتے ہیں، کہ تیری آنکھیں بتلا رہی ہیں کہ تو کل رات سویا نہیں ہے۔ یعنی بے خوابی کے آثار اس میں نمایاں ہیں۔

بہرحال یہ کوئی غیر مانوس بات نہیں ہے، کیونکہ موجودہ زمانے میں انسان کے علم و دانش کی پیش رفت کی وجہ سے ایسے آلات و وسائل اختراع ہو چکے ہیں جو ہر جگہ اور ہر لمحہ انسان کی آواز کو گرفت میں لے سکتے ہیں، یا انسان اور اس کے اعمال و افعال کی تصویریں کھینچ سکتے ہیں، اور ایک مسلّم سند کے عنوان سے اُسے عدالت میں پیش کر سکتے ہیں، اس طرح کہ انکار کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔

اگر لوگ گزشتہ زمانہ میں زمین کی گواہی سے تعجب کرتے تھے، تو موجودہ زمانہ میں ایک پتلی سی ریل (فیتہ) یا (ریکارڈ) ضبط کرنے کی مشین جو ایک بٹن کی صورت میں لباس سے ٹکی ہوئی ہوتی ہے، بہت سے مسائل کو بیان کر سکتی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں علی علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"صلوا المساجد فی بقاع مختلفة، فان كل بقعه تشهد للمصلی علیها یوم القیامة"

"مساجد کے مختلف حصوں میں نماز پڑھا کرو، کیونکہ زمین کا ہر ٹکڑا، اس شخص کے لیے جو اس پر نماز پڑھتا ہے، گواہی دے گا۔"[1]

ایک اور دوسری حدیث میں آیا ہے کہ امیر المومنین علی علیہ السلام جب بیت المال تقسیم فرماتے تھے، اور وہ خالی ہو جاتا تھا تو وہاں دو رکعت نماز بجالاتے اور فرماتے:

"اشهدی انی ملأتك بحق و فرغتك بحق"

(قیامت کے دن) "گواہی دینا کہ میں نے تجھے حق کے ساتھ پُر کیا تھا اور حق کے ساتھ ہی خالی کیا ہے۔"[2]

بعد والی آیت میں مزید فرماتا ہے: "یہ اس خبر (نبا) پر ہے کہ تیرے پروردگار نے زمین کو وحی کی ہے۔" (بان ربك اوحی لها)[3] اور زمین اس فرمان کے اجراء میں کوتاہی نہیں کرے گی۔" "اوحی" کی تعبیر یہاں اس بناء پر ہے کہ اس قسم کی اسرار آمیز گفتگو کرنا زمین کی طبیعت کے خلاف ہے۔ اور یہ چیز ایک وحی الٰہی کے طریقے کے سوا ممکن نہیں ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ زمین کو وحی کرے گا کہ جو کچھ اس کے اندر ہے وہ باہر پھینک دے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح اور مناسب نظر آتی ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے، "اس دن لوگ مختلف گروہوں کی صورت میں قبروں سے نکل کر عرصۂ محشر میں وارد ہوں گے، تاکہ ان کے اعمال

---

[1] "لئالی الاخبار" جلد ۵ ص ۹۰، چاپ جدید

[2] "لئالی الاخبار" جلد ۵ ص ۹۰، چاپ جدید

[3] "بان" میں "باء" سببیت کے لیے ہے اور لها میں "لام" "الی" کے معنی میں ہے جیسا کہ سورہ "نحل" کی آیہ ۶۸ میں آیا ہے "و اوحی ربك الی النحل"۔

انہیں دکھائے جائیں۔ (یومئذ یصدر الناس اشتاتا لیروا اعمالهم)۔

"اشتات" "شت" (بروزن شط) کی جمع ہے، جو پراگندہ اور متفرق کے معنی میں ہے، یہ اختلاف و پراگندگی ممکن ہے اس بنا پر ہو کر ہر مذہب والے الگ الگ عرصۂ محشر میں وارد ہوں گے، یا زمین کے علاقوں میں سے ہر علاقے کے لوگ جدا جدا وارد ہوں گے، یا یہ ہے کہ ایک گروہ تو ہشاش بشاش، شاد و خنداں، حسین و خوبصورت چہروں کے ساتھ آئے گا اور ایک گروہ تیوری چڑھائے تیرہ و تاریک چہروں کے ساتھ محشر میں وارد ہوگا۔

یا ہر اُمت اپنے امام، رہبر اور پیشوا کے ساتھ ہوگی جیسا کہ سورہ اسراء کی آیہ ۷۱ میں آیا ہے: یوم ندعوا کل اناس بامامهم: "اس دن ہم ہر گروہ کو اس کے امام و پیشوا کے ساتھ بلائیں گے۔

یا یہ ہے کہ مؤمنین، مؤمنین کے ساتھ، اور کفار کفار کے ساتھ محشور ہوں گے۔

ان تمام تفاسیر کے درمیان جمع بھی پورے طور پر ممکن ہے کیونکہ آیت کا مفہوم وسیع ہے۔

"یصدر" "صدر" (بروزن صبر) کے مادہ سے اُونٹوں کے پانی والی جگہ سے نکلنے کے معنی میں ہے، جو انبوہ کی صورت میں ہیجان میں آئے ہوئے باہر آتے ہیں۔ "ورود" کے برعکس جو پانی کی جگہ میں داخل ہونے کے معنی میں ہے۔ اور یہاں مختلف قوموں کے قبروں سے نکلنے اور حساب دینے کے لیے محشر میں آنے سے کنایہ ہے۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس سے مراد محشر سے نکل کر جنت یا جہنم میں اپنی جگہ کی طرف چلنا ہے۔

پہلا معنی گزشتہ آیات کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

"لیروا اعمالهم" (تاکہ ان کے اعمال انہیں دکھائے جائیں) کے جملہ سے مراد اعمال کی جزا کا مشاہدہ ہے۔

یا نامۂ اعمال کا مشاہدہ مراد ہے جس میں ہر نیک و بد عمل ثبت ہے۔

یا مشاہدہ باطنی مراد ہے جس کا معنی ان کے اعمال کی کیفیت کی معرفت و شناخت ہے۔

یا "تجسم اعمال" کی صورت میں خود اعمال کا مشاہدہ مراد ہے۔

آخری تفسیر ظاہر آیہ کے ساتھ سب سے زیادہ موافق ہے، اور یہ آیت مسئلہ تجسم اعمال پر روشن ترین آیات میں سے شمار ہوتی ہے کہ اس دن انسان کے اعمال مناسب صورتوں میں مجسم ہو کر اس کے سامنے حاضر ہوں گے، اور ان کی ہم نشینی خوشی کا موجب یا رنج و بلا کا باعث ہوگی۔

اس کے بعد ان دونوں گروہوں مومن و کافر، نیکوکار و بدکار کے انجام کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "پس جس شخص نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اُسے دیکھے گا"۔ (فمن یعمل مثقال ذرة خیرا یره)۔

اور جس شخص نے ذرہ برابر بُرا کام کیا ہوگا وہ اُسے دیکھے گا"۔ (ومن یعمل مثقال ذرة شرا یره)۔

یہاں بھی مختلف تفسیریں ذکر ہوئی ہیں، کہ کیا اعمال کی جزا کو دیکھے گا، یا نامۂ اعمال کا مشاہدہ کرے گا، یا خود عمل کو۔

ان آیات کا ظاہر بھی، قیامت کے دن "تجسم اعمال" اور خود عمل کے مشاہدہ کے مسئلہ پر نئے سرے سے ایک تاکید ہے چاہے وہ عمل نیک ہو یا بُرا، یہاں تک کہ اگر ایک سوئی کے برابر بھی نیک یا بُرا کام ہوگا تو وہ بھی اپنے کرنے والے کے سامنے مجسم ہو جائے گا، اور

اور وہ اس کا مشاہدہ کرے گا۔

"مثقال" لغت میں بوجھ اور سنگینی کے معنی میں بھی آیا ہے، اور اس ترازو کے معنی میں بھی جس سے چیزوں کو تولا جاتا ہے اور یہ یہ پہلے معنی میں ہی ہے۔

"ذرّۃ" کے لیے بھی لغت اور مفسرین کے کلمات میں مختلف تفسیریں ذکر ہوئی ہیں، کبھی تو چھوٹی چیونٹی کے معنی میں، اور کبھی اس گرد و غبار کے معنی میں جو زمین پر ہاتھ رکھ کر اٹھانے کے بعد اس سے چپک جاتا ہے اور کبھی غبار کے ان چھوٹے چھوٹے ذرات کے معنی میں تفسیر ہوئی ہے جو فضا میں معلق ہوتے ہیں اور جب سورج کی شعاعیں کسی سوراخ سے تاریک کمرے میں پڑتی ہیں تو وہ ظاہر ہو جاتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں "ذرہ" کا "ایٹم" پر بھی اطلاق کرتے ہیں۔ اور ایٹم بم کو "القنبلۃ الذریۃ" کہتے ہیں۔

"ایٹم" اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ نہ تو وہ عام آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی دقیق ترین خوردبینوں کے ذریعے قابل مشاہدہ ہے اور صرف اس کے آثار کا ہی مشاہدہ کرتے ہیں، اور اس کا حجم اور وزن علمی حساب کتاب کے ذریعے ہی ناپا تولا جاتا ہے، اور وہ اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ سوئی کی ایک نوک پر لاکھوں کی تعداد میں سما جاتے ہیں۔

ذرہ کا مفہوم چاہے جو بھی ہو یہاں مراد سب سے چھوٹا وزن ہے۔

بہرحال یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو آدمی کی پشت میں لرزہ پیدا کر دیتی ہیں۔ اور اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ اس دن حساب و کتاب حد سے زیادہ دقیق اور حساس ہوگا۔ اور قیامت میں ناپ تول کا ترازو اس قدر ظریف ہوگا، کہ وہ انسان کے چھوٹے سے چھوٹے اعمال کا وزن اور اس کا حساب کرلے گا۔

چند نکات

۱: قیامت کے حساب و کتاب میں دِقّت اور سخت گیری

نہ صرف اس سورہ کی آخری آیات سے، بلکہ قرآن کی مختلف آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں اعمال کی حساب رسی میں حد سے زیادہ دِقت اور موشگافیاں ہوں گی۔ سورۂ لقمان کی آیہ ۱۶ میں آیا ہے، یا بنی انها ان تك مثقال حبة من خردل فتكن فی صخرة او فی السماوات او فی الارض یأت بها الله ان الله لطیف خبیر: "اے بیٹے! اگر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی (نیک یا بد عمل ہوگا) اور وہ پتھر کے اندر یا آسمان یا زمین کے کسی گوشہ میں چھپا ہوا ہوگا، تو خدا (قیامت میں) حساب رسی کے لیے اُسے لے آئے گا۔ بے شک خدا لطیف و خبیر ہے۔

"خردل" رائی کا دانہ، جو بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے، اور وہ چھوٹے ہونے میں ضرب المثل ہے۔

یہ تعبیریں اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ اس حساب رسی میں چھوٹے سے چھوٹے کاموں کا بھی محاسبہ ہوگا۔ ضمنی طور پر یہ آیات اس بات کی تنبیہ کرتی ہیں کہ نہ تو چھوٹے گناہوں کو کم اہمیت شمار کریں، اور نہ ہی چھوٹے نیک کاموں کو۔ وہ چیز جس کا

خدا حساب لے گا، چاہے وہ کچھ بھی ہو کم اہمیت نہیں ہے۔

اسی لیے بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ آیات اس وقت نازل ہوئیں جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض صحابہ تھوڑے مال کے خرچ کرنے کے سلسلہ میں بے اعتنا تھے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ اجر و ثواب تو ان چیزوں پر دیا جاتا ہے جنہیں ہم دوست رکھتے ہیں، اور چھوٹی چھوٹی چیزیں ایسی نہیں ہوتیں جن سے ہمیں کچھ لگاؤ اور محبت ہو، اور اسی طرح سے وہ چھوٹے چھوٹے گناہوں کے سلسلہ میں بھی بے اعتنا تھے، لہٰذا یہ آیات نازل ہوئیں، اور انہیں چھوٹی اور کم خیرات کرنے کی بھی ترغیب دی، اور چھوٹے چھوٹے گناہ کرنے سے ڈرایا۔

۲۔ ایک سوال کا جواب

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان آیات کے مطابق انسان قیامت میں اپنے سب اعمال، چاہے وُہ اچھے ہوں یا بُرے، چھوٹے ہوں یا بڑے، دیکھے گا۔ یہ معنی آیات "احباط" و "تکفیر" اور آیات "عفو" و "توبہ" کے ساتھ کیسے سازگار ہو سکتا ہے۔ کیونکہ آیات "احباط" تو یہ کہتی ہیں کہ بعض عمل مثلاً "کفر" انسان کی تمام نیکیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ لئن اشرکت لیحبطن عملك (زمر۔ ۶۵) اور آیات "تکفیر" کے مطابق بعض اوقات نیکیاں بُرائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ ان الحسنات یذھبن السیئات (ھود۔ ۱۱۴) اور عفو و توبہ کی آیات یہ کہتی ہیں کہ عفو الٰہی کے سائے میں، یا توبہ کرنے سے، گناہ محو ہو جاتے ہیں، یہ سارے مفہوم تمام نیک و بد اعمال کا مشاہدہ کرنے کے مسئلہ کے ساتھ کیسے مطابقت کرتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنا چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ : وہ دو اصول جو اُوپر والی آیات میں بیان ہوئے ہیں اور جو یہ کہتے ہیں کہ انسان اچھے اور بُرے کام کا ایک ایک ذرہ تک دیکھے گا، ایک قانون کلی کی صورت میں ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ ہر قانون میں کچھ مستثنیات ہو سکتے ہیں، لہٰذا آیات عفو و توبہ، اور احباط و تکفیر حقیقت میں اس قانونِ کلی میں استثنا کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ "احباط" و "تکفیر" کے سلسلہ میں درحقیقت موازنہ اور ایک عجز و انکسار رونما ہوتا ہے، اور یہ ٹھیک مطالبات اور قرضوں کے مانند ہے، جن میں ایک دوسرے سے منہا ہو جاتے ہیں، جس وقت انسان اس موازنہ کا نتیجہ دیکھتا ہے تو حقیقت میں اُس نے اپنے تمام اچھے اور بُرے اعمال کو دیکھ لیا ہے۔ یہی بات "عفو" و "توبہ" میں بھی جاری ہے۔ کیونکہ عفو لیاقت و شائستگی کے بغیر صورت پذیر نہیں ہوتا، اور توبہ خود ایک نیک عمل ہے۔

بعض نے یہاں ایک اور جواب دیا ہے، جو صحیح نظر نہیں آتا، اور وہ یہ ہے کہ کافر اپنے اچھے اعمال کا نتیجہ اسی دنیا میں دیکھ لیں گے، جیسا کہ مومن اپنے بُرے اعمال کی سزا اسی جہان میں پا لیتے ہیں۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ زیر بحث آیات قیامت کے ساتھ مربوط ہیں نہ کہ دُنیا کے ساتھ، علاوہ ازیں یہ کوئی کلیہ نہیں ہے کہ ہر مومن و کافر اپنے اعمال کا نتیجہ دنیا میں دیکھے۔

۳۔ قرآن کی سب سے زیادہ جامع آیات

"عبداللہ بن مسعودؓ" سے نقل ہوا ہے کہ قرآن مجید کی سب سے زیادہ محکم آیات "فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرًا یرہ و من

یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ " ہی ہیں۔ اور وہ انہیں "جامعہ" سے تعبیر کیا کرتے تھے، اور یہی بات یہ ہے کہ ان کے مطالب پر گہرا ایمان، اس بات کے لیے کافی ہے کہ انسان کو راہِ حق پر چلائے اور ہر قسم کے فساد و شر سے روکے۔

اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی، علمنی مما علمك الله جو کچھ خدا نے آپ کو تعلیم دی ہے اس میں سے مجھے بھی تعلیم دیجئے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے اپنے اصحاب میں سے ایک کے سپرد کر دیا تا کہ وہ اُسے قرآن کی تعلیم دے۔ اور اس نے اُسے سُورہ " اذا زلزلت الارض " کی آخر تک تعلیم دی۔ وہ شخص اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا: میرے لیے تو یہی کافی ہے۔ (اور ایک اور دوسری روایات میں آیا ہے کہ اس نے یہ کہا: " تکفینی ھذہ الآیة: " یہی ایک آیت میرے لیے کافی ہے")

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اسے اس کے حال پر چھوڑ دو کہ وہ ایک مرد فقیہ ہوگیا ہے۔ (اور ایک روایت کے مطابق آپ نے فرمایا: رجع فقیھا: وہ فقیہ ہو کر لوٹا ہے) اس کی وجہ بھی واضح ہے، کیونکہ جو شخص یہ جانتا ہو کہ ہمارے اعمال، چاہے ایک ذرہ کے برابر ہوں، یا رائی کے ایک دانہ کے برابر، ان کا حساب لیا جائے گا، تو وہ آج ہی سے اپنے حساب کتاب میں مشغول ہو جائے گا اور اس کا اس کی تربیت پر سب سے زیادہ اثر ہوگا[1]

اس کے باوجود ابوسعید خدری سے آیا ہے کہ جس وقت آیۂ فمن یعمل ... نازل ہوئی تو میں نے عرض کیا: اے رسولِ خدا کیا میں اپنے تمام اعمال کو دیکھوں گا؟ آپ نے فرمایا: ہاں! میں نے کہا، اُن بڑے بڑے کاموں کو؟ فرمایا: ہاں! میں نے کہا، چھوٹے چھوٹے کام بھی؟ فرمایا: ہاں! میں نے کہا وائے ہے مجھ پر، میری ماں میری عزا میں بیٹھے۔ فرمایا: اے ابوسعید! تجھے بشارت ہو، کیونکہ نیکیاں دس گنا شمار ہوں گی جو سات سو تک ہو سکتی ہیں اور خدا جس شخص کے لیے چاہے گا اس سے بھی کئی گنا کر دے گا۔ لیکن ہر گناہ کے لیے صرف ایک ہی گناہ کی سزا ملے گی، یا خدا معاف کر دے گا اور جان لے کہ کوئی شخص اپنے عمل کی وجہ سے نجات نہیں پائے گا۔ مگر یہ کہ خُدا کا کرم اس کے شاملِ حال ہو۔ میں نے عرض کیا: اے رسُولِ خدا کیا آپ بھی؟ فرمایا: ہاں میں بھی مگر یہ کہ خدا مجھے اپنی رحمت کا مشمول قرار دے۔[2]

خداوندا! جب تیرا پیغمبر اس عظمت و بزرگی کے باوجود صرف تیری بخشش اور عفو پر دل بستہ ہے تو پھر ہماری حالت تو واضح ہے۔

پروردگارا! اگر ہمارے اعمال ہماری نجات کا معیار ہوں تو وائے ہے ہماری حالت پر، اور اگر تیرا کرم ہمارا یار و مددگار ہو تو پھر خوشا بحال ما۔

بارِ الٰہا! جس دن ہمارے سارے چھوٹے بڑے گناہ ہمارے سامنے مجسّم ہو جائیں گے، اس دن کے لیے ہم صرف تیرے ہی لطف و کرم پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔

اختتام ترجمہ

تیئیسویں شب ماہ مبارک رمضان ۱۴۰۸ھ
بوقت ۱۲ بجکر ۲۱ منٹ شب
بر مکان حقیر قم مقدس جمہوری اسلامی ایران

آمین یا رب العالمین
سُورہ "زلزلہ" کا اختتام

---

[1] "تفسیر رُوح البیان" جلد ۱۰ ص ۴۹۵۔ یہی مضمون " نورالثقلین" جلد ۵ ص ۶۰ میں بھی آیا ہے۔

[2] " درالمنثور" جلد ۶ ص ۳۸۱

سورۂ والعدیٰت

* یہ سورہ مکّہ میں نازل ہوا۔
* اس میں ۱۱ آیات ہیں۔

سورہ "والعادیات" کے مطالب اور اس کی فضیلت

اس بارے میں کہ یہ سورہ "مکہ" میں نازل ہوا ہے یا "مدینہ" میں مفسرین کے درمیان شدید اختلاف ہے۔ بہت سوں نے تو اُسے مکی شمار کیا ہے جب کہ ایک جماعت اسے مدنی سمجھتی ہے۔

آیات کے مقطع کا مختصر اور چھوٹا ہونا اور قسموں پر تکیہ، اور اسی طرح مسئلہ معاد کے بارے میں بیان ایسے قرائن ہیں جو اس کے "مکی" ہونے کی تائید کرتے ہیں۔

لیکن دوسری طرف سے اس سورہ کی قسموں کا مضمون، جو جہاد کے مسائل سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، جیسا کہ انشاء اللہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوگا، اسی طرح وہ روایات جو یہ کہتی ہیں کہ یہ سورہ جنگِ "ذات السلاسل" کے بعد نازل ہوا ہے۔

(یہ وہ جنگ ہے جو ہجرت کے آٹھویں سال واقع ہوئی تھی، اور اس میں کفار کے بہت سے گروہ قیدی بنائے گئے تھے، اور انہیں محکم رسیوں سے باندھا گیا تھا، لہٰذا اس کا نام "ذات السلاسل" ہو گیا۔ جس کی تفصیل انشاء اللہ آیات کی تفصیل میں آئے گی) یہ اس سورہ کے مدنی ہونے پر گواہ ہے، یہاں تک کہ اگر ہم اس سورہ کے آغاز کی قسموں کو حاجیوں کے منیٰ و مشعر کی طرف جانے پر ناظر سمجھیں، تب بھی یہ مدینہ ہی کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ مراسمِ حج اپنی اکثر فروعات کے ساتھ زمانۂ جاہلیت کے عربوں میں بھی ۔۔۔۔ سُنّتِ ابراہیمی کی اقتداء کرنے کی وجہ سے ۔۔۔۔ رواج رکھتے تھے لیکن وہ خرافات کے ساتھ ایسے آلودہ ہو چکے تھے کہ یہ بات بعید نظر آتی ہے کہ قرآن نے ان کی قسم کھائی ہو۔

ان تمام جہات کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہم اس کے "مدنی" ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے سورہ کے مطالب بھی واضح ہو گئے ہیں کہ آغاز میں کچھ بیدار کرنے والی قسموں کا ذکر کرتا ہے

اور اس کے بعد نوع انسانی کی چند کمزوریوں مثلاً کفر، بخل اور دنیا پرستی کو درمیان میں لے آتا ہے، اور انجام کار مسئلہ معاد پر ایک مختصر اور گویا اشارے اور بندوں پر خدا کے علمی احاطہ پر سورہ کو ختم کرتا ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"من قرأها اعطی من الاجر عشر حسنات، بعدد من بات بالمزدلفة، وشهد جمعًا":

"جو شخص اس کی تلاوت کرے گا تو ان تمام حاجیوں کی تعداد سے (جو عید قرباں کی رات) "مزدلفہ" میں توقف کرتے ہیں، اور وہاں حاضر رہتے ہیں، دس گنا زیادہ نیکیاں اُسے دی جائیں گی۔[1] [2]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے:

"من قرأ والعاديات وادمن قراءتها بعثه الله مع امير المؤمنين (سلام الله عليه) يوم القيامة خاصه، وكان في حجره و رفقائه":

"جو شخص سورہ والعادیات کو پڑھے گا، اور اس کی مداومت کرے گا، تو خدا اُسے قیامت کے دن خصوصیت کے ساتھ امیر المومنین (سلام اللہ علیہ) کے ہمراہ مبعوث کرے گا، اور وہ آپ کی جماعت میں اور آپ کے دوستوں کے درمیان ہوگا۔"[3]

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سورہ والعادیات نصف قرآن کے برابر ہے۔[4]

یہ بات کہے بغیر ظاہر و واضح ہے کہ یہ تمام فضیلتیں ان لوگوں کے لیے ہیں جو اس کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنا لیں گے، اور اس کے تمام مطالب و مضامین پر ایمان رکھیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔

---

[1] "جمع" و "مشعر الحرام" کے ناموں میں سے ایک نام ہے اس بنا پر کہ لوگ وہاں جمع ہوتے ہیں، یا وہاں نماز مغرب و عشاء فاصلہ کے بغیر پڑھی جاتی ہے۔

[2] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۲۷

[3] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۲۷

[4] "در المنثور" جلد ۶ ص ۳۸۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ

۲۔ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ

۳۔ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ

۴۔ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ

۵۔ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۙ

۶۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ

۷۔ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۚ

۸۔ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۭ

۹۔ اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۙ

۱۰۔ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ

۱۱۔ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ۧ

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ ان فراٹے بھرتے ہوئے سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم (جو میدانِ جہاد کی طرف پیش رفت کرتے ہیں)۔

۲۔ اور ان کی قسم جو (اپنے سموں سے پتھروں پر ٹاپ مارتے ہوئے) چنگاریاں نکالتے ہیں۔

۳۔ اور صبح ہوتے ہی دشمن پر یلغار کر دیتے ہیں۔

۴۔ اور اس سے ہر طرف گرد و غبار ہی گرد و غبار کر دیتے ہیں۔

۵۔ اور یکایک دشمن کے دل بادل میں گھس جاتے ہیں۔

۶۔ بے شک انسان اپنے پروردگار کی نعمتوں کے سامنے ناشکرا اور بخیل ہے۔

۷۔ اور وہ خود بھی اس معنی پر گواہ ہے۔

۸۔ وُہ مال کے ساتھ شدید لگاؤ اور محبت رکھتا ہے۔

۹۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ اُس دن جو بھی قبروں میں ہیں وُہ سب زندہ ہو جائیں گے۔

۱۰۔ اور جو کچھ سینوں کے اندر (چھپایا ہوا) ہے، وہ آشکار اور ظاہر ہو جائے گا۔

۱۱۔ اس دن ان کا پروردگار ان سے مکمل طور پر باخبر ہے۔

شانِ نزول

ایک حدیث میں آیا ہے کہ یہ سورہ جنگ " ذات السلاسل " کے بعد نازل ہوا، اور اس کا واقعہ اس طرح ہے۔

ہجرت کے آٹھویں سال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر ملی کہ بارہ ہزار سوار سرزمین " یا لیس " میں جمع ہیں، اور انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ یہ عہد کیا ہے کہ جب تک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علی علیہ السلام کو قتل نہ کرلیں اور مسلمانوں کی جماعت

کو منتشر نہ کر دیں آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کی ایک بہت بڑی جماعت کو بعض صحابہ کی سرکردگی میں ان کی جانب روانہ کیا، لیکن وہ کافی گفتگو کے بعد بغیر کسی نتیجہ کے واپس لوٹ آئے۔

آخر کار پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام کو مہاجرین و انصار کے ایک گروہ کثیر کے ساتھ ان سے جنگ کرنے کے لیے بھیجا۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ دشمن کے علاقہ کی طرف روانہ ہوئے اور رات بھر میں سارا سفر طے کر کے صبحدم دشمن کو اپنے محاصرے میں لے لیا۔ پہلے تو ان کے سامنے اسلام کو پیش کیا۔ جب انہوں نے قبول نہ کیا تو ابھی فضا تاریک ہی تھی کہ ان پر حملہ کر دیا اور انہیں درہم برہم کر کے رکھ دیا، ان میں سے کچھ لوگوں کو قتل کیا، ان کی عورتوں اور بچوں کو اسیر کر لیا اور بکثرت مال غنیمت کے طور پر حاصل کیا۔

سورۂ "والعادیات" نازل ہوئی حالانکہ ابھی سربازانِ اسلام مدینہ کی طرف لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دن نماز صبح کے لیے آئے تو اس سورہ کی نماز میں تلاوت کی۔ نماز کے بعد صحابہ نے عرض کیا، یہ تو ایسا سورہ ہے جسے ہم نے آج تک سُنا نہیں ہے۔

فرمایا: ہاں! علیؑ دشمنوں پر فتح یاب ہوئے ہیں اور جبرئیل نے گزشتہ رات یہ سورہ لا کر مجھے بشارت دی ہے۔

کچھ دن کے بعد علیؑ غنائم اور قیدیوں کے ساتھ مدینہ میں وارد ہوئے۔[1]

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ واقعہ اس سورہ کے واضح مصادیق میں سے ایک ہے۔ یہ اس کا شانِ نزول نہیں ہے۔

تفسیر

بیدار مجاہدین کی قسم

ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سورہ بیدار کرنے والی قسموں سے شروع ہوا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: "ان فراٹے بھرتے ہوئے سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم (جو میدان جہاد کی طرف پیش رفت کرتے ہیں)۔" (والعادیات ضبحًا)[2]

یا حاجیوں کے ان اونٹوں کی قسم جو ہانپتے ہوئے سرزمینِ عرفات سے مشعر الحرام اور مشعر سے منیٰ کی طرف چلتے ہیں۔

"عادیات" "عادیة" کی جمع ہے، جو "عدو" (بروزن صبر) کے مادہ سے ہے، اصل میں گزرنے اور جُدا ہونے کے معنی میں ہے، چاہے دل سے ہو، جسے "عداوت" کہتے ہیں، یا خارجی حرکت اور چلنے سے ہو جسے "عدو" (دوڑنا) کہتے ہیں اور کبھی یہ معاملات میں ہوتی ہے جسے "عدوان" کہتے ہیں، اور یہاں وہی سرعت اور تیزی کے ساتھ دوڑنا مراد ہے۔

"ضبح" (بروزن مدح) تیزی اور سُرعت کے ساتھ دوڑنے والے کے سانس کی آواز کے معنی میں ہے جو اس کے دوڑنے

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۲۱ ص ۶۶ سے آگے، "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۲۸ اور بعض دوسری کتب تاریخ۔

[2] قاعدہ کی رُو سے "والعادیات عدوًا" کہنا چاہیئے، لیکن چونکہ عدو (دوڑنے) کا لازمہ سانس نکالنا ہے، لہٰذا اس کے بجائے "ضبحًا" کہا گیا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ آیت میں ایک محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے۔ والعادیات یضبحن ضبحًا)۔

کے وقت کانوں میں آتی ہے۔

جیسا کہ ہم نے اُوپر اشارہ کیا ہے اس آیت کی تفسیر میں دو نظریے موجود ہیں۔

پہلا نظریہ یہ ہے کہ اس سے مراد ان گھوڑوں کی قسم ہے جو سرعت اور تیزی کے ساتھ میدانِ جہاد کی طرف آگے بڑھتے ہیں اور چونکہ جہاد ایک مقدس امر ہے اس لیے جانور بھی اس مقدس راستے میں اس طرح کی قدر و قیمت پیدا کر لیتے ہیں کہ وہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ ان کی قسم کھائی جائے۔

دوسری تفسیر ان اُونٹوں کی قسم ہے جو حج جیسے عظیم فریضہ میں مواقف اور اماکنِ مقدس میں سُرعت اور تیزی کے ساتھ چلتے ہیں، اس بنا پر وہ ایک تقدس کے حامل بن جاتے ہیں اور قسم کے لائق ہیں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ "ابنِ عباسؓ" سے روایت ہے، کہ انہوں نے فرمایا:

"میں خانہ کعبہ کے پاس حجرِ اسمٰعیل میں تھا کہ ایک شخص آیا اور اس نے آیہ" والعادیات ضبحًا" کے بارے میں مجھ سے سوال کیا۔" میں نے کہا: " اس سے مراد وہ گھوڑے ہیں جو راہِ جہاد میں حملہ کرتے ہیں اور رات کو اپنے آرام کرنے کی جگہ پر لوٹ آتے ہیں' اور وہ غازی لڑنے والے مجاہدین ہیں جو آگ روشن کرتے ہیں اور اپنے لیے کھانا پکاتے ہیں"

وہ شخص میرے پاس سے چلا گیا اور علی علیہ السلام کے پاس پہنچا، آپ اس وقت چاہِ زمزم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے آپ سے بھی اس آیت کے بارے میں سوال کیا۔

آپ نے فرمایا: کیا تم نے مجھ سے پہلے بھی کسی شخص سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا ہے؟ اس نے عرض کیا،

ہاں! میں نے ابنِ عباس سے پوچھا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ گھوڑے ہیں جو راہِ جہاد میں حملہ کرتے ہیں" آپ نے فرمایا: جاؤ اور اُسے میرے پاس بلا لاؤ۔

جب میں حضرتؑ کی خدمت میں آیا تو آپ نے فرمایا:

جو بات تم نہیں جانتے اس کے بارے میں لوگوں کو فتوے کیوں دیتے ہو۔ اسلام میں سب سے پہلا غزوہ جنگِ بدر تھا، اور ہمارے پاس دو گھوڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک گھوڑا "زبیرؓ" کے پاس اور دوسرا گھوڑا "مقدادؓ" کے پاس تو "عادیات" سے مراد گھوڑے کیسے ہو سکتے ہیں؟ ایسا نہیں ہے۔ اس سے مراد وہ اُونٹ ہیں جو عرفات سے مشعر کی طرف اور مشعر سے منیٰ کی طرف جاتے ہیں۔ ابنِ عباسؓ کہتے ہیں: جب میں نے یہ سُنا تو میں نے اپنا نظریہ بدل لیا اور امیرالمومنین علی علیہ السلام کے نظریہ کو قبول کر لیا۔[1]

یہ احتمال بھی ہے کہ "عادیات" ایک وسیع معنی رکھتا ہے۔ لہٰذا یہ مجاہدوں کے گھوڑوں کو بھی شامل ہے اور حاجیوں کے اونٹوں کو بھی، اور اُوپر والی روایت سے مراد یہ ہو کہ اس کے معنی کو گھوڑوں میں محدود نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ یہ معنی تمام مقامات پر صادق نہیں آتا۔ اس کا سب سے

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۲۹۔ اس روایت کو قرطبی نے بھی اپنی تفسیر کی جلد ۱۰ ص ۷۲۹۵ میں نقل کیا ہے۔

زیادہ واضح مصداق حاجیوں کے اُونٹ ہیں۔

یہ تفسیر کئی جہات سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "قسم ہے ان کی جو آگ کی چنگاریاں نکالتے ہیں"۔ (فالموریات قدحًا)۔

مجاہدین کے وہ گھوڑے جو میدانِ جنگ کی طرف اتنی تیزی کے ساتھ جاتے ہیں کہ اُن کے سموں کے پتھروں پر ٹکرانے سے چنگاریاں نکلتی ہیں، یا وہ اونٹ جو سُرعت کے ساتھ مواقفِ حج میں دوڑتے ہیں اور ان کے پاؤں کے نیچے سے کنکریاں اور ریت اُڑتی ہے اور ان کے دوسرے سنگریزوں کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔

یا وہ قبیلے اور گروہ جو مواقفِ حج میں کھانا پکانے کے لیے آگ جلاتے ہیں، یا ان لوگوں سے کنایہ ہے جو جنگ اور جہاد کی آگ بھڑکاتے ہیں، یا ان زبانوں کی طرف اشارہ ہے جو اپنے چبھنے والے بیان سے دشمن کے دل میں آگ لگا دیتے ہیں، یا بعض مفسرین کے قول کے مطابق اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو لوگوں کی حاجات کو انجام دینے کے لیے کوشش کرتے ہیں اور اپنا مقصود حاصل کر لیتے ہیں جیسے کہ آگ چقماق کے پتھر سے باہر آتی ہے۔ لیکن یہ سارے احتمالات بعید نظر آتے ہیں اور آیت کا ظاہر وہی پہلی دو تفاسیر ہیں۔

"موریات" "ایراء" کے مادہ سے "موریۃ" کی جمع ہے جو آگ بھڑکانے کے معنی میں ہے اور "قدح" چنگاری نکالنے کیلیے پتھر یا لکڑی یا لوہے یا چقماق کو ایک دوسرے پر مارنے کے معنی میں ہے۔

اس کے بعد تیسری قسم میں فرماتا ہے: "اور صبح ہوتے ہی دشمن پر حملہ کرنے والوں کی قسم" (فالمغیرات صبحًا)۔

عربوں کی عادت - جیسا کہ طبرسی نے مجمع البیان میں لکھا ہے - یہ تھی کہ وہ رات کے وقت دشمن کے علاقے کے قریب جا کر گھات میں بیٹھ جاتے تھے تاکہ صبح سویرے ان پر حملہ کر دیں۔

ان آیات کی شانِ نزول (یا اس کے ایک واضح مصداق) میں یہ آیا ہے کہ لشکرِ اسلام علی علیہ السلام کی کمان میں رات کی تاریکی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میدانِ جنگ کی طرف بڑھتا چلا گیا اور دشمن کے قبیلے کے قریب پہنچ کر گھات لگا کر بیٹھ گیا اور صبح سویرے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ان پر حملہ کر دیا اور دشمن کے ردِّعمل دکھانے سے پہلے پہلے ان کی طاقت کو درہم برہم کر دیا۔

اور اگر ہم ان قسموں کو حاجیوں کے اُونٹوں کی طرف اشارہ سمجھیں تو پھر اس آیہ سے مراد اُونٹوں کے قافلوں کا عید کی صبح مشعر سے منیٰ کی طرف دوڑتے ہوئے آنا ہے۔

"مغیرات" "اغارۃ" کے مادہ سے "مغیرۃ" کی جمع ہے، جو ہجوم کرنے اور دشمن پر حملہ کرنے کے معنی میں ہے - چونکہ بعض اوقات یہ ہجوم اور حملہ مال لوٹنے کی غرض سے ہوتا ہے لہٰذا یہ لفظ بعض اوقات فارسی میں عام معنی یعنی غارت کرنے اور دوسروں کا مال چھیننے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس لفظ کے مادہ میں گھوڑے کے ساتھ ہجوم اور حملہ کرنا چھپا ہوا ہے، لیکن اس کے موارد استعمال اچھی طرح اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اگر ابتداً میں یہ قید موجود تھی بھی تو تدریجاً اب ختم ہو گئی ہے۔

اور یہ جو بعض نے احتمال دیا ہے کہ یہاں "مغیرات" سے مراد وہ ہجوم کرنے والے طوائف و قبائل ہیں جو میدانِ جنگ کی طرف، یا عجلت اور تیزی کے ساتھ منیٰ کی طرف چلتے ہیں، بعید نظر آتا ہے کیونکہ آیہ " والعادیات ضبحًا " یقینی طور پر گھوڑوں یا اونٹوں کی

توصیف ہے نہ کہ ان کے سواروں کی، اور یہ آیت بھی اسی مطلب کو جاری رکھے ہوئے ہے۔

اس کے بعد ان مجاہدین اور ان کی سواریوں کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "دشمن پر اس قدر تیزی کے ساتھ دوڑ کر جاتے ہیں کہ جس کی وجہ سے ہر طرف گرد و غبار ہی گرد و غبار کر دیتے ہیں" (فاثرن بہ نقعًا)[1]

یا یہ کہ حاجیوں کے اونٹوں کے مشعر سے منیٰ کی طرف ہجوم کے زیر اثر ہر طرف سے گرد و غبار اٹھتا ہے۔

"اثرن" "اثارہ" کے مادہ سے "غبار" یا "دھوئیں" کو پراگندہ کرنے کے معنی میں ہے۔ اور بعض اوقات ہیجان میں لانے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اسی طرح فضا میں آواز کی لہروں کے پھیلنے کے معنی میں آیا ہے۔

"نقع" (بروزن نفع) غبار کے معنی میں ہے اور اس مادہ کی اصل پانی کے نیچے چلا جانا، یا کسی کے پانی کے نیچے چلے جانے کے معنی میں ہے اور چونکہ "غبار" میں ڈوب جانا بھی اس سے مشابہت رکھتا ہے لہٰذا اس لفظ کا اس پر اطلاق ہوا ہے "نقیع" ساکن اور ٹھہرے ہوئے پانی کو کہا جاتا ہے۔

ان کی خصوصیات میں سے آخری خصوصیت کے بارے میں فرماتا ہے: "وہ اسی صبح دشمن کے درمیان پہنچ گئے" (فوسطن بہ جمعًا)[2]

انہوں نے غفلت کی حالت میں دشمن پر ایسی برق رفتاری کے ساتھ حملہ کیا کہ چند ہی لمحوں کے اندر صفوں کو درہم برہم کر کے رکھ دیا، ان کے قلب لشکر پر حملہ کر کے ان کی جمعیت کو تتر بتر کر دیا اور یہ اسی سرعت عمل، بیداری، آمادگی، شہامت اور شجاعت کا نتیجہ ہے یا یہ حاجیوں کے "مشعر" سے قلب "منیٰ" میں ورود کی طرف اشارہ ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد دشمن کو محاصرے میں لے لینا ہے۔ لیکن یہ تفسیر اسی صورت میں صحیح ہو گی جب "فوسطن" کا جملہ "سین" کی تشدید کے ساتھ پڑھا جائے جب کہ مشہور قرائت اس طرح نہیں ہے۔ اس بنا پر صحیح وہی پہلا معنی ہے۔

مجموعی طور پر اس سارے مضمون کو یکجا کر کے یہ مطلب نکلتا ہے کہ ان مذکورہ گھوڑوں کی قسم جو پہلے تو بڑی سرعت کے ساتھ فراٹے بھرتے سانس نکالتے میدان جہاد کی طرف پیش رفت کرتے ہیں، پھر ان کی سرعت میں ایسی تیزی آتی ہے کہ پتھروں پر ان کے سموں کی ٹاپوں سے چنگاریاں نکلتی ہیں، جو رات کی تاریکی کو چیر کر رکھ دیتی ہیں۔ اور اس کے بعد جب وہ دشمن کے علاقے میں پہنچ جاتے ہیں تو ابھی وہ غفلت میں ہی ہوتے ہیں کہ فضا کے صاف اور روشن ہوتے ہی ان پر حملہ کر دیتے ہیں، ایسا حملہ، جس سے فضا میں گرد و غبار چھا جاتا ہے، اور انجام کار وہ دشمن کی جمعیت کے قلب میں وارد ہو کر ان کی صفوں کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔

ان طاقتور اور پُر قدرت گھوڑوں کی قسم

ان شجاع اور بہادر سواروں کی قسم

مجاہدین کے گھوڑوں کے فراٹے بھرنے کی قسم

---

[1] "بہ" کی ضمیر "عدو" (دوڑنے) کی طرف لوٹتی ہے جس کا "والعادیات ضبحًا" کے جملہ سے استفادہ ہوتا ہے۔ اس بنا پر "باء" یہاں "سببیت" کے معنی میں ہے، یعنی اس دوڑنے کے سبب سے گرد و غبار فضا کو پُر کر دیتا ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہ اس زمانہ یا مکان کی طرف لوٹتی ہے جس میں یہ تاخت و تاز انجام پائی ہے۔ اس بنا پر "باء" ظرفیت کے معنی میں ہے، لیکن صحیح وہی پہلا معنی ہے۔

[2] "بہ" کی ضمیر کے مرجع اور "باء" کے معنی کے سلسلہ میں یہاں وہی بحث ہے جو پہلی آیت میں تھی۔

ان چنگاریوں کی قسم جو ان کے سموں سے نکلتی ہیں۔
غفلت کی حالت میں ان کے حملے کی قسم
گرد و غبار کے ان ذرات کی قسم جو فضا میں پھیل جاتے ہیں۔
اور انجام کار ان کے دشمن کی صفوں کے قلب میں وارد ہو کر انہیں درہم برہم کر کے
فتح یاب ہونے کی قسم۔

اگرچہ وہ تمام باتیں جو بیان کی گئی ہیں وہ ان قسموں کے معنی میں نہیں آئی ہیں، لیکن کلام کی ضمنی دلالت میں یہ سب جمع ہیں۔

اور یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہاد اس قدر عظمت رکھتا ہے کہ مجاہدین کے گھوڑوں کا فراٹے بھرنا اور سانس لینا تک بھی لائق قسم ہے۔ اسی طرح پتھروں پر ان کی ٹاپوں سے نکلنے والی چنگاریاں اور اسی طرح وہ گرد و غبار جو وہ فضا میں اُڑاتے ہیں، ہاں! ہاں! میدانِ جہاد کا گرد و غبار بھی قابلِ قدر اور باعظمت ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ ان قسموں سے مراد احتمالاً وہ نفوس ہیں جو اپنے کمالات کو دوسروں کی طرف منتقل کر سکیں اور اپنے افکار سے علم و دانش کی چنگاریاں نکالیں اور ہوا و ہوس پر حملہ آور ہوں اور اپنے اندر اور دوسروں میں خدا کا شوق پیدا کریں۔ اور انجام کار ساکنینِ علیین کے قلب میں مقام حاصل کریں۔[1]

لیکن یہ بات واضح ہے کہ ان باتوں کو اُوپر والی آیات کی تفسیر کے عنوان سے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ وہ تشبیہات ہیں جو آیت کی تفسیر سے مناسبت کی وجہ سے ذہن میں آتی ہیں۔

ان عظیم قسموں کے بعد جوابِ قسم، یعنی وہ چیز جس کے لیے قسمیں کھائی گئی ہیں، پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"بے شک انسان اپنے پروردگار کی نعمتوں کے بارے میں ناشکرا اور بخیل ہے": (ان الانسان لربہ لکنود)۔

وہی غیر تربیت یافتہ انسان، وہی انسان جس کے دل پر معارفِ الٰہی اور انبیاءؑ کی تعلیمات کے انوار نہیں چمکے، — اور وہی انسان جس نے خود کو خواہشاتِ نفسانی اور سرکش شہوتوں کا تابع بنالیا ہے، یقیناً وہ "ناشکرا" اور "بخیل" ہے۔

"کنود" اس زمین کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز نہیں اُگتی۔ ناشکرے اور بخیل انسان پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

مفسرین نے کنود کے لیے بہت سے معنی بیان کیے ہیں۔ "ابوالفتوح رازی" نے تقریباً پندرہ معانی اس سلسلہ میں نقل کیے ہیں، لیکن ان میں سے اکثر اسی اصل معنی کے شاخ و برگ ہیں جو اُوپر بیان ہوا ہے۔ مزید معانی یہ ہیں:

۱۔ کنود اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی مصیبتوں کو تو بڑھا چڑھا کر بیان کرے لیکن نعمتوں کو بھول جائے۔

۲۔ کنود اس شخص کو کہتے ہیں جو خدا کی نعمتوں کو اکیلا ہی کھاتا ہے اور دوسروں کو روک دیتا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"اتدرون من الکنود"

"کیا تم جانتے ہو کہ کنود کسے کہتے ہیں"؟!

---

[1] "تفسیر بیضاوی" ص ۴۶۵

لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی زیادہ بہتر جانتے ہیں، تو آپ نے فرمایا:

"الکنود الّذی یأکل وحدہ، و یمنع رفدہ و یضرب عبدہ"

۲۔ "کنود اس شخص کو کہتے ہیں جو اکیلے ہی اکیلے کھاتا ہے اور دُوسروں سے عطا و بخشش کو روکتا ہے اور اپنے ماتحت غلاموں کو مارتا ہے۔" [1]

۳۔ کنود وہ شخص ہے جو مشکلات و مصائب میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہمدردی نہیں کرتا۔

۴۔ کنود وہ ہے جس کی نیکیاں بہت ہی کم ہوں۔

۵۔ کنود وہ شخص ہے کہ جب اسے کوئی نعمت ملتی ہے تو وُہ اسے دوسروں کو نہیں دیتا اور اگر کسی مشکل میں گرفتار ہو جائے تو بے صبری دکھاتا اور بہت گڑگڑاتا ہے۔

۶۔ کنود وہ جو اللہ کی نعمتوں کو معصیت میں صَرف کرتا ہے۔

۷۔ کنود وہ شخص ہے جو خدا کی نعمتوں کا انکار کرتا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، یہ سب معانی اسی ناشکری اور بُخل کی شاخ و برگ اور مصادیق ہیں۔

ایسے موارد میں "انسان" کی تعبیر، بدکار، ہوا پرست، سرکش اور باغی انسانوں کے معنی میں ہے، اور بعض نے اس کی کافر انسان سے تفسیر کی ہے ورنہ یقیناً ہر انسان ایسا نہیں ہے کیونکہ بہت سے انسان ایسے ہیں کہ جن کی رُوح میں شکرگزاری اور عطا و بخشش گندھی ہوئی ہے، اور وہ ناشکری اور بُخل سے بیزار ہیں۔ اسی طرح وہ انسان جنہوں نے اللہ پر ایمان کے سائے میں خود خواہی اور خُود پرستی کو چھوڑ دیا ہے، اور پروردگار کے اسماء و صفات کی معرفت اور اخلاقِ الٰہی کی فضا میں آسمان پر بلند پروازی کر رہے ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور وہ خُود بھی اسی معنی پر گواہ ہے": (وانہ علیٰ ذالک لشھید)۔

کیونکہ انسان اپنے نفس کے بارے میں اچھی طرح آگاہ ہے اور اگر وہ اپنی اندرونی صفات کو ہر شخص سے چھپا سکتا ہو تو خدا اور اپنے وجدان سے مخفی نہیں رکھ سکتا، چاہے وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے یا نہ کرے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "انہ" کی ضمیر "خدا" کی طرف لوٹتی ہے، یعنی خدا انسان میں کنود کی صفت کے وجود کا گواہ ہے۔

لیکن قبل و بعد کی آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جن میں اس سے مشابہ ضمیریں انسان کی طرف لوٹتی ہیں، یہ احتمال بہت ہی بعید نظر آتا ہے، اگرچہ بہت سے مفسرین نے اس تفسیر کو ترجیح دی ہے۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس سے مراد انسان کی اپنے گناہوں اور عیوب پر قیامت میں گواہی دینا ہے، جیسا کہ قرآن کی بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے۔

اس تفسیر کے لیے بھی یہاں کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے جو اس دنیا میں بھی اس کے کفران اور بُخل پر گواہی کو شامل ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ بعض اوقات انسان اپنی شناخت سے عاجز ہو جاتا ہے، اور اصطلاح کے مطابق اپنے وجدان کو دھوکا دیتا ہے اور

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۳

شیطانی آرائش و زیبائش اُس کی مذموم صفات کو اس کی نظر میں خوبصورت بنا کر جلوہ گر کر دیتی ہیں۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ کفران و بخل کے بارے میں مطلب اس قدر واضح ہے کہ اس کی پردہ پوشی نہیں کی جا سکتی اور اپنے وجدان کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "وہ مادّی چیزوں اور مال سے شدید لگاؤ اور محبت رکھتا ہے"۔ (وانه لحب الخير لشديد[1])

اور مال و دولت کے ساتھ اس کا یہی شدید اور کثرت سے لگاؤ اس کے بخل، ناشکری اور کفران کا سبب بن جاتا ہے۔

البتہ "خیر" ایک وسیع معنی رکھتا ہے، جو ہر قسم کی نیکی کو شامل ہے۔ اور یقینی طور پر بہت سی نیکیوں اور اچھی چیزوں مثلاً علم و دانش، تقویٰ اور بہشت و سعادت سے لگاؤ اور محبت کوئی ایسا مذموم مطلب نہیں ہے کہ قرآن اُوپر والی تعبیر کے ساتھ اس کی مذمت کرے اسی لیے مفسرین نے اس کی یہاں "مال" کے معنی سے تفسیر کی ہے، جس پر قرینۂ مقام اور گزشتہ آیت بھی گواہ ہے، اور قرآن کی بعض دوسری آیات بھی (اس کی گواہی دیتی ہیں)۔ مثلاً: سورہ بقرہ کی آیہ ۱۸۰ جس میں فرماتا ہے: "كتب عليكم اذا حضر احدكم الموت ان ترك خيرا الوصية للوالدين والاقربين" تم پر فرض ہے کہ اگر تم میں سے کوئی کچھ مال چھوڑ جائے تو وہ باپ، ماں اور نزدیکیوں کے لیے وصیت کرے۔

مسلّم طور پر "مال" پر "خیر" کا اطلاق اس بنا پر ہے کہ مال اپنی ذات کی حد تک ایک اچھی چیز ہے۔ اور وہ انواع و اقسام کی نیکیوں کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ لیکن ناشکرا اور بخیل انسان اس کو اس کے اصلی ہدف سے روک کر خودپسندی اور خودغرضی کی راہ میں استعمال کرتا ہے۔

اس کے بعد ایک استفہام انکاری کی صورت میں، جو تہدید کے ساتھ توأم ہے، فرماتا ہے: "کیا یہ ناشکرا، بخیل اور دنیا پرست انسان یہ نہیں جانتا کہ جب وہ سب کے سب جو قبروں میں ہیں وہ زندہ ہو جائیں گے"۔ (افلا يعلم اذا بعثر ما في القبور)۔

اور جب وہ تمام چیزیں جو سینوں میں ہیں جیسے کفر و ایمان، اخلاص و ریا، تکبر و غرور، تواضع و انکسار اور اچھی اور بُری نیتیں، سب آشکار ہو جائیں گی۔ (وحصّل ما في الصدور)۔

"اس دن ان کا پروردگار ان سے اور ان کے اعمال اور نیتوں سے آگاہ ہے"۔ اور اس کے مطابق ہی انہیں جزا و سزا دے گا۔ (ان ربهم بهم يومئذ لخبير)۔

"بعثر" "بعثرة" (بروزن منقبة) کے مادہ سے اصل میں زیر و زبر کرنے، باہر نکالنے اور استخراج کرنے کے معنی میں ہے۔ اور چونکہ مُردوں کو زندہ کرنے کے وقت قبریں زیر و زبر ہوں گی، اور جو کچھ ان میں ہے وہ ظاہر ہو جائے گا، لہٰذا اُوپر والی آیات میں یہ تعبیر قیامت کے بارے میں استعمال ہوئی ہے۔

"ما في القبور" کی تعبیر (اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "ما" عام طور پر غیر ذوی العقول کے لیے آتا ہے) یا تو اس بنا پر ہے کہ اس میں یہ بات مدّ نظر ہے کہ مُردے ابھی مٹی ہیں، یا یہ اُس ابہام کی بنا پر ہے جو اس پر حاکم ہے کہ معلوم نہیں کون سے اشخاص ہیں؟

"قبور" (قبروں) کی تعبیر اس سے کوئی منافات نہیں رکھتی کہ لوگوں کا ایک گروہ اصولاً قبر نہیں رکھتا مثلاً وہ لوگ جو دریا میں ڈوب جائیں۔

---

[1] "لحب الخير" کی "لام" ممکن ہے "لام تعدیہ" ہو یا لام علت، پہلے احتمال کی بنا پر اس کی تفسیر وہی ہے جو اُوپر بیان ہو چکی ہے، اور دوسرے احتمال کی بنا پر آیت کا مفہوم اس طرح ہے: انسان مال کی محبت کی وجہ سے بخیل ہے، لیکن مسلّم طور پر پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

یا ان کی قبر ایک مدّت کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور اُن کی مٹی بکھر جاتی ہے کیونکہ اُن لوگوں کی اکثریت مدِّنظر ہے جو قبر رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں ممکن ہے کہ قبر یہاں ایک وسیع معنی رکھتی ہو، یعنی وہ جگہ جہاں لوگوں کی مٹی موجود ہو اگرچہ وہ عام قبر کی صورت میں نہ ہو۔

"حصّل" "تحصیل" کے مادہ سے اصل میں "چھلکے" سے "مغز" کو باہر نکالنے کے معنی میں ہے۔ اسی طرح معادن کو صاف کرنے اور سونے وغیرہ کو کان کے پتھر سے نکالنے پر بولا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ ایک وسیع معنی یعنی مطلق استخراج کرنے اور الگ کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا، اور زیرِ بحث آیت میں اس خیر و شر اور نیکی و بُرائی کو جُدا کرنا مراد ہو جو دلوں میں چھپی ہوئی ہے چاہے وہ ایمان و کفر ہو، یا صفات حسنہ و رذیلہ، یا اچھی اور بُری نیتیں، وہ سب کی سب اس دن ایک دوسرے سے جُدا اور ظاہر و آشکار ہو جائیں گی۔ اور ہر شخص کو ان کے مطابق جزا و سزا ملے گی۔

جیسا کہ سورہ طارق کی آیہ ۹ میں آیا ہے: یوم تبلی السرائر: "اس دن سارے اندرونی بھید ظاہر و آشکار ہو جائیں گے۔"

"یومئذ" کی تعبیر اور اس معنی پر تکیہ کہ خدا "اس دن" ان کے اعمال اور ان کے دلوں میں چھپے ہوئے بھیدوں سے آگاہ ہوگا حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ خدا ہمیشہ ان مسائل سے آگاہ ہے، اس بناء پر ہے کہ وہ دن روزِ جزا ہے، اور وہ انہیں ان کے اعمال و عقائد کی جزا دے گا۔

بعض مفسّرین کے قول کے مطابق اس تعبیر کی مثال اس طرح ہے کہ کوئی شخص دوسرے سے تہدید کے طور پر کہے ساعرف لک عملک "میں عنقریب تجھے تیرے عمل کا تعارف کراؤں گا" حالانکہ آج بھی اس قسم کا تعارف موجود ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ اس کا نتیجہ اور بدلہ تجھے دوں گا۔

ہاں! خدا ہمیشہ اور ہر حالت میں اندر اور باہر کے اسرار سے مکمل طور پر آگاہ ہے، لیکن اس آگاہی کا اثر قیامت میں اجر و ثواب اور جزا و سزا کے وقت زیادہ ظاہر اور زیادہ آشکار ہو جائے گا۔ اور یہ تمام انسانوں کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ اگر واقعاً وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں تو یہ چیز ان کے اور گناہوں کے درمیان ایک طاقتور سد بن جائے گی، چاہے وہ گناہ آشکار ہوں یا پنہاں، اندرونی گناہ ہوں یا بیرونی، اور اس اعتقاد کا تربیت پر کیا اثر پڑتا ہے کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

چند نکات

اِس سُورہ کی قسموں اور اس کے ہدف کے درمیان ربط

اس سُورہ کے سلسلہ میں جو سوالات سامنے آتے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ مجاہدین کے گھوڑوں کی قسم اور "ان الانسان لربہ لکنود" کے جملہ کے درمیان کیا ربط ہے؟ کیونکہ قرآن کی آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ قسموں اور مقسم بہ (جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے) کے درمیان ایک قسم کا ربط موجود ہوتا ہے، اور اصولی طور پر قرآن کی فصاحت و بلاغت بھی اس قسم کے مطلب کا اقتضا کرتی ہے۔

زیرِ بحث آیات میں ممکن ہے اس طرح کا ربط ہو کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ ایسے ایثار کرنے والے انسان بھی موجود ہیں جو جہاد کے راستہ میں بے پروا ہو کر پیش رفت کرتے ہیں اور کسی قسم کی فداکاری میں کوتاہی نہیں کرتے، اور اپنی جان و مال خدا کی راہ میں دے دیتے ہیں۔ لیکن بعض لوگ اتنے بخیل اور ناشکرے کیوں بن جاتے ہیں کہ نہ تو وہ حق تعالیٰ کی نعمتوں کے مقابلہ میں خدا کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی راہ

نہیں ایثار کرتے ہیں؟

یہ ٹھیک ہے کہ قسم گھوڑوں ہی کی کھائی گئی ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ ان کی اہمیت اس لحاظ سے ہے کہ وہ مجاہدین کے لیے ایک آلہ ہیں، اور حقیقت میں مجاہدین کے جہاد کی قسم کھائی گئی ہے۔ (اور اسی طرح اگر یہ حاجیوں اور خانہ خدا کے زائرین کے اُونٹوں کی قسم ہو)۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ ربط اس طرح سے حاصل ہوتا ہے کہ یہ جانور حق تعالیٰ کی راہ میں سُرعت کے ساتھ جاتے ہیں۔ پس اے انسان تو کیوں اس کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا جب کہ تُو اشرف المخلوقات ہے اور اس کے زیادہ لائق ہے؟

لیکن پہلی مناسبت زیادہ واضح ہے۔

۲۔ کیا اِنسان طبعاً ناشکرا اور بخیل ہے؟

ممکن ہے کچھ لوگ ان الانسان لربہ لکنود کے جملہ سے یہ مفہوم لیں کہ "کنود" کی حالت میں ہونا یعنی ناشکری اور بُخل کرنا سب انسانوں کی طبیعت کا جزء ہے تو پھر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ امر بیدار وجدان اور فطری شعور کے ساتھ، جو انسان کو شکرِ منعم اور ایثار و قربانی کی دعوت دیتا ہے، کیسے سازگار ہو سکتا ہے؟

اس قسم کا سوال، قرآن مجید کی بہت سی آیات ہیں، جو انسان کی کمزوریوں کے واضح نقاط کو بیان کرتی ہیں، سامنے آتا ہے۔

ایک جگہ انسان کو "ظلوم و جھول" شمار کیا گیا ہے۔ (احزاب - ۷۲)

دوسری جگہ "ھلوع" (کم ظرف) (معارج - ۱۹)

ایک دوسری جگہ "یئوس کفور" (مایوس و ناشکرا) (ھود - ۹)

ایک اور مقام پر طاغی اور سرکش۔ (علق - ۶) کے ساتھ متعارف ہوا ہے۔

کیا واقعاً ضعف و کمزوری کے یہ نقاط انسان کی طبیعت میں پوشیدہ ہیں، حالانکہ قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ خدا نے آدم کو مکرم بنایا ہے اور سب مخلوق پر اُسے برتری دی ہے: ولقد کرمنا بنی اٰدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقناھم من الطیبات وفضلناھم علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلاً۔ (اسراء - ۷۰)

اس سوال کا جواب ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان دو بُعد و جہات وجودی رکھتا ہے، اور اسی بنا پر وہ اپنے "قوسِ صعودی" میں "اعلیٰ علیین" تک پہنچ جاتا ہے اور اپنے "قوسِ نزولی" میں اسفل سافلین میں جا گرتا ہے۔

اگر وہ مربیانِ الٰہی سے تربیت پائے، عقل کے پیام سے ہدایت حاصل کرے اور اپنی اصلاح کرے تو وہ "فضلناھم علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلاً" کا مصداق ہو جاتا ہے۔

اور اگر ایمان و تقویٰ سے منہ موڑ لے، اور اولیائے خدا کی رہنمائی سے باہر نکل جائے، تو پھر وہ "ظلوم" و "کفار" "یئوس" و "کفور" اور "ھلوع" و "کنود" کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس طرح ان آیات کے درمیان کسی قسم کا تضاد موجود نہیں ہے، البتہ ان میں سے ہر ایک کا انسان کے ایک بُعد اور جہت کے ساتھ تعلق ہے۔

ہاں ! انسان کی فطرت کے اندر تمام نیکیوں ، اچھائیوں اور افتخارات و فضائل کی اصل اور جڑ پوشیدہ ہے اور اسی طرح انسان ان فضائل کے نقطہ مقابل کے لیے بھی آمادگی رکھتا ہے۔ اسی لیے عالم آفرینش کی کسی بھی مخلوق کے قوسِ صعودی و نزولی کے درمیان اس قدر فاصلہ اور دُوری نہیں ہے ، (غور کیجئے)

۳۔ جہاد کی عظمت

قرآن مجید میں جہاد اور راہِ خدا کے مجاہدین کی عظمت کے بارے میں بہت ہی زیادہ گفتگو ہوئی ہے۔ لیکن شاید یہ مسئلہ کسی جگہ بھی اس عظمت کے ساتھ بیان نہیں ہوا کہ ان کے گھوڑوں کے ہنکارنے ، ان کے سموں سے نکلنے والی چنگاریاں اور ان کے تیز دوڑنے سے اُٹھنے والا گرد و غبار تک بھی اس قدر باعظمت سمجھا جائے ، کہ اس کی قسم کھائی جائے۔

خصوصاً ان کے سُرعت عمل پر ، جو جنگوں میں کامیابی کا اہم ترین عامل ہے ، تکیہ ہوا ہے ، اور غفلت کی حالت میں جا لینے پر بھی ' جو جنگ میں موفق ہونے کا ایک اور عامل ہے ، تکیہ ہوا ہے۔

اور یہ سب جہاد کے پروگرام کے سلسلہ میں ایک تربیت اور تعلیم ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس سُورہ کے شانِ نزول میں بھی آیا ہے کہ علی علیہ السلام نے یہ حکم دیا تھا کہ رات کی تاریکی میں اپنی سواریاں کو تیار کر لیں ، انہیں ضروری خوراک دیں ، اُن پر زین کس لیں ، اور مکمل طور پر (الرٹ) تیاری کی صُورت میں آجائیں ، جب رات کی تاریکی کا پردہ ہٹا تو آپ نے فوراً اپنے ساتھیوں کے ساتھ نمازِ صبح ادا کی ' اور بلا فاصلہ دشمن پر حملہ کر دیا ، اور دشمن اس وقت بیدار ہوا جب مجاہدینِ اسلام کے گھوڑے ان کے سروں پر پہنچ گئے۔

غفلت کی حالت میں اس سریع حملہ سے تلف ہونے والوں کی تعداد بھی بہت کم رہی ' اور جنگ کا خاتمہ بھی مختصر سے وقت میں ہو گیا ، اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ سب باتیں اس سورہ کی آیات میں بہت ہی عمدہ طریقے سے بیان ہوئی ہیں۔

یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ نہ تو گھوڑوں میں کوئی خصوصیت ہے اور نہ ہی بیابان کے پتھروں پر سموں کے ٹکرانے سے پیدا ہونے والی چنگاریاں کوئی خصوصیت رکھتی ہیں ' اور نہ ہی ان کے پاؤں سے اُٹھنے والا گرد و غبار ، جو چیز خصوصیت رکھتی ہے وہ مسئلہ جہاد ہے ' اور اس کے بعد اس کے آلات ہیں ' جو موجودہ زمانہ کے تمام جنگی وسائل کو شامل ہیں ' جیسا کہ سُورہ انفال کی آیہ ۹ میں " رباط الخیل " (قوی اور طاقتور گھوڑوں) کے بیان میں " قوۃ " اور " طاقت " کے بارے میں کلی طور پر گفتگو ہوئی ہے۔

خداوندا ! ہمیں اپنی رضا اور خوشنودی کی راہ میں جہاد کرنے اور قربانی دینے کی توفیق مرحمت فرما۔

پروردگارا ! نفس سرکش ناشکری اور کفران کی طرف مائل رہتا ہے ، ہمیں اس کے خطرات سے محفوظ فرما۔

بارِ الٰہا ! تو ہر شخص کے اندرونی اور بیرونی اسرار سے آگاہ ہے اور ہمارے اعمال سے باخبر ہے۔ اپنے لطف و کرم اور عنایت و بخشش سے ہمارے ساتھ سلوک کر۔

آمین یا رب العالمین

اختتام سُورہ والعادیات

اختتام ترجمہ شب ۲۵ رمضان المبارک ایک بج کر ۱۰ منٹ شب
بر مکان حقیر قم مقدس جمہوری اسلامی ایران

سُورَہ اَلقَارِعَة

- یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔
- اس میں ۱۱ آیات ہیں

سورۂ "قارعہ" کے مطالب اور اس کی فضیلت

اس سورہ میں کُلی طور پر معاد اور اس کے مقدمات کے بارے میں گفتگو ہے۔ اس میں چبھنے والی تعبیریں ہیں، ہلا دینے والے بیان ہیں، اور صریح و واضح انذار اور تنبیہ ہے۔ اور آخر میں انسانوں کی دو گروہوں میں تقسیم کا بیان ہے۔

ایک گروہ تو وہ ہے جن کے اعمال عدلِ الٰہی کی میزان میں وزنی ہوں گے، اور ان کی جزا حق تعالیٰ کے جوارِ رحمت میں سراسر رضایت بخش زندگی ہے۔ اور دوسرا گروہ وہ ہے جن کے اعمال ہلکے اور کم وزن ہوں گے، ان کی سرنوشت جہنم کی جلانے والی آگ ہے۔

اس سورہ کا نام یعنی "قارعۃ" اس کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے۔

اس کی فضیلت کے سلسلہ میں بس اتنا ہی کافی ہے کہ ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے:

"من قرأ القارعة آمنه الله من فتنة الدجال ان یؤمن به، و من قیح جهنم یوم القیامة ان شاء الله"۔

"جو شخص سورہ "قارعہ" کو پڑھے گا تو خداوند تعالیٰ اسے دجال کے فتنہ اور اس پر ایمان لانے سے محفوظ رکھے گا، اور اسے قیامت کے دن انشاءاللہ پیپ سے دور رکھے گا"۔[1]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰، ص ۵۳۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ اَلْقَارِعَةُ ۝

۲۔ مَا الْقَارِعَةُ ۝

۳۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝

۴۔ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝

۵۔ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝

۶۔ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝

۷۔ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝

۸۔ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝

۹۔ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝

۱۰۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ۝

۱۱۔ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ وہ چبھنے والا حادثہ۔

۲۔ اور وہ کیسا چبھنے والا حادثہ ہے؟

۳۔ اور تو کیا جانے کہ وہ چبھنے والا حادثہ کیسا ہے؟

۴۔ وہ دن جس میں لوگ پراگندہ پروانوں کی طرح ہر طرف دوڑ رہے ہوں گے۔

۵۔ اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اُون کی طرح ہو جائیں گے۔

۶۔ (اس دن) جس کے اعمال کا ترازو وزنی ہوگا۔

۷۔ وہ ایک پسندیدہ زندگی میں ہوگا۔

۸۔ لیکن جس کا ترازوئے اعمال ہلکا ہوگا۔

۹۔ اُس کی پناہ گاہ ھاویہ (جہنم) ہوگی۔

۱۰۔ اور تو کیا جانے کہ ھاویہ کیا ہے؟

۱۱۔ ایک جلا ڈالنے والی آگ ہے۔

تفسیر

چبھنے والا حادثہ

ان آیات میں، جو قیامت کا تعارف کراتی ہیں، پہلے ارشاد ہوتا ہے: "وہ چبھنے والا حادثہ" (القارعة)۔
"اور وہ کیسا چبھنے والا حادثہ ہے" (ما القارعة)۔
"اور تو کیا جانے کہ وہ چبھنے والا حادثہ کیا ہے؟" (وما ادراك ما القارعة)۔

" قارعۃ " " قرع " (بروزن فرع) کے مادہ سے ، کسی چیز کو کسی دوسری چیز پر اس طرح رگڑنے کے معنی ہیں سے کہ اس سے سخت آواز پیدا ہو ، تازیانہ اور ہتھوڑے کو بھی اسی مناسبت سے " مقرعۃ " کہتے ہیں ، بلکہ ہر اہم اور سخت حادثہ کو " قارعۃ " کہا جاتا ہے۔ (یہاں تانیث کا تاء ممکن ہے تاکید کی طرف اشارہ ہو۔

ان تعبیروں سے جو دوسری اور تیسری آیات میں آئی ہیں ، جن میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک سے یہ فرماتا ہے کہ تو کیا جانے یہ سخت اور سرکوبی کرنے والا حادثہ کیا ہے ؛ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ چھبنے والا حادثہ اس قدر عظیم ہے کہ اس کے ابعاد اور مختلف جہات ہر شخص کے ذہن میں نہیں آسکتے۔

بہر حال بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ " قارعۃ " قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے ، لیکن انہوں نے ٹھیک طور سے یہ واضح نہیں کیا کہ کیا یہ تعبیر قیامت کے مقدمات کی طرف اشارہ ہے جس میں عالم دنیا درہم برہم ہو جائے گا ، آفتاب و ماہتاب تاریک ہو جائیں گے ، سمندروں میں آگ لگ جائے گی۔ اگر اس طرح ہو تو پھر اس حادثہ کے لیے " قارعۃ " کے نام کے انتخاب کی وجہ واضح ہے۔

دوم اس سے دوسرا مرحلہ مراد ہو ، یعنی مُردوں کے زندہ ہونے اور عالم ہستی میں ایک نئی طرح ڈالنے کا مرحلہ ، اور ٹکرانے اور چھبنے کی تعبیر اس بناء پر ہے کہ اس دن وحشت و خوف اور ڈر دلوں سے ٹکرائیں گے اور ان کی سرکوبی کریں گے۔

وہ آیات جو اس کے بعد آئی ہیں اُن میں سے بعض تو جہان کے خراب و برباد ہونے کے حادثہ سے مناسبت رکھتی ہیں اور بعض مُردوں کے زندہ ہونے کے ساتھ ، لیکن مجموعی طور سے پہلا احتمال زیادہ مناسب نظر آتا ہے ، اگرچہ ان آیات میں دونوں حادثے یکے بعد دیگرے ذکر ہوئے ہیں (قرآن کی اور بہت سی دوسری آیات کے مانند جو قیامت کی خبر دیتی ہیں)۔

اس کے بعد اس عجیب و غریب دن کے تعارف میں کہتا ہے : " وہی دن جس میں لوگ پراگندہ ، حیران و پریشان پروانوں کی طرح ہر طرف جائیں گے " (یوم یکون الناس کالفراش المبثوث)۔

" فراش " " فراشۃ " کی جمع ہے ، بہت سے اسے " پروانہ " کے معنی میں سمجھتے ہیں ، بعض نے اس کی " ٹڈی دل " کے معنی میں تفسیر کی ہے ، اور ظاہراً یہ معنی سورۂ قمر کی آیہ ۷ سے لیا ہے جو لوگوں کو اس دن پراگندہ ٹڈی دل سے تشبیہ دیتی ہے ، (کانھم جراد منتشر) ورنہ اس کے لغوی معنی " پروانہ " ہی ہیں۔

بہر حال " پروانہ " کے ساتھ تشبیہ اس لیے ہے کہ پروانے اپنے آپ کو دیوانہ وار آگ پر پھینک دیتے ہیں۔ بدکار لوگ بھی اپنے آپ کو جہنم کی آگ میں ڈالیں گے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ پروانہ کے ساتھ تشبیہ ایک خاص قسم کی حیرت و سرگردانی کی طرف اشارہ ہے ، جو اس دن تمام انسانوں پر غالب ہوگی۔

اور اگر " فراش " ٹڈی دل کے معنی میں ہو تو پھر مذکورہ تشبیہ اس لیے ہے کہ کہتے ہیں بہت سے پرندے اُڑتے وقت ایک معین راستہ میں اکٹھے پرواز کرتے ہیں ، سوائے ٹڈی دل کے ، جو گروہ کی صورت میں اُڑتے ہوئے بھی کوئی مشخص راستہ نہیں رکھتے ، بلکہ اُن میں سے ہر ایک کسی دوسری ہی طرف اُڑ رہا ہوتا ہے۔

پھر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حیرت و پراگندگی و سرگردانی اور دحشت و اضطراب جہان کے خاتمہ کے ہولناک حوادث کی وجہ سے ہوگا، یا قیامت اور حشر و نشر کے آغاز کی وجہ سے ۔

اس سوال کا جواب ہمارے اسی بیان سے جو ہم نے اُوپر بیان کیا ہے واضح ہو جاتا ہے ۔

اس کے بعد اس دن کی ایک اور خصوصیت کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے : " اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اون کے مانند ہو جائیں گے"۔ (وتکون الجبال کالعھن المنفوش)۔

" عھن " (بروزن ذہن) رنگی ہوئی اُون کے معنی میں ہے ۔

اور " منفوش " " نفش " (بروزن نقش) کے مادہ سے اون کو پھیلانے کے معنی میں ہے جو عام طور پر دھنکنے کے مخصوص آلات کے ذریعے اُون کو دھنکنے سے انجام پاتی ہے ۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ قرآن کی مختلف آیات کے مطابق قربِ قیامت میں پہاڑ پہلے تو چلنے لگیں گے، پھر ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور انجام کار غبار کی صُورت میں فضا میں اُڑنے لگیں گے ۔ زیر بحث آیت میں ان کو رنگین اور دھنکی ہوئی اون سے تشبیہ دی گئی ہے ۔ ایسی اُون جو تیز آندھی کے ساتھ چلے اور اس کا صرف رنگ ہی رنگ نمایاں ہو ۔ اور یہ پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے کا آخری مرحلہ ہوگا ۔

ممکن ہے یہ تعبیر پہاڑوں کے مختلف رنگوں کی طرف اشارہ ہو کیونکہ رُوئے زمین کے پہاڑوں میں سے ہر ایک ایک خاص رنگ رکھتا ہے ۔

بہر حال یہ جملہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اُوپر والی آیات قیامت کے پہلے مرحلوں، یعنی اس جہان کی ویرانی اور اختتام کے مرحلہ کی ہی بات کرتی ہیں ۔

اس کے بعد حشر و نشر، مردوں کے زندہ ہونے اور ان کی دو گروہوں میں تقسیم کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے : " پس جس شخص کا ترازوئے عمل وزنی ہوگا ۔ ۔ ۔ " (فاما من ثقلت موازینہ)۔

" وہ ایک عمدہ اور پسندیدہ زندگی میں ہوگا " (فھو فی عیشۃ راضیۃ)۔

" لیکن جس شخص کا ترازوئے اعمال ہلکا ہوگا ۔ ۔ ۔ " (و اما من خفت موازینہ)

" تو اس کی پناہ گاہ جہنم ہے " (فامہ ھاویۃ)۔

اور تو کیا جانے ھاویہ (دوزخ) کیا ہے ؛ (وما ادراک ماھیہ)[1]

" ایک جلانے والی آگ ہے " (نار حامیۃ)۔

" موازین " میزان کی جمع ہے جو تولنے کے ایک آلہ کے معنی میں ہے ۔ یہ لفظ پہلے تو مادی وزنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے، اس کے بعد معنوی موازین اور مقاییس کے لیے بھی استعمال ہونے لگا ۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ اس دن انسان کے اعمال جسمانی اور قابلِ وزن موجودات کی صُورت اختیار کر لیں گے اور واقعی طور پر انہیں اعمال کے

---

[1] " ماھیہ " اصل میں " ماھی " تھا، پھر " ھاء سکت " کا اس سے الحاق ہوا ۔

تولنے والے ترازوؤں کے ساتھ تولیں گے۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ خود نامۂ اعمال کا وزن کیا جائے گا۔ اگر اس میں کچھ اعمال صالح لکھے ہوئے ہیں تو وہ سنگین اور بھاری ہوگا ورنہ وہ ہلکا یا بے وزن ہوگا۔

لیکن ظاہراً ان توجیہات کی ضرورت نہیں ہے۔ میزان یقینی طور پر ظاہری ترازو کے معنی میں نہیں ہے، جس میں مخصوص قسم کے پلڑے ہوتے ہیں، بلکہ اس کا ہر قسم کے تولنے کے وسیلہ اور ذریعہ پر اطلاق ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے۔

" ان امیرالمؤمنین والائمۃ من ذریتہ (ع) ھو الموازین"

" امیرالمؤمنینؑ اور وہ ائمہ جو آپ کی ذریت میں ہیں، وہی تولنے کے ترازو ہیں"۔ [1]

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ جب لوگوں نے آپؑ سے میزان کے معنی کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے جواب میں فرمایا:

" المیزان العدل"

" تولنے کی ترازو وہی عدل ہے":

اس طرح اولیاء اللہ یا قوانینِ عدلِ الٰہی ہی وہ ترازو ہیں جن کے سامنے انسانوں اور ان کے اعمال کو پیش کیا جاتا ہے اور جس قدر وہ ان کے ساتھ مشابہت اور مطابقت رکھتے ہیں وہی ان کا وزن ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ میزان کے "ہلکا" اور "بھاری" ہونے سے مراد خود تولنے کے ترازوؤں کی سنگینی و سبکی نہیں ہے، بلکہ ان چیزوں کا وزن ہے جن کو ان سے تولتے ہیں۔

ضمنی طور پر "موازین" کی تعبیر جمع کی صورت میں اس بناء پر آئی ہے کہ اولیائے حق اور قوانینِ الٰہی میں سے ہر ایک علیٰحدہ علیٰحدہ تولنے کی ایک میزان ہے۔ اس سے قطع نظر انسان کی صفات اور اعمال کا تنوع اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہر ایک کو ایک ترازو سے تولا جائے، اور تولنے کے نمونے اور ترازو مختلف ہوں۔

"راغب" "مفردات" میں کہتا ہے: "قرآن مجید میں میزان کبھی تو مفرد کی صورت میں آیا ہے اور کبھی جمع کی صورت میں، پہلی صورت میں اس کے لیے آیا ہے جو حساب کرتا ہے یعنی خدائے یکتا، اور دوسری صورت میں ان کے لیے ہے جن کا حساب ہوگا۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ موازین "موزون" کی جمع ہے، یعنی وہ عمل جس کا وزن کرتے ہیں۔ اس بناء پر موازین کا ہلکا یا بھاری ہونا خود اعمال کے ہلکا اور بھاری ہونے کے معنی میں ہے، نہ کہ ترازوؤں کے ہلکا اور بھاری ہونے کے معنی میں۔ [2]

البتہ دونوں کا نتیجہ ایک ہے لیکن دو مختلف راستوں سے۔

اس سلسلہ میں ہم نے سورہ اعراف کی آیہ ۸، ۹ کے ذیل میں (جلد ۴ ص ۴۲) پر، اور اسی طرح سورۂ کہف کی آیہ ۱۰۵ کے

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۷، ص ۲۵۱

[2] اس معنی کو "زمخشری" نے "کشاف" میں اور "فخرازی" نے "تفسیر کبیر" میں اور "ابوالفتوح رازی" نے اپنی تفسیر میں "موازین" کے معنی میں دو احتمالوں میں سے ایک احتمال کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔

ذیل میں (جلد ۷ ص ۴۲۷) پر اور سورۂ مومنون کی آیہ ۱۰۲ کے ذیل میں (جلد ۸ ص —) پر زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔

" عیشة راضیة " (خوش و خرم زندگی) کی تعبیر بہت ہی عمدہ اور ایک بلیغ تعبیر ہے، جو قیامت میں اہل بہشت کی پُر نعمت اور سراسر سکون و آرام کی زندگی کے لیے بیان ہوئی ہے۔ یہ زندگی اتنی پسندیدہ اور رضایت بخش ہے گویا کہ وہ خود راضی ہیں، یعنی بجائے اس کے کہ " مرضیة " کہا جائے، زیادہ سے زیادہ تاکید کے لیے " اسم مفعول " کی بجائے " اسم فاعل " استعمال ہوا ہے[1]

اور یہ عظیم امتیاز آخرت کی زندگی کے ساتھ ہی مخصوص ہے، کیونکہ دنیا کی زندگی چاہے جتنی بھی مرفہ، پُر نعمت، امن و امان اور رضایت و خوشنودی کے ساتھ ہو، پھر بھی ناخوشی اور ناپسندیدگی کے عوامل سے خالی نہیں ہوتی۔ یہ صرف آخرت ہی کی زندگی ہے جو سراسر رضایت و خوشنودی، آرام و سکون اور امنیت و دل جمعی کا سبب ہے۔

" فامه هاویة " کے جملہ میں " ام " کی تعبیر اس بنا پر ہے کہ " ام " ماں کے معنی میں ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ ماں اولاد کے لیے ایک ایسی پناہ گاہ ہے جس کی طرف مشکلات میں پناہ لیتے ہیں اور اس کے پاس رہتے ہیں، اور یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ہلکے وزن والے گنہگار، دوزخ کے علاوہ اور کوئی جگہ پناہ لینے کے لیے نہ پائیں گے۔ اس شخص کے حال پر وائے ہے جس کی پناہ گاہ دوزخ ہوگی۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں " ام " کا معنی " مغز " (دماغ) ہے کیونکہ عرب سر کے مغز کو " ام الرأس " کہتے ہیں، تو اس بنا پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ انہیں سر کے بل جہنم میں پھینکیں گے، لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے کیونکہ اس صورت میں بعد والی آیت " وما ادراك ماهیه " (تو کیا جانے کہ وہ کیا ہے) کا مفہوم درست نہیں رہے گا۔

" هاویة " " هوی " کے مادہ سے گرنے اور سقوط کرنے کے معنی میں ہے، اور وہ " دوزخ " کے ناموں میں سے ایک نام ہے کیونکہ گنہگار اس میں گریں گے اور یہ جہنم کی آگ کے عمق اور گہرائی کی طرف بھی اشارہ ہے۔

اور اگر ہم " ام " کو یہاں " مغز " کے معنی میں لیں، تو " هاویة " کا معنی گرنے والی ہوگا، لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح اور زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

" حامیة " " حمی " (بروزن نفی) کے مادہ سے شدتِ حرارت کے معنی میں ہے، اور " حامیة " یہاں جہنم کی آگ کی حد سے زیادہ حرارت اور جلانے کی طرف اشارہ ہے۔

بہرحال یہ جملہ جو یہ کہتا ہے تو کیا جانے کہ " هاویة " کیا ہے " هاویة " جلانے والی آگ ہے: اس معنی پر ایک تاکید ہے کہ قیامت کا عذاب اور جہنم کی آگ تمام انسانوں کے تصور سے بالاتر ہے۔

ایک نکتہ

میزان اعمال کی سنگینی کے اسباب

اس میں شک نہیں کہ تمام نیک اور صالح اعمال کی قدر و قیمت یکساں نہیں ہے اور یہ آپس میں بہت زیادہ فرق رکھتے ہیں،

---

[1] بعض نے " راضیة " کو " ذات رضا " کے معنی میں بھی سمجھا ہے، یا تقدیر میں کچھ فرض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے مراد اس زندگی والوں کی رضایت ہے، لیکن ان تین تفاسیر میں سے وہی تفسیر اوپر بیان ہوئی ہے جو سب سے زیادہ مناسب ہے۔

اور اسی وجہ سے مختلف اسلامی روایات میں کچھ اعمالِ خیر پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور ان کو ہی قیامت میں میزانِ عمل کے بھاری ہونے کے اسباب شمار کیا گیا ہے۔

منجملہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپ نے لا الٰہ الّا اللہ کی تفسیر میں فرمایا:

"یعنی بوحدانیتہ لا یقبل الاعمال الا بھا، وھی کلمۃ التقوی یثقل اللہ بھا الموازین یوم القیامۃ:

"لا الٰہ الّا اللہ" خدا کی وحدانیت کی طرف اشارہ ہے۔ اور کوئی عمل اس کے بغیر قبول نہیں ہوگا۔ یہ وہ کلمۂ تقویٰ ہے جو عمل تولنے والے ترازو کو قیامت میں سنگین اور وزنی بنائے گا"۔[1]

ایک اور حدیث میں امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام سے خدا کی وحدانیت اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی شہادت کے بارے میں آیا ہے:

"خف میزان ترفعان منہ وثقل میزان توضعان فیہ"

"تولنے کا وہ ترازو جس سے شہادتین کو اٹھا لیا جائے وہ ہلکا ہو جائے گا، اور وہ ترازو جس میں شہادتین کو رکھ دیا جائے وہ سنگین اور وزنی ہو جائے گا"۔[2]

اور ایک اور دوسری حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے:

"ما فی المیزان شیء اثقل من الصلوٰۃ علی محمد وآل محمد"

"میزانِ عمل میں کوئی چیز محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وآلِ محمدؐ پر درود بھیجنے سے زیادہ سنگین نہیں ہے"۔

اور روایت کے ذیل میں آیا ہے کہ قیامت میں کچھ لوگ میزانِ عمل کے نیچے کھڑے ہوں گے جن کے اعمال کا پلڑا ہلکا ہوگا، پھر محمدؐ وآلِ محمدؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود کو اس میں رکھ دیں گے تو وہ سنگین اور وزنی ہو جائے گا۔[3]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے:

"من کان ظاھرہ ارجح من باطنہ خف میزانہ"

"جس شخص کا ظاہر اس کے باطن سے بہتر ہوگا قیامت میں اس کا میزانِ عمل ہلکا رہے گا"۔[4]

ہم اس بحث کو سلمان فارسی کی ایک گفتگو پر ختم کرتے ہیں جو حقیقت میں وحی اور سنت کا خلاصہ ہے۔ اس حدیث میں آیا ہے

---

[1]، [2] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۶۵۹ حدیث ۱۲، ۸

[3] وہی مدرک حدیث،

[4] "نور الثقلین" ج ۵ ص ۶۶۰ حدیث ۱۳

• کسی شخص نے تحقیر کے طور پر سلمان فارسیؓ سے کہا :
تُو کون ہے اور تیری حیثیت کیا ہے ؟ تیری کچھ بھی قدر و قیمت نہیں ہے سلمانؓ نے جواب میں کہا :

" اما اولی و اولك فنطفة قذرة و اما اخری و اخرك فجیفة منتنة فاذا كان یوم القیامة ، ونصبت الموازین فمن ثقلت موازینه فهو الكریم و من خفت موازینه فهو اللئیم " :

" لیکن ! میرے اور تیرے وجود کا آغاز تو ایک گندے نطفہ سے ہوا ہے اور میرے اور تیرے وجود کا اختتام ایک بدبودار مردار ہے ، اور جب قیامت کا دن ہوگا اور اعمال کے تولنے کے لیے ترازو نصب کیے جائیں گے تو جس شخص کے عمل کا ترازو سنگین اور بھاری ہوگا وہ شریف و بزرگوار ہے ، اور جس کے عمل کا ترازو سبک اور ہلکا ہوگا وہ پست و ذلیل اور کمینہ ہوگا ۔[1]

خداوندا ! ہمارے عمل کے ترازو کو محمدؐ و آلِ محمدؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کے ذریعے سنگین اور وزنی کر دے ۔
پروردگارا ! " عیشة راضیة " کا حصول تیرے لطف و کرم کے بغیر آسان نہیں ہے ۔ پس تو خود ہی اس راہ میں ہماری مدد فرما !
بارالٰہا ! تیری دوزخ کی آگ بہت ہی سخت جلانے والی ہے اور ہم میں اس کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے ۔ اسے اپنے رحم و کرم کے پانی سے ہمارے لیے خاموش کر دے ۔

آمین یا رب العالمین
سورہ " قارعۃ " کا اختتام

---

[1] " نورالثقلین " جلد ۵ ص ۶۶۰ حدیث ۱۴

سُورۃ التّکاثُر

* یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔
* اس میں ۸ آیات ہیں۔

سورۂ "تکاثر" کے مطالب اور اس کی فضیلت

بہت سے مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا ہے۔ اس بنا پر اس میں تفاخر کے بارے میں جو گفتگو آئی ہے وہ اصولی طور پر قبائل قریش کے ساتھ مربوط ہے جو موہوم امور کی بنا پر ایک دوسرے پر فخر و مباہات کیا کرتے تھے۔

لیکن۔ جیسا کہ مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں لکھا ہے۔ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوا ہے اور اس میں تفاخر کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ یہودیوں یا انصار کے دو قبیلوں کے بارے میں ہے، لیکن اس سورہ کا مکی سورتوں سے زیادہ مشابہت رکھنے کی وجہ سے مکی ہونا زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

اس سورہ کے مطالب میں مجموعی طور سے پہلے تو ایسے لوگوں کی، جو موہوم مطالب کی بنیاد پر ایک دوسرے پر فخر و مباہات کرتے تھے، سرزنش اور ملامت ہے اس کے بعد قیامت و معاد اور جہنم کی آگ کے مسئلہ پر تنبیہ ہے اور آخر میں نعمتوں کے بارے میں سوال اور باز پرس کے مسئلہ میں تنبیہ کی گئی ہے۔

اس سورہ کا نام اس کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے۔

اس کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

" ومن قرأها لم يحاسبه الله بالنعيم الذي انعم عليه في دار الدنيا و اعطي من الاجر كانما قرء الف اٰية ":

" جو شخص اس کو پڑھے گا تو خدا اس سے ان نعمتوں کا حساب نہیں لے گا جو اس نے اسے دارِ دنیا میں دی ہیں اور اسے اس قدر اجر و ثواب عطا کرے گا گویا کہ اس نے قرآن کی ہزار آیتوں کی تلاوت کی ہے۔[1]

اور ایک حدیث میں امام جعفر صادق ؑ سے آیا ہے کہ" اس سورہ کا واجب اور مستحب نمازوں میں پڑھنا شہدا کی شہادت کا ثواب رکھتا ہے"[2]

واضح ہو کہ یہ سب ثواب ان لوگوں کے لیے ہیں جو اسے پڑھیں اور اسے اپنی زندگی کا پروگرام بنائیں اور دل جان سے اپنے آپ کو اس کے ساتھ ہم آہنگ کریں۔

---

[1] " مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۲۲

[2] " وہی مدرک" (تلخیص کے ساتھ)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ اَلۡهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۝

۲۔ حَتّٰى زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ۝

۳۔ كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۝

۴۔ ثُمَّ كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۝

۵۔ كَلَّا لَوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عِلۡمَ الۡيَقِيۡنِ ۝

۶۔ لَتَرَوُنَّ الۡجَحِيۡمَ ۝

۷۔ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيۡنَ الۡيَقِيۡنِ ۝

۸۔ ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ يَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِيۡمِ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ تفاخر و تکاثر نے تمہیں اپنے حال میں مشغول رکھا۔ (اور اس نے تمہیں خدا سے غافل کر دیا)۔

۲۔ یہاں تک کہ تم قبروں کی زیارت کے لیے گئے۔ (اور تم نے اپنے مُردوں کی قبریں شمار کیں)۔

۳۔ ایسا نہیں ہے جیسا کہ تم نے خیال کر لیا ہے، تم جلدی ہی (اصل حقیقت کو) جان لوگے۔

۴۔ ہرگز ایسا نہیں ہے جیسا کہ تمہارا خیال ہے، یہ جلدی ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا۔

۵۔ اس طرح نہیں ہے جس طرح تم خیال کرتے ہو، اگر تم آخرت کا علم الیقین رکھتے ہوتے (تو ان موہومات اور فخر و مباہات کے پیچھے نہ لگتے)۔

۶۔ تم یقیناً جہنم کو دیکھو گے۔

۷۔ پھر (اس میں وارد ہو کر) اس کو عین الیقین کے ساتھ مشاہدہ کرو گے۔

۸۔ پھر اس دن تم سب سے ان نعمتوں کے بارے میں جو تمہیں دی گئی تھیں، سوال کیا جائے گا۔

شان نزول

جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے کہ مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ سورہ ان قبائل کے بارے میں نازل ہوا ہے جو ایک دوسرے پر فخر و مباہات کیا کرتے تھے اور اپنی جمعیت، افراد کی کثرت یا مال و دولت کی زیادتی کے باعث ایک دوسرے پر فخر کرتے تھے، یہاں تک کہ اپنے قبیلہ کے افراد کی تعداد کو بڑھانے کے لیے قبرستان میں جاتے تھے اور ہر قبیلہ کی قبریں شمار کرتے تھے۔

البتہ بعض مفسرین تو اس کو مکہ میں قریش کے دو قبیلوں کے بارے میں سمجھتے ہیں، اور بعض مدینہ میں انصار پیغمبرؐ کے بارے میں اور بعض یہودیوں کے دوسرے لوگوں پر فخر کرنے کے بارے میں۔ اگرچہ اس کا مکمل ہونا صحیح نظر آتا ہے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ شان نزول چاہے جو کچھ بھی ہو آیت کے مفہوم کو ہرگز محدود نہیں کرتی۔

تفسیر

تکاثر و تفاخر کی مصیبت

ان آیات میں پہلے ملامت بھرے لہجہ میں فرماتا ہے: "تفاخر اور ایک دوسرے پر کثرت رکھنے کے خیال نے تمہیں خدا اور قیامت سے غافل کر کے اپنی طرف مشغول کر دیا ہے۔" (الھکم التکاثر)۔

"یہاں تک کہ تم قبروں کی زیارت اور دیدار کے لیے بھی گئے اور تم نے اپنے مردوں کی قبروں کو شمار کیا" (حتّٰی زرتم المقابر)۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ " تکاثر " اور " تفاخر " نے انہیں اس طرح سے اپنی طرف مشغول کر لیا ہے کہ وہ قبروں میں وارد ہونے کے لمحہ تک جاری و ساری ہے۔

لیکن پہلا معنی " زرتم المقابر " کی تعبیر، اور اسی طرح شانِ نزول اور نہج البلاغہ کے خطبہ کے ساتھ ، جس کی طرف انشاءاللہ بعد میں اشارہ ہوگا ، زیادہ سازگار ہے۔

" الھاکم " " لھو " کے مادہ سے ، چھوٹے چھوٹے کاموں میں مشغول ہو جانا ، اور اہم مقاصد اور کاموں سے غافل رہنے کے معنی میں ہے۔" راغب " " مفردات " میں کہتا ہے " لھو " اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو اپنی طرف مشغول رکھتے ہوئے اس کے اہداف و مقاصد سے اسے باز رکھتی ہے۔

" تکاثر " " کثرت " کے مادہ سے ، تفاخر اور مباہات اور ایک دوسرے پر اپنی بڑائی جتلانے کے معنی میں ہے[1]

" زرتم " " زیارۃ " اور " زور " (بروزن قول) کے مادہ سے اصل میں سینہ کے اوپر والے حصّہ کے معنی میں ہے۔اس کے بعد ملاقات کرنے اور رُو برو ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اور " زور " (بروزن قر) سینہ کے اوپر والے حصّہ کے ٹیڑھا ہو جانے کے معنی میں ہے۔ اور چونکہ جھوٹ ایک قسم کا حق سے انحراف ہے اس لیے اس پر " زور " (بروزن نور) کا اطلاق ہوتا ہے۔

" مقابر " " مقبرۃ " کی جمع ہے جو میّت کی قبر کی جگہ کے معنی میں ہے اور یہاں قبروں کی زیارت کرنا یا تو (بعض تفاسیر کے مطابق) مَوت سے کنایہ ہے یا شمار کرنے اور فخر و مباہات کرنے کے لیے قبروں کے پاس جانے کے معنی میں ہے (جو اس کی مشہور تفسیر کے مطابق ہے)۔

اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے دوسرا معنی زیادہ صحیح نظر آتا ہے اور اس کے شواہد میں سے ایک امیرالمومنین علی علیہ السّلام کا وہ کلام ہے جو اس سلسلہ میں نہج البلاغہ میں آیا ہے، جو آپ نے " الھاکم التکاثر حتّٰی زرتم المقابر " کے بعد فرمایا ہے :

> " یاله مرامًا ما ابعده ؟ وزورًا ما اغفله ؛ وخطرًا ما افظعه ؟ لقد استخلوا منهم ای مدّکر وتناوشوهم من مکان بعید افبمصارع ابائهم یفخرون ؟ ام بعدید الھلکی یتکاثرون ؟ یرتجعون منهم اجسادًا خوت، وحرکات سکنت ، ولان یکونوا عبرًا احق من ان یکونوا مفتخرًا ! " :
>
> " تعجب ہے وُہ مقصد سے کتنے زیادہ دُور ہیں اور کیسے غافل زیارت کرنے والے ہیں ؟ اور کیسا موہوم اور رُسوا کرنے والا

---

[1] فارسی کے روز مرّہ کے استعمالات میں " تکاثر " دولت جمع کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ، حالانکہ یہ معنی لغت کی اصل کے اعتبار سے نہیں ہے۔ لیکن بعض روایات میں جن کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے ، اس قسم کا استعمال ہوا ہے۔

افتخار ہے؟ ایسے افراد کی بوسیدہ ہڈیوں کی یاد میں پڑے ہوئے ہیں جو سالہا سال
سے مٹی ہو چکے ہیں اور وہ یاد بھی کیسی؟ اتنے دُور دراز کے فاصلہ پر ایسے
لوگوں کی یاد میں پڑے ہیں جو ان کی حالت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی۔ کیا وہ اپنے
آباؤ اجداد کی نابودی کی جگہ پر فخر کرتے ہیں یا اپنے مُردوں اور معدومین کی تعداد کو شمار
کر کے خُود کو بہت زیادہ سمجھتے ہیں۔ وہ ایسے جسموں کی بازگشت کے خواہاں ہیں
جن کا تار و پود بکھر چکا ہے، اور جن کی حرکتیں ختم ہو چکی ہیں، یہ بوسیدہ جسم اگر عبرت کا
باعث ہوں تو وہ اس سے زیادہ سزاوار ہیں کہ موجب افتخار ہوں؟ [1]

یہ خطبہ جس کے صرف ایک حصّہ کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اس قدر ہلا دینے والا گویا و صریح ہے کہ "ابن ابی الحدید معتزلی" کہتا ہے کہ: میں اس ذات کی قسم کھاتا ہوں جس کی تمام اُمتیں قسم کھاتی ہیں کہ میں نے پچھلے پچاس سال سے لے کر آج تک اس خطبہ کو ایک ہزار بار پڑھا ہے، اور ہر بار میرے دل میں ایک نیا لرزہ و خوف اور ایک نئی پند و نصیحت پیدا ہوئی ہے، اور اس نے میری رُوح کے اندر ایک شدید اثر چھوڑا ہے اور میرے اعضاء و جوارح لرزنے لگے، اور کبھی ایسا نہیں ہوا، کہ میں اس میں غور و فکر کروں اور اس حال میں اپنے خاندان، عزیزوں اور دوستوں کی موت کو یاد نہ کروں، اور ٹھیک میرے سامنے یہ بات مجسّم ہو جاتی تھی کہ میں وہی ہوں جس کی امام نے وضاحت کی ہے۔

اس سلسلے میں کتنے ہی واعظوں، خطباء، سُخن وروں اور فصیح افراد نے گفتگو کی ہے، اور میں نے انہیں کان لگا کر سُنا ہے اور ان کی باتوں میں غور و فکر کیا ہے۔ کسی ایک میں بھی میں نے کلام امامؑ والی تاثیر نہیں پائی۔

یہ تاثیر جو ان کا کلام میرے دل میں چھوڑتا ہے، یا تو اس کا سرچشمہ وہ ایمان ہے جو اس کا کہنے والا رکھتا ہے، یا اس کے یقین و اخلاص والی نیت اس بات کا سبب بن گئی ہے کہ وہ اس طرح ارواح میں نفوذ کرے اور دلوں میں جاگزیں ہو جائے۔

"ابن ابی الحدید" اپنی گفتگو کے ایک اور حصّہ میں کہتا ہے:

"ینبغی لو اجتمع فصحاء العرب قاطبة فی مجلس وتلی علیهم ان یسجدوا له!":

"یہ خطبہ اس لائق ہے کہ، اگر فصحائے عرب سب کے سب کسی مجلس میں جمع ہوں اور یہ خطبہ ان کے سامنے پڑھا جائے، تو وہ اس کے سامنے سجدہ کریں"۔

اور اسی مقام پر امیرالمومنین علی علیہ السلام کی فصاحت کے بارے میں معاویہ کی گفتگو کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ یہ کہتا ہے:

"واللہ ما سنّ الفصاحة لقریش غیره"؛

"خُدا کی قسم قریش کے لیے علیؑ کے سوا کسی نے فصاحت و بلاغت کی بُنیاد نہیں رکھی۔ [2]

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۱

[2] "شرح نہج البلاغہ" "ابن ابی الحدید" جلد ۱۱ ص ۱۵۳

بعد والی آیت میں ان لوگوں کو اس بات کے ساتھ سختی سے تہدید کرتے ہوئے فرماتا ہے': " ایسا نہیں ہے جیسا کہ تم گمان کرتے ہو، اور تم اس کے ذریعے ایک دوسرے پر فخر و مباہات کرتے ہو۔ تم عنقریب اپنے اس موہوم تفاخر کا نتیجہ دیکھ لوگے": (كلا سوف تعلمون).

پھر دوبارہ مزید تاکید کے لیے کہتا ہے: " پھر بھی اس طرح نہیں ہے جس طرح تم خیال کرتے ہو۔ عنقریب تم جان لوگے": (ثم كلا سوف تعلمون).

مفسرین کی ایک جماعت نے ان دونوں آیتوں کو ایک ہی مطلب کی تکرار اور تاکید سمجھا ہے اور یہ دونوں ہی سربستہ طور پر اُن عذابوں کی خبر دیتی ہیں' جو ان متفاخر متکبرین کے انتظار میں ہے۔

جب کہ بعض دوسروں نے پہلی آیت کو عذاب قبر اور عذاب برزخ کی طرف اشارہ سمجھا ہے ; جس سے انسان موت کے بعد رو برو ہوگا اور دوسری کو عذاب قیامت کی طرف۔

ایک حدیث میں امیرالمومنین علی علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

"مازلنا نشك في عذاب القبر حتّٰى نزلت الهاكم التكاثر' الى قوله كلا سوف تعلمون' يريد في القبر' ثم كلا سوف تعلمون بعد البعث":

" ہم میں سے ایک گروہ ہمیشہ عذاب قبر کے بارے میں شک کیا کرتا تھا یہاں تک کہ سورہ " الهاكم التكاثر" نازل ہوئی ، یہاں تک کہ فرماتا ہے :

" كلا سوف تعلمون " اس سے مراد عذاب قبر ہے۔ اس کے بعد فرماتا ہے:

"ثم كلا سوف تعلمون " اس سے مراد قیامت کا عذاب ہے"۔[1]

تفسیر کبیر فخر رازی میں یہ مطلب علی علیہ السلام کے ایک صحابی " زر بن جیش" سے نقل ہوا ہے۔ جو کہتا ہے کہ :

" ہم عذاب قبر کے بارے میں شک کیا کرتے تھے ، یہاں تک کہ ہم نے علی علیہ السلام سے سُنا کہ آپؑ فرماتے ہیں ":

" یہ آیت عذاب قبر پر دلیل ہے"۔[2]

اس کے بعد مزید کہتا ہے : " ایسا نہیں ہے جیسا کہ تم ایک دوسرے پر فخر کرنے والے خیال کرتے ہو۔ اگر تمہارا آخرت پر ایمان ہوتا اور علم الیقین کے ساتھ اُسے جان لیتے ، تو ہرگز ایسا کام نہ کرتے اور ان باطل مسائل پہ فخر و مباہات کرنے سے باز آتے۔ (كلا لو تعلمون علم اليقين)[3]

---

[1] " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۳۴

[2] " تفسیر فخر رازی " جلد ۲۲ ص ۷۸ ۔

[3] بعض کا نظریہ یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر لفظ " کلا " تاکید کے لیے ہوتا ہے اور "حقاً" کے معنی میں ہوتا ہے ، یہ بات طبرسی نے مجمع البیان میں نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ " العرب تؤكد بكلا وحقاً " عرب لفظ کلا اور حقا سے تاکید کرتے ہیں۔

پھر دوبارہ تاکید اور مزید ڈرانے کے لیے اضافہ کرتا ہے : تم یقینی طور پر جہنّم کو دیکھو گے : (لترون الجحیم) ۔
" پھر اس میں داخل ہو کر عین الیقین کے ساتھ اس کا مشاہدہ کرو گے " (ثم لترونھا عین الیقین) ۔
" پھر اس دن تم سے ان نعمتوں کے بارے میں ، جو تمہیں دی گئی تھیں سوال کیا جائے گا " (ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم) ۔
اس دن تمہیں اس بات کی وضاحت کرنی پڑے گی کہ تم نے ان خداداد نعمتوں کو کس طریقہ سے صرف کیا ہے ؟ اور ان سے تم نے خدا کی اطاعت کے لیے مدد لی ہے یا اس کی معصیت کے لیے ، یا ان نعمتوں کو ضائع کر کے ہرگز ان کا حق ادا نہیں کیا ہے ؟

چند نکات

۱۔ تفاخر کا سرچشمہ

اُوپر والی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تفاخر اور ایک دوسرے پر فخر و مباہات کرنے کے عوامل اصلی میں ایک ، دینی ، الٰہی جزا و سزا کے بارے میں جہالت و نادانی اور معاد کے بارے میں ایمان کا نہ ہونا ہے ۔
اس کے علاوہ انسان کا اپنی پیدائش کے آغاز سے لے کر انجام تک ، اپنی کمزوریوں اور مصیبتوں سے بے خبر رہنا بھی کبر و غرور اور تفاخر کے عوامل میں سے ایک عامل ہے ۔ اسی بناء پر قرآن مجید اس تفاخر و تکاثر کو توڑنے کے لیے گزشتہ اقوام کی سرگزشت کو مختلف آیات میں بیان کرتا ہے کہ یہ قومیں کتنے امکانات اور فراواں قدرت رکھنے کے باوجود کتنے سادہ اور عام قسم کے وسائل کے ذریعے کس طرح سے نابود ہو گئیں ۔
ہواؤں کے چلنے سے آسمانی بجلی (صاعقہ) کے کوندنے سے ، زمین کے ایک زلزلہ سے ، حد سے زیادہ بارش کے برسنے سے ، خلاصہ یہ ہے کہ پانی ، ہوا اور مٹی سے اور بعض اوقات " سجیل " (کنکریوں) اور چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ذریعے نابود ہو گئے ۔
اِن حالات میں یہ سب تفاخر و غرور کس لیے ہے ؟
اِس بات کے لیے دوسرا عامل وہی ضعف و حقارت کا احساس ہے جو ناکامیوں اور شکستوں سے پیدا ہوتا ہے کہ کچھ افراد اپنی شکستوں کی پردہ پوشی کے لیے تفاخر و مباہات کی پناہ لیتے ہیں ۔ اسی لیے ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے :

" ما من رجل تکبّر او تجبّر الّا لذلة وجدھا فی نفسہ "

" کوئی شخص تکبّر اور فخر و مباہات نہیں کرتا مگر اس ذلّت کی وجہ سے جسے وہ اپنے نفس کے اندر پاتا ہے "[1]

لہٰذا جب وہ یہ احساس کرتا ہے کہ وہ حدِ کمال کو پہنچ گیا ہے ، تو پھر وہ تفاخر کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا ۔

---

[1] " اصول کافی " جلد ۲ ص ۳۳۶ باب الکبر حدیث ۱۷

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے:

"ثلاثة من عمل الجاهلية، الفخر بالانساب، والطعن فى الاحساب والاستسقاء بالانواء"

"تین چیزیں ایسی ہیں جو زمانۂ جاہلیت کے عمل میں سے ہیں، نسب پر فخر کرنا، لوگوں کی شخصیت اور خاندانی شرافت میں طعن کرنا اور ستاروں کے ذریعے بارش طلب کرنا[1]

ایک اور حدیث میں امیرالمومنین علی علیہ السلام سے آیا ہے:

"اهلك الناس اثنان: خوف الفقر، وطلب الفخر"

"دو چیزوں نے لوگوں کو ہلاک کیا: فقر و فاقہ کا خوف (جو انسان کو ہر طریقہ اور ہر ذریعہ سے مال جمع کرنے پر اُبھارتا ہے) اور ایک دوسرے پر فخر کرنا[2]

اور حقیقتاً حرص، بُخل، دُنیا پرستی اور تباہ کرنے والی رقابتوں اور بہت سے اجتماعی مفاسد کے اہم ترین عوامل میں سے ایک یہی فقر و فاقہ کا بلاوجہ خوف اور افراد و قبائل اور اُمتوں کے درمیان ایک دوسرے پر فخر و مباحات کرنا اور برتری کا اظہار کرنا ہے۔

اسی لیے ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"ما اخشى عليكم الفقر، ولكن اخشى عليكم التكاثر"

"میں تم پر فقر و فاقہ سے نہیں ڈرتا، لیکن میں تمہارے تکاثر و تفاخر سے ڈرتا ہوں"[3]

"تکاثر" جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے اصل میں تفاخر کے معنی میں ہے، لیکن بعض اوقات یہ زیادہ طلب اور مال جمع کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے چنانچہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"التكاثر، (فى) الاموال جمعها من غير حقها، ومنعها من حقها، وشدّها فى الاوعية"

"تکاثر، غیر شرعی طریقہ سے مال جمع کرنا، اور اس کا حق ادا نہ کرنا اور اُسے صندوقوں اور خزانوں میں جمع کرنا ہے۔[4]

ہم اس وسیع بحث کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک پُر معنی حدیث پر ختم کرتے ہیں، جو آپ نے "الهاكم التكاثر" کی تفسیر میں بیان فرمائی ہے:

"يقول ابن آدم مالى مالى، ومالك من مالك الا ما اكلت فافنيت او

---

[1] "بحارالانوار" جلد ۷۳، ص ۲۹۱

[2] "بحارالانوار" جلد ۷۳، ص ۲۹۰ حدیث ۱۲

[3] "الدرالمنثور" جلد ۶ ص ۳۸۷

[4] "نورالثقلین" جلد ۵ ص ۶۶۲ حدیث ۸

لبست فابليت او تصدقت فامضيت ۔

" انسان کہتا ہے : میرا مال ، میرا مال ، حالانکہ تیرا مال تو صرف وہ غذا ہے جو تو کھاتا ہے، وہ لباس جو تُو پہنتا ہے اور وہ صدقات ہیں جو تو راہِ خدا میں دیتا ہے " [1]

اور یہ ایک بہت ہی عمدہ نکتہ ہے کہ اس فراواں مال میں سے ہر شخص کا حصّہ، جسے وہ جمع کرتا ہے، اور اس کے حلال و حرام ہونے کے بارے میں کبھی تھوڑی سی دیر کے لیے بھی غور و فکر نہیں کرتا، اس تھوڑے سے کھانے پینے، پہننے اور راہِ خدا میں خرچ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ وہ جو کچھ اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے وہ بہت ہی کم، حقیر اور نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور کیا ہی اچھا ہو کہ وہ راہِ خدا میں خرچ کرنے میں اپنا حصّہ زیادہ کرے۔

۲۔ یقین اور اس کے مراحل

" یقین " " شک " کا نقطۂ مقابل ہے، جیسا کہ علم، جہالت کا نقطۂ مقابل ہے، اور کسی چیز کے واضح اور ثابت ہونے کے معنی میں آیا ہے۔ اور اختیار و روایات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کے مطابق ایمان کے اعلیٰ مرحلہ کو یقین کہا جاتا ہے امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا :

" ایمان اسلام سے ایک درجہ بالاتر ہے، اور تقویٰ ایمان سے ایک درجہ بالاتر ہے اور یقین تقویٰ سے ایک درجہ بالاتر ہے۔

اس کے بعد آپؑ نے فرمایا :

" ولم يقسم بين الناس شیء اقل من اليقين "

" لوگوں میں یقین سے کمتر کوئی چیز تقسیم نہیں ہوئی ہے "

راوی نے سوال کیا : یقین کیا ہے ؟ امامؑ نے فرمایا :

" التوكل على الله، والتسليم لله ، والرضا بقضاء الله ، والتفويض الى الله "

" یقین کی حقیقت اللہ پر توکّل کرنا، اللہ کی پاک ذات کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا، قضائے الٰہی پر راضی رہنا اور اپنے تمام کاموں کو خدا کے سپرد کر دینا ہے " [2]

مقامِ تقویٰ و ایمان و اسلام سے مقامِ یقین کی برتری ایک ایسی چیز ہے جس پر دوسری روایات میں بھی تاکید ہوئی ہے۔ [3]

ایک دوسری حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے :

" من صحة يقين المرأ المسلم ان لا يرضى الناس بسخط الله، ولا يلومهم على مالم يؤته الله ... ان الله بعدله و قسطه جعل الروح

---

[1] " صحیح مسلم " (مطابق نقل مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۵۳۴)

[2] " بحارالانوار " جلد ۷۰ ص ۱۳۸ حدیث ۴

[3] " بحارالانوار " جلد ۷۰ ص ۱۳۵ ۔ ۱۳۷ ۔

والراحة فی الیقین والرضا وجعل الھم والحزن فی الشک والسخط ،

" مرد مسلمان کے یقین کے صحیح ہونے کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ خدا کو ناراض کرکے لوگوں کو راضی نہ کرے اور جو کچھ خدا نے اُسے نہیں دیا اس پر لوگوں کو ملامت نہ کرے (انہیں اپنی محرومیوں کا ذمہ دار نہ ٹھہرائے) خدا نے اپنے عدل و انصاف کی بنا پر راحت و آرام ، یقین و رضا میں رکھا ہے ، اور غم و اندوہ کو شک اور ناراضی میں قرار دیا ہے "!

ان تعبیرات اور دوسری تعبیروں سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ جب انسان یقین کے مقام تک پہنچ جاتا ہے تو ایک خاص قسم کا سکون و آرام اس کے سارے دل و جان میں سرایت کر جاتا ہے ۔

لیکن اس کے باوجود یقین کے لیے کئی مراتب ہیں جن کی طرف اُوپر والی آیات اور سورۂ واقعہ کی آیہ (انّ ھٰذا لھو حق الیقین) میں اشارہ ہوا ہے ، اور وہ تین مرحلہ میں ہیں[1]

۱۔ **علم الیقین** : یہ ہے کہ انسان مختلف دلائل سے کسی چیز پر ایمان لائے ، اس شخص کے مانند جو دھوئیں کو دیکھ کر آگ کے ہونے پر ایمان لے آتا ہے ۔

۲۔ **عین الیقین** : اس مقام پر حاصل ہوتا ہے جب انسان مشاہدہ کے مرحلہ تک پہنچ جاتا ہے ، اور اپنی آنکھ سے مثلاً کسی آگ کو دیکھ لے ۔

۳۔ **حق الیقین** : اور وہ اس شخص کے مانند ہے جو آگ میں داخل ہو جائے ، اور اس کی سوزش اور حرارت کو لمس کرے ، اور یہ یقین کا بالا ترین مرحلہ ہے ۔

محقق طوسی اپنی ایک گفتگو میں کہتے ہیں : " یقین " وہی پختہ ، اور ثابت اعتقاد ہے ، جس کا زوال ممکن نہیں ہے اور حقیقت میں وہ دو علموں سے مرکب ہے ۔ ایک معلوم کے متعلق علم ، اور دوسرا یہ علم کہ اس علم کے خلاف محال ہے ، اور اس کے کئی مراتب ہیں ۔ " علم الیقین " و " عین الیقین " و " حق الیقین "[2]

حقیقت میں پہلا مرحلہ عمومی پہلو رکھتا ہے اور دوسرا مرحلہ پرہیزگاروں کے لیے ہے ۔ اور تیسرا مرحلہ خواص اور مقربین کے ساتھ مخصوص ہے ۔

اسی سے ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں صحابہ نے عرض کیا : ہم نے سُنا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعض اصحاب پانی پر چلتے تھے !! آپ نے فرمایا :

" لوکان یقینہ اشد من ذالک لمشی علی الھواء " :

" اگر اس کا یقین اس سے زیادہ پختہ اور محکم ہوتا تو وہ ہوا پر چلتا " !

---

[1] " بحارالانوار " جلد ۷۰ ص ۱۴۳

[2] " مطابق نقل بحارالانوار " جلد ۷۰ ص ۱۴۳

مرحوم "علامہ طباطبائی" اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد مزید کہتے ہیں: تمام چیزیں خداوند سبحان پر یقین اور عالم تکوین کے اسباب کی تاثیر کے استقلال کو محو کرنے کے محور کے گرد گھومتی ہیں، اس بنا پر انسان کا قدرت مطلقہ الٰہیہ پر اعتقاد و ایمان جتنا زیادہ ہوگا، اشیاء عالم اسی نسبت سے اُس کے سامنے مطیع و منقاد ہو جائیں گی۔[1]

اور عالم آفرینش میں یقین اور خارق العادت تصرف کے رابطہ کی یہی رمز ہے۔

۳۔ سب لوگ دوزخ کا مشاہدہ کریں گے

"لترون الجحیم" کے جملہ کی دو تفسیریں ہیں۔ پہلی یہ کہ اس سے مراد آخرت میں دوزخ کا مشاہدہ کرنا ہے جو کفار کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور یا یہ تمام جن و انس کے لیے عام ہے، کیونکہ قرآن کی بعض آیات کے مطابق سب کو ہی جہنم کے پاس سے گزرنا پڑے گا۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد اسی عالم دنیا میں شہود قلبی ہے، اور اس صورت میں یہ جملہ قضیہ شرطیہ کا جواب ہے۔ فرماتا ہے: "اگر تم "علم الیقین" رکھتے ہوتے تو "جہنم" کو اسی عالم میں دل کی آنکھ سے مشاہدہ کر لیتے" کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بہشت و دوزخ اَب بھی خلق شدہ موجود ہیں، اور وجود خارجی رکھتی ہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ پہلی تفسیر بعد والی آیات کے ساتھ، جو روز قیامت کی بات کر رہی ہیں، زیادہ مناسب ہے۔ اس بنا پر یہ ایک قطعی اور غیر مشروط قضیہ ہے۔

۴۔ قیامت میں کون سی نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا؟

اس سورہ کی آخری آیت میں آیا ہے کہ یقینی طور پر تم سب سے قیامت کے دن نعمتوں کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس نعمت سے مراد "سلامتی" اور "فراغت خاطر" ہے، اور بعض اسے "تندرستی" اور "امن و امان" سمجھتے ہیں، اور بعض نے تمام ہی نعمتوں کو اس آیت کا مشمول سمجھا ہے۔

ایک حدیث میں امیرالمومنین علی علیہ السلام سے آیا ہے:

"النعیم الرطب، والماء البارد":

"نعیم سے مراد تازہ کھجوریں اور ٹھنڈا پانی ہے"۔

جب کہ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ "ابوحنیفہ" نے "امام جعفر صادق علیہ السلام" سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا تو امام علیہ السلام نے اس کے سوال کو اسی کی طرف پلٹا کر فرمایا: تیرے نظریہ کے مطابق نعیم سے کیا مراد ہے"؟ اس نے عرض کیا: غذا ہے اور کھانا اور ٹھنڈا پانی ہے۔ آپ نے فرمایا: اگر خدا قیامت کے دن تجھے اپنی بارگاہ میں اس لیے کھڑا کرے کہ وہ ہر اس لقمہ کا جو تو نے کھایا ہے، اور ہر اُس گھونٹ کا جو تُو نے پیا ہے، تجھ سے سوال کرے، پھر تو تجھے

[1] "المیزان" جلد ۲ ص ۲۰۰ (سورۂ مائدہ کی آیہ ۱۰۵ کے ذیل میں)۔

وہاں بہت زیادہ دیر تک ٹھہرنا پڑے گا"! اس نے عرض کیا: پھر نعیم کیا ہے؟!
آپ نے فرمایا: "ہم اہل بیت ہیں کہ خدا نے ہمارے وجود کے ذریعے اپنے بندوں کو نعمت عطا کی ہے اور ان کے درمیان اختلاف کے بعد الفت بخشی ہے، ان کے دلوں کو ہماری وجہ سے آپس میں جوڑ دیا ہے اور انہیں ایک دوسرے کا بھائی بنایا جب کہ وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اور ہمارے ہی ذریعے سے انہیں اسلام کی طرف ہدایت کی ہے"۔۔۔۔ ہاں! نعیم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت ہی ہیں؛[1]

ان روایات کی تفسیر، جو ظاہراً مختلف ہیں، جو تمام مواہب الہٰی کو، چاہے وہ معنوی ہوں جیسے دین، ایمان، اسلام و قرآن اور ولایت یا انواع و اقسام کی انفرادی و اجتماعی نعمتیں ہوں، ان سب کو شامل ہے۔

البتہ جو نعمتیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں مثلاً نعمت "ایمان و ولایت" تو ان کے بارے میں زیادہ سوال ہو گا کہ ان کا حق ادا ہوا ہے یا نہیں؛ اور ظاہراً وہ روایات جو اس آیت کے مادی نعمتوں کے شمول کی نفی کرتی ہیں وہ اس معنی میں ہیں کہ تمہیں اہم تر مصادیق کو چھوڑ کر بہت ہی چھوٹے مصادیق کی طرف نہیں جانا چاہیئے۔ اور حقیقت میں یہ لوگوں کو خدائی نعمتوں اور مواہب کے مراتب کے سلسلے میں ایک تنبیہ ہے کہ ان کے لیے ان سے بہت ہی سخت قسم کی باز پرس ہوگی۔

اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ان نعمتوں کے بارے میں سوال نہ ہو حالانکہ یہ بہت ہی بڑے سرمائے ہیں جو نوع بشر کے اختیار میں دیے گئے ہیں۔ اور انہیں ان میں سے ہر ایک کی بڑی باریکی کے ساتھ قدردانی کرنی چاہیئے اور ان کا شکر بجا لانا چاہیئے۔ اور انہیں ان کے صحیح موارد میں صرف کرنا چاہیئے۔

خداوندا! تو اپنی بے انتہا نعمتوں کو، خصوصاً ایمان و ولایت کی نعمت کو ہمیشہ ہمیشہ ہم پر جاری رکھ۔

پروردگارا! ہمیں ان تمام نعمتوں کے حق کی ادائیگی کی توفیق مرحمت فرما۔

بارالہٰا! ہم پر ان عظیم نعمتوں میں اضافہ کرتا رہ، اور انہیں ہرگز ہم سے سلب نہ کرنا۔

آمین یا رب العالمین

سورہ تکاثر کا اختتام

اختتام ترجمہ
۱۱ منٹ کم ایک بجے شب
۲۹ رمضان ۱۴۰۸ھ
بر مکان حقیر قم مقدسہ ایران

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۳۵

سورۂ والعصر

- یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔
- اس میں ۳ آیات ہیں۔

سُورۂ "والعصر" کے مطالب اور اس کی فضیلت

مشہور یہ ہے کہ یہ سُورہ مکہ میں نازل ہوا ہے اگرچہ بعض نے مدنی ہونے کا احتمال بھی ظاہر کیا ہے لیکن سُورہ کی آیات کے چھوٹے چھوٹے مقاطع اور اس کا لب ولہجہ اس کے مکی ہونے کا شاہد ہے۔

بہرحال اس سُورہ کی جامعیت اس حد تک ہے کہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق قرآن کے تمام علوم و مقاصد کا خلاصہ اس سورہ میں موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس سُورہ نے مختصر ہونے کے باوجود انسان کی سعادت و خوش بختی کا ایک مکمل اور جامع پروگرام پیش کیا ہے۔

سب سے پہلے "عصر" کی معنی خیز قسم سے شروع ہوتا ہے، جس کی تفسیر عنقریب پیش کی جائے گی۔ اس کے بعد تمام انسانوں کے زیاں کار اور خسارے میں ہونے کی گفتگو ہے جو تدریجی زندگی کی فطرت میں پوشیدہ ہے۔ اس کے بعد صرف ایک گروہ کو اس اصل کلی سے جُدا کرتا ہے، جو ذیل کی چار خصوصیات والے پروگرام کے حامل ہیں:

۱۔ ایمان۔ ۲۔ عمل صالح۔ ۳۔ ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرنے والے۔

۴۔ ایک دُوسرے کو صبر کی وصیت کرنے والے، اور حقیقتاً یہ چار اصول اسلام کے اعتقادی وعملی، اور انفرادی واجتماعی پروگراموں کو اپنے اندر لیے ہوتے ہیں۔ اس سُورہ کی فضیلت کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السّلام سے ایک حدیث میں آیا ہے:

"من قرأ "والعصر" فی نوافلہ بعثہ اللہ یوم القیامۃ مشرقاً وجھہ ضاحکاً سنہ قریرۃ عینہ حتّٰی یدخل الجنۃ"

"جو شخص سُورۂ "والعصر" کو نافلہ نمازوں میں پڑھے گا، خدا اُسے قیامت کے دن اس حالت میں اُٹھائے گا کہ اس کا چہرہ نورانی، لب خنداں، اور اس کی آنکھ خدا کی نعمتوں سے روشن اور ٹھنڈی ہوگی یہاں تک کہ وہ جنّت میں داخل ہوگا۔"[1]

اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ یہ سب اعزاز وافتخار اور سرور وشادمانی اس شخص کے لیے ہے، جو اپنی زندگی میں ان چار اصولوں پر عمل کریگا، نہ کہ صرف پڑھنے پر ہی قناعت کرے۔

---

[1] "تفسیر مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۴۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ وَالْعَصْرِ ۙ

۲۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ

۳۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۧ

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ قسم ہے عصر کی۔

۲۔ کہ سب انسان خسارے میں ہیں۔

۳۔ سوائے ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح انجام دیے ہیں، ایک دوسرے کو حق کی وصیت و نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر و استقامت کی وصیت کی۔

تفسیر

نجات کی صرف ایک راہ

اِس سورہ کی ابتداء میں ہم ایک نئی قسم سے رُوبرو ہو رہے ہیں، فرماتا ہے: "عصر کی قسم" (والعصر)۔

"عصر" کا لفظ اصل میں نچوڑنے کے معنی میں ہے، اس کے بعد اس کا وقت عصر پر اطلاق ہونے لگا کیونکہ اس میں دن کے پروگراموں اور کاموں کو لپیٹ کر مختصر کر دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد یہ لفظ مطلق "زمانہ" اور تاریخ بشر کے دَور یا زمانے کے ایک حصّہ، جیسے ظہورِ اسلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قیام کے زمانے، اور اسی قسم کے دوسرے زمانوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اسی لیے اس قسم کی تفسیر میں مفسّرین نے بہت زیادہ احتمال دیے ہیں۔

۱۔ بعض تو اسے اسی وقت "عصر" کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، اس قرینہ سے کہ قرآن کی بعض دوسری آیات میں دن کے آغاز کی قسم کھائی گئی ہے مثلاً: "والضحٰی" (سورہ ضحٰی آیہ ۱) یا "والصبح اذا اسفر" (مدثر۔۳۴)
یہ قسم اس اہمیت کی بناء پر ہے جو دن کے اس موقع کو حاصل ہے کیونکہ یہ وقت انسانوں کی حیات اور نظامِ زندگی کے خاتمے کا وقت ہوتا ہے، دن کے کام اپنے انجام کو پہنچتے ہیں، پرند و چرند اپنے اپنے آشیانوں اور ٹھکانوں کو لوٹتے ہیں، سورج اُفقِ مغرب میں اپنا سَر چھپا لیتا ہے اور فضا بتدریج تاریک ہوتی چلی جاتی ہے۔
یہ اختتام اور تغیّر انسان کو خدا کی لا یزال قدرت کی طرف ــ جو اس نظام پر حاکم ہے ــ متوجہ کرتا ہے اور حقیقت میں یہ توحید کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور پروردگار کی آیتوں میں سے ایک آیت ہے جو قسم کے لائق ہے۔

۲۔ بعض دُوسروں نے اسے تمام زمانے اور تاریخ بشریت کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جو درسہائے عبرت، ہلا دینے والے حوادث اور بیدار کرنے والے واقعات سے پُر ہے، اور اسی بناء پر ایسی عظمت رکھتا ہے کہ خدا کی قسم کے لائق ہے۔

۳۔ اور بعض نے زمانے کے ایک خاص حصّہ کو، جیسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قیام کا زمانہ یا مہدی علیہ السلام کے قیام کا زمانہ، جو تاریخ بشر میں خصوصیت اور مخصوص عظمت کا حامل ہے، مُراد لیا ہے اور قسم کو اسی کے بارے میں سمجھتے ہیں[1]

۴۔ بعض نے اس لفظ کے لغوی ریشہ اور جڑ بنیاد کی طرف بھی خصوصی توجہ دی ہے۔ اور اس قسم کو ان مشکلات اور دشواریوں کے بارے میں سمجھتے ہیں جو انسانوں کی طویل زندگی میں رُونما ہوتے ہیں، انہیں خوابِ غفلت سے بیدار کرتے ہیں، انہیں خدائے عظیم کی یاد دلاتے ہیں اور رُوحِ استقامت کی پرورش کرتے ہیں۔

۵۔ بعض اسے کامل انسانوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو عالمِ ہستی اور جہانِ خلقت کا نچوڑ ہیں۔

۶۔ اور آخر میں بعض اسے "نمازِ عصر" کے بارے میں سمجھتے ہیں، اس خصوصی اہمیت کی بناء پر جو اُسے باقی نمازوں میں حاصل ہے کیونکہ وہ "صلاۃ وسطیٰ" جس کے لیے قرآن میں خاص قسم کی تاکید کی گئی ہے، نمازِ عصر کو سمجھتے ہیں۔

اگرچہ اُوپر والی تفاسیر آپس میں ایک دوسرے سے کوئی تضاد نہیں رکھتیں، اور ممکن ہے کہ وہ سب ہی آیت کے معنی میں جمع ہوں، اور ان تمام اہم امور کی قسم کھائی گئی ہو، لیکن ان سب میں سے، سب سے زیادہ مناسب، عصر کو زمانہ اور تاریخ بشر کے

---

[1] ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے کہ والعصر ان الانسان لفی خسر کی تفسیر میں فرمایا: العصر عصر خروج القائم عصر سے مراد حضرت مہدی (سلام اللہ علیہ) کے قیام کا زمانہ ہے۔ (نور الثقلین جلد ۵۔ ص ۶۶۶ حدیث ۵)

معنی میں لینا ہی نظر آتا ہے۔

کیونکہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ قرآن کی قسمیں ہمیشہ اس مطلب کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے۔ اور مسلّمہ طور سے انسانوں کی زندگی میں زیان و خسارہ ان کی عمر کے زمانے کے گزرنے کا نتیجہ ہے، یا پیغمبرؐ خاتم کے قیام کا زمانہ، کیونکہ اس سُورہ میں بیان کیے گئے چار اصولوں کا پروگرام اسی زمانہ میں نازل ہوا ہے۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے آیاتِ قرآنی کی عظمت اور اس کے مفاہیم کی وسعت اچھی طرح سے واضح ہو گئی ہے کہ ان میں سے ایک ہی لفظ کس حد تک پُر معنی اور عمیق و گوناں گوں تفاسیر کے لائق ہے۔

بعد والی آیت میں اس چیز کی طرف اشارہ ہے جس کے لیے یہ اہم قسم کھائی گئی ہے، فرماتا ہے: "یقینی طور پر تمام انسان خسارے میں ہیں" (ان الانسان لفی خسر)۔

وہ اپنے وجودی سرمائے کو، خواہ چاہیں یا نہ چاہیں، کھو بیٹھتے ہیں، عمر کی گھڑیاں، دن، مہینے اور سال تیزی کے ساتھ گزرتے چلے جاتے ہیں، معنوی اور مادی قوتیں تحلیل ہو جاتی ہیں اور طاقت و قدرت گھٹتی چلی جاتی ہیں۔

ہاں! انسان اس شخص کے مانند ہے جس کے پاس عظیم سرمایہ ہو اور اس کی مرضی اور خواہش کے بغیر اس سرمایہ کا ایک حصّہ ہر روز اُس سے لے لیتے ہوں۔ یہ دنیا کی زندگی کا مزاج ہے، ہمیشہ کم ہوتے چلے جانے والا مزاج۔

ایک دل میں حرکت کرنے کی ایک معین استعداد ہوتی ہے، اور جب وہ استعداد اور طاقت ختم ہو جاتی ہے تو دل خود بخود رُک جاتا ہے، حالانکہ اس میں کوئی عیب، بیماری یا علت نہیں ہوتی، اور یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب کہ وہ کسی بیماری کی وجہ سے پہلے ہی فیل نہ ہو جائے۔ انسانی وجود کے باقی کارخانوں، اور اس کی مختلف استعدادوں کے سرمایوں کا بھی یہی حال ہے۔

"خسر" (بروزن عسر) اور خسران" جیسا کہ" راغب" "مفردات" میں کہتا ہے: سرمایہ کے کم ہونے کے معنی میں ہے۔ کبھی تو اس کی انسان کی طرف نسبت دی جاتی ہے اور یہ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی کو نقصان ہو گیا، اور بعض اوقات خود عمل کی طرف نسبت دی جاتی ہے اور یہ کہتے ہیں کہ اس کی تجارت میں نقصان ہو گیا۔ یہ لفظ عام طور پر خارجی سرمایوں مثلاً مال و مقام کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور بعض اوقات اندرونی سرمایوں، مثلاً صحت و سلامتی، عقل و ایمان اور ثواب کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور یہ وہی چیز ہے جسے خداوندِ عالم نے "خسران مبین" (واضح خسارہ) کے عنوان سے ذکر کیا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: ان الخاسرین الذین خسروا انفسھم واھلیھم یوم القیامۃ الا ذالک ھو الخسران المبین " واقعی زیاں کار لوگ تو وہ ہیں جو قیامت میں اپنے وجود اور اپنے گھر والوں کے وجود کا سرمایہ ہاتھ سے دے بیٹھیں گے۔ جان لو کہ خسران مبین (واضح خسارہ) یہی ہے۔ (زمر - ۱۵)۔[1]

فخر رازی اس آیت کی تفسیر میں ایک بات نقل کرتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ گزشتہ بزرگوں میں سے ایک کہتے ہیں کہ اس سورہ کا معنی میں نے ایک برف فروش شخص سے سیکھا ہے جو پُکار پُکار کر کہہ رہا تھا: ارحموا من یذوب رأس مالہ ارحموا من یذوب رأس مالہ! : اس شخص پر رحم کرو جس کا سرمایہ پگھلا جا رہا ہے، اس شخص پر رحم کرو جس کی پونجی پگھل رہی ہے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا یہ ہے معنی ان الانسان لفی خسر کا: اس پر زمانہ گزرتا چلا جاتا ہے اور اس کی عمر ختم ہو جاتی ہے اور

[1] "مفردات راغب" مادہ "خسر"

وہ کوئی ثواب حاصل نہیں کرتا۔ اور وہ اس حال میں خسارے میں ہے۔ [1]

بہر حال اسلام کی جہاں بینی کے لحاظ سے دنیا ایک بازارِ تجارت ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں امام ہادی علی بن محمد التقی علیہ السلام سے آیا ہے:

"الدنیا سوق ربح فیھا قوم وخسر اٰخرون"

"دنیا ایک بازار ہے جس میں ایک گروہ نے نفع کمایا اور دوسری جماعت خسارے میں رہی" [2]

زیرِ بحث آیت کہتی ہے کہ اس عظیم بازار میں سبھی لوگ خسارے میں رہتے ہیں، سوائے ایک گروہ کے جس کا پروگرام بعد والی آیت میں بیان ہوا ہے۔

ہاں! اس عظیم خسارے اور قہری و جبری نقصان سے بچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے، صرف ایک ہی راہ جس کی طرف اس سورہ کی آخری آیت میں اشارہ ہوا ہے، فرماتا ہے: "سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اعمالِ صالح انجام دیے ہیں، اور ایک دوسرے کو حق کی وصیت اور صبر و استقامت کی نصیحت کرتے ہیں" (الا الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر)۔

دوسرے لفظوں میں جو چیز اس عظیم نقصان کو روک سکتی ہے اور اسے عظیم نفع میں تبدیل کر سکتی ہے، یہ ہے کہ اس سرمائے کو ہاتھ سے دینے کے مقابلہ میں زیادہ گران بہا اور زیادہ قیمتی سرمایہ حاصل کرے، جس سے نہ صرف اس سرمایہ کی خالی جگہ پُر ہوگی بلکہ اس سے سینکڑوں اور ہزار ہا گنا زیادہ اور بہتر ہو جائے گی۔

ہر وہ سانس جو انسان لیتا ہے، اس سے موت کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے، جیسا کہ امیرالمومنین علی علیہ السلام اپنی اس نورانی عبارت میں فرماتے ہیں:

"نفس المرء خطاہ الی اجلہ"

"انسان کا سانس موت کی طرف اس کا ایک قدم ہے۔" [3]

اس بنا پر انسان کے دل کی ہر حرکت اسے اختتامِ عمر سے ایک قدم اور زیادہ نزدیک کر دیتی ہے۔ اس طرح سے اس قطعی نقصان کے مقابلہ میں کوئی ایسا کام کرنا چاہیئے جس سے خالی جگہ پُر ہو جائے۔

ایک گروہ عمر اور زندگی کا نفیس سرمایہ ہاتھ سے دے دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں تھوڑا یا زیادہ مال، معمولی گھر یا خوبصورت محل فراہم کر لیتا ہے۔

ایک گروہ اس تمام سرمائے کو، مقام و منصب تک پہنچنے کے لیے ضائع کر دیتا ہے۔

اور کچھ لوگ اسے عیش و نوش اور جلدی گزر جانے والی لذتوں میں صَرف کر دیتے ہیں۔

---

[1] "تفسیر فخر رازی" جلد ۳۲ ص ۸۵

[2] "تحف العقول" ص ۳۶۱ (کلمات امام ہادی علیہ السلام)

[3] "نہج البلاغہ" کلمات قصار جلد ۷۴

مسلّمہ طور سے ان میں سے کوئی سی چیز بھی اس عظیم سرمایہ کی قیمت نہیں ہوسکتی ۔ اس کی قیمت صرف اور صرف خدا کی رضا اور اس کا مقام قرب ہے ۔

یا جیسا کہ امیرالمومنین علی علیہ السلام نے فرمایا ہے :

" انہ لیس لانفسکم ثمن الا الجنۃ فلا تبیعوھا الا بھا "

" تمہارے وجود کی قیمت جنّت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے ، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس کو اس سے کمتر کسی چیز کے بدلے میں بیچ دو "[1]

یا جیسا کہ ماہِ رجب کی دُعا میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے :

" خاب الوافدون علی غیرک وخسر المتعرضون الا لک "

" جو تیرے غیر کے پاس جائیں گے وہ مایوس ہو جائیں گے اور تیرے سوا دوسروں کی طرف رجوع کرنے والے خسارے میں رہیں گے "

اور قیامت کے ناموں میں سے ایک نام " یوم التغابن " بلا وجہ نہیں ہے ، جیسا کہ سُورہ تغابن کی آیہ ۹ میں آیا ہے : ذالک یوم التغابن " " اس دن پتہ چل جائے گا کہ گھاٹے میں کون لوگ ہیں "

حسنِ مطلب اور لطفِ مسئلہ یہ ہے کہ ایک طرف تو انسانی وجود کے سرمایوں کا خریدار خداوندِ عظیم ہے : " ان اللّٰہ اشتریٰ من المؤمنین ... " (توبہ - ۱۱۱)

دوسری طرف وہ تھوڑے سے سرمایوں کو بھی خرید لیتا ہے : فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرًا یرہ (زلزال - ۷)

اور تیسری طرف اس کے مقابلہ میں وہ بہت زیادہ قیمت لگاتا ہے ۔ کبھی دس گنا کبھی سات سو گنا اور کبھی اس سے بھی زیادہ " فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ واللّٰہ یضاعف لمن یشاء " (بقرہ - ۲۶۱) اور جیسا کہ دُعا میں وارد ہوا ہے ، یا من یقبل الیسیر ویعفو عن الکثیر ؛ " اے وہ خدا جو تھوڑے سے حسنات اور نیکیوں کو بھی قبول کر لیتا ہے اور بہت زیادہ گناہوں کو بخش دیتا ہے "

اور چوتھی طرف سے ، باوجود اس کے کہ یہ تمام سرمائے خود اسی نے انسان کو دیے ہیں ، وہ اس قدر بزرگوار ہے کہ پلٹ کر انہیں کو زیادہ گراں قیمت پر خرید لیتا ہے ۔

ایک نکتہ

خوش بختی کا چار نکاتی پروگرام

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن نے اس عظیم خسارے کے لیے ایک جامع پروگرام پیش کیا ہے ، جس میں چار اصولوں پر تکیہ ہوا ہے

پہلی اصل : اس پروگرام میں مسئلہ " ایمان " ہے جو انسان کی تمام کارکردگیوں کی بنیاد ہے ، کیونکہ انسان کی عملی جدوجہد اس کی

[1] " نہج البلاغۃ " کلمات قصار جملہ ۴۵۶

فکری و اعتقادی بنیادوں سے سرچشمہ حاصل کرتی ہے۔ وہ حیوانات کے افعال کی طرح نہیں ہوتیں جن کی حرکات فطری و طبعی اسباب کی بنا پر ہوتی ہیں۔

دوسرے لفظوں میں انسان کے اعمال اس کے عقائد و افکار کی ایک مجسم صورت ہوتے ہیں، اور اسی بنا پر خدا کے تمام انبیاء ہر چیز سے پہلے اُمتوں کی اعتقادی بنیادوں کی اصلاح کیا کرتے تھے۔ اور وہ خصوصیت کے ساتھ شرک سے ـــ جو انواع و اقسام کے رذائل، بدبختیوں اور پراگندگیوں کا سرچشمہ ہے ـــ مبارزہ کرتے تھے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "ایمان" یہاں مطلق طور پر ذکر ہوا ہے تاکہ ایمان کے تمام کے تمام پہلوؤں کو شامل کیا جائے، یعنی خدا اور اس کی صفات پر ایمان سے لے کر قیامت و حساب و کتاب، جزا و سزا، کتب آسمانی، خدا کے انبیاء اور ان کے اوصیاء کے ایمان تک۔

دوسری اصل : میں ایمان کے بار آور اور پُرثمر درخت کے پھل اور نتیجہ کو پیش کرتے ہوئے "اعمالِ صالح" کی بات کرتا ہے۔

کیسی وسیع اور مطالب سے پُر تعبیر ہے، ہاں! "صالحات" وہی سارے کے سارے شائستہ اعمال، نہ صرف عبادات، نہ صرف انفاق فی سبیل اللہ، نہ صرف راہِ خدا میں جہاد، نہ صرف علم و دانش کا حصول، بلکہ ہر وہ شائستہ کام جو تمام میدانوں میں نفوس کے تکامل و ارتقاء، اخلاق کی پرورش، قربِ الی اللہ اور انسانی معاشرے کی پیش رفت کا وسیلہ ہو۔

یہ تعبیر چھوٹے سے چھوٹے کاموں سے لے کر۔ جیسے لوگوں کے راستہ سے ایک رکاوٹ ڈالنے والے پتھر کو ہٹانا۔ کروڑوں انسانوں کو گمراہی و ضلالت سے نجات دلانے اور دینِ حق و عدالت کی سارے جہان میں نشر و اشاعت کرنے تک کو شامل ہے۔

اور اگر ایک حدیث میں "اعمالِ صالح" کی امام جعفر صادق علیہ السلام سے، "مواسات اور دینی بھائیوں سے مساوات کرنے" سے تفسیر ہوئی ہے، تو وہ واضح و روشن مصداق کے قبیل سے ہے۔

ممکن ہے کہ بعض اوقات اعمالِ صالح بعض غیر مومن انسانوں سے بھی سرزد ہوں، لیکن مسلمہ طور پر وہ مضبوط و پائیدار اور وسعت رکھنے والے نہیں ہوتے، کیونکہ وہ خدائی عمیق اور گہرے اسباب سے سرچشمہ حاصل نہیں کرتے۔ لہٰذا ان میں جامعیت نہیں ہوتی۔

قرآن نے یہاں "صالحات" کو خصوصیت کے ساتھ جمع کی صورت میں بیان کیا ہے، ایسی جمع جو "الف و لام" کے ساتھ ہے اور عموم کے معنی رکھتی ہے۔ اور یہ اس حقیقت کو بیان کر رہی ہے کہ ایمان کے بعد اس طبعی و قہری خسارے سے روکنے والا راستہ تمام اعمالِ صالح کو انجام دینا ہے نہ کہ صرف ایک یا چند اعمالِ صالح پر قناعت کرنا، اور واقعاً اگر ایمان عمیق اور گہرے طور پر انسان کے دل میں جاگزیں ہو جائے تو وہ ایسے ہی آثار ظاہر کیا کرتا ہے۔

ایمان کوئی ایسا فکر اور اعتقاد نہیں ہوتا جو رُوح کے گوشوں میں تو موجود ہو لیکن اس میں کسی قسم کی تاثیر موجود نہ ہو۔ ایمان تو انسان کے سارے وجود کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔

ایمان اس پُرنور چراغ کے مانند ہے جو کسی کمرے کے اندر روشن ہے، جو نہ صرف اس کمرے کی فضا کو روشن کرتا ہے بلکہ اس کی روشنی اس کمرے کے تمام دریچوں سے باہر نکلتی ہے اور جو شخص اس کے باہر سے گزرے وہ اچھی طرح سے سمجھ لیتا ہے کہ اس میں ایک پُرنور چراغ روشن ہے۔

اسی طرح سے جب ایمان کا چراغ انسان کے دل کی سرائے میں روشن ہوتا ہے تو اس کا نور انسان کی زبان، آنکھ، کان اور ہاتھ پاؤں سے منعکس ہوتا ہے، ان میں سے ہر ایک کی حرکت بتاتی ہیں کہ دل میں ایک نور موجود ہے جس کی شعاعیں باہر نکل رہی ہیں۔

اسی بناء پر قرآن کی آیات میں عام طور پر "عمل صالح" "ایمان" کے ساتھ "لازم و ملزوم" کے عنوان سے آیا ہے۔

سورۂ نحل کی آیہ ۹۷ میں آیا ہے: من عمل صالحًا من ذکر او انثٰی و هو مؤمن فلنحیینه حیٰوة طیبة "

جو بھی عمل صالح انجام دے، مرد ہو یا عورت، لیکن ہو وہ صاحب ایمان، تو ہم اُسے پاکیزہ حیات کے ساتھ زندہ کریں گے۔

اور سورۂ مؤمنون کی آیہ ۹۹-۱۰۰ میں آیا ہے، اس عالم سے جُدائی کے بعد بدکاروں کو اس بات پر افسوس ہوگا کہ انہوں نے اعمال صالح کیوں انجام نہیں دیے۔ لہٰذا بہت ہی زیادہ اصرار کے ساتھ عمل صالح کو انجام دینے کے لیے بازگشت کا تقاضا کریں گے: رب ارجعون لعلی اعمل صالحًا فیما ترکت

اور سورۂ مومنون کی آیہ ۵۱ میں آیا ہے کہ خدا اپنے رسولوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ "پاک و پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور عمل صالح بجالاؤ"

" یاایها الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحًا"

اور چونکہ ایمان و عملِ صالح سوائے اس صورت کے ہرگز جاری نہیں رہتے کہ ایک طرف تو معاشرے میں حق کی طرف دعوت اور اس کی معرفت کے لیے کام کیا جائے اور دوسری طرف سے اس دعوت کی انجام دہی کی راہ میں صبر و استقامت کی دعوت ہو، اس لیے ان دو اصولوں کے بعد دُوسرے دو اصولوں کی طرف اشارہ فرماتا ہے، جو حقیقت میں دو بُنیادی اصولوں "ایمان" اور "عملِ صالح" کے اجراء کے ضامن ہیں۔

تیسری اصل میں "تواصی بہ حق" کے مسئلہ یعنی حق کی طرف سب کو عمومی دعوت دینے کی طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ سب لوگ حق کو باطل سے اچھی طرح پہچان لیں اور ہرگز اسے فراموش نہ کریں اور زندگی کی راہ میں اُس سے منحرف نہ ہوں۔

" تواصوا " تواصی کے مادہ سے ہے، جیسا کہ "راغب" نے "مفردات" میں بیان کیا ہے، اس معنی میں ہے کہ بعض افراد دوسرے بعض افراد کو نصیحت کریں۔

اور "حق" "واقعیت" یا واقعیت سے مطابقت کے معنی میں ہے۔ کتاب "وجوہ قرآن" میں قرآن مجید میں اس لفظ کے بارہ معانی اور موارد استعمال ذکر ہوئے ہیں، مثلاً خدا، قرآن، اسلام، توحید، عدل، آشکار ہونا، اور واجب ہونا وغیرہ، لیکن وہ سب ہی اسی ریشہ اور جڑ کی طرف لوٹتے ہیں جو ہم نے اُوپر بیان کی ہے۔

بہر حال " تواصوا بالحق " کا جملہ بہت ہی وسیع معنی رکھتا ہے، جو امر بہ معروف اور نہی از منکر کو بھی شامل ہے، اور جاہل کو تعلیم دینے اور اس کو ہدایت کرنے، غافل کو تنبیہ کرنے، شوق دلانے اور ایمان و عمل صالح کی تبلیغ کرنے کو بھی۔

یہ بات ظاہر و واضح ہے کہ جو لوگ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے ہیں انہیں خود بھی حق کا طرف دار اور اس کا عامل ہونا چاہیئے۔

چوتھی اصل میں "صبر" و استقامت اور اس کی نصیحت و وصیت کرنے کا مسئلہ پیش ہوا ہے، کیونکہ معرفت اور آگاہی کے بعد ہر شخص عمل کی راہ میں ہر قدم پر موانع سے رُوبرو ہوتا ہے۔ اگر استقامت اور صبر نہ ہو تو وہ ہرگز احقاق حق نہیں کر سکتا اور کوئی عملِ صالح انجام نہیں دے سکتا، یا اپنے ایمان کی حفاظت نہیں کر سکتا۔

ہاں! احقاقِ حق، اور اجراء حق اور معاشرے میں حق کی ادائیگی، ایک عمومی فعالیت اور پختہ و عظیم استقامت یعنی موانع کے مقابلہ میں ڈٹ جانے کے سوا ممکن نہیں ہے۔

"صبر" بھی یہاں ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو اطاعت پر صبر کرنے کو بھی شامل ہے، گناہ پر اُبھارنے والی چیزوں پر صبر کرنے، اور مصائب اور ناگوار حوادث پر صبر کرنے اور توانائیوں، سرمایوں اور ثمرات کو کھو بیٹھنے کے مقابلہ میں صبر کرنے کو بھی۔[1]

ان چار اصولوں کے بارے میں جو کچھ اُوپر بیان کیا گیا ہے۔۔۔اور جو حقیقت میں انسانوں کی زندگی اور سعادت کا جامع ترین پروگرام ہے۔۔۔اس کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ روایات میں یہ کیوں آیا ہے کہ "جب اصحاب پیغمبرؐ ایک دوسرے کے پاس جاتے تھے، تو ایک دوسرے سے جُدا ہونے سے پہلے سُورہ "والعصر" کی تلاوت کیا کرتے تھے، اور اس چھوٹی سی سُورت کے عظیم مطالب کو بیان کیا کرتے تھے اور پھر ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے ہوئے اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے تھے۔"[2]

اور حقیقتاً اگر مسلمان آج بھی اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں ان چار اصولوں پر عمل پیرا ہو جائیں تو ان کی مشکلات اور بے سر و سامانیاں حل ہو جائیں، پس ماندگی کی تلافی ہو جائے، کمزوریاں اور ناکامیاں کامیابیوں سے بدل جائیں، اور دُنیا جہان کے شریروں کے شر ان سے منقطع ہو جائیں۔

خداوندا! ہمیں صبر و استقامت اور حق و صبر کی ایک دوسرے کو وصیت و نصیحت کرنے کی توفیق مرحمت فرما۔

پروردگارا! ہم سب خسارے میں ہیں اور اس خسارے کی تلافی تیرے لطف و کرم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

بارِ الٰہا! ہم ان چاروں احکام پر، جو تُو نے اس سُورہ میں دیے ہیں، عمل کرنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں اس کی توفیق عطا فرما۔

آمین یا ربّ العالمین

سُورہ والعصر کا اختتام

ترجمہ کا اختتام

بروز اتوار ۲۸ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ

بوقت ۹ بجے صبح

بر مکان حقیر قم المقدسہ ایران

---

[1] ہم نے "صبر کی حقیقت اور اس کے مراحل اور شعبوں کے بارے میں جلد اوّل میں سُورہ بقرہ کی آیہ ۱۵۳ کے ذیل میں مفصل بحث کی ہے۔

[2] "در المنثور" جلد ۶ ص ۳۹۲

سُورَۃ ہُمَزَۃ

- یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔
- اس میں ۹ آیات ہیں۔

سُورۂ ھمزۃ کے مطالب اور فضیلت

یہ سُورہ جو مکّی سورتوں میں سے ہے ایسے لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے جو مال جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں اور ان کے نزدیک انسانی وجود کی تمام اقدار کا خلاصہ یہی ہے پھر وہ ان لوگوں کو جن کے ہاتھ اس سے خالی ہوتے ہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

یہ مغرور دولت جمع کرنے والے اور خود پسند جیلہ گر، بادۂ کبر و نخوت سے ایسے مست ہو جاتے ہیں کہ دُوسروں کی تحقیر، عیب جوئی، استہزاء اور عیبت کرنے سے لذّت اُٹھاتے ہیں اور اس سے تفریح کرتے ہیں۔

اور سُورہ کے آخر میں ان کی دردناک سرنوشت کی بات کرتا ہے کہ وہ کیسی حقارت آمیز صُورت میں دوزخ میں پھینکے جائیں گے اور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہر چیز سے پہلے ان کے دل پر مسلّط ہو جائے گی، اور ان کی رُوح و جان کو، جو اس سارے کبر و نخوت اور ان سب شرارتوں کا مرکز تھا، آگ میں ڈال دیا جائے گا، بھڑکتی ہوئی دوامی اور طولانی آگ۔

اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت میں ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے آیا ہے:

"من قرأ سورة الهمزة اعطى من الاجر عشر حسنات بعدد من استهزأ بمحمد (ص) واصحابه"۔

"جو شخص اس سُورہ کی تلاوت کرے گا اُسے ان لوگوں کی تعداد سے، جنہوں نے محمدؐ اور ان کے اصحاب کا مذاق اُڑایا تھا، دس گنا حسنات دیے جائیں گے۔"[1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے: "جو شخص اس کو واجب نماز میں پڑھے گا، تو اس سے فقر و فاقہ دُور ہو جائے گا، اور روزی اس کا رُخ کرے گی اور قبیح اور بُری موت اس سے دُور ہو جائے گی۔"[2]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۳۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۙ

۲۔ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۙ

۳۔ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۚ

۴۔ كَلَّا ۖ لَيُنبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۖ

۵۔ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ۙ

۶۔ نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ ۙ

۷۔ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ ۙ

۸۔ إِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ ۙ

۹۔ فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۚ

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ ہر عیب جو اور تمسخر کرنے والے کے لیے وائے ہے۔

۲۔ وہی جو مال کو جمع کر کے گنتا رہا، (جائز و ناجائز کا حساب کیے بغیر)

۳۔ وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اس کے اموال اُس کے دوام کا سبب بن جائیں گے۔

۴۔ جیسا کہ وُہ خیال کرتا ہے ایسا نہیں ہے، عنقریب اُسے حطمہ (ریزہ ریزہ کرنے والی آگ) میں پھینک دیا جائے گا۔

۵۔ اور تُو کیا جانے کہ حُطمہ کیا ہے؟

۶۔ خدا کی بھڑکتی ہوئی آگ۔

۷۔ ایسی آگ جو دِلوں سے نکلتی ہے۔

۸۔ یہ آگ ان کے اُوپر دربستہ صُورت میں ہے۔

۹۔ کشیدہ اور طولانی ستونوں میں۔

شانِ نزول

مفسّرین کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ اس سُورہ کی آیات "ولید بن مغیرہ" کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، جو پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پسِ پُشت تو آپ کی غیبت کیا کرتا تھا اور آپ کے سامنے طعن و تشنیع اور استہزا کیا کرتا تھا۔

اور بعض دوسرے مفسّرین نے اسے رؤسائے شرک اور اسلام کے جانے پہچانے دوسرے کینہ ور لوگوں مثلاً، "اخنس بن شریق" و "اُمیہ بن خلف" و "عاص بن وائل" کے بارے میں سمجھا ہے۔

لیکن اگر ہم ان شانِ ہائے نزول کو قبول بھی کر لیں تو بھی آیات کے مفہوم کی عمومیت ختم نہیں ہوتی، بلکہ وہ ان تمام لوگوں کو شامل ہے جو ان صفات کے حامل ہیں۔

تفسیر

عیب جوئی اور غیبت کرنے والوں کے لیے وائے ہے۔

یہ سُورہ ایک چُبھنے والی تہدید کے ساتھ شروع ہوتا ہے، فرماتا ہے: "ہر عیب جو اور تمسخر اڑانے والے کے لیے وائے ہے"

(ویل لکل ھمزۃ لمزۃ)۔

وہ لوگ جو زبان کے ڈنک، ہاتھ اور پاؤں کی حرکات اور چشم و ابرو کے اشاروں سے، پیٹھ پیچھے اور رُوبرو دوسروں کا مذاق اُڑاتے ہیں، یا ان کی عیب جوئی اور غیبت کرتے ہیں، یا انہیں طعن و تشنیع اور تہمت کے تیروں کا ہدف بناتے ہیں۔

"ھمزۃ" و "لمزۃ" دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں[1]

پہلا "ھمز" کے مادہ سے اصل میں "توڑنے" کے معنی میں ہے۔ اور چونکہ عیب جو اور غیبت کرنے والے دوسروں کی شخصیت کو توڑتے ہیں اس لیے ان پر "ھمزہ" کا اطلاق ہوتا ہے۔

اور "لمزۃ" "لمز" (بروزن رمز) کے مادہ سے اصل میں غیبت کرنے اور عیب جوئی کرنے کے معنی میں ہے اس بارے میں کہ کیا یہ دونوں لفظ ایک ہی معنی میں ہیں اور غیبت کرنے والوں اور عیب جوئی کرنے والوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، یا ان دونوں کے درمیان کوئی فرق ہے؟ مفسرین نے بہت سے احتمال دیے ہیں، بعض نے انہیں ایک ہی معنی میں لیا ہے اور اس بنا پر ان دونوں کا اکٹھا ذکر تاکید کے لیے ہے۔

لیکن بعض نے یہ کہا ہے کہ "ھمزۃ" غیبت کرنے والے کے معنی میں ہے اور "لمزۃ" عیب جوئی کرنے والے کے معنی میں۔

اور بعض دوسروں نے "ھمزۃ" ان اشخاص کے معنی میں سمجھا ہے جو ہاتھ اور سر کے اشارہ سے عیب جوئی کرتے ہیں اور "لمزہ" ان اشخاص کے معنی میں جو زبان سے یہ کام انجام دیتے ہیں۔

اور بعض نے "پہلے" کو رُوبرو عیب جوئی کرنے اور "دوسرے" کو پیٹھ پیچھے عیب جوئی کرنے کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

اور بعض نے پہلے کو آشکارا عیب جوئی اور دوسرے کو پنہاں اور آنکھ اور ابرو کے اشارہ سے عیب جوئی کے معنی میں سمجھا ہے۔

اور بعض اوقات یہ کہا گیا ہے کہ یہ دونوں ہی اس شخص کے معنی میں ہیں جو لوگوں کو بُرے اور چبھنے والے القاب سے یاد کرتا ہے۔

اور آخر میں "ابن عباسؓ" کی ایک روایت میں آیا ہے کہ وہ ان دونوں کی تفسیر میں اس طرح کہا کرتے تھے:

"ھم المشاؤون بالنمیمۃ، المفرقون بین الاحبۃ، الناعتون للناس بالعیب":

"یہ وہ لوگ ہیں جو چغل خوری کرتے ہیں اور دوستوں کے درمیان جُدائی ڈالتے ہیں اور لوگوں میں عیب نکالتے ہیں"[2]

گویا ابن عباسؓ نے اس بات کا اس حدیث سے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہے استفادہ کیا ہے،

---

[1] مبالغہ کا صیغہ مشہور چھ اوزان کے علاوہ دوسرے اوزان پر بھی آتا ہے منجملہ ان کے ایک یہی وزن ہے، جس کی عربی زبان میں نظائر بھی موجود ہیں، مثلاً: "ضحکہ" جو بہت زیادہ ہنسنے والے کے معنی میں ہے۔

[2] "تفسیر فخر رازی" جلد ۳۲ ص ۹۲۔

جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :

" الا انبئکم بشرارکم ؟ قالوا : بلی یا رسول اللہ (ص) قال :
المشاؤون بالنمیمۃ ، المفرقون بین الاحبۃ ، الباغون للبرآء المعایب " :

" کیا میں تمہیں شریر ترین افراد کی خبر نہ دوں ؟ انہوں نے کہا : " ہاں ! اے رسولِ خدا (ص)
فرمایا : وہ لوگ جو بہت زیادہ چغل خوری کرتے ہیں ، دوستوں کے درمیان جدائی ڈالتے ہیں
اور پاکیزہ و بے گناہ افراد کے عیوب کی جستجو میں رہتے ہیں [1]

لیکن ارباب لغت کے کلمات کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں الفاظ ایک ہی معنی میں ہیں اور ایک وسیع معنی رکھتے ہیں ، جو ہر قسم کی عیب جوئی ، غیبت ، طعن و تشنیع اور علائم و اشارات اور زبان کے ذریعے تمسخر کرنے اور مذاق اڑانے اور چغل خوری اور بدگوئی کو شامل ہے ۔

بہر حال اس گروہ کے بارے میں " ویل " کی تعبیر ایک تہدید شدید ہے ۔ اور اصولی طور پر آیات قرآنی نے اس قسم کے افراد کے لیے سخت تنقید اور اعتراض کیا ہے اور ان کے لیے ایسی تعبیریں استعمال کی ہیں کہ ان جیسی کسی بھی گناہ کے لیے نظر نہیں آتیں ، مثلاً جب کور دل منافقین کو مومنین کا مذاق اڑانے کی بنا پر عذاب الیم کی تہدید کرتا ہے تو فرماتا ہے : استغفر لھم او لا تستغفر لھم ان تستغفر لھم سبعین مرۃ فلن یغفر اللہ لھم : " تو ان کے لیے استغفار کر اور چاہے نہ کر ، اگر تو ان کے لیے ستر مرتبہ بھی استغفار کرے گا تو بھی خدا انہیں نہیں بخشے گا " (توبہ ـ ۸۰)

اسی معنی کے مشابہ ، ان منافقین کے بارے میں ، جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا استہزاء کرتے اور مذاق اڑاتے تھے ، سورہ منافقین کی آیہ ۵ میں آیا ہے ۔

اصولی طور پر اسلام کی نظر میں اشخاص کی عزت اور حیثیت بہت ہی محترم ہے ۔ اور ہر وہ کام جو لوگوں کی تحقیر و تذلیل کا سبب ہو بہت بڑا گناہ ہے ۔ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے :

" اذل الناس من اھان الناس " :

" لوگوں میں سب سے زیادہ ذلیل شخص وہ ہے جو لوگوں کی توہین و تذلیل کرے ۔ " [2]

ہم نے اس سلسلہ میں سورۂ حجرات کی آیہ ۱۱ ، ۱۲ کے ذیل میں (جلد ۱۲ ص ۴۵۸ ـ ۴۵۹ پر) زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے ۔

اس کے بعد اس قبیح عمل (عیب جوئی و استہزا) کے سرچشمہ کو (جو عام طور پر مال و دولت سے پیدا ہونے والے کبر و غرور کے سبب سے ہوتا ہے) پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے : " وہی شخص جو مال کو جمع کرکے گنتا رہا ، (حلال و حرام کا خیال رکھے بغیر) (الذی جمع مالا و عددہ) ۔

اُسے مال و دولت کے ساتھ اتنی محبت ہے ، کہ وہ ہمیشہ انہیں گنتا رہتا ہے اور درہم و دینار کی چمک اور دوسری قسم کے

---

[1] " اصول کافی " جلد ۲ باب النمیمۃ حدیث ۱

[2] " بحار الانوار " جلد ۵ ، ص ۱۴۲

سکوں سے لذت حاصل کرتا ہے، اور خوش ہوتا ہے۔ ہر درہم و دینار اس کے لیے ایک بُت ہے، وُہ نہ صرف اپنی شخصیت بلکہ تمام شخصیتوں کو انہیں میں منحصر سمجھتا ہے اور یہ ایک طبیعی و فطری اَمر ہے کہ اس قسم کا گمراہ اور دیوانہ و احمق آدمی فقیر و نادار مومنین کا ہمیشہ مذاق اڑایا کرتا ہے۔

"عدّدہ" اصل میں "عد" کے مادہ سے اُسے شمار کرنے اور گننے کے معنی میں ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہ "عدہ" (بروزن غدہ) کے مادہ سے ہے جو ان اموال کو آمادہ کرنے اور مشکلات اور بُرے دن کے لیے ذخیرہ کرنے کے معنی میں ہے۔

اور بعض نے اس کی تفسیر روک رکھنے اور بچانے کے ساتھ بھی کی ہے۔

لیکن پہلا معنی سب سے زیادہ مناسب ہے۔

بہرحال یہ آیت ان مال جمع کرنے والوں کے بارے میں ہے جو مال کو ایک وسیلہ کے طور پر نہیں بلکہ ایک ہدف اور مقصد کے طور پر دیکھتے ہیں اور اس کے جمع کرنے میں کسی قسم کی قید و شرط کے قائل نہیں ہیں۔ وہ اسے حلال و حرام اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرکے، شریفانہ طریقہ سے، یا پست و رذیلانہ طریقہ سے، جمع کرتے ہیں۔ اور صرف اسی کو عظمت و شخصیت کی نشانی سمجھتے ہیں۔

وہ مال و دولت کو زندگی کی ضروریات کے پورا کرنے کے لیے نہیں چاہتے، اور یہی وجہ ہے کہ ان کے مال و دولت میں جتنا اضافہ ہوتا جاتا ہے ان کی حرص اور طمع بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ورنہ معقول حدود میں اور جائز طریقہ سے حاصل شدہ مال و دولت نہ صرف مذموم نہیں ہے بلکہ بعض اوقات قرآن مجید نے اسے "فضل اللہ" کے عنوان سے تعبیر کیا ہے، جہاں فرماتا ہے:

وابتغوا من فضل الله (جمعہ۔۱۰) اور دوسری جگہ اُسے خیر سے تعبیر کرتا ہے: کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیة: تم پر واجب ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آپہنچے تو اگر اس نے کچھ خیر چھوڑی ہے تو اس کے لیے وصیت کرے۔

ایسا مال یقینی طور پر نہ تو طغیان و سرکشی کا باعث ہوتا ہے، نہ ہی تفاخر کا سبب بنتا ہے اور نہ ہی وہ دوسروں کے استہزاء کا موجب ہوتا ہے، لیکن وہ مال جو معبود بنا لیا گیا ہے اور وہی اصلی ہدف و مقصد بن چکا ہے، اور وہ اپنے مالکوں کو "قارون" کی طرح طغیان و سرکشی کی دعوت دیتا ہے، وہ ننگ و عار ہے، ذلت ہے اور مصیبت و نکبت ہے اور خدا سے دُوری اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم کی آگ میں رہنے کا باعث ہے۔

عام طور پر اس مال کو زیادہ مقدار میں جمع کرنا بہت زیادہ آلودگیوں کے سوا ممکن نہیں ہے۔

اس لیے ایک حدیث میں امام علیؑ بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے آیا ہے، آپؑ نے فرمایا:

"لا یجتمع المال الا بخمس خصال: بخل شدید، وامل طویل، وحرص غالب، وقطیعة رحم، وایثار الدنیا علی الاخرة":

پانچ خصلتوں کے بغیر مال کسی کے پاس جمع نہیں ہو سکتا۔ (۱) بخل شدید (۲) طویل آرزوئیں

۱۱ حرص غالب ۱۲ قطع رحمی ۱۳ اور دنیا کو آخرت پر مقدم رکھنا۔[1]

جو لوگ سخی ہوتے ہیں اور لمبی لمبی آرزوؤں میں گرفتار نہیں ہوتے، حلال و حرام کا خیال رکھتے ہیں، اپنے اقربا کی مدد کرتے ہیں، عام طور پر ایسوں کے پاس مال جمع نہیں ہوتا، چاہے ان کی آمدنی زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "دولت جمع کرنے والا مال پرست انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اس کے اموال اس کی ہمیشگی کا سبب ہیں" (یحسب ان مالہ اخلدہ)۔[2]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ "اخلد" یہاں "فعل ماضی" کی صورت میں آیا ہے، یعنی وہ یہ گمان کرتا ہے، کہ اس کے اموال نے اسے ایک جاودانی اور دائمی موجود بنا دیا ہے، نہ تو موت اس کے پاس پھٹک سکتی ہے، اور نہ ہی بیماریاں اور دنیا کے حوادث اس کے لیے کوئی مشکل پیدا کر سکتے ہیں، کیونکہ اس کی نظر میں مشکل کشا صرف مال و دولت ہے، اور یہ مشکل کشا اس کے پاس حاضر ہے۔

یہ تصور کتنا غلط اور خام خیالی ہے؛ اس قدر مال و دولت جو قارون کے قبضہ و اختیار میں تھا، کہ اس کے خزانوں کی چابیاں کئی طاقتور مرد بڑی مشکل سے اٹھا سکتے تھے، لیکن عذاب الٰہی کے حملہ کے وقت وہ اس کی موت کو ایک گھڑی کے لیے مؤخر نہ کر سکے اور خدا نے اسے اور اس کے خزانوں کو ایک ہی لمحہ میں مختصر سے زلزلہ کے ساتھ زمین میں دھنسا دیا": فخسفنا بہ و بدارہ الارض (قصص - ۸۱)

وہ اموال جن کا کامل نمونہ فراعنہ مصر کے پاس تھا، لیکن بمصداق "کم ترکوا من جنات وعیون و زروع و مقام کریم و نعمۃ کانوا فیھا فاکھین": "وہ کتنے زیادہ باغات اور چشمے کھیتیاں اور عمدہ و قیمتی محلات، اور دوسری فراواں نعمتیں جن میں وہ ناز و نعمت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے، اپنے پیچھے چھوڑ گئے" (دخان - ۲۵ تا ۲۷) لیکن یہ سب کے سب آسانی کے ساتھ ایک ہی ساعت میں دوسروں کے ہاتھ میں پہنچ گئے؛ "کذالک و اورثناھا قوما اخرین" (دخان - ۲۸)

اور اسی لیے کیونکہ قیامت میں پردے ہٹ جائیں گے، اور انہیں اپنی عظیم غلطی کا علم ہو جائے گا، تو وہ پکار اٹھیں گے: ما اغنیٰ عنی مالیہ ھلک عنی سلطانیہ: "میرے مال و دولت نے مجھے ہرگز بے نیاز نہیں کیا، اور میری قدرت طاقت و اقتدار بھی میرے پاس نہ رہے۔ (حاقہ - ۲۸ - ۲۹)

اصولی طور پر انسان فنا و نیستی سے متنفر ہے۔ اور وہ ہمیشگی اور دوام کا طرف دار ہے، اور یہی اندرونی لگاؤ ہماری معاد کے مباحث میں مدد کرتا ہے کہ ہم یہ جان لیں کہ انسان ہمیشگی اور دوام کے لیے پیدا ہوا ہے، ورنہ جاوداں ہونے کے ساتھ لگاؤ کی فطری خواہش اس میں نہ ہوتی۔

لیکن یہ مغرور و خود غرض اور دنیا پرست انسان اپنی ہمیشگی کو ایسے امور میں سمجھنے لگتا ہے جو ٹھیک اس کی فنا و نیستی کا

---

[1] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۶۶۸ حدیث ۷

[2] "مالہ" ممکن ہے کہ "مال" ضمیر غائب کی طرف مضاف ہو، یا "ما" موصولہ اور اس کے صلہ سے مرکب ہو، "اخلدہ" کا جملہ جو کہ فعل ماضی ہے مضارع کے معنی میں ہے۔ یا خلود کے موجبات و اسباب کے معنی میں ہے۔

سبب ہیں، مثلاً وہ مال و مقام کو، جو عام طور پر اس کی بقا کے دشمن ہیں، "دوام کا ذریعہ شمار کرنے لگتا ہے۔

اس بیان سے واضح ہوگیا کہ مال کے ذریعے دوام اور ہمیشگی کا تصور، مال کے جمع کرنے کی ایک دلیل ہے۔ اور ان دل کے اندھوں کی نظر میں مال کا جمع ہو جانا بھی دوسروں پر استہزاء اور تمسخر کرنے کا ایک عامل شمار ہوتا ہے۔

قرآن اس گروہ کے جواب میں فرماتا ہے: ایسا نہیں ہے جیسا کہ وہ گمان کرتا ہے۔ (کلا)۔

بلکہ وہ عنقریب انتہائی ذلت و خواری کے ساتھ پاش پاش کرنے والی آگ میں پھینک دیے جائیں گے"۔ (لینبذن فی الحطمۃ)۔

اس کے بعد حطمہ کی اس طرح تفسیر کرتا ہے: "اور تو کیا جانے کہ حطمہ کیا ہے" (وما ادراک ما الحطمۃ)۔

"وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے"۔ (نار اللہ الموقدۃ)۔

"وہ آگ جو دلوں سے نکلے گی اور اس کے ابتدائی شعلے دلوں میں ظاہر ہوں گے"۔ (التی تطلع علی الافئدۃ)

"لینبذن" "نبذ" (بروزن سبز) کے مادہ سے "مفردات" میں "راغب" کے قول کے مطابق، اصل میں کسی چیز کو اس کی حقارت اور بے قدری کی وجہ سے دُور پھینکنے کے معنی میں ہے۔

یعنی خدا ان مغرور، خود خواہ، اپنے آپ کو بڑا سمجھنے والوں کو اس دن ذلیل اور بے قدر و قیمت موجودات کی صورت میں جہنم کی آگ میں پھینکے گا، تاکہ وہ اپنے کبر و غرور کا نتیجہ دیکھ لیں۔

"حطمہ" "حطم" کے مادہ سے مبالغہ کا صیغہ ہے جو کسی چیز کو درہم برہم کرنے کے معنی میں ہے، اور یہ اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ بڑی سختی کے ساتھ ان کے اعضاء و جوارح کو توڑ کر رکھ دے گی، لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ "حطمہ" ساری جہنم کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کے حد سے زیادہ گرم اور بھڑکتے ہوئے حصّہ کا نام ہے[1]۔

اس معنی کو سمجھنا کہ آگ جلانے کی بجائے اعضا کو توڑ دے گی، شاید گزشتہ زمانوں میں تو مشکل ہو، لیکن موجودہ زمانہ میں بم کے پھٹنے کی لہروں کی تاثیر کی شدت کا مسئلہ ہم سب پر واضح ہو چکا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک خوفناک بم کے پھٹنے سے پیدا ہونے والی لہریں، نہ صرف انسانوں کو بلکہ لوہے کے محکم گارڈروں اور عمارتوں کے بڑے بڑے ستونوں کو بھی توڑ دیتی ہیں، یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔

"نار اللہ" (خدائی آگ) کی تعبیر اس کی عظمت کی دلیل ہے اور "موقدۃ" کی تعبیر اس کے ہمیشہ کے لیے روشن ہونے کی دلیل ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ آگ دُنیا کی آگ کے برخلاف، جو پہلے چمڑے کو جلاتی ہے، اور اس کے بعد بدن کے اندر نفوذ کرتی ہے، سب سے پہلے دلوں میں شعلہ ور ہوگی اور اندر کو جلائے گی۔ پہلے دل کو جلائے گی پھر دماغ اور ہڈیوں کو اور اس کے بعد باہر کی طرف سرایت کرے گی۔

یہ کس قسم کی آگ ہے جس کا پہلا شعلہ انسان کے دل میں ظاہر ہوگا؟ یہ کیسی آگ ہے جو باطن کو ظاہر سے پہلے جلائے گی؟ قیامت کی ہر چیز عجیب و غریب ہے اور اس کا اس جہان کی باتوں کے ساتھ بہت زیادہ فرق ہے، یہاں تک کہ اس کی جلانے

---

[1] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۶۷۱، ۱۹ حدیث ۶۰، ۶۲

والی آگ کی گرفت میں بھی ایک الگ خاصیت ہے۔

ایسا کیوں نہ ہو ؟ جب کہ ان کے دل ہی تو کفر اور کبر و نخوت کا مرکز تھے ، اور وہ حُبِّ دنیا اور مال و دولت کی محبت کا محور بنے ہوئے تھے ۔

خدا کے قہر و غضب کی آگ ہر چیز سے پہلے ان کے دلوں پر کیوں مسلط نہ ہو ، جب کہ انہوں نے اس دنیا میں مومنین کے دل کو تمسخر ، عیب جوئی ، غیبت اور تحقیر و تذلیل کے ساتھ جلایا تھا ۔ لہٰذا عدالتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنے اعمال جیسا ہی کیفرِ کردار دیکھیں ۔

اس سُورہ کی آخری آیت میں فرماتا ہے : " یہ جلانے والی آگ ان پر دروازہ بند صُورت میں ہوگی " (انها عليهم مؤصدة) ۔
مؤصدة " ایصاد " کے مادہ سے ، دروازہ بند کرنے اور اس کو محکم کرنے کے معنی میں ہے ، اسی لیے ان کمروں کو جو پہاڑوں کے اندر اموال جمع کرنے کے لیے بناتے ہیں " وصید " کہتے تھے ۔

حقیقت میں جیسا کہ وہ اپنے اموال کو مضبوط صندوقوں اور دربست خزانوں میں محفوظ کرکے رکھا کرتے تھے ، خدا بھی انہیں دوزخ کے دربست عذاب میں ، جس سے خلاصی اور نجات پانے کی کوئی راہ نہ ہوگی ، قید کرے گا ۔

اور آخر میں فرماتا ہے :

" انہیں کھینچے ہوئے اور طولانی ستونوں میں رکھا جائے گا " (فی عمد ممددة) ۔

" عمد " " عمود " جیسا کہ لکڑی اور لوہے کے قطعات (شہتیر) ہوتے ہیں ، اور " ممددة " کھینچے ہوئے اور طولانی کے معنی میں ہے ۔

مفسرین کی ایک جماعت نے اس تعبیر کو لوہے کی بڑی بڑی میخوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے ، جن کے ساتھ جہنم کے دروازے محکم طور پر جڑے ہوئے ہوں گے ، اس طرح کہ ان سے نکلنے کی بالکل کوئی راہ نہ ہوگی ۔ اس بنا پر یہ گزشتہ آیت پر ایک تاکید ہے جو یہ کہتی ہے کہ جہنم کے دروازوں کو ان پر بند کر دیں گے ، اور وہ ہر طرف سے محصور ہو کر رہ جائیں گے ۔

بعض نے اسے عذاب و مجازات کے وسائل کی ایک قسم کی طرف بھی اشارہ سمجھا ہے ، اس چیز کے مانند جو ہمارے ملک " ہتھکڑی اور بیڑی " کے ساتھ معروف ہے ، اور وہ لکڑی یا لوہے کا ایک وزنی ٹکڑا ہوتا ہے جس میں پاؤں کے ناپ کے برابر دو سُوراخ ہوتے ہیں ، اس میں پاؤں کو رکھ دیتے ہیں اور اس کے اوپر کے سُوراخ سے پکڑ کر اس میں تالہ لگا دیتے ہیں ۔ اس طرح اس آدمی میں چلنے کی طاقت نہیں رہتی تھی ، اور یہ ان شکنجوں کی سزا ہوگی جو وہ بے گناہ لوگوں کو دیا کرتے تھے ۔

بعض نے ایک تیسری تفسیر بھی آخری انکشافات کی مدد سے اس کے لیے بیان کی ہے ۔ اور وہ یہ ہے کہ جہنم کے جلانے والے شعلے کشیدہ اور طولانی ستونوں کی طرح ان پر مسلط ہو جائیں گے ۔ وہ کہتے ہیں کہ آخری انکشافات میں یہ ثابت ہوا ہے کہ ایکسرے (رونتگن) کی مخصوص شعاعیں ، دوسری شعاعوں کے برخلاف جو مخروطی صُورت میں پھیلتی ہیں ، وہ استوانی صُورت میں ٹھیک ستون کی طرح منتشر ہوتی ہیں ، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ شعاعیں انسان کے سارے وجود میں نفوذ کر جاتی ہیں ، یہاں تک کہ اس کے دل پر بھی مسلط ہو جاتی ہیں ، اور اسی بنا پر داخلی اعضاء کا ایکسرے لینے کے لیے اس سے استفادہ کرتے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ سے

ایسی شعاعیں اٹھیں گی جو اُوپر والی شعاعوں سے ملتی جلتی ہوں گی۔[1]

لیکن ان تفاسیر میں سب سے زیادہ مناسب وہی پہلی تفسیر ہے۔ (البتہ ان تفاسیر میں بعض کی بنا پر "فی عمد ممددۃ" کا جملہ دوزخ کی حالت کو بیان کرتا ہے اور دوسری بعض کی بنا پر دوزخیوں کی حالت کو)

چند نکات

۱۔ کبر و غرور بڑے بڑے گناہوں کا سرچشمہ ہے

"اپنے آپ کو بڑا خیال کرنا ایسی عظیم بلا ہے جو بہت سے گناہوں کی اصل اور بنیاد قرار پاتی ہے۔ خدا سے غفلت، نعمتوں کا کفران، عیاشی اور ہوس بازی میں غرق ہونا، دوسروں کی تحقیر و تذلیل، مومنین کا مذاق اُڑانا اسی صفتِ رذیلہ کے منحوس اور بُرے اثرات ہیں۔ کم ظرف لوگ جب کسی مقام و منصب یا کسی اچھی منزل پر پہنچ جاتے ہیں تو وہ ایسے کبر و غرور میں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ کسی دوسرے کے لیے کسی قدر و قیمت کے قائل ہی نہیں ہوتے۔ اور یہی چیز ان کے معاشرے سے جُدا ہونے اور معاشرے کے ان سے الگ ہونے کا سبب بن جاتی ہے۔

وہ اپنے ہی تصورات و خیالات کی دنیا میں ڈوبے رہتے ہیں اور خود کو باقیوں سے علیحدہ کوئی اور مخلوق خیال کرنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ اپنے آپ کو مقربانِ خدا میں بھی شمار کرنے لگتے ہیں، اور اسی وجہ سے دوسروں کی عزت و آبرو بلکہ ان کی جان تک بھی ان کی نظر میں بے قدر و قیمت ہو جاتی ہے، اور وہ "ہمزہ" و "لمزہ" یا دوسروں کی عیب جوئی اور مذمت میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اور یوں اپنے خیال میں وہ اپنی عظمت میں اضافہ کرتے ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بعض روایات میں اس قسم کے افراد کو عقرب (بچھو) سے تشبیہ دی گئی ہے، اور اگرچہ بچھو کا ڈنک مارنا کسی کینہ کی وجہ سے نہیں ہوتا، لیکن ان کا ڈنک مارنا کینہ پروری کی وجہ سے ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"میں نے شبِ معراج دوزخیوں کے ایک گروہ کو دیکھا کہ ان کے پہلوؤں سے گوشت الگ کرکے انہیں کھلاتے تھے۔ میں نے جبرئیل سے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ تو انہوں نے کہا:

"ھٰؤلاء الھمازون من امتك، اللمازون!":

"یہ آپ کی اُمت میں سے عیب جوئی کرنے والے اور استہزا کرنے والے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے اُوپر اشارہ کیا ہے، ہم نے سورہ حجرات کی آیات کے ذیل میں اس سلسلہ میں تفصیلی بحث کی ہے۔

---

[1] "طنطاوی" زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

۲۔ مال جمع کرنے کی حرص

مال و دولت کے بارے میں افراط و تفریط کے لحاظ سے مختلف نظریے پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ تو اس کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اُسے تمام مشکلات کا حل سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس نظریہ کے طرف داروں نے اپنے اشعار میں اس سلسلہ میں خوب دادِ سخن دی ہے، منجملہ ایک شاعر عرب کہتا ہے:

" فصاحة سحبان و خط ابن مقلة

وحكمة لقمان وزهد بن ادهم

اذا اجتمعت فى المرء والمرء مفلس

فليس له قدر بمقدار درهم"

"(عرب کے معروف فصیح) "سحبان کی فصاحت" اور (معروف خطاط) "ابن مقلہ" کا خط اور "لقمان" کی حکمت اور "ابراہیم بن اُدھم" کا زہد اگر کسی انسان میں جمع ہو جائے اور مفلس و نادار ہو، تو اس کی قدر و قیمت ایک درہم کے برابر بھی نہیں ہوگی"!

لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے اگر یہ گروہ ہمیشہ مال جمع کرنے میں مشغول رہے اور ایک آن کے لیے بھی راحت و آرام سے نہ بیٹھے اور اس کے لیے کسی بھی قید و شرط کا قائل نہ ہو اور حلال و حرام ان کی نظر میں یکساں ہو جائے۔

اِس گروہ کے نقطۂ مقابل میں وہ گروہ ہے جو مال و دولت کے لیے کم سے کم قدر و قیمت کا بھی قائل نہیں ہے۔ وہ فقر و فاقہ کی تعریف کرتا ہے اور اس کی عظمت و بلندی کا قائل ہے، یہاں تک کہ وہ مال کو تقویٰ اور قربِ خدا میں مزاحم سمجھتے ہیں۔

لیکن ان دونوں نظریات کے مقابلہ میں (جو افراط و تفریط رکھتے ہیں) قرآن مجید اور اسلامی روایات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مال اچھی چیز ہے، لیکن چند شرائط کے ساتھ:

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ ذریعہ اور وسیلہ ہو نہ کہ ہدف اور مقصد۔

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنا "اسیر" نہ بنائے بلکہ انسان اس کا "امیر" ہو۔

تیسری شرط یہ ہے کہ اُسے مشروع اور حلال طریقہ سے حاصل کیا جائے اور وہ رضائے خدا کے لیے صرف ہو۔

اس قسم کے مال سے محبت نہ صرف یہ کہ وہ دنیا پرستی نہیں ہے، بلکہ آخرت سے محبت کی ایک دلیل ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے:

"جس وقت آپ نے ذہب و فضہ (سونا اور چاندی) پر لعنت کی، تو آپ کے ایک صحابی نے تعجب کیا، اور اس بارے میں سوال کیا تو امامؑ نے فرمایا:

" ليس حيث تذهب اليه انما الذهب الذى ذهب بالدين والفضة التى افاضت الكفر":

"(ذھب) سونے سے مراد وہ چیز ہے جو دین کو ختم کر دے اور فضہ (چاندی) سے
مراد وہ چیز ہے جو کفر و بے ایمانی کا سرچشمہ بنے"۔[1]

ایک اور حدیث میں حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے آیا ہے:

"السکر اربع سکرات سکر الشراب وسکر المال، وسکر النوم، وسکر الملک"۔

"نشہ اور مستی چار قسم کی ہوتی ہے:
۱۔ شراب کی مستی۔ ۲۔ مال کی مستی۔ ۳۔ نیند کی مستی۔ ۴۔ اقتدار کی مستی"![2]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا، میرے ماں باپ آپ پر قربان، مجھے کچھ وعظ و نصیحت فرمائیے، تو آپ نے فرمایا:

"ان کان الحسنات حقًّا فالجمع لماذا؟ وان کان الخلف من الله عزوجل حقًّا فالبخل لماذا؟!"۔

"اگر حسنات حق ہیں اور ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں تو پھر مال کا جمع کرنا کس لیے؟ (کیوں اُسے راہِ خدا میں خرچ نہ کریں) اور اگر بدلہ دینا اور تلافی کرنا اللہ کی طرف سے حق ہے، تو پھر بخل کس لیے؟"[3]

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو آخر عمر تک مال جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں اور انجام کار دوسروں کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کا حساب تو انہیں دینا پڑے گا اور اس سے فائدہ دوسرے لوگ اٹھائیں گے۔ اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ لوگوں نے امیرالمومنین علیؑ سے سوال کیا، من اعظم الناس حسرۃ؟: لوگوں میں سب سے زیادہ حسرت و ندامت کس کو ہوگی؟ آپؑ نے فرمایا:

"من رأی مالہ فی میزان غیرہ وادخلہ اللہ بہ النار وادخل وارثہ بہ الجنۃ"

"وہ شخص جو اپنے اموال کو دوسروں کے اعمال تولنے کی ترازو میں دیکھے، خدا اُسے تو اس کے اموال کی وجہ سے دوزخ میں داخل کرے، اور اس کے وارث کو اس کی وجہ سے جنت میں داخل کرے"۔[4]

---

[1] "بحارالانوار" جلد ۷۳، ص ۱۴۱ حدیث ۱۷

[2] "بحارالانوار" جلد ۷۳، ص ۱۴۲

[3] "توحید صدوق" مطابق نقل "نورالثقلین" جلد ۵ ص ۶۶۸ حدیث ۸۔

[4] "بحارالانوار" جلد ۷۳ ص ۱۴۲

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے آیہ " کذالک یریھم اللہ اعمالھم حسرات علیھم "، (اسی طرح سے خدا ان کے اعمال کو ان کے لیے حسرت بنا دے گا) کی تفسیر میں فرمایا :

" ھو الرجل یدع المال لا ینفقہ فی طاعۃ اللہ بخلا ثم یموت فیدعہ لمن یعمل بہ فی طاعۃ اللہ او فی معصیتہ "

" یہ اس شخص کے بارے میں ہے جو مال چھوڑ جاتا ہے اور بخل کی وجہ سے اُسے راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتا۔ پھر وہ مرجاتا ہے، اور اُسے ایسے شخص کے لیے چھوڑ جاتا ہے جو اُسے اللہ کی اطاعت یا اس کی معصیت میں خرچ کرتا ہے "

اس کے بعد امام نے مزید فرمایا :

" اگر وہ خدا کی اطاعت میں خرچ کرے گا تو وہ اُسے دوسرے کی میزانِ عمل میں دیکھ کر حسرت کرے گا کیونکہ وہ مال تو اس کی ملکیت تھا، اور اگر وہ خدا کی معصیت و نافرمانی میں صَرف کرے گا، تو وہ گناہ کرنے میں اس کی تقویت کا سبب بنا۔ (اس پر بھی اُسے عقوبت اور حسرت ہوگی) [1]

ہاں ! انسان مال کو مختلف انداز میں استعمال کرتے ہیں، کبھی تو اس سے ایک خطرناک بُت بنا لیتے ہیں، اور کبھی عظیم سعادت کا وسیلہ۔

اس گفتگو کو ہم " ابن عباسؓ سے منقول ایک پُرمعنی حدیث پر ختم کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں :

" ان اول درھم و دینار ضربا فی الارض نظر الیھما ابلیس فلما عاینھما اخذھما فوضعھما علی عینیہ، ثم ضمھما علی صدرہ، ثم صرخ صرخۃ، ثم ضمھما الی صدرہ، ثم قال : انتما قرۃ عینی ! و ثمرۃ فؤادی ما ابالی من بنی ادم اذا احبوکما ان لا یعبدوا و ثنا ! حسبی من بنی ادم ان یحبوکما " : [2]

" جب دُنیا میں درہم و دینار کا سب سے پہلا سکہ بنایا گیا تو ابلیس نے اُن پر نگاہ کی، جب انہیں دیکھا تو اس نے ان دونوں کو اُٹھا لیا اور دونوں کو اپنی آنکھوں پر رکھا، پھر انہیں سینہ سے لگا لیا۔ پھر وہ والہانہ طور پر چیخا اور دوبارہ انہیں سینہ سے لگا لیا اور کہنے لگا : تم (اے درہم و دینار) میری آنکھوں

---

[1] وہی مدرک حدیث ۲۰

۲ [illegible] ۱۳ حدیث ۱۳

کی روشنی ہو، تم میرے دل کا میوہ ہو۔ اگر انسان تمہیں دوست بنالیں تو پھر میرے لیے یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ وہ بُت پرستی نہ کریں۔ بس میرے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ تم سے محبت کرنے لگیں، (کیونکہ تم سب بتوں سے بڑھ کر بُت ہو)۔[1]

خداوندا! ہمیں مال و غضب، دنیا و شہوات کی مستی سے محفوظ فرما۔

پروردگارا! ہمیں شیطان کے تسلط اور درہم و دینار کی بندگی سے رہائی عطا فرما۔

بار الٰہا! جہنم کی آگ سخت توڑنے والی ہے اور تیرے لطف و کرم کے بغیر اس سے نجات ممکن نہیں ہے۔ ہمیں اپنے لطف کا مشمول قرار دے۔

آمین یارب العالمین

سُورۂ ھُمزہ کا اختتام

---

[1] وہی مدرک ص ۱۳۷۔ حدیث ۳

سُورَہ اَلفِیل

- یہ سُورہ مکہ میں نازل ہوا
- اِس میں ۵ آیات ہیں۔

سورۂ "فیل" کے مطالب اور اس کی فضیلت

یہ سورہ ـــ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے ـــ ایک مشہور تاریخی داستان کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے سال واقع ہوئی تھی اور خدا نے خانہ "کعبہ" کو کفار کے اس عظیم لشکر کے شر سے محفوظ رکھا تھا، جو سرزمین یمن سے ہاتھیوں پر سوار ہو کر آیا تھا۔

یہ سورہ اس عجیب داستان کی یاد دلاتا ہے جو مکہ کے بہت سے لوگوں کو یاد تھی، کیونکہ وہ ماضی قریب میں ہی واقع ہوئی تھی۔

اس داستان کی یادآوری مغرور اور ہٹ دھرم کفار کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ وہ یہ جان لیں کہ وہ خدا کی قدرت کے مقابلہ میں کچھ بھی قدرت نہیں رکھتے۔ وہ خدا جس نے ہاتھیوں کے اس عظیم لشکر کو ان چھوٹے چھوٹے پرندوں اور ان نیم بند کنکریوں (حجارۃ من سجیل) سے ریزہ ریزہ کر دیا۔ وہ ان ہٹ دھرم متکبرین کو سزا دینے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

نہ تو ان کی قدرت ہی "ابرھہ" کی قدرت سے زیادہ تھی اور نہ ہی ان کے لشکر اور افراد کی تعداد کبھی اس حد تک پہنچی تھی۔ یعنی تم لوگ جنہوں نے اس واقعہ کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے، غرور و تکبر کی سواری سے نیچے کیوں نہیں اُترتے؟

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے:

"جو شخص سورہ فیل کو نماز واجب میں پڑھے گا قیامت میں ہر پہاڑ اور ہموار زمین اور ہر ڈھیلہ اس کی گواہی دے گا کہ وہ نماز گزاروں میں سے ہے اور ایک منادی ندا دے گا کہ تم نے میرے بندے کے بارے میں سچ کہا ہے میں تمہاری گواہی کو اس کے نفع یا نقصان میں قبول کرتا ہوں۔ میرے بندے کو حساب کے بغیر جنت میں داخل کر دو، کیونکہ

وہ ایسا شخص ہے جسے میں دوست رکھتا ہوں اور اس کے عمل کو بھی دوست رکھتا ہوں۔[1]

یہ بات واضح اور ظاہر ہے کہ یہ سب فضیلت و ثواب اور عظیم جزا اس شخص کے لیے ہے جو ان آیات کو پڑھ کر غرور و تکبر کی سواری سے نیچے اُتر آئے اور رضائے الٰہی کی راہ میں قدم رکھ دے۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۳۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ؕ

۲۔ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۙ

۳۔ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۙ

۴۔ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ

۵۔ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۧ

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ کیا تُو نے دیکھا نہیں کہ تیرے پروردگار نے اصحابِ فیل (ابرہہ کے لشکر کو جو کعبہ کو نابُود کرنے کے ارادے سے آیا تھا) کے ساتھ کیا کیا۔

۲۔ کیا ان کے منصوبہ کو خاک میں نہیں مِلا دیا؟

۳۔ اور ان کے اُوپر گروہ در گروہ پرندے بھیجے۔

۴۔ جو اُن کے اُوپر چھوٹی چھوٹی کنکریاں برسا رہے تھے۔

۵۔ اور اس طرح انہیں کھائے ہُوئے بھوسہ کی مانند بنا دیا۔

شانِ نزول

ایک حدیث میں امام علی بن الحسین علیہ السلام سے آیا ہے کہ :

"ابو طالبؑ ہمیشہ اپنی تلوار کے ذریعے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ فرماتے ہیں : (ایک دن) ابو طالب نے کہا :
اے بھتیجے! کیا آپ سب لوگوں کے لیے مبعوث ہوئے ہیں یا صرف اپنی قوم کے لیے بھیجے گئے ہیں؟"

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، "نہیں! میں تمام انسانوں کے لیے مبعوث ہوا ہوں، وہ گورا ہو یا کالا، عربی ہو یا عجمی۔ اسی ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، میں تمام انسانوں کو چاہے وہ گورے ہوں یا کالے اس دین کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ اور ان تمام لوگوں کو جو پہاڑوں کی چوٹی پر بستے ہیں یا دریاؤں میں رہتے ہیں اس دین کی طرف بلاتا ہوں، اور میں فارس و روم کی تمام زبانوں کو دعوت دیتا ہوں۔

جب یہ گفتگو قریش کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے تعجب کیا اور کہا، کیا آپ اپنے بھتیجے کی باتوں کو نہیں سنتے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ خدا کی قسم اگر فارس و روم کے لوگ یہ بات سن لیں گے تو ہمیں ہماری سرزمین سے باہر نکال کھڑا کریں گے اور خانہ کعبہ کے پتھروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے الگ الگ کر دیں گے۔ اس موقع پر خدا نے آیہ شریفہ و قالوا ان نتبع الھدٰی معک نتخطف من ارضنا اولم نمکن لھم حرمًا امنًا یجبٰی الیہ ثمرات کل شیء : "انہوں نے کہا: اگر ہم تیرے ساتھ مل کر ہدایت کو قبول کر لیں تو ہمیں ہماری سرزمین سے باہر نکال دیں گے، کیا ہم نے انہیں، امن کے اس حرم میں، جس کی طرف ہر طرح کے پھل لاتے ہیں، جگہ نہیں دی" (قصص - ۵۷) نازل ہوئی۔

اور ان کے اس قول کے بارے میں کہ وہ خانہ کعبہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے سورۂ فیل نازل کی۔ (اور انہیں گوش گزار کیا کہ کوئی شخص بھی اس قسم کے کام کی قدرت نہیں رکھتا)[1]۔

اصحابِ فیل کی داستان

مفسرین اور مورخین نے اس داستان کو مختلف صورتوں میں نقل کیا ہے۔ اور اس کے وقوع کے سال میں بھی اختلاف ہے لیکن اصل داستان ایسی مشہور ہے کہ یہ اخبار متواتر میں شمار ہوتی ہے۔ اور ہم اسے مشہور روایات کے مطابق "سیرۃ ابن ہشام" و "بلوغ الارب" و "بحار الانوار" و "مجمع البیان" سے خلاصہ کر کے نقل کرتے ہیں۔

یمن کے بادشاہ "ذونواس" نے نجران کے عیسائیوں کو جو اس سرزمین کے نزدیک بستے تھے، اس لیے بہت تنگ کر رکھا تھا کہ وہ اپنا دین مسیحیت چھوڑ دیں۔ قرآن نے اس واقعہ کو سورۂ "بروج" میں اصحاب الاخدود کے عنوان سے بیان کیا ہے

---

[1] "روضۃ الواعظین" (مطابق نقل "نورالثقلین" جلد ۵ ص ۶۶۹ حدیث ۸)

اور ہم نے اسے اسی سُورہ کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اس عظیم جُرم کے بعد " دوس " نامی ایک شخص ان میں سے اپنی جان بچا کر نکل گیا اور وہ قیصر روم کے پاس، جو دینِ مسیحیت پر تھا، جا پہنچا، اور اس کے سامنے یہ سارا ماجرا بیان کیا۔

چونکہ " روم " اور " یمن " کے درمیان فاصلہ زیادہ تھا لہٰذا اس نے حبشہ کے بادشاہ " نجاشی " کو خط لکھا کہ وہ " ذونواس " سے نصارائے نجران کا انتقام لے، اور اس خط کو اسی شخص کے ہاتھ " نجاشی " کے پاس روانہ کیا۔

" نجاشی " نے ایک بہت بڑا لشکر جو ستر ہزار افراد سے زیادہ پر مشتمل تھا " ارياط " نامی شخص کی کمان میں یمن کی طرف روانہ کیا۔ " ابرھہ " بھی اس لشکر کے افسروں میں سے ایک تھا۔

" ذونواس " کو شکست ہوئی، اور " ارياط " یمن کا حکمران ہوگیا۔ کچھ مدت کے بعد " ابرھہ " نے ارياط کے خلاف بغاوت کر دی، اور اس کا خاتمہ کرنے کے بعد اس کی جگہ پر بیٹھ گیا۔

اس واقعہ کی نجاشی کو خبر پہنچی تو اس نے " ابرھہ " کی سرکوبی کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ ابرھہ نے اپنی نجات کے لیے اپنے سر کے بال منڈوا کر یمن کی کچھ مٹی کے ساتھ مکمل تسلیم کی نشانی کے طور پر نجاشی کے پاس بھیج دیے، اور وفاداری کا اعلان کیا۔ نجاشی نے جب یہ دیکھا تو ابرھہ کو معاف کر دیا، اور اُسے اس کے منصب پر برقرار رکھا۔

اس موقع پر " ابرھہ " نے اپنے حُسنِ خدمت کو ثابت کرنے کے لیے ایک اہم اور بہت ہی خوبصورت گرجا تعمیر کرایا، جس کی اس زمانہ میں کُرۂ زمین پر کوئی مثل و نظیر نہ تھی۔ اور اس کے بعد جزیرہ عرب کے لوگوں کو خانۂ کعبہ کی بجائے اس گرجے کی طرف دعوت دینے کا مصمم ارادہ کر لیا، اور یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ اس جگہ کو عرب کے حج کا مرکز بنا کر مکّہ کی اہم مرکزیت کو وہاں منتقل کر دے۔

اس مقصد کے لیے اس نے ہر طرف عرب کے قبائل اور سرزمین حجاز میں بہت سے مبلّغ بھیجے۔ عربوں نے، جو مکّہ اور کعبہ کے ساتھ شدید لگاؤ رکھتے تھے اور اُسے ابراہیمؑ خلیل کے آثار میں سے جانتے تھے، اس سے خطرہ محسوس کیا۔

بعض روایات کے مطابق ایک گروہ نے وہاں جا کر مخفی طور پر اس گرجے کو آگ لگا دی، اور دوسری روایت کے مطابق بعض نے اُسے مخفی طور پر گندہ اور ملوث کر دیا۔ اور اس طرح سے انہوں نے اس عظیم دعوت کے مقابلہ میں شدید ردِّ عمل کا مظاہرہ کیا، اور " ابرھہ " کے عبادت خانے کو بے اعتبار اور حقیر بنا دیا۔

ظاہر ہے اس پر " ابرھہ " کو بہت غصّہ آیا اور اس نے خانۂ کعبہ کو کلّی طور پر ویران کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ اُس کا خیال تھا اس طرح وہ انتقام بھی لے لے گا اور عربوں کو نئے معبد کی طرف متوجہ بھی کر دے گا۔ چنانچہ وہ ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ، جن میں سے کچھ لوگ ہاتھیوں پر سوار تھے، مکّہ کی طرف روانہ ہوا۔

جب وہ مکّہ کے قریب پہنچا تو اُس نے کچھ لوگوں کو مکّہ والوں کے اُونٹ اور دوسرے اموال لوٹنے کے لیے بھیجا۔ ان میں سے دو سو اُونٹ " عبدالمطلبؑ " کے بھی لُوٹ لیے گئے۔

" ابرھہ " نے کسی آدمی کو مکّہ کے اندر بھیجا اور اس سے کہا کہ رئیس مکّہ کو تلاش کر کے اس سے کہنا کہ " ابرھہ "

یمن کا بادشاہ کہتا ہے کہ : میں جنگ کرنے کے لیے نہیں آیا۔ میں تو صرف اس لیے آیا ہوں کہ اس خانہ کعبہ کو ویران کردوں۔ اگر تم جنگ نہ کرو تو مجھے تمہارا خون بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔

" ابرھہ " کا قاصد مکہ میں داخل ہوا اور رئیس و شریف مکہ کے بارے میں دریافت کیا۔ سب نے "عبدالمطلب" کی طرف راہنمائی کی۔ اس نے " عبدالمطلب " کے سامنے ماجرا بیان کیا۔ " عبدالمطلب " نے بھی یہی جواب دیا کہ ہم میں تم سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں ہے، رہا خانہ کعبہ تو خدا خود اس کی حفاظت کرے گا۔

" ابرھہ " کے قاصد نے عبدالمطلب سے کہا کہ تمہیں میرے ساتھ اس کے پاس چلنا پڑے گا۔ جب عبدالمطلب اس کے دربار میں داخل ہوئے تو وہ آپ کے بلند قد، حسین چہرے اور حد سے زیادہ رُعب اور دبدبہ کو دیکھ کر سخت متاثر ہوا، یہاں تک کہ " ابرھہ " ان کے احترام میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور زمین پر بیٹھ گیا اور " عبدالمطلب " کو اپنے پہلو میں بٹھالیا، کیونکہ وُہ نہیں چاہتا تھا کہ انہیں اپنے ساتھ تخت پر بٹھائے۔ اس کے بعد اس نے اپنے مترجم سے کہا کہ ان سے پُوچھ کہ ان کی کیا حاجت ہے ؟

آپ نے مترجم سے کہا : میری حاجت یہ ہے کہ میرے دو سو اُونٹ تیرے لشکری لُوٹ کرلے گئے ہیں، تو انہیں حکم دے کہ وہ میرا مال واپس کردیں۔

" ابرھہ " کو ان کے اس مطالبہ پر سخت تعجب ہوا اور اس نے اپنے مترجم سے کہا : ان سے کہو : جب مَیں نے تمہیں دیکھا تھا، تو میرے دل میں تمہاری بہت زیادہ عظمت پیدا ہوئی تھی، لیکن جب سے یہ بات کہی تو میری نظر میں تمہاری توقیر گھٹ گئی۔ تم اپنے دو سو اُونٹوں کے بارے میں تو بات کرتے ہو لیکن " کعبہ " کے بارے میں جو تمہارا اور تمہارے آباؤ اجداد کا دین ہے، اور مَیں اُسے ویران کرنے کے لیے آیا ہوں، بالکل کوئی بات نہیں کرتے۔

" عبدالمطلب " نے کہا :

" انا رب الابل، وان للبیت ربا سیمنعہ "!

" مَیں اُونٹوں کا مالک ہوں، اور اس گھر کا بھی ایک مالک ہے، وہ اس کی حفاظت خُود کرے گا "۔

(اس بات نے ابرھہ کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ سوچ میں پڑگیا)۔

" عبدالمطلب " مکہ کی طرف آئے، اور لوگوں کو اطلاع دی کہ وہ پہاڑوں میں پناہ گزیں ہوجائیں۔ اور آپ خُود ایک گروہ کے ساتھ خانہ کعبہ کے پاس آئے تاکہ دُعا کریں اور مدد طلب کریں۔ آپ نے خانہ کعبہ کے دروازے کی زنجیر میں ہاتھ ڈال کر اپنے یہ مشہور اشعار پڑھے :

لاھم ان المرء یمنع رحلہ فامنع رحالک

لا یغلبن صلیبھم و محالھم ابدا محالک

جروا جمیع بلادهم والفیل کی یسبوا عیالك

لاهم ان المرء یمنع رحله فامنع عیالك

وانصر علی آل الصلیب وعابدیه الیوم آلك[1]

"خدایا ہر شخص اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے تو اپنے گھر کی حفاظت فرما۔"

ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی دن ان کی صلیب اور ان کی قدرت تیری قدرتوں پر غلبہ حاصل کرے۔"

اور اپنے شہروں کی تمام توانائیاں اور ہاتھی ساتھ لے کر آئے ہیں تاکہ تیرے حرم کے ساکنوں کو قیدی بنا لیں"۔

"خدایا ہر شخص اپنے گھر والوں کا دفاع کرتا ہے تو بھی اپنے حرم امن کے رہنے والوں کا دفاع کر؛

"اور آج اس حرم کے رہنے والوں کی آل صلیب اور اس کی عبادت کرنے والوں کے برخلاف مدد فرما۔"

اس کے بعد عبدالمطلب اطراف مکہ کے ایک درہ کی طرف آئے، قریش کی ایک جماعت کے ساتھ وہاں پناہ لی اور اپنے ایک بیٹے کو حکم دیا کہ وہ کوہ ابوقبیس کے اوپر جا کر دیکھے کہ کیا ہو رہا ہے۔

آپ کا بیٹا بڑی تیزی کے ساتھ آپ کے پاس آیا اور کہا: بابا جان! سمندر (دریائے احمر) کی طرف سے ایک سیاہ بادل آتا ہوا نظر آرہا ہے۔ عبدالمطلب خوش ہو گئے اور پکار کر کہا:

"یا معشر قریش! ادخلوا منازلکم فقد اتاکم الله بالنصر من عنده"

"اے جمیعت قریش اپنے گھروں کی طرف پلٹ جاؤ کیونکہ خدا کی نصرت تمہاری مدد کے لیے آرہی ہے۔ یہ تو اس طرف کی بات تھی"۔

دوسری طرف سے ابرہہ اپنے مشہور ہاتھی پر سوار جس کا نام "محمود" تھا، اپنے کثیر لشکر کے ساتھ کعبہ کو تباہ کرنے کے لیے اطراف کے پہاڑوں سے مکہ کی طرف اترا، لیکن وہ اپنے ہاتھی پر جتنا دباؤ ڈالتا تھا وہ آگے نہ بڑھتا تھا، لیکن جب وہ اس کا رخ یمن کی طرف کرتا تھا تو وہ فوراً چل پڑتا تھا۔ ابرہہ اس واقعہ سے سخت متعجب ہوا اور حیرت میں ڈوب گیا۔

اسی اثناء میں سمندر کی طرف سے غول کے غول اور جھنڈ کے جھنڈ چھوٹے چھوٹے پرندوں کے آن پہنچے، جن میں سے ہر ایک کے پاس تین تین کنکریاں تھیں، ایک ایک چونچ میں اور دو دو پنجوں میں، جو تقریباً چنے کے دانے کے برابر تھیں۔ انہوں نے یہ کنکریاں ابرہہ کے لشکر پر برسانی شروع کر دیں۔ یہ کنکریاں جس کسی کو لگتیں وہ ہلاک ہو جاتا۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ کنکریاں ان کے بدن پر جہاں بھی لگتیں سوراخ کر دیتی تھیں، اور دوسری طرف نکل جاتی تھیں۔

اس وقت ابرہہ کے لشکر پر ایک عجیب و غریب وحشت طاری ہو گئی۔ جو زندہ بچے وہ بھاگ کھڑے ہوئے، اور واپسی کے لیے

---

[1] مورخین و مفسرین نے اوپر والے اشعار کو مختلف طور پر نقل کیا ہے۔ جو کچھ اوپر نقل کیا گیا ہے وہ مختلف نقلوں کا مرکب خلاصہ ہے۔

یمن کی راہ پوچھتے تھے، لیکن مسلسل خزاں کے پتوں کی طرح سڑک کے بیچوں بیچ گر جاتے تھے۔
ایک پتھر خود "ابرہہ" کے آکر لگا اور وہ زخمی ہوگیا۔ اس کو صنعا (یمن کے پایۂ تخت) کی طرف واپس لے گئے اور وہ وہاں جاکر ہلاک ہوگیا۔
بعض نے کہا ہے کہ چیچک کی بیماری پہلی مرتبہ عرب میں اسی سال پھیلی تھی۔
ہاتھیوں کی تعداد جو ابرہہ اپنے ساتھ لے گیا تھا، بعض نے وہی "محمود" ہاتھی، بعض نے آٹھ، بعض نے دس اور بعض نے بارہ لکھی ہے۔
مشہور قول کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت اسی سال ہوئی اور عالم آپ کے نور وجود سے منور ہوگیا۔ لہٰذا بہت سے لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان دونوں واقعات کے درمیان ایک رابطہ موجود تھا۔
بہر حال اس عظیم حادثہ کی اس قدر اہمیت تھی کہ اس سال کا نام عام الفیل (ہاتھی کا سال) رکھا گیا اور یہ عربوں کی تاریخ کا مبداء قرار پایا۔[1]

تفسیر

"ابرہہ" سے کہہ دو کہ آنے میں جلدی نہ کرے

اس سورہ کی پہلی آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے اصحاب فیل کے ساتھ کیا کیا"؟ (الم تر کیف فعل ربک باصحاب الفیل)۔
وہ اپنی پوری قدرت و طاقت اور لشکر کے ساتھ آئے تھے تاکہ خانۂ خدا کو ویران و تباہ کر دیں اور خدا نے ایک ایسے لشکر کے ساتھ، جو بظاہر بہت ہی چھوٹا اور بے حیثیت تھا، انہیں درہم برہم کردیا۔ ہاتھیوں کو چھوٹے سے پرندوں کے ساتھ، اور اس زمانہ کے ترقی یافتہ اسلحہ کو "سجیل" پتھریلی کنکریوں کے ساتھ بیکار کردیا تاکہ اس مغرور و سرکش انسان کی کمزوری و ناتوانی کو قدرت الٰہی کے مقابلہ میں ظاہر و آشکار کرے۔
الم تر (کیا تُو نے نہیں دیکھا؟) کی تعبیر، حالانکہ یہ حادثہ ایسے زمانہ میں رونما ہوا تھا کہ پیغمبرؐ نے ابھی دُنیا میں آنکھ نہیں کھولی تھی، یا یہ آپ کی پیدائش سے قریب تر تھا، اسی وجہ سے مذکورہ حادثہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے بہت ہی نزدیک تھا، اس کے علاوہ یہ اتنا مشہور و معروف اور متواتر تھا کہ گویا پیغمبرؐ نے اپنی چشم مبارک سے اس کا مشاہدہ کیا ہوا تھا، اور پیغمبرؐ کے معاصرین میں سے ایک گروہ نے یقینی طور پر اُسے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔
"اصحاب الفیل" کی تعبیر انہیں چند ہاتھیوں کی وجہ سے ہے جنہیں وہ اپنے ساتھ یمن سے لائے تھے تاکہ مخالفین کو

---

[1] "سیرۃ ابن ہشام" جلد ۱ ص ۳۸ تا ۶۲ "بلوغ الارب" جلد ۱ ص ۲۵۰ تا ۲۶۳ "بحار الانوار" جلد ۱۵ ص ۱۳۰ سے آگے "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۴۲

مرعوب کریں، اور اُونٹ اور گھوڑے انہیں دیکھ کر بدک جائیں اور میدانِ جنگ میں نہ ٹھہر سکیں۔[1]

اس کے بعد مزید کہتا ہے : " کیا خدا نے ان کے منصوبہ کو خاک میں نہیں ملا دیا " (الم یجعل کیدھم فی تضلیل)۔

ان کا ارادہ یہ تھا کہ خانہ کعبہ کو تباہ کر ڈالیں تاکہ یمن کے گرجے کو مرکزیت حاصل ہو اور تمام قبائل عرب اس کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ لیکن وہ نہ صرف یہ کہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے بلکہ اس ماجرے نے ۔ جس کی شہرت تمام جزیرہ نمائے عرب میں پھیل گئی تھی ۔ مکّہ اور خانہ کعبہ کی عظمت کو اور چار چاند لگا دیے اور اس کے مشتاق دلوں کو پہلے سے بھی زیادہ اس کی طرف متوجہ کر دیا اور شہر کو اور بھی زیادہ پُر امن بنا دیا۔

" تضلیل " سے مراد ، جو راہی گمراہ کرنا ہے یہ ہے ، کہ وہ ہرگز اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے۔

اس کے بعد اس ماجرے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے : " خدا نے گروہ در گروہ پرندے ان کے سروں پر بھیج دیے "۔ (وارسل علیھم طیرًا ابابیل)۔

" ابابیل " لوگوں کی زبانوں پر جو کچھ مشہور ہے اس کے برخلاف یہ اس پرندے کا نام نہیں تھا ، بلکہ یہ وصفی معنی رکھتا ہے۔ بعض نے اسے (متفرق گروہوں) کے معنی میں سمجھا ہے ، اس معنی میں کہ مذکورہ پرندے گروہ در گروہ ہر طرف ہاتھیوں کے لشکر کی طرف آئے تھے۔

یہ لفظ جمع کے معنی دیتا ہے ، جس کا مفرد بعض نے " ابابلہ " یعنی پرندوں یا گھوڑوں یا اُونٹوں کا گروہ سمجھا ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک ایسی جمع ہے جس کی جنس کا مفرد نہیں ہے۔

بہر حال " طیر " یہاں جمع کا معنی دیتا ہے ، اور یہ دونوں الفاظ " طیر " و " ابابیل " مجموعی طور پر گروہ در گروہ پرندوں کے معنی میں ہے (ایسا نہیں ہے کہ ابابیل ان پرندوں کا نام ہو)۔

اس بارے میں کہ یہ پرندہ کون سا پرندہ تھا ۔ جیسا کہ ہم نے داستانوں کی تفصیل میں بیان کیا ہے ۔ مشہور یہ ہے کہ وہ پرندے کوّے یا چیل کی طرح کے پرندے تھے جو بحرِ احمر کی راہ سے اُٹھے تھے اور ہاتھیوں کے لشکر کی طرف آئے تھے۔

بعد والی آیت میں مزید فرماتا ہے : " ان پرندوں نے اس لشکر کو سجیل (پتھریلی مٹی) کے چھوٹے چھوٹے کنکروں سے نشانہ بنایا تھا "۔ (ترمیھم بحجارۃ من سجیل)[2]

اور جیسا کہ اس ماجرے کی تفصیل میں ہم نے تواریخ ، تفاسیر اور روایات سے نقل کیا ہے ، ان چھوٹے چھوٹے پرندوں میں سے ہر ایک نے چنے کے دانے کے برابر یا اس سے بھی چھوٹی چھوٹی کنکریاں اُٹھائی ہوئی تھیں ، ایک ایک کنکری چونچ میں اور دو دو اپنے پنجوں میں۔ اور یہ چھوٹی چھوٹی کنکریاں جس پر بھی پڑتی تھیں ، اسی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی تھیں۔

جیسا کہ بعد والی آیت میں فرماتا ہے : " انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی مانند بنا دیا "۔ (فجعلھم کعصف مأکول)۔

---

[1] " فیل " اگرچہ یہاں مفرد ہے ، لیکن جنس و جمع کا معنی رکھتا ہے۔

[2] " سجیل " فارسی کا لفظ ہے جو " سنگ " (پتھر) اور " گل " (مٹی) سے لیا گیا ہے ، اسی بنا پر وہ ایک ایسی چیز ہوتی ہے جو نہ پتھر کی طرح سخت ہو اور نہ مٹی کی طرح نرم۔

"عصف" (بروزن حذف) اُن پتوں کو کہتے ہیں جو زراعت کی شاخ پر ہوتے ہیں اور پھر خشک ہوکر ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ "گھاس" کے معنی میں ہے۔

اور بعض نے اس کی گندم کے اس چھلکے کے معنی میں تفسیر کی ہے، جب کہ وہ خوشہ میں ہوتا ہے۔

"مأکول" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ گھاس جانوروں کے دانتوں کے نیچے آکر دوبارہ پس جاتا ہے اور مکمل طور پر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ پھر جانور کے معدے نے بھی اُسے تیسری مرتبہ ریزہ ریزہ کیا ہے اور یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ سنگ ریزے جس کسی کو بھی جا کر لگتے تھے، اس کو مکمل طور پر ریزہ ریزہ کر دیتے تھے۔

یہ تعبیر ان کے شدت کے ساتھ پارہ پارہ ہونے کی دلیل قرار پانے کے علاوہ اس سرکش و مغرور اور ظاہراً طاقت ور گروہ اور جمعیت کے بے قدر و قیمت ہونے اور اس کے ضعف و ناتوانی کی طرف بھی اشارہ ہے۔

چند نکات

۱۔ ایک بے نظیر معجزہ (اس گھر کا ایک مالک ہے)

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس مفصل و طولانی داستان کو چند مختصر اور چبھنے والے انتہائی فصیح و بلیغ جملوں میں بیان کر دیا ہے۔ اور حقیقتاً ایسے نکات بیان کیے ہیں جو قرآنی اہداف، یعنی مغرور سرکشوں کو بیدار کرنے اور خدا کی عظیم قدرت کے مقابلہ میں انسان کی کمزوری دکھانے میں مدد دیتے ہیں۔

یہ ماجرا اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ معجزات و خوارق عادات، بعض لوگوں کے خیال کے برخلاف لازمی نہیں ہے کہ پیغمبر یا امام ہی کے ہاتھ پر ظاہر ہوں۔ بلکہ جن حالات میں خدا چاہے اور ضروری سمجھے انجام پا جاتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ خدا کی عظمت اور اس کے دین کی حقانیت سے آشنا ہو جائیں۔

یہ عجیب و غریب اعجاز آمیز عذاب دوسری سرکش اقوام کے عذاب کے ساتھ ایک واضح فرق رکھتا ہے۔ کیونکہ طوفانِ نوحؑ کا عذاب، اور قوم لوطؑ کا زلزلہ اور سنگ باری، قوم عاد کی تیز آندھی اور قوم ثمود کا صاعقہ طبعی حوادث کا ایک سلسلہ تھے، کہ جن کا صرف ان خاص حالات میں وقوع معجزہ تھا۔

لیکن لشکرِ ابرہہ کی نابودی کی داستان ان سنگریزوں کے ذریعے جو چھوٹے چھوٹے پرندوں کی چونچ اور پنجوں سے گرتے تھے۔ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو طبعی حوادث سے مشابہ ہو۔

ان چھوٹے چھوٹے پرندوں کا اُٹھنا، اسی خاص لشکر کی طرف آنا، اپنے ساتھ کنکریوں کا لانا، خاص طور سے اُنہیں کو نشانہ بنانا اور ان چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے ایک عظیم لشکر کے افراد کے اجسام کا ریزہ ریزہ ہوجانا، یہ سب کے سب خارق عادت امور ہیں، لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ خدا کی قدرت کے سامنے بہت ہی معمولی چیز ہے۔

وہی خدا جس نے انہیں سنگ ریزوں کے اندر ایٹم کی قدرت پیدا کی ہے، کہ اگر وہ آزاد ہو جائے تو ایک عظیم تباہی پھیلا دے۔

اس کے لیے یہ بات آسان ہے کہ ان کے اندر ایسی خاصیت پیدا کر دے کہ ابرہہ کے لشکر کے جسموں کو "عصف مأکول" (کھائے ہوئے بھوسے کی مانند) بنا دے۔

ہمیں بعض مصری مفسرین کی طرح اس حادثہ کی توجیہہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ان کنکریوں میں وبا یا چیچک کے جراثیم تھے۔[1]

اور اگر بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ صدمہ زدہ لوگوں کے بدنوں سے چیچک میں مبتلا افراد کی طرح خون اور پیپ آتی تھی، تو یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ حتمی طور پر چیچک میں مبتلا تھے۔

اسی طرح سے ہمیں اس بات کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ یہ سنگ ریزے پھسے ہوئے ایٹم تھے جن کے درمیان کی فضا ختم ہو گئی تھی۔ اور وہ حد سے زیادہ سخت تھے، اس طرح سے کہ وہ جہاں بھی گرتے تھے سوراخ کر دیتے تھے۔

یہ سب کی سب ایسی توجیہات ہیں جو اس حادثہ کو طبیعی بنانے کے لیے ذکر ہوئی ہیں اور ہم اس کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ ان سنگ ریزوں میں ایسی عجیب و غریب خاصیت تھی جو جسموں کو ریزہ ریزہ کر دیتی تھی۔ اس سے زیادہ اور کوئی اطلاع ہمارے پاس نہیں ہے۔ بہرحال خدا کی قدرت کے مقابلہ میں کوئی کام بھی مشکل نہیں ہوتا۔[2]

۲۔ معمولی وسیلہ سے سخت ترین سزا

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ خدا نے اس ماجرے میں متکبرین اور سرکشوں کے مقابلہ میں اپنی قدرت اعلیٰ ترین صورت میں دکھا دی ہے۔ شاید دنیا میں ابرہہ کے لشکر کے عذاب سے بڑھ کر زیادہ سخت اور کوئی عذاب نہ ہو اور ان مغرور لوگوں کو اس طرح سے تباہ و برباد کر دیا جائے کہ ریزہ ریزہ اور کھائے ہوئے بھوسے (عصف مأکول) کی طرح ہو جائیں۔

اتنی بڑی قدرت و شوکت رکھنے والی جمعیت کی نابودی کے لیے نرم قسم کے سنگ ریزوں اور کمزور اور چھوٹے چھوٹے پرندوں سے کام لیا جائے۔ وہی بات کہ یہ دنیا جہان کے تمام متکبرین اور سرکشوں کے لیے ایک تنبیہ ہے، تاکہ وہ جان لیں کہ وہ خدا کی قدرت کے مقابلہ میں کس قدر ناتوان ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ خدا اس قسم کے عظیم کام بہت ہی چھوٹے سے موجودات کے سپرد کر دیتا ہے۔ مثلاً ایسے جراثیم کو، جو ہرگز آنکھ سے دیکھے نہیں جا سکتے، مامور کر دیتا ہے کہ وہ ایک مختصر سی مدت میں سرعت کے ساتھ اپنی پیدائش بڑھا کر طاقتور قوموں کو ایک خطرناک سرایت کرنے والی بیماری، مثلاً: "وبا" و "طاعون" میں مبتلا کر دے۔ اور ایک مختصر سی مدت میں خزاں کے پتوں کی طرح زمین پر ڈھیر کر دے۔

یمن کا عظیم بند (سد مارب) — جیسا کہ ہم نے سورۂ سبا کی تفسیر میں بیان کیا ہے — آبادی اور ایک عظیم طاقت و تمدن کی پیدائش کا ذریعہ بنی۔ اور اس کے بعد اس قوم کی سرکشی بڑھ گئی، لیکن اس قوم کی نابودی کا فرمان جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے،

---

[1] "تفسیر عبدہ" جزء عم ص ۱۵۸ ملاحظہ ہو۔

[2] اگر بعض تواریخ میں یہ آیا ہے کہ عرب کے شہروں میں چیچک کا مرض پہلی مرتبہ اسی سال دیکھنے میں آیا ہے تو یہ بات اس معنی پر دلیل نہیں بنتی۔

ایک یا چند صحرائی چوہوں کے سپرد ہوا تاکہ وہ اس عظیم بند کے اندر گھس جائیں اور اس میں ایک سوراخ کر دیں۔ اس سوراخ میں پانی داخل ہونے کی وجہ سے یہ سوراخ بڑے سے بڑا ہوتا چلا گیا اور آخرکار وہ عظیم بند ٹوٹ گیا اور وہ پانی جو اس بند کے تھپیڑے مار رہا تھا، اس نے ان سب آبادیوں، گھروں اور محلوں کو ویران اور تباہ و برباد کر دیا۔ اور وہ بڑی جمعیت یا تو نابود ہو گئی یا دوسرے علاقوں میں پراگندہ اور منتشر ہو گئی۔ یہ ہے خداوندِ بزرگ و برتر کی قدرت نمائی۔

۳۔ داستانِ "فیل" کے اہداف

آگے آنے والی سورت (سورۂ لایلاف) سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ سورۂ فیل کا ایک ہدف قریش پر خدا کی عظیم نعمتوں کی یادآوری ہے تاکہ انہیں یہ بتا دے کہ اگر پروردگار کا لطف نہ ہوتا تو نہ تو اس مقدس مرکز یعنی مکہ و کعبہ کے آثار ہوتے اور نہ ہی قریش ہوتے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اسی طرح کبر و غرور کی سواری سے نیچے اُتر آئیں اور پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔

دُوسری طرف یہ ماجرا، جو پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے میلاد کے قریب قریب ساتھ واقع ہوا تھا، حقیقت میں اس عظیم ظہور کا پیش خیمہ تھا اور اس قیام کی عظمت کا پیام لانے والا تھا۔ اور یہ وہی چیز ہے جسے مفسرین نے "ارھاص" سے تعبیر کیا ہے۔[1]

اِس واقعہ کا تیسرا مقصد یہ ہے کہ یہ ساری دنیا جہان کے سرکشوں کے لیے ایک تنبیہ ہے، چاہے وہ قریش ہوں یا ان کے علاوہ کوئی اور ہوں، کہ وُہ جان لیں کہ وُہ ہرگز پروردگار کی قدرت کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ وہ خیالِ خام کو اپنے سر سے نکال دیں، اس کا حکم مانیں اور حق و عدالت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔

چوتھا مقصد اس عظیم گھر کی اہمیت کو ظاہر کرنا ہے کہ جب "کعبہ" کے دشمنوں نے اس کو نابود کرنے کا منصوبہ بنایا، اور وہ اس ابراہیمی سرزمین کی مرکزیت کو دوسری جگہ منتقل کرنا چاہتے تھے، تو خدا نے ان کی اس طرح سے گوشمالی کی کہ ساری دنیا کے لیے باعثِ عبرت بن گئی اور اس مقدس مرکز کی اہمیت کو مزید بڑھا دیا۔

اور پانچواں مقصد یہ ہے کہ، وہ خدا جس نے اس سرزمینِ مقدس کی امنیت کے بارے میں ابراہیمؑ خلیل کی دعا کو قبول کیا تھا، اور اس کی ضمانت دی تھی، اس نے اس ماجرے میں اس بات کی نشان دہی کر دی ہے کہ اس کی مشیت یہی ہے کہ یہ توحید و عبادت کا مرکز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مرکزِ امن رہے۔

۴۔ ایک مسلّم تاریخی روئیداد

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "اصحابِ فیل" کا ماجرا عربوں کے درمیان ایسا مسلّم تھا کہ یہ ان کے لیے تاریخ کا آغاز قرار پایا اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، قرآن مجید نے ایک نہایت ہی عمدہ تعبیر "الم تر" (کیا تُو نے نہیں دیکھا) کے ساتھ اس کا

---

[1] "ارھاص" ان معجزات کے معنی میں ہے جو پیغمبرؐ کے قیام سے قبل واقع ہوں اور اس کی دعوت کے لیے زمین ہموار کرنے والے ہوں۔ یہ لفظ اصل میں بنیاد گزاری اور پہلا سنگِ بُنیاد رکھنے کے معنی میں ہے جسے دیوار کے نیچے رکھتے ہیں اور آمادہ ہونے اور (کھڑے ہونے) کے معنی میں بھی آیا ہے۔

ذکر کیا ہے، وہ بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے جو نہ تو اس زمانہ میں موجود تھے اور نہ ہی اُسے دیکھا تھا جو اس ماجرے کے مسلّم ہونے کی ایک اور نشانی ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین مکہ کے سامنے ان آیات کی تلاوت کی تو کسی نے اس کا انکار نہ کیا۔ اگر یہ مطلب مشکوک ہوتا تو کم از کم کوئی تو اعتراض کرتا اور ان کا اعتراض ان کے باقی اعتراضوں کی طرح ہی تاریخ میں ثبت ہو جاتا، خصوصاً جب کہ قرآن نے جملہ "الم تر" کے ساتھ اس مطلب کو ادا کیا تھا۔

خداوندا! ہمیں توفیق مرحمت فرما کہ ہم اس توحید کے عظیم مرکز کی پاسداری کریں۔

پروردگارا! ان لوگوں کے ہاتھ، جو اس مقدس مرکز کی ظاہری حفاظت پر قناعت کرنا چاہتے ہیں، لیکن اس کی حقیقت کے پیغام کو نظرانداز کرتے ہیں، اس مرکز سے کاٹ دے۔

بارالہا! تمام اشتیاق رکھنے والوں کو مکمل آگاہی و عرفان کے ساتھ اس کی زیارت نصیب فرما۔

* * *

آمین یا رب العالمین

اختتام سورۂ فیل

اختتام ترجمہ

۲ شوال ۱۴۰۸ھ صبح سات بج کر دس منٹ

بر مکان حقیر قم مقدس ایران

سُورَہ قُرَیش

- یہ سُورہ مکہ میں نازل ہوا۔
- اِس میں ۴ آیات ہیں۔

سورۂ قریش کے مطالب اور اس کی فضیلت

یہ سورہ حقیقت میں سورۂ فیل کی تکمیل کرنے والی سمجھی جاتی ہے اور اس کی آیات اس مطلب پر واضح دلیل ہیں۔

اس سورہ کا مضمون قریش پر خدا کی نعمت اور ان کے بارے میں اس کے الطاف اور محبتوں کا بیان ہے، تاکہ ان میں شکرگزاری کا احساس پیدا ہو اور یہ اس عظیم گھر کے پروردگار کی عبادت کے لیے — جس سے ان کا سارا شرف اور افتخار ہے — تیار ہو جائیں۔

جیسا کہ ہم نے سورۂ "والضحیٰ" کے آغاز میں بیان کیا تھا کہ یہ سورہ اور سورہ الم نشرح حقیقت میں ایک شمار ہوتی ہے اسی طرح سورۂ "فیل" اور سورۂ "قریش" بھی ایک ہی شمار ہوتی ہیں۔ کیونکہ اگر ہم ٹھیک طرح سے ان دونوں کے مطالب پر غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ ان دونوں کے مطالب ایک دوسرے کے ساتھ اتنے ملتے جلتے ہیں کہ وہ دونوں کے ایک ہونے کی دلیل بن سکتے ہیں۔

اسی بنا پر نماز کی ہر رکعت میں ایک مکمل سورت پڑھنے کے لیے اگر کوئی شخص اوپر والی سورتوں کا انتخاب کرے تو ضروری ہے کہ وہ دونوں کو اکٹھا پڑھے۔

اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے فقہی کتابوں (کتاب صلوٰۃ بحث قرات) کی طرف رجوع کیا جائے۔[1]

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت میں یہی بات کافی ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"من قرأها اعطی من الاجر عشر حسنات، بعدد من طاف بالکعبة، واعتکف بها:"

"جو شخص اس کو پڑھے تو اُسے ان لوگوں کی تعداد سے دس گنا نیکیاں دی جائے گی، جنہوں نے خانہ کعبہ کا طواف کیا ہے، یا وہاں اعتکاف کیا ہے۔"[2]

مسلّمہ طور پر اس قسم کی فضیلت اس شخص کے لیے ہے جو اس خدا کی بارگاہ میں جو کعبہ کا پروردگار ہے سر تعظیم جھکائے، اس کی عبادت کرے، اس گھر کے احترام کو مدِنظر رکھے، اس کا پیام دل کے کان سے سُنے اور اس کی پابندی کرے۔

---

[1] مرحوم شیخ حر عاملی نے کتاب وسائل میں اس مطلب کی روایات جلد ۴ ص ۷۴۳ (باب ۱۰ از ابواب قرات نماز) میں نقل کی ہیں۔
[2] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۴۳۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۙ

۲۔ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۚ

۳۔ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۙ

۴۔ الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ؑ

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ (اصحاب فیل کا عذاب) اس بنا پر تھا کہ قریش (اس سرزمینِ مقدس سے) اُلفت رکھیں۔ (اور پیغمبرؐ کے ظہور کے مقدمات فراہم ہوں)۔

۲۔ انہیں سردیوں اور گرمیوں کے سفروں سے اُلفت ہے۔

۳۔ پس (اس عظیم نعمت کے شکرانے کے طور پر) اس گھر کے پروردگار کی عبادت کریں۔

۴۔ وہی جس نے انہیں بھوک سے نجات دی اور بدامنی سے نجات بخشی۔

تفسیر

اس گھر کے پروردگار کی عبادت کرنی چاہیئے۔

چونکہ گزشتہ سُورہ (سورۂ فیل) میں اصحاب فیل اور ابرہہ کے لشکر کی نابودی کی تفصیل بیان ہوئی تھی، جو خانہ کعبہ کو نابود کرنے اور اس خدائی مرکزِ مقدس کو ویران کرنے کے ارادہ سے آیا تھا، لہٰذا اس سُورہ کی پہلی آیت میں، جو حقیقت میں سُورۂ فیل کا ایک تکمیلی بیان ہے، فرماتا ہے: "ہم نے ہاتھیوں کے لشکر کو نابود کرکے انہیں کھائے ہوئے بھوسہ کے مانند ریزہ ریزہ کر دیا، "تاکہ قریش اس مقدس سرزمین سے اُلفت پیدا کریں" اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کے مقدمات فراہم ہوں"۔ (لایلاف قریش)[1]

"ایلاف" مصدر ہے، اور اُلفت بخشنے کے معنی میں ہے اور "اُلفت" انس و محبت اور گھل مل جانے کے ساتھ اجتماع کے معنی میں ہے، اور یہ جو بعض نے "ایلاف" کی مؤالفت اور "عہد و پیمان" کے ساتھ تفسیر کی ہے، تو وہ نہ تو اس لفظ کے ساتھ مناسب ہے جو باب افعال کا مصدر ہے، اور نہ ہی اس سُورہ کی آیات کے مضمون سے۔

بہرحال اس سے مُراد قریش اور سرزمین مکہ اور خانہ کعبہ کے درمیان اُلفت پیدا کرنا ہے کیونکہ قریش اور تمام اہل مکہ اس سرزمین کی مرکزیت اور امنیت کی بنا پر ہی وہاں رہائش پذیر تھے۔ حجاز کے بہت سے لوگ ہر سال وہاں آتے تھے اور مراسم حج بجالاتے تھے اقتصادی اور ادبی مبادلات رکھتے تھے اور اس سرزمین کی مختلف برکات سے استفادہ کرتے تھے۔

یہ سب کچھ اس کی مخصوص سلامتی کی وجہ سے تھا۔ اگر ابرہہ یا کسی اور کی لشکر کشی سے اس کی سلامتی اور امنیت مخدوش ہو جاتی، یا خانہ کعبہ ویران ہو جاتا، تو پھر کسی کو اس سرزمین سے اُلفت و محبت نہ رہتی۔

"قریش" کا لفظ، جیسا کہ بہت سے مفسرین اور ارباب لغت نے کہا ہے۔ اصل میں سمندر کے عظیم جانوروں کی ایک نوع کے معنی میں ہے، جو ہر جانور کو آسانی کے ساتھ کھا لیتی ہے۔ یہ عبارت "ابن عباس" سے مشہور ہے کہ جب ان سے سوال ہوا کہ قریش کو "قریش" کیوں کہتے ہیں؟ تو انہوں نے یہ جواب دیا:

"لدابة تكون في البحر من اعظم دوابه يقال لها القريش، لاتمر بشيء من الغث والسمين الا اكلته"!:

"یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ سمندر کے ایک بہت بڑے جانور کا نام ہے، وہ جس دُبلے یا موٹے جانور کے پاس سے گزرتا ہے اُسے کھا جاتا ہے"۔

اس کے بعد وہ اپنی بات کے ثبوت میں اشعارِ عرب سے شہادت پیش کرتے ہیں۔

---

[1] "لایلاف" میں "لام" علت کے معنی میں ہے اور "جار و مجرور" "جعل" سے متعلق ہے، جو گزشتہ سُورہ کی آیہ "فجعلهم كعصف مأكول" میں، یا کسی اور دوسرے فعل کے جو اس سُورہ میں تھا۔ بعض نے اس جار و مجرور کو فلیعبدوا کے جملہ سے متعلق سمجھا ہے، جو بعد والی آیات میں آیا ہے لیکن یہ احتمال آیات کے مفہوم کے ساتھ چنداں سازگار نہیں ہے اور پہلا معنی بہتر ہے۔

اس بنا پر اس قبیلہ کے لیے اس نام کا انتخاب، اس قبیلہ کی قدرت و قوت اور اس قدرت سے غلط فائدہ اٹھانے کی وجہ سے ہوا۔

لیکن بعض نے اسے "قرش" (بروزن فرش) کے مادہ سے اکتساب کے معنی میں لیا ہے، کیونکہ عام طور پر یہ قبیلہ تجارت اور کسب میں مشغول رہتا تھا۔

بعض اس مادہ کو خبرگیری اور دیکھ بھال کرنے کے معنی میں جانتے ہیں اور چونکہ قریش حاجیوں کے حالات کی خبرگیری کرتے تھے، اور بعض اوقات ان کی مدد کرتے تھے، اس لیے یہ لفظ ان کے لیے منتخب ہوا۔

"قریش" لغت میں اجتماع کے معنی میں بھی آیا ہے کیونکہ یہ قبیلہ ایک خاص قسم کی تنظیم اور اجتماع رکھتا تھا، اس لیے یہ نام ان کے لیے انتخاب ہوا۔

لیکن بہرحال موجودہ زمانہ میں قریش کسی اچھے مفہوم میں استعمال نہیں ہوتا، اور باوجود اس کے کہ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قبیلہ تھا، اسلام کا سخت ترین دشمن شمار ہوتا تھا جو کسی قسم کی عہد شکنی، عداوت اور دشمنی سے نہیں چوکتا تھا۔ یہاں تک کہ جب ان کی قدرت و طاقت اسلام کی کامیابی کی وجہ سے دم توڑ گئی تو پھر بھی انہوں نے مخفی سازشوں کو جاری رکھا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد بھی انہوں نے ایسے دردناک حوادث پیدا کیے جنہیں تاریخ اسلام کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ہم جانتے ہیں کہ "بنی امیہ" اور "بنی عباس" جو طاغوتی حکومت کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے، قریش میں سے ہی اٹھے تھے۔

قرائن بھی اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ وہ عربوں کے زمانۂ جاہلیت میں بھی لوگوں کے استثمار و استعمار کی کوشش میں لگے رہتے تھے اور اسی وجہ سے جب آزادی بخش اسلام نے طلوع کیا اور ان کے ناجائز منافع خطرے میں پڑ گئے تو وہ پوری طاقت کے ساتھ مبارزہ کے لیے کھڑے ہو گئے۔ لیکن اسلام کی عظیم قدرت نے انہیں درہم برہم کر دیا۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "ہدف اور مقصد یہ تھا کہ خدا قریش کو سردیوں اور گرمیوں کے سفروں میں الفت بخشے":

(ایلافھم رحلۃ الشتاء والصیف)[1][2]

ممکن ہے کہ اس سرزمین مقدس سے قریش کو الفت بخشنا مراد ہو، تاکہ وہ گرمیوں اور سردیوں کے طویل سفروں میں اس مقدس مرکز سے اپنا تعلق اور لگاؤ دل سے نہ بھلائیں اور اس کی سلامتی کی وجہ سے اس کی طرف لوٹ آئیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سرزمین یمن اور شام کی زندگی کی آسائشوں سے متاثر ہو کر مکہ کو خالی چھوڑ دیں۔

یا اس سے ان دو عظیم سفروں میں قریش اور دوسرے لوگوں کے درمیان الفت پیدا کرنا مراد ہے، کیونکہ ابرہہ کی داستان کے

---

[1] "ایلافھم" اس "ایلاف" کا بدل ہے جو گزشتہ آیت میں آیا ہے، اور "ھم" کی ضمیر پہلا مفعول ہے۔ اور "رحلۃ الشتاء" دوسرا مفعول ہے اور بعض کے نظریے کے مطابق ظرفیت کے معنی میں ہے۔ اور ممکن ہے کہ وہ "منصوب بنزع خافض" ہو، اور تقدیر میں اس طرح ہو "ایلافھم من رحلۃ الشتاء والصیف" (دوسرا اور تیسرا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔)

[2] "رحلۃ" "رحل" (بروزن شہر) سے اس پردہ کے معنی میں ہے جو سوار ہونے کے لیے ڈالتے ہیں۔ اسی مناسبت سے، خود اونٹ پر یا ان مسافرتوں پر جو اونٹ یا دوسرے ذرائع سے ہوتی ہیں، پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

بعد لوگ انہیں دوسری نظر سے دیکھتے تھے اور قریش کے قافلہ کے احترام و اہمیت کے قائل تھے۔

قریش کو اس طویل سفر میں بھی امن کی ضرورت تھی اور سرزمینِ مکہ کے لیے بھی، اور خدا نے ابرھہ کے لشکر کی شکست کے نتیجہ میں یہ دونوں سلامتیاں انہیں بخش دی تھیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ "مکہ" کی زمین میں نہ تو کوئی باغ تھا اور نہ ہی کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ جانوروں کی دیکھ بھال بھی ان کی محدود تھی، ان کی در آمد زیادہ تر انہیں تجارتی قافلوں کے ذریعے پوری ہوتی تھی۔ وہ سردی کے موسم میں جنوب یعنی سرزمین یمن کی طرف ــ جس کا موسم نسبتاً گرم ہوتا تھا ــ رُخ کرتے تھے اور گرمی کے موسم میں شمال اور سرزمین شام کی طرف ــ جس کی ہوا اور موسم خوشگوار ہوتا تھا۔ اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ سرزمین یمن بھی اور سرزمین شام بھی، اس زمانہ میں اہم تجارتی مرکز تھے۔ اور مکہ اور مدینہ ان دونوں کے درمیان حلقۂ اتصالی شمار ہوتے تھے۔

البتہ قریش ان غلط کاریوں کی وجہ سے، جو وہ انجام دیتے تھے، خدا کے ان الطاف و محبت کے مستحق تو نہ تھے۔ لیکن چونکہ یہ مقدر ہو چکا تھا کہ اس قبیلہ اور اس سرزمینِ مقدس سے اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طلوع ہو، لہٰذا خدا نے ان پر یہ لطف فرمایا۔

بعد والی آیت میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قریش کو ان سب خدائی نعمتوں کی وجہ سے جو انہیں کعبہ کی برکت سے حاصل ہوئی تھیں "اس گھر کے پروردگار کی عبادت کرنا چاہیئے نہ کہ بتوں کی"۔ (فلیعبدوا رب ھٰذا البیت)۔

"وہی خدا جس نے انہیں بھوک سے نجات بخشی اور کھانا دیا، اور بے امنی سے رہائی بخشی اور امن دیا"۔ (الذی اطعمھم من جوع و اٰمنھم من خوف)[1]

ایک طرف تو انہیں تجارت میں فروغ عطا کیا اور انہیں فائدہ پہنچایا اور دوسری طرف بدامنی کو ان سے دُور کر دیا اور دفع ضرر کیا۔ اور یہ سب کچھ ابرھہ کے لشکر کی شکست سے فراہم ہوا۔ اور حقیقت میں یہ کعبہ کے بانی ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کی قبولیت تھی۔ لیکن انہوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی۔ اس مقدس گھر کو ایک بُت خانہ میں تبدیل کر دیا، بُتوں کی عبادت کو اس گھر کے خدا کی عبادت پر ترجیح دی اور انجام کار ان تمام ناشکریوں کا انجام بد دیکھا۔

خداوندا! ہمیں عبادت و بندگی اور نعمتوں کا شکر ادا کرنے اور اس عظیم گھر کی حفاظت، پاسداری اور احترام کرنے کی توفیق مرحمت فرما۔

پروردگارا! اس عظیم اسلامی مرکز کو روز بروز زیادہ سے زیادہ پُرشکوہ، اور دُنیا جہان کے مُسلمانوں کے لیے حلقۂ اتصال قرار دے۔

بار الٰہا! سارے خونخوار دشمنوں اور ان لوگوں کے جو اس عظیم مرکز سے غلط فائدہ اُٹھاتے ہیں، ہاتھ کاٹ دے۔

آمین یا رب العالمین
سورۂ قریش کا اختتام

اختتام ترجمہ
۲ شوال ۱۴۰۸ھ
قم مقدسہ۔ ایران

[1] بعض مفسرین نے اس آیت کو دو آیات سمجھا ہے، اور اس سورہ کی آیات کو پانچ آیات شمار کیا ہے، لیکن مشہور و معروف یہ ہے کہ یہ ایک آیت ہے، اور سورہ کی چار کی چار ہی آیات ہیں۔

سُورہ اَلْمَاعُون

- یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔
- اس میں ۷ آیات ہیں۔

سُورۂ ماعون کے مطالب اور اس کی فضیلت

یہ سُورہ بہت سے مفسّرین کے نظریہ کے مطابق مکّی سورتوں میں سے ہے۔ اس کی آیات کا لب ولہجہ، جو مختصر اور چبھنے والے مقاطع ہیں قیامت اور اس کے منکرین کے اعمال کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں، اس مطلب کی ناطق گواہ ہیں۔

مجموعی طور پر اس سُورہ میں منکرین قیامت کی صفات و اعمال کو پانچ مرحلوں میں بیان کیا گیا ہے، کہ وہ اس عظیم دن کی تکذیب کی وجہ سے راہِ خدا میں "انفاق" کرنے اور "یتیموں" اور "مسکینوں کی مدد کرنے سے کس طرح رُوگردانی کرتے ہیں اور وہ "نماز" کے بارے میں کیسے غافل اور ریاکار ہیں، اور "حاجت مندوں" کی مدد کرنے سے کس طرح رُوگردانی کرتے ہیں؟

اِس سُورہ کی شانِ نزول کے بارے میں بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ ابوسفیان کے بارے میں نازل ہوا ہے جو روزانہ دو بڑے بڑے اُونٹ نحر کیا کرتا تھا اور وُہ خود اور اس کے یار دوست اُنہیں کھاتے تھے۔ لیکن ایک دن ایک یتیم آیا اور اس نے اُن سے کچھ مانگا تو اس نے اپنے عصا سے اُسے مارا، اور اُسے دُور کر دیا۔

بعض دوسرے مفسّرین نے یہ کہا ہے کہ یہ "ولید بن مغیرہ" یا "عاص بن وائل" کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

اِس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے:

"من قرأ أرءيت الّذي يكذب بالدين في فرائضه و نوافله قبل الله صلاته وصيامه، ولم يحاسبه بما كان منه في الحياة الدنيا"۔

"جو شخص اس سُورہ کو اپنی فریضہ اور نافلہ نمازوں میں پڑھے گا تو خدا اس کے نماز و روزہ کو قبول کرے گا اور ان کاموں کے مقابلہ میں جو اس سے دنیا کی زندگی میں سرزد ہوئے ہیں اس کا کوئی حساب نہیں لے گا"۔[1]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۴۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝

۲۔ فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝

۳۔ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝

۴۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝

۵۔ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝

۶۔ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝

۷۔ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ کیا تُو نے اس شخص کو دیکھا ہے، جو ہمیشہ ہی روزِ جزا کا انکار کرتا رہتا ہے؟

۲۔ وہی تو ہے، جو یتیم کو سختی کے ساتھ دھکے دیتا ہے۔

۳۔ اور دوسروں کو مسکین کو کھانا کھلانے کا شوق نہیں دلاتا۔

۴۔ پس ان نمازگزاروں پر وائے ہے، جو

۵۔ اپنی نمازوں کو بھول جاتے ہیں۔

۶۔ وہی جو ریاکاری کرتے ہیں۔

۷۔ اور دوسروں کو ضروریاتِ زندگی سے باز رکھتے ہیں۔

تفسیر

معاد کے انکار کے اثراتِ بد

اس سورہ میں پہلے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے منکرین کے اعمال میں روزِ جزا کے انکار کے اثراتِ بد کو بیان کرتا ہے۔

"کیا تُو نے اس شخص کو دیکھا ہے جو ہمیشہ روزِ جزا کا انکار کرتا ہے" (ارءیت الذی یکذب بالدین)۔

اس کے بعد ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر مزید فرماتا ہے، "وہی تو ہے جو یتیم کو سختی کے ساتھ دھکے دیتا ہے" (فذالک الذی یدع الیتیم)۔

"اور دوسروں کو مسکین و نادار کو کھانا کھلانے کے لیے شوق نہیں دلاتا"۔ (ولا یحض علیٰ طعام المسکین)۔

"دین" سے مُراد یہاں "جزا" یا "روزِ جزا" ہے۔ اور روزِ جزا اور اس کی عظیم دادگاہ کے انکار سے انسان کے عمل میں ایک وسیع ردِّ عمل پیدا ہوتا ہے۔ جس کے پانچ حصّوں کی طرف اس سُورہ میں اشارہ ہوا ہے، منجملہ: یتیموں کو سختی کے ساتھ دھتکارنا اور دوسرے لوگوں کو مسکینوں کو کھانا کھلانے کا شوق نہ دلانا۔ یعنی نہ تو خُود ہی انفاق کرنا اور نہ ہی دوسروں کو اس کام کی دعوت دینا۔

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہاں "دین" سے مراد قرآن یا تمام آئین و دینِ اسلام ہے۔ لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے، اور اس کی نظیر سورہ انفطار کی آیہ ۹ کلا بل تکذبون بالدین، اور سورہ "تین" کی آیہ ۷ فما یکذبک بعد بالدین میں بھی آئی ہے، جہاں ان سُورتوں کی دوسری آیات کے قرینہ سے دین سے مراد روزِ جزا ہے۔

"یدع" "دع" (بروزن حد) کے مادہ سے، سختی کے ساتھ دُور کرنے اور غصّہ کے ساتھ دھتکارنے کے معنی میں ہے اور "یحض" "حض" کے مادہ سے کسی چیز کے لیے دوسروں کو تحریص و ترغیب دینے کے معنی میں ہے۔ "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے، "حث" چلنے اور سیر کرنے کے لیے شوق دلانا ہے، لیکن "حض" اس طرح نہیں ہے[1]

چونکہ "یحض" اور "یدع" فعل مضارع کی صورت میں آئے ہیں، لہٰذا یہ اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ یتیموں اور

---

[1] "مفردات" مادہ "حض"۔

مسکینوں کے بارے میں ان کا یہ کام دائمی طور پر تھا۔

یہ نکتہ بھی یہاں پر قابل توجہ ہے کہ یتیموں کے بارے میں انسانی شفقت اور مہربانی کرنے کا مسئلہ کھانا کھلانے اور سیر کرنے کی نسبت زیادہ عمدہ ہے۔ کیونکہ یتیم کو سب سے زیادہ رنج اور دکھ شفقت و مہربانی کے مرکز اور غذائے روحی کے ہاتھ سے چلے جانے کی وجہ سے ہوتا ہے، اور جسمانی غذا کا مرحلہ بعد میں آتا ہے۔

پھر ان آیات میں ہمارے سامنے مسکینوں کو کھانا کھلانے کا مسئلہ آتا ہے، جو اہم ترین کارہائے خیر میں سے ہے۔ یہاں تک کہ فرماتا ہے کہ اگر کوئی شخص خود کسی مسکین کو کھانا کھلانے کی قدرت نہیں رکھتا، تو دوسروں کو اس بات کی ترغیب دے اور شوق دلائے۔

"فذالک" کی تعبیر (اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہاں "فا" سببیت کا معنی دیتا ہے) اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ معاد پر ایمان کا نہ ہونا ان غلط کاریوں کا سبب بنتا ہے، اور واقعاً ایسا ہی ہے وہ شخص جو دل کی گہرائیوں کے ساتھ اس عظیم دن اور اس دادگاہ عدل، اور اس حساب و کتاب اور جزا و سزا پر یقین رکھتا ہو، اس کے تمام اعمال میں اس کے مثبت آثار ظاہر ہوں گے، لیکن جو اس پر ایمان نہیں رکھتے تو گناہ کرنے اور انواع و اقسام کے جرائم کرنے پر ان کی جرأت کرنے میں اس کے اثرات کامل طور پر نمایاں ہوتے ہیں۔

اس گروہ کی تیسری صفت کے بارے میں فرماتا ہے: پس ان نمازگزاروں پر وائے ہے"۔ (فویل للمصلین)۔

"وہی نمازی جو اپنی نماز کو بھول جاتے ہیں"۔ (الذین ھم عن صلاتھم ساھون)۔

وہ اس کے لیے نہ تو کسی قدر و قیمت کے قائل ہیں اور نہ ہی اس کے اوقات کو کوئی اہمیت دیتے ہیں، اور نہ ہی اس کے ارکان و شرائط اور آداب کی رعایت کرتے ہیں۔

"ساھون" "سھو" کے مادہ سے اصل میں اس خطا کے معنی میں ہے جو غفلت کی بنا پر سرزد ہو جاتا ہے اس کے مقدمات کے فراہم کرنے میں مقصر ہو یا نہ ہو البتہ پہلی صورت میں معذور نہیں ہے، اور دوسری صورت میں معذور ہے۔ لیکن یہاں وہ سہو مراد ہے جو تقصیر کے ساتھ توأم ہو۔

اس بات پر توجہ رکھنی چاہیئے کہ یہ نہیں فرماتا کہ "وہ اپنی نماز میں سہو کرتے ہیں": چونکہ نماز میں سہو تو بہرحال ہر شخص سے ہو جاتا ہے، بلکہ فرماتا ہے" وہ اصل نماز سے ہی سہو کرتے ہیں، اور کل کی کل نماز کو ہی بھول جاتے ہیں"۔

یہ بات واضح ہے کہ اگر اس مطلب کا ایک یا چند مرتبہ اتفاق ہو تو ممکن ہے کہ وہ کوتاہی کی وجہ سے ہو۔ لیکن جو شخص نماز کو ہمیشہ کے لیے ہی بھلائے ہوئے ہو، اور اسے بالکل ہی بھلا چکا ہو، تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کے لیے کسی اہمیت کا قائل نہیں ہے، یا اصلاً اس پر ایمان نہیں رکھتا، اور اگر وہ کبھی کبھار نماز پڑھ لیتا ہے تو لوگوں کی زبان یا اسی طرح کی باتوں سے ڈر کر پڑھتا ہے۔

اس بارے میں کہ یہاں "ساھون" سے مراد کیا ہے، جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اس کے علاوہ دوسری تفسیریں بھی بیان کی گئی ہیں۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ اس سے مراد وقتِ فضیلت سے تاخیر کرنا ہے۔

یا اس سے مراد ان منافقین کی طرف اشارہ کرنا ہے جو نہ نماز کے ثواب کا اعتقاد رکھتے ہیں اور نہ ہی اس کے ترک کے عذاب کا۔
یا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو لوگ نماز میں ریاکاری کرتے ہیں۔ (جب کہ یہ معنی بعد والی آیت میں آرہا ہے)۔
البتہ ان معانی کے درمیان جمع بھی ممکن ہے اگرچہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔
بہر حال جب نماز کو بھول جانے والے ویل اور ہلاکت کے مستحق ہیں، تو پھر ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو کلی طور پر نماز کو چھوڑے ہوئے ہیں اور تارک الصلوٰۃ ہیں۔
چوتھے مرحلہ میں ان کے ایک اور بدترین عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ ایسے لوگ ہیں جو ہمیشہ ریاکاری کرتے ہیں"۔ (الذین ھم یراءون)۔
اور آخری مرحلہ میں مزید فرماتا ہے، "وہ دوسروں کو ضروریات زندگی سے منع کرتے ہیں"۔ (و یمنعون الماعون)۔
مسلمہ طور پر اس تظاہر اور ریاکاری کے سرچشمے روز قیامت پر ایمان کا نہ ہونا، اور خدائی جزاؤں کی طرف توجہ نہ کرنا ہے، ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان خدائی جزاؤں کو تو چھوڑ دے، اور مخلوق کو خوش کرنے کی طرف توجہ رکھے۔
"ماعون" "معن" (بروزن شأن) کے مادہ سے، کم اور تھوڑی سی چیز کے معنی میں ہے۔ اور بہت سے مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہاں اس سے مراد جزئی اور معمولی قسم کی چیزیں ہیں، جو لوگ خصوصاً ہمسائے ایک دوسرے سے عاریتاً لے لیتے ہیں، مثلاً کچھ نمک، پانی، آگ (ماچس) برتن وغیرہ۔
واضح رہے کہ جو شخص اس قسم کی چیزیں بھی دوسروں کو نہیں دیتا، وہ انتہائی پست اور بے ایمان آدمی ہوتا ہے۔ ایسے افراد اس قدر بخیل ہوتے ہیں کہ اس قسم کی معمولی چیزوں کے دینے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ حالانکہ یہی معمولی معمولی چیزیں بعض اوقات بڑی بڑی احتیاجات کو پورا کرتی ہیں اور ان کے روک لینے سے لوگوں کی زندگی میں بڑی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔
ایک گروہ نے یہ بھی کہا ہے کہ "ماعون" سے مراد زکوٰۃ ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ اصل مال سے عام طور پر بہت ہی کم ہوتی ہے۔ کبھی سو میں سے دس، کبھی سو میں سے پانچ اور کبھی سو میں سے اڑھائی۔
یقیناً "زکوٰۃ کا نہ دینا" بھی بدترین کاموں میں سے ایک ہے، کیونکہ زکوٰۃ معاشرے کی بہت سی اقتصادی مشکلات کو حل کرتی ہے۔
ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے ماعون کی تفسیر میں فرمایا:

"ھو القرض یقرضہ، والمتاع یعیرہ، والمعروف یصنعہ":

"ماعون وہ قرض ہے جو انسان دوسرے کو دیتا ہے۔ اور وہ وسائل زندگی ہیں جو وہ ادھار کے طور پر دوسروں کو دیتا ہے۔ اور وہ امدادیں اور کارہائے خیر ہیں جنہیں انسان انجام دیتا ہے"[1]

ایک اور روایت میں انہیں حضرت سے یہی معنی نقل ہوا ہے، اور اس کے ذیل میں آیا ہے کہ راوی نے کہا: ہمارے ہمسائے ایسے ہیں کہ جب ہم کچھ وسائل زندگی ان کو دیتے ہیں تو وہ انہیں توڑ دیتے ہیں اور خراب کر دیتے ہیں، تو کیا انہیں نہ دینا بھی گناہ ہے؟

---

[1] "کافی" مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۶۸۹

تو آپ نے فرمایا اس صورت میں کوئی مانع نہیں ہے[1]

"ماعون" کے معنی کے بارے میں دوسرے احتمالات بھی دیے گئے ہیں، یہاں تک کہ تفسیر قرطبی میں بارہ سے زیادہ قول اس سلسلے میں نقل ہوئے ہیں جن میں سے بہت سوں کو ایک دوسرے میں ملایا جا سکتا ہے، البتہ زیادہ اہم وہی ہیں جو ہم نے اوپر نقل کیے ہیں۔

ان دونوں کاموں کو ایک دوسرے کے بعد ذکر کرنا (ریا کاری و منع ماعون) گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو بات خدا کے لیے ہے اُسے وہ مخلوق کی نیت سے بجا لاتے ہیں، اور جو مخلوق کے لیے ہے وہ ان کے لیے نہیں کرتے۔ اور اس طرح سے وہ کوئی بھی حق اس کے حق دار تک نہیں پہنچاتے۔

ہم اس گفتگو کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں، آپؐ نے فرمایا:

"من منع الماعون جارہ منعہ اللہ خیرہ یوم القیامۃ، ووکلہ الی نفسہ، ومن وکلہ الی نفسہ فما اسوء حالہ"!:

"جو شخص ضروری اور معمولی چیزوں کو اپنے ہمسایہ سے روکتا ہے، خدا اُسے قیامت کے دن اپنی خیر سے روک دے گا، اور جسے خدا اس کی اپنی حالت پر چھوڑ دے اس کا بہت ہی بُرا حال ہوگا[2]

چند نکات

۱۔ سورۂ ماعون کے مباحث کی جمع بندی

اس مختصر سے سورہ میں صفات رذیلہ کا ایک ایسا مجموعہ آیا ہے کہ وہ جس شخص میں بھی ہو اس کی بے ایمانی، پستی اور حقارت کی ایک نشانی ہے۔ اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان سب کو تکذیب دین یعنی جزا' یا روزِ جزا کی فرع قرار دیا ہے۔

یتیموں کو حقیر جاننا، بھوکوں کو کھانا نہ کھلانا، نماز سے غفلت برتنا، ریا کاری کرنا اور لوگوں سے موافقت نہ کرنا یہاں تک کہ زندگی کے معمولی وسائل دینے میں۔ یہ ہے ان (صفاتِ رذیلہ) کا مجموعہ۔

اور اس طرح سے ان بخیل، خود خواہ اور ریاکار افراد کو ظاہر کرتا ہے، جن کا نہ تو "مخلوقِ خدا" ہی کے ساتھ کوئی تعلق ہے اور نہ ہی "خالق" کے ساتھ کوئی رابطہ۔ ایسے افراد جن کے وجود میں نورِ ایمان اور احساسِ مسئولیت نہیں ہوتا، نہ تو وہ خدائی اجر و ثواب میں غور و فکر کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

---

[1] "کافی" مطابق نقل "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۶۷۹۔

[2] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۶۷۹ حدیث ۲۰

۲۔ تظاہر و ریا ایک بہت بڑی اجتماعی مُصیبت ہے

ہر عمل کی قدر و قیمت اس کے سبب کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، یا دوسرے لفظوں میں اسلام کی نگاہ میں ہر عمل کی بُنیاد اس کی "نیت" پر ہوتی ہے، وہ بھی "خالص نیت"

اسلام ہر چیز سے پہلے نیت کے بارے میں تحقیق کرتا ہے، لہٰذا ایک مشہور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"انما الاعمال بالنیات ولکل امرء مانوی":

"ہر عمل نیت کے ساتھ وابستہ ہے اور ہر شخص کا عمل میں حصّہ، اس کی اس نیت کے مطابق ہوگا، جو وہ عمل میں رکھتا تھا"

اور اسی حدیث کے ذیل میں آیا ہے:

"جو شخص خدا کے لیے جہاد کرے اس کا اَجر خدائے بزرگ و برتر پر ہے۔ اور جو شخص مالِ دنیا کے لیے جنگ کرے، یہاں تک کہ ایک عقال (وہ چھوٹی سی رسّی جس سے اُونٹ کے پاؤں کو باندھتے ہیں) لینے کے لیے کرے اس کا حصّہ بس وہی ہے[1]"

یہ سب اس بنا پر ہے کہ "نیت سے ہی عمل وجود میں آتا ہے۔ وہ شخص جو خدا کے لیے کوئی کام انجام دیتا ہے، تو وہ اس کی بنیاد کو محکم کرتا ہے، اور اس کی تمام کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھائیں۔ لیکن جو شخص تظاہر اور ریاکاری کے لیے کسی عمل کو انجام دیتا ہے وہ صرف اس کے ظاہر اور زرق و برق پر نظر رکھتا ہے، اور وہ اس کی گہرائی و بنیاد اور حاجت مندوں کے استفادے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

وہ معاشرہ جو ریاکاری کا عادی ہو جاتا ہے وہ نہ صرف خُدا، اخلاقِ حسنہ اور ملکاتِ فاضلہ سے دُور کر دیا جاتا ہے، بلکہ اس کے تمام اجتماعی پروگرام مفہوم و مطلب سے خالی ہو جاتے ہیں، اور وہ مُٹھی بھر بے معنی ظواہر کا خلاصہ رہ جاتے ہیں، اور ایسے انسان اور اس قسم کے معاشرے کی سرنوشت کتنی دردناک ہے؟!

"ریا" کی مذمت میں بہت زیادہ روایات آئی ہیں، یہاں تک کہ اس کو شرک کی ایک نوع کہا گیا ہے، اور ہم یہاں تین ہلا دینے والی روایات پر قناعت کرتے ہیں۔

۱۔ ایک حدیث میں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"سیأتی علی الناس زمان تخبث فیہ سرائرھم۔ وتحسن فیہ علانیتھم۔ طمعاً فی الدنیا لا یریدون بہ ما عند ربھم یکون دینھم ریاء لا یخالطھم خوف، یعمھم اللہ بعقاب فیدعونہ دعاء الغریق فلا یستجیب لھم!:

---

[1] وسائل الشیعہ جلد اول ص ۳۵ (ابواب مقدمۃ العبادات باب ۵ حدیث ۱۰)۔

"لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جب ان کے باطن قبیح، گندے اور آلودہ ہو جائیں گے، اور ان کے ظاہر زیبا اور خوبصورت ہوں گے۔ دُنیا میں طمع کی خاطر وہ اس سے اپنے پروردگار کی جزاؤں کے طلب گار نہیں ہوں گے۔ ان کا دین ریا ہو جائے گا، خوفِ خدا ان کے دل میں باقی نہ رہے گا، خدا ان سب کو ایک سخت عذاب میں گرفتار کرے گا، اور وہ جتنا بھی ایک ڈوبنے والے کی طرح خدا کو پکاریں گے، ہرگز ان کی دُعا قبول نہ ہوگی"[1]

۲۔ ایک دوسری حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے اپنے ایک صحابی "زرارہ" سے فرمایا:

"من عمل للناس کان ثوابه علی الناس یا زرارہ! کل ریاء شرک!":

"جو شخص لوگوں کے لیے عمل کرے گا اس کا اجر و ثواب لوگوں پر ہی ہوگا اے زرارہ! ہر ریا شرک ہے"[2]

۳۔ ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"ان المرائی یدعی یوم القیامة باربعة اسماء:

یا کافر! یا فاجر! یا غادر! یا خاسر! حبط عملك، و بطل اجرك

فلا خلاص لك الیوم، فالتمس اجرك ممن کنت تعمل له!":

"ریاکار شخص کو قیامت کے دن چار ناموں سے پکارا جائے گا:

اے کافر! اے فاجر! اے حیلہ گر! اے خاسر و زیاں کار! تیرا عمل نابود ہو گیا ہے، تیرا اجر و ثواب باطل ہو چکا ہے۔ آج تیرے لیے نجات کی کوئی راہ نہیں ہے لہٰذا تو اپنا اجر و ثواب اس سے طلب کر جس کے لیے تو عمل کرتا تھا۔"[3]

خداوندا! خلوصِ نیت سخت مشکل کام ہے، تو خود اس راہ میں ہماری مدد فرما۔

پروردگارا! ہمیں ایسا ایمان مرحمت فرما کہ ہم تیرے ثواب و عقاب کے علاوہ اور کچھ نہ سوچیں، اور مخلوق کی رضا و خوشنودی اور غصہ و غضب تیری راہ میں ہمارے لیے یکساں ہو۔

بارالہا! اس راہ میں جو خطا اور غلطی اب تک ہم نے کی ہے وہ ہمیں بخش دے۔

آمین یا ربّ العالمین

اختتام سورۂ ماعون

---

[1] "اصول کافی" جلد ۲ باب الریاء حدیث ۱۴

[2] "وسائل الشیعہ" جلد اوّل ص ۴۹ (حدیث ۱۱ کے ذیل میں)۔

[3] "وسائل الشیعہ" جلد اوّل ص ۵۱ (حدیث ۱۶ کے ذیل میں)۔

سُورَۃ الکَوثَر

* یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔
* اس میں ۳ آیات ہیں۔

سُورۂ کوثر کے مطالب اور اس کی فضیلت

مشہور یہ ہے کہ یہ سُورہ "مکہ" میں نازل ہوا ہے۔ لیکن بعض نے اس کے مدنی ہونے کا احتمال بھی دیا ہے۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ یہ سُورہ دو بار نازل ہوا۔ ایک دفعہ مکہ میں اور دوسری دفعہ مدینہ میں، لیکن جو روایات اس کے شانِ نزول میں وارد ہوئی ہیں وہ اس کے مکّی ہونے کے مشہور قول کی تائید کرتی ہیں۔

اس سُورہ کے شانِ نزول میں آیا ہے کہ: "عاص بن وائل" نے جو مشرکین کے سرداروں میں سے تھا، پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے مسجد الحرام سے نکلتے وقت ملاقات کی اور کچھ دیر تک آپ سے باتیں کرتا رہا۔ قریش کے سرداروں کا ایک گروہ مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے دُور سے اس منظر کا مشاہدہ کیا۔ جس وقت "عاص بن وائل" مسجد میں داخل ہوا تو انہوں نے اس سے کہا کہ تُو کس سے باتیں کر رہا تھا؟ اس نے کہا: اس "ابتر" شخص سے۔

اس نے اس تعبیر کا اس لیے انتخاب کیا کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرزند "عبداللہ" دُنیا سے رُخصت ہو چکے تھے۔ اور عرب اپنے آدمی کو جس کے کوئی بیٹا نہ ہو "ابتر" کہا کرتے تھے یعنی (بلاعقب۔ مقطوع النسل) لہٰذا قریش نے پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرزند کی وفات کے بعد اس لقب کو آنحضرتؐ کے لیے انتخاب کر رکھا تھا، جس پر یہ سُورت نازل ہوئی، اور پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بہت سی نعمتوں اور کوثر کی بشارت دی اور ان کے دشمنوں کو ابتر کہا۔[1]

اس کی وضاحت اِس طرح ہے کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بانوئے اسلام جناب خدیجہؑ سے دو پسر تھے، ایک قاسم اور دوسرے طاہر جنہیں عبداللہ بھی کہتے تھے۔ دونوں ہی مکہ میں دُنیا سے چل بسے اور پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کوئی بیٹا نہ رہا۔ اس بات نے قریش کے بدخواہوں کی زبان کھول دی، اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو "ابتر" کہنے لگے۔[2]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۴۹۔

[2] اگلے صفحہ پر

وہ اپنی روایت کے مطابق بیٹے کو حد سے زیادہ اہمیت دیتے تھے، اسے باپ کے پروگراموں کو جاری رکھنے والا شمار کرتے تھے اس سانحے کے باعث ان کا خیال یہ تھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے آپ کے پروگرام معطل ہو کر رہ جائیں گے چنانچہ وہ اس بات پر بہت خوش تھے۔

قرآن مجید نازل ہوا اور اس سورہ میں اعجاز آمیز طریقے سے انہیں جواب دیا اور یہ خبر دی کہ آنحضرتؐ کے دشمن ہی ابتر رہیں گے اور اسلام و قرآن کا پروگرام کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ اس سورہ میں جو بشارت دی گئی ہے وہ ایک طرف تو دشمنانِ اسلام کی امیدوں پر ایک ضرب تھی اور دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تسلّیٔ خاطر تھی جن کا قلبِ پاک اور نازک دل اس قبیح لقب اور دشمنوں کی سازش کو سن کر غمگین اور مکدر ہوا تھا۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"من قرأها سقاه الله من انهار الجنة، واعطی من الاجر بعدد کل قربان قربه العباد فی یوم عید ویقربون من اهل الکتاب والمشرکین"

"جو شخص اس کی تلاوت کرے خدا اسے جنت کی نہروں سے سیراب کرے گا اور ہر قربانی کی تعداد میں جو خدا کے بندے عید (قربان) کے دن کرتے ہیں، اور اسی طرح سے وہ قربانیاں جو اہلِ کتاب اور مشرکین دیتے ہیں ان سب کی تعداد کے برابر اس کو اجر دے گا۔[1]

اس سورہ کا نام (کوثر) اس کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے۔

---

[2] (گزشتہ صفحہ کا حاشیہ) پیغمبر اکرمؐ کے اور بیٹا جس کا نام "ابراہیم" تھا "ماریہ قبطیہ" سے مدینہ میں ہجرت کے آٹھویں سال پیدا ہوا، لیکن اتفاقاً وہ بھی دو سال کا ہونے سے پہلے وفات پا گیا۔ ان کی وفات نے پیغمبر اکرمؐ کے دل کو بہت آزردہ کیا تھا۔ (حاشیہ صفحہ ہٰذا)

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ۵۴۸۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ ؕ

۲۔ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ ؕ

۳۔ اِنَّ شَانِئَکَ ہُوَ الۡاَبۡتَرُ ۠

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ ہم نے تجھے کوثر (بہت زیادہ خیر و برکت) عطا کی۔

۲۔ اَب جب کہ یہ بات ہے تو اپنے پروردگار کے لیے نماز پڑھ اور قربانی دے۔

۳۔ یقیناً تیرا دُشمن ہی اَبتر (اور بلا عقب و مقطوع النسل) ہے۔

تفسیر

ہم نے تجھے فراواں خیر و برکت دی

اس تمام سورے میں روئے سُخن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے (جیسا کہ سُورۂ والضحٰی اور سورہ الم نشرح میں ہے) اور تینوں سُوروں کے اہم اہداف و مقاصد میں سے ایک آنحضرتؐ کے دل کو دردناک انبوہ حوادث میں تسلی دینا اور دشمنوں کے بار بار لگائے ہوئے زبان کے زخموں کے مقابلہ میں تشفی بخشنا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "ہم نے تجھے کوثر عطا کیا" (انا اعطیناک الکوثر)۔

"کوثر" وصف ہے جو "کثرت" سے لیا گیا ہے، اور فراواں خیر و برکت کے معنی میں ہے۔ اور "سخی" افراد کو بھی "کوثر" کہا جاتا ہے۔

اس بارے میں کہ یہاں کوثر سے کیا مراد ہے ۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ جس وقت یہ سورہ نازل ہوا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر پر تشریف لے گئے، اور اس سورہ کی تلاوت فرمائی۔ اصحاب نے عرض کیا یہ کیا چیز ہے جو خدا نے آپ کو عطا فرمائی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ جنت میں ایک نہر ہے، جو دودھ سے زیادہ سفید اور قدح (بلور) سے زیادہ صاف ہے، اس کے اطراف میں دُر و یاقوت کے قبے ہیں۔[1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"کوثر جنت میں ایک نہر ہے جو خدا نے اپنے پیغمبرؐ کو ان کے فرزند (عبداللہ جو آپ کی زندگی میں فوت ہو گئے تھے) کے بدلے میں عطا کی ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد وہی "حوض کوثر" ہے جو پیغمبر سے تعلق رکھتا ہے، اور جس سے مومنین جنت میں داخل ہونے کے وقت سیراب ہوں گے۔

بعض نے اس کی نبوت سے تفسیر کی ہے، بعض دوسروں نے قرآن سے، بعض نے اصحاب و انصار کی کثرت سے اور بعض نے کثرتِ اولاد اور ذریت سے، جو سب آپ کی دختر نیک اختر فاطمہ زہرا علیہا السلام سے وجود میں آئی اور اس قدر بڑھ گئی ہے کہ حساب و شمار سے باہر ہو گئی ہے اور دامنِ قیامت تک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود کی یادگار ہے۔ بعض نے اس کی "شفاعت" سے بھی تفسیر کی ہے۔ اور اس سلسلہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث بھی نقل کی ہے۔[2]

یہاں تک کہ فخر رازی نے "کوثر" کی تفسیر میں "پندرہ قول" نقل کیے ہیں۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ ان میں سے زیادہ تر اس وسیع معنی کے واضح مصادیق کا بیان ہے، کیونکہ جیسا کہ ہم نے کہا ہے "کوثر" "خیر کثیر اور فراواں نعمت" کے معنی میں ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت ہی زیادہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ اور جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے ان میں سے ہر ایک اس کے مصادیق میں سے ایک واضح مصداق ہے۔ اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مصداق ہیں، جنہیں آیت کی مصداقی تفسیر کے عنوان سے بیان کیا جا سکتا ہے۔

بہر حال تمام میدانوں میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر تمام نعمتیں ــ یہاں تک کہ دشمنوں کے ساتھ جنگوں میں آپ کی کامیابیوں میں، یہاں تک کہ آپ کی امت کے علماء، جو ہر عصر اور ہر زمانہ میں قرآن و اسلام کی مشعلِ فروزاں کی پاسداری کرتے ہیں اور اُسے دنیا کے ہر گوشہ میں لے جاتے ہیں۔ سب اس خیر کثیر میں شامل ہیں۔

اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ خدا اپنے پیغمبرؐ سے یہ بات اس وقت کہہ رہا ہے کہ ابھی تک اس خیر کثیر کے آثار ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ یہ ایک ایسی خبر اور پیش گوئی تھی جو مستقبل قریب اور مستقبل بعید کے لیے کی جا رہی تھی۔ یہ ایک اعجاز آمیز اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی حقانیت کو بیان کرنے والی خبر ہے۔

اس عظیم نعمت اور خیرِ فراواں کے لیے بہت ہی زیادہ شکر ادا کرنے کی ضرورت ہے، اگرچہ مخلوق کا شکر ادا کرنا خالق کی نعمت

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۴۹

[2] "وہی مدرک"

کے حق کو ہرگز ادا نہیں کرتا، بلکہ شکر گزاری کی توفیق اس کی طرف سے خود ایک اور نعمت ہے، لہٰذا فرماتا ہے: "اب جب کہ ایسا ہے تو صرف اپنے پروردگار کے لیے نماز پڑھ اور قربانی دے"۔ (فصل لربك وانحر)۔

ہاں! نعمت کا بخشنے والا وہی ہے۔ اسی بنا پر نماز، عبادت اور قربانی جو ایک قسم کی عبادت ہے، اس کے علاوہ کسی اور کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی. خصوصاً "رب" کے مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو نعمتوں کے دوام اور پروردگار کی تدبیر و ربوبیت کو بیان کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ "عبادت" خواہ نماز کی صورت میں ہو، یا قربانی کرنے کی صورت میں، وہ رب اور ولی نعمت کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ اور وہ خدا کی ذاتِ پاک سے وابستہ ہے۔

یہ بات مشرکین کے اعمال کے مقابلہ میں ہے جو اپنی نعمتوں کو تو خدا ہی کی طرف سے سمجھتے تھے۔ لیکن سجدہ اور قربانی بتوں کے لیے کرتے تھے۔ بہرحال "لربك" کی تعبیر عبادات میں قصدِ قربت کے لازم ہونے کے مسئلہ پر ایک واضح دلیل ہے۔

بہت سے مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ نماز سے مراد عید قربان کے دن کی نماز ہے۔ اور قربانی کرنا بھی اسی دن ہے۔ لیکن ظاہراً آیت کا مفہوم عام اور وسیع ہے۔ اگرچہ عید کے دن کی نماز اور قربانی بھی اس کا ایک واضح مصداق ہے۔

"وانحر" "نحر" کے مادہ سے، اونٹ کو حلال کرنے کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ بات شاید اس بناء پر ہے کہ قربانیوں میں سے اونٹ کی قربانی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی اور پہلے پہل مسلمان اس سے زیادہ لگاؤ رکھتے تھے اور اونٹ کی قربانی دینا ایثار و قربانی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

اوپر والی آیت کے لیے یہاں دو اور تفسیریں بھی بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ "وانحر" کے جملہ سے مراد نماز کے وقت رو بقبلہ کھڑا ہونا ہے، چونکہ "نحر" کا مادہ گلے والی جگہ کے معنی میں ہے اس کے بعد عربوں نے اسے ہر چیز کے آمنے سامنے ہونے کے معنی میں استعمال کیا ہے، لہٰذا وہ کہتے ہیں:

"منازلنا تتناحر" یعنی ہمارے گھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہیں۔

۲۔ اس سے مراد تکبیر کے وقت ہاتھوں کو بلند کرنا اور گلے اور چہرے کے سامنے لانا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے:

"جس وقت یہ سورہ نازل ہوا، تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرئیل سے سوال کیا:
یہ "نُحَیرہ"[1] جس کے لیے میرے پروردگار نے مجھے مامور کیا ہے، کیا ہے؟

"جبرئیل" نے عرض کیا:

"یہ نحیرہ نہیں ہے، بلکہ خدا نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ جس وقت نماز میں داخل ہوں تو تکبیر کہتے وقت اپنے ہاتھوں کو بلند کریں، اور اسی طرح جب رکوع کریں، یا رکوع سے سر اٹھائیں، یا سجدہ کریں، اس وقت بھی، کیونکہ ہماری اور سات آسمانوں کے

---

[1] "نحیرہ" مہینہ کے آخری دن کے معنی میں ہے، چونکہ اس دن انسان نئے چاند کے استقبال کے لیے جاتا ہے اور بعض نے اسے مہینہ کے آخری شب و روز کے معنی میں لیا ہے، تو اس بنا پر روایت کا معنی اس طرح ہوگا، یہ اگلے مہینہ کا استقبال جس کا خدا نے مجھے حکم دیا ہے کیا ہے؛ لہٰذا جبرئیل نے کہا یہ "نحیرہ" نہیں ہے۔

فرشتوں کی نماز اسی طرح کی ہے۔ اور ہر چیز کی ایک زینت ہوتی ہے، اور نماز کی زینت ہر تکبیر کے وقت ہاتھوں کو بلند کرنا ہے :[1]

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں اپنے دستِ مبارک سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :

"اس سے مراد یہ ہے کہ نماز کے آغاز میں ہاتھوں کو اس طرح بلند کرو کہ ان کی ہتھیلیاں رُو بقبلہ ہوں۔"[2]

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے، کیونکہ اس سے مراد بُت پرستوں کے اعمال کی نفی ہے جو غیر خدا کے لیے عبادت و قربانی کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان تمام روایات اور مطالب کے درمیان جمع کرنا، جو اس سلسلہ میں ہم تک پہنچی ہیں کوئی مانع نہیں ہے۔ خاص طور سے تکبیرات کے وقت ہاتھ بلند کرنے کے سلسلہ میں تو شیعہ اور اہلِ سنّت کی کتابوں میں متعدد روایات نقل ہوئی ہیں۔ اس طرح سے یہ آیت ایک جامع مفہوم رکھتی ہے جو ان کو بھی شامل ہے۔

اور اس سورہ کی آخری آیت میں، اس نسبت کی طرف توجہ دیتے ہوئے، جو شرک کے سرغنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف دیتے تھے، فرماتا ہے : "تو اَبتر اور بلا عقب و مقطوع النسل نہیں ہے۔ بلکہ تیرا دشمن اَبتر، بلا عقب اور مقطوع النسل رہے گا۔" (انّ شانئك هوالابتر)۔

"شانئ" "شنئان" (بروزن ضربان) کے مادہ سے عداوت دُشمنی، کینہ ورزی اور بدخلقی کرنے کے معنی میں ہے اور "شانئ" اس شخص کو کہتے ہیں جو اس صفت کا حامل ہو۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "ابتر" اصل میں "دُم کٹے جانور" کے معنی میں ہے، اور دُشمنانِ اسلام کی طرف سے اس تعبیر کا انتخاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہتکِ حرمت اور توہین کرنے کے لیے تھا۔ اور "شانئ" کی تعبیر اسی واقعیت کو بیان کرتی ہے کہ وہ اپنی دشمنی میں کم سے کم آداب کی رعایت تک بھی نہیں کرتے تھے۔ یعنی ان کی عداوت دُشمنی قساوتُ رذالت سے آمیختہ تھی۔ حقیقت میں قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ لقب خود تمہارا ہے نہ کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا۔

دوسری طرف — جیسا کہ سورہ کی شانِ نزول میں بیان کیا گیا ہے — قریش پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اور اسلام کی بساط کے اُلٹ جانے کے انتظار میں تھے، کیونکہ وہ یہ کہتے تھے کہ آپ کے پیچھے کوئی اولاد نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تو بلا عقب اور بے اولاد نہیں ہے بلکہ تیرے دشمن ہی بلا عقب اور بے اولاد ہیں۔

چند نکات

۱۔ حضرت فاطمہ (ع) اور "کوثر"

ہم بیان کر چکے ہیں کہ "کوثر" ایک عظیم جامع اور وسیع معنی رکھتا ہے۔ اور وہ "خیرِ کثیر و فراواں ہے" اور اس کے

[1,2] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۵۰

بہت زیادہ مصادیق ہیں۔ لیکن بہت سے بزرگ شیعہ علماء نے اس کے واضح ترین مصادیق میں سے ایک مصداق "فاطمہ زہراؑ" (سلام اللہ علیہا) کے وجود مبارک کو سمجھا ہے۔ چونکہ آیت کی شانِ نزول سے ظاہر ہے کہ دشمن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ابتر اور بلاعقب ہونے سے متہم کرتے تھے۔ قرآن ان کی بات کی نفی کے ضمن میں کہتا ہے: "ہم نے تجھے کوثر عطا کیا ہے" اس تعبیر کا مطلب یہی بنتا ہے کہ یہ "خیر کثیر" فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا ہی ہیں کیونکہ پیغمبرؐ کی نسل اور ذریت اسی دُخترِ گرامی کے ذریعے سارے عالم میں منتشر ہوئی، جو نہ صرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جسمانی اولاد تھی بلکہ انہوں نے آپ کے دین اور اسلام کی تمام اقدار کی حفاظت کی اور اُسے آنے والوں تک پہنچایا۔ نہ صرف اہلِ بیتؑ کے آئمہ معصومینؑ جن کی اپنی ایک مخصوص حیثیت تھی، بلکہ ہزارہا فرزندانِ فاطمہ عالم میں پھیل گئے، جن میں بڑے بڑے بزرگ علماء، مؤلفین، فقہا، محدثین، مفسرین والا مقام، اور عظیم حکمران ہو گزرے ہیں جنہوں نے ایثار و قربانی اور فداکاری کے ساتھ دینِ اسلام کی حفاظت کی کوشش کی۔

یہاں پر "فخر رازی" کی ایک عمدہ بحث ہمارے سامنے آئی ہے جو اُس نے کوثر کی مختلف تفسیروں کے ضمن میں بیان کی ہے:

تیسرا قول یہ ہے کہ یہ سورہ ان لوگوں کے ردّ کے عنوان سے نازل ہوا ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کے نہ ہونے پر طعن و طنز، اور تنقید و اعتراض کرتے تھے۔ اس بناء پر سورہ کا معنی یہ ہوگا کہ خدا آپ کو ایسی نسل دے گا جو زمانۂ دراز تک باقی رہے گی۔ غور تو کرو کہ لوگوں نے اہلِ بیتؑ کے کتنے افراد کو شہید کیا۔ لیکن اس کے باوجود دُنیا اُن سے بھری پڑی ہے۔ جب کہ بنی اُمیہ میں سے (جو اسلام کے دشمن تھے) کوئی قابلِ ذکر شخص دنیا میں باقی نہیں رہا۔ پھر آنکھ کھول کر دیکھو اور غور کرو کہ فاطمہؑ کی اولاد کے درمیان باقرؑ و صادقؑ و رضاؑ و نفسِ ذکیہؑ[1] جیسے کتنے عظیم اور بزرگ علماء ہوئے ہیں۔[2]

۲۔ اس سُورہ کا اعجاز

درحقیقت اس سُورہ میں تین پیشین گوئیاں بیان کی گئی ہیں۔ ایک طرف تو پیغمبرؐ کو خیر کثیر عطا کرنے کی خوش خبری دیتی ہے۔ (اگرچہ "اعطینا" فعل ماضی کی صورت میں ہے لیکن ممکن ہے کہ یہ مضارع مسلّم کی قسم سے ہو، جو ماضی کی صورت میں بیان ہوا ہے)۔ اور یہ خیر کثیر ان تمام فتوحات، کامیابیوں اور توفیقات کو شامل ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بعد میں نصیب ہوئی ہیں۔ اگرچہ وہ مکہ میں اس سُورہ کے نزول کے وقت پیش بینی کے قابل نہیں تھیں۔

دُوسری طرف یہ سُورۃ اس بات کی خبر دے رہا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے اولاد، بلاعقب اور مقطوع النسل نہیں ہوں گے۔ بلکہ آپ کی نسل اور اولاد بڑی کثرت سے عالم میں موجود رہے گی۔

تیسری جانب یہ سورہ اس بات کی خبر دیتا ہے کہ آپ کے دشمن اُبتر، بلاعقب اور مقطوع النسل ہو جائیں گے۔ یہ پیشگوئی بھی پوری ہوگئی ہے اور آپ کے دشمن اس طرح تتر بتر اور تباہ و برباد ہوئے کہ آج ان کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔ حالانکہ "بنی اُمیہ" اور "بنی عباس" جیسے قبائل جو پیغمبرؐ اور ان کی اولاد کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے ایک وقت اتنی جمعیت اور کثرت

---

[1] "نفس زکیہ" "امام حسن مجتبیٰؑ" کے فرزند "محمد بن عبداللہ" کا لقب ہے، جو منصور دوانقی کے ہاتھوں ۱۴۵ ہجری میں شہید ہوئے۔

[2] "تفسیر فخر رازی" جلد ۳۲ ص ۱۲۴

رکھتے تھے کہ ان کی اولاد شمار میں نہ آتی تھی، لیکن آج اگر اُن میں سے کوئی باقی رہ بھی گیا ہو تو وہ بالکل پہچانا نہیں جاتا۔

۳۔ خُدا کے لیے جمع کی ضمیر کس لیے ہے؟

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہاں بھی اور قرآن مجید کی اور بہت سی دُوسری آیات میں بھی صیغہ "متکلم مع الغیر" (جمع متکلم) کے ساتھ اپنا ذکر کرتا ہے۔ فرماتا ہے: "ہم نے تجھے کوثر عطا کیا۔"

یہ تعبیر اور اس قسم کی تعبیریں عظمت و قدرت کو بیان کرنے کے لیے ہوتی ہیں کیونکہ بزرگ اور بڑی ہستیاں جب اپنے بارے میں بات کرتی ہیں، تو وہ صرف اپنے بارے میں ہی نہیں، بلکہ اپنے ماموریں کارندوں کے بارے میں بھی خبر دیتی ہیں اور یہ قدرت و عظمت اور ان کے اوامر کے مقابلہ میں فرمانبرداری کرنے والوں سے کنایہ ہے۔

زیر بحث آیت میں لفظ "ان" بھی اس معنی پر ایک دوسری تاکید ہے۔ اور "اٰتیناك" کے بجائے "اعطیناك" کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ خدا نے پیغمبرؐ کو کوثر بخش دیا ہے اور عطا کر دیا ہے۔ اور یہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایک بہت بڑی بشارت ہے تاکہ دشمنوں کی بیہودہ باتوں سے آپ کا قلب مبارک آزردہ نہ ہو۔ اور آپ کے آہنی عزم میں سستی اور کمزوری پیدا نہ ہونے پائے۔ اور دُشمن یہ جان لیں کہ آپ کی تکیہ گاہ وہ خدا ہے، جو تمام خیرات کا منبع ہے اور اس نے خیرِ کثیر آپ کو بخش دی ہے۔

خداوندا! ہمیں اس خیرِ کثیر کی برکات سے جو تُو نے اپنے پیغمبرؐ کو مرحمت فرمائی ہے، بے نصیب نہ کرنا۔

پروردگارا! تُو جانتا ہے کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی ذُریّت طاہرہ کو خلوص دل کے ساتھ دوست رکھتے ہیں، لہٰذا ہمیں انہیں کے ساتھ محشور کرنا۔

بارِ الٰہا! آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے دین و آئین کی بہت بڑی عظمت ہے، اس عظمت و عزت و شوکت میں روز بروز اضافہ فرما۔

آمین یا ربّ العالمین

اختتام سُورۂ کوثر

سُورَۃ اَلْکٰفِرُوْن

* یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا
* اس میں ۶ آیات ہیں

سورۂ کافرون کے مطالب اور اس کی فضیلت

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس کا لب ولہجہ اور اس کے مطالب اس بات کے واضح گواہ ہیں۔ اسی طرح وہ شانِ نزول جس کی طرف بعد میں اشارہ ہوگا، اس مدعا پر دوسری دلیل ہے ۔۔ یہ جو بعض نے اس کے مدنی ہونے کا احتمال دیا ہے بہت بعید نظر آتا ہے۔

سورہ کا لب ولہجہ بتاتا ہے کہ یہ سورہ ایسے زمانہ میں نازل ہوا جب مسلمان اقلیت میں تھے اور کفار اکثریت میں۔ پیغمبرؐ پر ان کی طرف سے سخت دباؤ تھا اور انہیں اصرار تھا کہ کسی طرح سازش کرکے آپ کو شرک کی طرف کھینچ لیں۔ پیغمبرؐ نے ان کی اس پیش کش کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا اور انہیں کُلّی طور پر مایوس کر دیا اور ان کے ساتھ اُلجھے بھی نہیں۔

یہ بات تمام مسلمانوں کے لیے ایک نمونہ ہے کہ وہ اِسلام اور دین کی اساس کے بارے میں دشمن کے ساتھ کسی حالت میں بھی مصالحت نہ کریں اور جب بھی ان کی طرف سے اس قسم کی خواہش کی جائے تو انہیں کامل طور سے مایوس کر دیں۔ اس سورہ میں اس معنی پر خصوصیت کے ساتھ دو مرتبہ تاکید ہوئی ہے کہ " میں تمہارے معبُودوں کی پرستش نہیں کروں گا" اور یہ تاکید انہیں مایوس کرنے کے لیے ہے۔ اسی طرح اس بات کی بھی دوبار تاکید ہوئی ہے کہ " تم بھی ہرگز میرے معبُودِ خدائے یگانہ کی عبادت نہیں کروگے "۔ یہ ان کی ہٹ دھرمی کی ایک دلیل ہے اور اس کا انجام یہ ہے کہ " میں ہوں اور میرا دین توحید، اور تم ہو اور تمہارا شرک آلود دین "۔

اس سُورہ کی فضیلت کے بارے میں بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں جو اس کے مطالب کی حد سے زیادہ اہمیت کی ترجمان ہیں۔

ایک حدیث میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

"من قرأ قل یاایها الکافرون فکانما قرأ ربع القرآن و تباعدت عنه مردة الشیاطین، و برأ من الشرك، و یعافی من الفزع الاکبر".

"جو شخص سورہ "قل یا ایها الکافرون" کو پڑھے گا تو ایسا ہے جیسے اس نے چوتھائی قرآن پڑھا ہو، سرکش شیاطین اس سے دُور رہیں گے، وہ شرک سے پاک ہو جائے گا اور "روزِ قیامت" کی گھبراہٹ سے امان میں ہوگا۔[1]

"ربع القرآن" (چوتھائی قرآن) کی تعبیر شاید اس بناء پر ہے کہ قرآن کا تقریباً چوتھا حصہ شرک و بُت پرستی سے مبارزہ میں ہے اور اس کا نچوڑ اور خلاصہ اس سُورہ میں آیا ہے۔ اور سرکش شیاطین کا دُور ہونا اس بناء پر ہے کہ اس سُورہ میں مشرکین کی پیشکش کو ٹھکرا دیا گیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ شرک شیطان کا اہم ترین آلہ ہے۔

قیامت میں نجات بھی پہلے درجہ میں توحید اور نفیِ شرک کی مرہونِ منت ہے، وہی مطلب جس کے محور پر یہ سورہ گردش کرتا ہے۔

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس نے عرض کیا: اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس لیے آیا ہوں کہ آپؐ مجھے کسی ایسی چیز کی تعلیم دیجئے جسے میں سوتے وقت پڑھا کروں، آپؐ نے فرمایا:

"اذا اخذت مضجعك فاقرأ قل یاایها الکافرون ثم نم علی خاتمتها فانها براءة من الشرك":

"جب تو اپنے بستر پر جائے تو سُورہ قل یا ایها الکافرون کو پڑھ۔ اس کے بعد سو جا کیونکہ یہ شرک سے بیزاری ہے۔[2]

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ نے "جبیرؓ بن مطعم" سے فرمایا:

"کیا تُو اس بات کو دوست رکھتا ہے کہ جب تُو سفر پر جائے تو زادِ راہ اور توشہ کے لحاظ سے اپنے ساتھیوں میں سب سے بہتر ہو"؟ اس نے عرض کی:

ہاں! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ان پانچ سُورتوں کو پڑھا کرو: "قل یا ایها الکافرون" و "اذا جاء نصر الله والفتح" و "قل هو الله احد" و "قل اعوذ برب الفلق" و "قل اعوذ برب الناس" اور اپنی قرأت کی ابتدا "بسم الله الرحمٰن الرحیم" سے کیا کرو۔

اور ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا: "میرے والد کہا کرتے تھے کہ "قل یاایها الکافرون" رُبع قرآن ہے اور جب آپ اس کی قرأت سے فارغ ہوتے تو فرماتے: "اعبد الله وحده، اعبد الله وحده" "میں صرف خدائے واحد کی عبادت کرتا ہوں"، "میں صرف خدائے واحد کی عبادت کرتا ہوں"۔

---

[1] ۔ "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۵۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ قُلۡ يٰۤاَيُّهَا الۡكٰفِرُوۡنَ ۙ

۲۔ لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۙ

۳۔ وَلَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ۚ

۴۔ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ ۙ

۵۔ وَلَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ؕ

۶۔ لَكُمۡ دِيۡنُكُمۡ وَلِىَ دِيۡنِ ۚ

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ کہہ دو! اے کافرو!

۲۔ جن کی تم پرستش کرتے ہو مَیں ان کی عبادت نہیں کرتا۔

۳۔ اور نہ تم اس کی عبادت کروگے جس کی مَیں پرستش کرتا ہوں۔

۴۔ اور نہ ہی میں ان کی پرستش کروں گا جن کی تم پرستش کرتے ہو۔

۵۔ اور نہ تم اس کی پرستش کروگے جس کی مَیں عبادت کرتا ہوں۔

۶۔ (اَب جب کہ معاملہ اس طرح ہے تو) تمہارا دین تمہارے لیے اور میرا دین میرے لیے۔

شانِ نزول

روایات میں آیا ہے کہ یہ سُورہ مشرکین کے سرغنوں کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوا ہے۔ مثلاً "ولید بن مغیرہ" "عاص بن وائل" "حارث بن قیس" اور "اُمیہ بن خلف" وغیرہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ اے محمدؐ! آؤ تم ہمارے دین کی پیروی کرو، ہم بھی تمہارے دین کی پیروی کر لیتے ہیں اور ہم تمہیں اپنے تمام امتیازات میں شریک کر لیں گے۔ ایک سال تو تم ہمارے خداؤں کی عبادت کیا کرو اور دوسرے سال ہم تمہارے خدا کی عبادت کیا کریں گے۔ اگر تمہارا دین بہتر ہے تو ہم اس میں شریک ہو گئے ہیں اور اپنا حصّہ اس میں سے لے لیا ہے۔ اور اگر ہمارا دین بہتر ہوا تو تم ہمارے دین میں شریک ہو گئے اور تم نے اس میں سے اپنا حصّہ لے لیا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"مَیں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ کسی چیز کو اس کا شریک قرار دوں"

اُنہوں نے کہا: کم از کم ہمارے خداؤں کو چھو ہی لو اور ان سے تبرک حاصل کر لو تو ہم تمہاری بات مان لیں گے اور تمہارے خدا کی پرستش کرنے لگیں گے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"مَیں تو اپنے پروردگار کے حکم کا منتظر ہوں۔ تو اس موقع پر سُورۂ "قل یاایھا الکافرون" نازل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد الحرام میں آئے جب کہ قریش کے سرداروں کی ایک جماعت وہاں جمع تھی۔ تو آپؐ نے اُن کے سروں کے اُوپر کھڑے یہ سورہ آخر تک ان کے سامنے پڑھا۔ جب اُنہوں نے اس سُورہ کے پیام کو سُنا تو مکمل طور پر مایوس ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کو آزار پہنچانے لگے۔[1]

تفسیر

بُت پرستوں کے ساتھ ہرگز مصالحت نہیں ہو سکتی

اِس سُورہ کی آیات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہیں: "کہہ دو اے کافرو!

---

[1] اس شانِ نزول کو عبارتوں میں مختصر سے اختلاف کے ساتھ بہت سے مفسرین نے نقل کیا ہے، منجملہ "طبرسی" نے "مجمع البیان" میں" قرطبی" نے اپنی تفسیر میں" ابوالفتوح رازی" نے اپنی تفسیر میں، اور" سیوطی" نے "درالمنثور" میں۔

(قل یاایھا الکافرون)۔

"تم جن کی پرستش کرتے ہو میں ان کی پرستش نہیں کرتا" (لا اعبد ما تعبدون)۔

"اور نہ ہی تم اس کی پرستش کروگے جس کی میں پرستش کرتا ہوں" (ولا انتم عابدون ما اعبد)۔

اس طرح اپنی مکمل علیحدگی کو مشخص کرتا ہے اور صراحت کے ساتھ کہتا ہے: "میں ہرگز بھی بت پرستی نہیں کروں گا" اور تم بھی اپنی اس ہٹ دھرمی اور اپنے بڑوں کی اندھی تقلید کے باعث، جس پر تمہیں اصرار ہے، اور بت پرستوں کی طرف سے جو بکثرت ناجائز منافع تمہیں حاصل ہوتے ہیں اس وجہ سے ہرگز شرک سے خالص خدا پرستی کی طرف نہیں آسکتے۔

بت پرستوں کو توحید و بت پرستی میں کسی قسم کی مصالحت سے مکمل طور پر مایوس کرنے کے لیے دوبارہ مزید فرماتا ہے: اور نہ ہی میں ہرگز ان کی پرستش کروں گا جن کی تم پرستش کرتے ہو: (ولا انا عابد ما عبدتم)۔

"اور نہ ہی تم اس کی پرستش کروگے جس کی میں عبادت کرتا ہوں": (ولا انتم عابدون ما اعبد)۔

اس بنا پر بت پرستی کے مسئلہ پر بے جا مصالحت کے لیے اصرار نہ کرو، کیونکہ یہ بات غیر ممکن ہے۔

"اب جب کہ معاملہ اس طرح ہے تو تمہارا دین تمہارے لیے اور میرا دین میرے لیے"۔ (لکم دینکم ولی دین)۔

"بہت سے مفسرین نے یہ تصریح کی ہے کہ یہاں "کافرون" سے مراد مکہ کے بت پرستوں کے سرغنوں کا ایک خاص گروہ ہے، اس بنا پر "الکافرون" پر "الف ولام" اصطلاح کے مطابق "عہد" کا ہے "جمع" کا نہیں ہے۔

ممکن ہے کہ اس مطلب پر ان کی دلیل۔ اس چیز کے علاوہ جو شانِ نزول میں بیان کی جا چکی ہے ۔۔ یہ ہو کہ مکہ کے بت پرستوں میں سے بہت سے آخرکار ایمان لے آئے تھے۔ اس بنا پر اگر وہ یہ کہتا ہے کہ: "نہ تم میرے معبود کی عبادت کروگے اور نہ ہی میں تمہارے معبودوں کی، تو یقینی طور پر یہ شرک و کفر کے سرغنوں کے اس گروہ کے بارے میں ہے جو آخری عمر تک ہرگز ایمان نہیں لایا، ورنہ فتح مکہ کے موقع پر بہت سے مشرکین فوج در فوج اسلام میں داخل ہوگئے تھے۔

یہاں چند سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب دینا ضروری ہے۔

۱۔ یہ سورہ "قل" (کہہ دے) کے ساتھ شروع کیوں ہوا؟

کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ "قل" اس کے آغاز میں لائے بغیر "یاایھا الکافرون" کہا جاتا؟ دوسرے لفظوں میں پیغمبر کو خدا کے حکم کا اجراء کرنا چاہیئے تھا اور انہیں "یاایھا الکافرون" کہنا چاہیئے تھا، نہ کہ جملہ "قل" کا بھی تکرار کریں۔

اس سوال کا جواب سورہ کے مضمون کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہوتا ہے۔ کیونکہ مشرکین عرب نے پیغمبر کو بتوں کے سلسلے میں مصالحت کرنے کی دعوت دی تھی، لہٰذا آپ کے لیے اپنی طرف سے اس مطلب کی نفی کرنا ضروری تھا اور یہ کہنا چاہیئے تھا کہ میں ہرگز تمہاری بات نہیں مانوں گا اور اپنی عبادت کو شرک سے آلودہ نہیں کروں گا۔ اگر اس سورہ کے آغاز میں لفظ "قل" نہ ہوتا تو یہ بات خدا کی بات ہوجاتی اور اس صورت میں "لا اعبد ما تعبدون" (تم جن کی عبادت کرتے ہو میں ان کی عبادت نہیں کروں گا) کا جملہ اور اسی قسم کے دوسرے جملوں کا کوئی مفہوم نہ ہوتا۔

اس کے علاوہ چونکہ جبرئیل کے پیام میں لفظ "قل" خدا کی طرف سے تھا، لہٰذا پیغمبر کی ذمہ داری یہ ہے کہ قرآن کی اصالت

کی حفاظت کے لیے اسے بعینہٖ بیان کریں اور خود یہی چیز اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ " جبرئیل " اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وحی الٰہی کے نقل کرنے میں معمولی سی بھی تبدیلی نہیں کی اور اُنہوں نے عملی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایسے مامور ہیں جو فقط فرمانِ الٰہی پر ہی کان دھرتے ہیں جیسا کہ سُورۂ یونس کی آیہ ۱۵ میں آیا ہے : قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقائی نفسی ان اتبع الا ما یوحٰی الیّ : کہ دیجئے مجھے اس بات کا کوئی حق نہیں ہے کہ میں قرآن کو اپنی طرف سے بدل دوں میں تو صرف اس بات کی پیروی کرتا ہوں جس کی مجھ پر وحی ہوتی ہے۔

۲۔ کیا بُت پرست خدا کے منکر تھے ؟

ہم جانتے ہیں کہ بُت پرستوں کو ہرگز خدا کا انکار نہیں تھا۔ اور قرآن کی صریح آیات کے مطابق جب اُن سے آسمان و زمین کے خالق کے بارے میں پوچھا جاتا تھا تو وہ یہ جواب دیتے تھے کہ وہ خدا ہے : ولئن سألتھم من خلق السمٰوات والارض لیقولن اللہ (لقمان - ۲۵)

تو پھر وہ اس سُورہ میں یہ کیسے کہتا ہے : " نہ تو میں تمہارے معبود کی پرستش کروں گا اور نہ ہی تم میرے معبود کی پرستش کرو گے "

اس سوال کا جواب بھی اس چیز کی طرف توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ بحث مسئلہ خلقت کے بارے میں نہیں ہے بلکہ مسئلہ عبادت کے بارے میں ہے۔ بُت پرست ، خالقِ جہاں خدا ہی کو سمجھتے تھے۔ لیکن ان کا عقیدہ یہ تھا کہ عبادت بتوں ہی کی کرنا چاہیئے تاکہ وہ بارگاہِ خدا میں واسطہ بنیں ، یا یہ کہ ہم اصلاً اس لائق نہیں ہیں کہ خدا کی پرستش کریں ، لہٰذا ہمیں جسمانی بتوں کی عبادت کرنا چاہیئے۔ اس موقع پر قرآن اُن کے اوہام اور خیالات پر سُرخ لکیر کھینچتے ہوئے رد کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ عبادت تو صرف خدا ہی کی ہونا چاہیئے ، نہ بُتوں کی ہونا چاہیئے اور نہ ہی دونوں کی۔

۳۔ یہ تکرار کس لیے ہے ؟

اس بارے میں کہ پیغمبرؐ کی طرف سے بُتوں کی عبادت کی نفی کی تکرار اور مشرکین کی طرف سے خدا کی عبادت کی نفی کی تکرار کس بنا پر ہے ، بہت زیادہ اختلاف ہے۔

ایک جماعت کا عقیدہ تو یہ ہے کہ یہ تکرار تاکید اور مشرکین کو مکمل طور پر مایوس کرنے ، ان کے راستے کو اسلام کے راستے سے جُدا کرنے اور یہ ثابت کرنے کے لیے ہے کہ توحید و شرک کے درمیان مصالحت کا امکان نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں ، چونکہ وہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو شرک کی طرف دعوت دینے میں اصرار کے ساتھ تکرار کرتے تھے ، لہٰذا قرآن بھی ان کے رد کرنے میں تکرار کرتا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ (امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے کے ایک زندیق) " ابوشاکر دیصانی " نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک صحابی " ابوجعفر احول " (محمد بن علی نعمانی کوفی معروف بہ مومن طاق) سے ان آیات کے تکرار کی دلیل کے بارے میں سوال کیا اور یہ کہا کہ کیا کسی عقل مند آدمی سے یہ بات ممکن ہے کہ اس کے کلام میں اس قسم کی تکرار ہو ؟

ابوجعفر احول کے پاس چونکہ اس کا کوئی جواب نہیں تھا لہٰذا وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں مدینہ پہنچے اور اس سلسلہ میں سوال کیا تو امامؑ نے فرمایا:

" ان آیات کے نزول اور ان میں تکرار کا سبب یہ تھا کہ قریش نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایک سال آپ ہمارے خداؤں کی پرستش کریں اور دوسرے سال ہم آپ کے خدا کی عبادت کریں گے اور اسی طرح بعد والے سال میں آپ ہمارے خداؤں کی عبادت کریں اور اس کے اگلے سال ہم آپ کے خدا کی عبادت کریں گے، تو اُوپر والی آیات نازل ہوئیں اور ان تمام تجاویز کی نفی کی "

جب ابوجعفر " احول " نے " ابو شاکر " کو یہ جواب دیا تو اس نے کہا:

" ھٰذا ما حملہ الابل من الحجاز "

" یہ وہ بار ہے جسے اُونٹ حجاز سے اُٹھا کر لائے ہیں " [1]

(یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تیرا جواب نہیں ہے بلکہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا قول ہے)۔

بعض دوسروں نے یہ کہا ہے کہ یہ تکرار اس بنا پر ہے کہ ایک جملہ تو حال کے بیان کے لیے ہے اور دوسرا استقبال کے بیان کے لیے، یعنی میں ہرگز بھی نہ تو حال میں تمہارے معبودوں کی پرستش کروں گا اور نہ ہی کبھی آئندہ تمہارے معبودوں کی عبادت کروں گا۔

لیکن ظاہراً اس تفسیر پر کوئی شاہد موجود نہیں ہے۔

ایک تیسری تفسیر بھی اس تکرار کے لیے بیان کی گئی ہے کہ پہلا جملہ تو معبودوں کے اختلاف کو اور دوسرا عبادت کے اختلاف کو بیان کرتا ہے۔ یعنی نہ تو میں ہرگز تمہارے معبودوں کی عبادت کروں گا اور نہ ہی میری عبادت تمہاری عبادت کی طرح ہے، کیونکہ میری عبادت مخلصانہ اور ہر قسم کے شرک سے خالی ہے۔

علاوہ ازیں تمہارا بُتوں کی عبادت کرنا بڑوں کی اندھی تقلید کی بنا پر ہے۔ لیکن میرا اللہ کی عبادت کرنا تحقیق و شکرانے کے طور پر [2]

لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ تکرار تاکید کے لیے ہے، جیسا کہ ہم نے اُوپر وضاحت کی ہے۔ وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

یہاں ایک چوتھی تفسیر بھی بیان کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ: " دوسری آیت میں تو یہ فرماتا ہے کہ جن کی تم اَب

---

[1] " تفسیر علی بن ابراہیم " جلد ۲ ص ۴۴۵

[2] اس تفسیر کی بنا پر " ما " دوسری اور تیسری آیت میں " ما موصولہ " ہے، اور چوتھی اور پانچویں آیت میں " مصدریہ " اس وجہ کو ابوالفتوح رازی نے ایک تفسیر کے عنوان سے جلد ۱۲ ص ۱۹۲ پر نقل کیا ہے اور مرحوم طبرسی نے بھی زیر بحث آیات کے ذیل میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

عبادت کر رہے ہو میں ان کی عبادت نہیں کروں گا۔ اور چوتھی آیت میں فرماتا ہے کہ "میں نے گزشتہ زمانہ میں بھی کبھی تمہارے معبودوں کی عبادت نہیں کی ہے چہ جائیکہ اَب کروں"

یہ فرق اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ دوسری آیت میں "تعبدون" فعل مضارع کی صُورت میں ہے، اور چوتھی آیت میں "عبدتم" فعل ماضی کی صورت میں ہے، بعید نظر نہیں آتا۔[1]

اگرچہ یہ تفسیر صرف دوسری اور چوتھی آیت کے تکرار کو تو حل کرتی ہے، لیکن تیسری اور پانچویں آیت اُسی طرح اپنی پُوری قوت کے ساتھ باقی رہتی ہے۔[2]

۴۔ کیا "لکم دینکم ..." کی آیت کا مفہوم بُت پرستی کا جواز ہے ؟

کبھی یہ خیال کیا گیا ہے کہ اس سُورہ کی آخری آیت جو یہ کہتی ہے کہ: "تمہارا دین تمہارے لیے اور میرا دین میرے لیے" تو اس کا مفہوم وہی "صلح کل" ہی ہے اور یہ انہیں اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنے دین پر برقرار رہیں کیونکہ یہ دینِ اسلام کو قبول کرنے پر اصرار نہیں کرتی۔

لیکن یہ خیال انتہائی کمزور اور بے بُنیاد ہے کیونکہ آیات کا لب و لہجہ اچھی طرح سے اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ یہ تعبیر ایک قسم کی تحقیر و تہدید ہے، یعنی تمہارا دین خود تمہیں ہی مبارک ہو اور تم جلدی ہی اس کے بُرے انجام کو دیکھ لوگے۔ جیسا کہ سُورۂ قصص کی آیہ ۵۵ میں آیا ہے: و اذا سمعوا اللغو اعرضوا عنه و قالوا لنا اعمالنا ولکم اعمالکم سلام علیکم لانبتغی الجاھلین: "مومنین جب کوئی لغو اور بیہودہ بات سُنتے ہیں تو اس سے رُوگردانی کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ تم پر سلام (وداع اور جُدائی کا سلام) ہم جاہلوں کے طلب گار نہیں ہیں"!

قرآن مجید کی سینکڑوں آیتیں اس مفہوم کی گواہ ہیں جو شرک کی ہر صُورت میں سرکوبی کرتی ہیں، اسے ہر کام سے زیادہ قابلِ نفرت سمجھتی ہیں اور اُسے نہ بخشا جانے والا گناہ خیال کرتی ہیں۔

علمائے اس سوال کے دوسرے جواب بھی دیے ہیں۔ مثلاً یہ کہ آیت میں کچھ محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے: لکم جزاء دینکم ولی جزاء دینی "یعنی تمہارے دین کی جزا تمہارے لیے اور میرے دین کی جزا میرے لیے"۔

دوسرے یہ کہ یہاں "دین" جزا کے معنی میں ہے۔ اور آیت میں کوئی بھی چیز محذوف نہیں ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم اپنی جزا لوگے اور مَیں اپنی جزا لوں گا۔[3]

---

[1] اس بنا پر "عابد" کو بھی جو اسم فاعل ہے اس آیت میں ماضی کا معنی دینا چاہیئے۔

[2] ضمنی طور پر اس بات پر بھی توجہ کرنا چاہیئے کہ "ما موصولہ" اگرچہ عام طور پر غیر ذوی العقول کے لیے آتا ہے لیکن بہت سے مقامات پر دیکھا گیا ہے کہ یہ ذوی العقول کیلیے بھی استعمال ہوتا ہے، قرآن کی آیات بھی اس مطلب کی شاہد ہیں۔

[3] ضمناً توجہ رکھنا چاہیئے کہ "ولی دین" کے جملہ میں "دین" مکسور ہے اور اس کا کسرہ یا محذوف پر دلالت کرتا ہے، اور اصل میں یہ "ولی دینی" تھا۔

لیکن پہلی تفسیر اور پہلا جواب زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

۵۔ آپ نے ایک لمحہ کے لیے بھی شرک سے مصالحت نہیں کی۔

اس سورہ میں جو کچھ آیا ہے وہ حقیقت میں اس واقعیت کو بیان کرتا ہے کہ توحید و شرک دو متضاد پروگرام اور مکمل طور پر دو الگ الگ راستے ہیں اور ان میں ایک دوسرے کے ساتھ کسی قسم کی مشابہت نہیں ہے۔ توحید انسان کو خدا سے مربوط کرتی ہے جب کہ شرک اس کو خدا سے بیگانہ کر دیتا ہے۔

توحید تمام مرحلوں اور میدانوں میں وحدت و یگانگی کی رمز ہے جب کہ شرک زندگی کے تمام شئون میں تفرقہ اور پراگندگی کا سبب ہے۔

توحید انسان کو عالمِ مادہ اور جہانِ طبیعت سے بلندی کی طرف لے جاتی ہے اور ماوراء طبیعت میں خدا کے لامتناہی وجود کے ساتھ اس کا رشتہ جوڑ دیتی ہے، جبکہ شرک انسان کو طبیعت کے کنویں میں سرنگوں کر دیتا ہے اور اس کا رشتہ محدود، کمزور اور فانی موجودات کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔

اسی بناء پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمام انبیاءؑ عظام نے نہ صرف شرک کے ساتھ مصالحت نہیں کی، بلکہ ان کا پہلا اور اہم ترین پروگرام شرک کے ساتھ مبارزہ کرنا تھا۔

اج بھی راہِ حق کے تمام چلنے والوں اور اس دین کے علماء و مبلغین کو یہی راستہ اور طریقہ اختیار کرنا چاہیئے اور ہر جگہ اور ہر مقام پر ہر قسم کے شرک اور مشرکین سے ساز باز اور مصالحت سے اپنی برائت اور بیزاری کا اعلان کرنا چاہیئے۔

یہی اسلام کی اصل راہ ہے۔

خداوندا! ہمیں شرک اور شرک آلودہ افکار و اعمال سے دور رکھ۔

پروردگارا! ہمارے زمانہ کے مشرکین کے وسوسے بھی خطرناک ہے، ہمیں ان کے دامِ فریب میں گرفتار ہونے سے محفوظ رکھ۔

بارِ الٰہا! ہمیں ایسی شجاعت اور صراحت و قاطعیت مرحمت فرما کہ ہم بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح ہر قسم کے کفر و شرک کی مصالحت کی پیش کش کو رد کر دیں۔

آمین یا ربّ العالمین

سورۂ کافرون کا اختتام

اختتام ترجمہ

بروز ہفتہ تقریباً آٹھ بجے صبح

۵ شوال ۱۴۰۸ھ

بر مکانِ خود قم مقدس ایران

سُورۂ نَصر

* یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہوا۔
* اس میں ۳ آیات ہیں۔

سورۂ "نصر" کے مطالب اور اس کی فضیلت

یہ سورہ مدینہ میں ہجرت کے بعد نازل ہوا ہے اور اس میں ایک بہت بڑی کامیابی اور فتح عظیم کی بشارت ہے کہ اس کے بعد لوگ گروہ در گروہ خدا کے دین میں داخل ہوں گے، لہٰذا اس عظیم نعمت کا شکر ادا کرنے کے لیے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسبیح، حمدِ الٰہی اور استغفار کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

اگرچہ اسلام میں بہت سی فتوحات ہوئی ہیں لیکن اُوپر والی بات کے پُورا ہونے کے طور پر "فتح مکہ" کے سوا اور کوئی فتح نہیں تھی۔

خصوصاً جب کہ بعض روایات کے مطابق عربوں کا نظریہ یہ تھا کہ اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کو فتح کر لیا اور وہ اس پر مسلط ہوگئے، تو یہ ان کے حقانیت کی دلیل ہوگی، کیونکہ اگر وہ حق پر نہ ہوئے تو خدا انہیں اس قسم کی اجازت نہیں دے گا، جیسا کہ اس نے "ابرہہ" کے عظیم لشکر کو اس قسم کی اجازت نہیں دی تھی۔ اسی بنا پر مشرکینِ عرب فتح مکہ کے بعد گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہوگئے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ سورہ "صلح حدیبیہ" کے بعد اور فتح مکہ سے دو سال پہلے، ہجرت کے چھٹے سال نازل ہوا۔

لیکن یہ بات، جس کے بارے میں بعض نے احتمال دیا ہے کہ یہ فتح مکہ کے بعد ہجرت کے دسویں سال حجۃ الوداع میں نازل ہوا، بہت ہی بعید ہے کیونکہ اس سورہ کی تعبیریں اس معنی کے ساتھ سازگار نہیں ہیں، کیونکہ یہ مستقبل سے مربوط ایک حادثہ کی خبر دیتا ہے نہ کہ گزشتہ کی۔

اس سورہ کا ایک نام سورہ "تودیع" ہے۔ (تودیع یعنی خدا حافظ)۔ کیونکہ اس میں ضمنی طور پر پیغمبرؐ کی رحلت کی خبر ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ جس وقت یہ سورہ نازل ہوا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی اپنے اصحاب کے

سامنے تلاوت کی تو سب کے سب بہت خوش اور مسرور ہوئے، لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا عباسؓ اس کو سن کر رونے لگے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اے چچا! آپ کیوں رو رہے ہیں؟

عرض کیا، میرا گمان یہ ہے کہ اس سورہ میں آپؐ کی رحلت کی خبر دی گئی ہے۔ تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"یہی بات ہے جو آپ کہہ رہے ہیں"[1]

اس بارے میں کہ یہ مطلب اس سورہ کے کس جملہ سے معلوم ہوتا ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کیونکہ آیات کے ظاہر میں تو فتح اور کامیابی کی بشارت کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ ظاہراً اس مفہوم کا اس بات سے استفادہ کیا گیا ہے کہ یہ سورہ اس بات کی دلیل ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت آخرت کو پہنچ رہی ہے۔ آپ کا دین مکمل طور پر ثابت اور مستقر ہو چکا ہے اور یہ معلوم ہے کہ ایسی حالت میں سرائے فانی سے جہان باقی کی طرف رحلت کی توقع پورے طور پر قابل پیش بینی ہے۔

اِس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"من قرأها فكانما شهد مع رسول الله صلى الله عليه واٰله وسلم فتح مكة"

"جو شخص اس کی تلاوت کرے گا وہ اس شخص کے مانند ہے جو فتح مکہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ تھا"[2]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے:

"جو شخص سورۂ "اذا جآء نصر الله والفتح" کو نافلہ یا واجب نماز میں پڑھے گا خدا اس کو اس کے تمام دشمنوں پر فتح یاب کرے گا اور وہ قیامت میں اس حالت میں وارد محشر ہوگا کہ اس کے ہاتھ میں ایک عہد نامہ ہوگا، جو بات کرے گا، خدا نے اُسے اس کی قبر کے اندر سے باہر بھیجا ہے، اور وہ جہنم کی آگ سے امان نامہ ہے"[3]

کہے بغیر واضح ہے کہ یہ سب اعزاز و افتخار اور فضیلت اس شخص کے لیے ہے جو اس سورہ کو پڑھنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرے اور ان کے راستے اور طریقہ پر چلے اور آپ کے دین و آئین اور سُنّت پر عمل کرے، نہ کہ صرف تعلقہ لسانی پر قناعت کرے۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۵۴۔ یہ مضمون متعدد روایات میں مختلف الفاظ کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ (المیزان جلد ۲۰ ص ۵۳۲)۔

[2] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۵۳

[3] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۵۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝

۲۔ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا ۝

۳۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ جب خُدا کی مدد اور کامیابی آن پہنچے

۲۔ اور تُو دیکھے گا کہ لوگ گروہ دَر گروہ خُدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں

۳۔ پس تم اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بجا لاؤ اور اس سے استغفار کرو کہ وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔

تفسیر

جب اصلی کامیابی آن پہنچے

اِس سُورہ کی پہلی آیت جس میں فرماتا ہے : "جس وقت خدا کی مدد اور کامیابی آن پہنچے"۔ (اذا جاء نصراللہ والفتح) "اور تُو دیکھے گا کہ لوگ گروہ در گروہ خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں"۔ (ورأیت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجًا)۔

تو اس عظیم نعمت اور اس کامیابی اور نصرتِ الٰہی کے شکرانے کے طور پر اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بجا لاؤ اور اس سے

بخشش طلب کرو کہ وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔ (فسبح بحمد ربك واستغفره انه كان توابًا)۔
ان تین مختصر اور پُرمعنی آیات میں بہت سے ایسے نکات ہیں جن میں غور کرنے سے اس سُورہ کے اصلی ہدف کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

۱۔ پہلی آیت میں "نصرت" کی اضافت "خدا" کی طرف ہوئی ہے (نصر اللہ) صرف یہی ایک جگہ نہیں ہے کہ جہاں یہ اضافت نظر آرہی ہے، بلکہ قرآن کی بہت سی آیات میں یہ معنیٰ منعکس ہے۔ منجملہ ان کے سُورہ بقرہ کی آیہ ۲۱۴ میں آیا ہے۔ (الا ان نصر الله قريب) "جان لو کہ خدا کی مدد قریب ہے"۔
اور سُورہ آل عمران کی آیہ ۱۲۶ اور انفال کی آیہ ۱۰ میں آیا ہے۔ (وما النصر الا من عند الله) "نصرت تو صرف خدا ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔
یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نصرت و کامیابی ہر حال میں خدا کے ارادہ سے ہی ہوتی ہے۔
یہ ٹھیک ہے کہ دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے توانائیوں کو مجتمع کرنا اور قدرت و طاقت مہیا کرنا ضروری ہے، لیکن ایک موحد آدمی نصرت کو خدا ہی کی طرف سے سمجھتا ہے اور اسی بناء پر کامیابی کی صُورت میں مغرور نہیں ہوتا بلکہ اس پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔

۲۔ اس سُورہ میں پہلے نصرتِ الٰہی، پھر فتح و کامرانی اور اس کے بعد اسلام کے نفوذ و وسعت اور لوگوں کے خدا کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہونے کی بات کی گئی ہے۔ یہ تینوں ایک دوسرے کی علت و معلول ہیں۔ جب تک خدا کی نصرت اور مدد نہ ہو، فتح و کامیابی حاصل نہیں ہوتی اور جب تک فتح و کامیابی حاصل نہ ہو اور راستہ کی رکاوٹیں دُور نہ ہوں لوگ گروہ در گروہ مسلمان نہیں ہوتے۔ البتہ ان تین مرحلوں کے بعد، جن میں سے ہر ایک بہت بڑی نعمت ہے، چوتھا مرحلہ شکر اور حمد و ستائش الٰہی کا آتا ہے۔
اور دوسری طرف سے خدائی نصرت اور کامیابی اس لیے ہے کہ اصلی ہدف یعنی لوگوں کا خدا کے دین میں داخل ہونا اور عمومی ہدایت صورت پذیر ہو۔

۳۔ "فتح" یہاں مطلق صُورت میں بیان ہوا ہے اور ان قرائن کی بناء پر جن کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے، اس سے مُراد فتح مکہ ہے، جس کا ایسا ہی ردِّ عمل ہوا تھا۔ اور واقعاً فتح مکہ نے تاریخ اسلام میں ایک نئی فصل کا اضافہ کیا، کیونکہ اس سے شرک کا اصلی مرکز تباہ و برباد ہوگیا، بُت توڑ دیے گئے اور بُت پرستوں کی اُمید مایوسی اور نا اُمیدی میں تبدیل ہوگئی، اور لوگوں کے لیے اسلام پر ایمان کے راستے میں جو رکاوٹیں تھیں وہ ہٹ گئیں۔ اسی بناء پر فتح مکہ کو جزیرۃ العرب میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں اسلام کے ثبات و استقرار کا مرحلہ سمجھنا چاہیئے۔ اور اسی لیے مشرکین کی جانب سے فتح مکہ کے بعد (سوائے ایک موقع کے جس کی جلدی ہی سرکوبی ہوگئی) کسی قسم کا مقابلہ نظر نہیں آیا اور لوگ تمام علاقوں سے اسلام قبول کرنے کے لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آتے تھے۔

۴۔ تیسری آیت کے ذیل میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (اور طبعاً سب مومنین کو) تین اہم حکم دیتا ہے جو حقیقت میں

اس عظیم کامیابی کا شکرانہ اور اس نصرتِ الٰہی کے مقابلہ میں ایک مناسب عکس العمل ہے۔ اور وہ تسبیح ، حمد اور استغفار کا حکم ہے۔
" تسبیح " کا معنی خدا کو ہر قسم کے عیب و نقص سے منزہ سمجھنا ہے۔ " حمد " صفاتِ کمالیہ کے ساتھ اس کی توصیف و تعریف کرنا ہے ، اور " استغفار " بندوں کی کوتاہیوں اور تقصیروں کو ظاہر کرتا ہے۔
یہ عظیم کامیابی اس بات کا سبب بنی ہے کہ شرک آلودہ افکار میں کمی ہو ، خدا کا کمال و جمال زیادہ سے زیادہ ظاہر ہو اور راستہ سے بھٹکے ہوئے لوگ حق کی طرف لوٹ آئیں۔
یہ فتح عظیم سبب بنی ہے کہ لوگ یہ گمان نہ کریں کہ خدا اپنے اولیاء اور دوستوں کو تنہا چھوڑ دیتا ہے۔ (اس نقص سے پاکیزگی) اور وہ یہ بھی جان لیں کہ خدا اپنے وعدوں کے انجام دینے پر توانا ہے۔ (اس کمال سے موصوف ہونا) اور بندے بھی اس کی عظمت کے مقابلہ میں اپنے نقص کا اعتراف کریں۔
اس کے علاوہ ممکن ہے کہ انسان میں کامیابی کے وقت غیر مطلوب ردِ عمل پیدا ہو جائے اور وہ " غرور و تکبر اور خود کو برتر سمجھنے " میں مبتلا ہو جائے۔ یا دشمن سے " انتقام لینے اور ذاتی حساب چکانے " کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ یہ تینوں احکام اُسے اس بات کی تعلیم دیتے ہیں کہ وہ کامیابی کے حساس لمحات میں خدا کی صفاتِ جلال و جمال کی یاد میں رہے ، سب چیزوں کو اس کی طرف سے سمجھے اور استغفار میں مشغول ہو جائے تاکہ غرور و غفلت بھی اس سے زائل ہو اور وہ جذبۂ انتقام سے بھی دور رہے۔

۵۔ مسلمہ طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام انبیاء کی طرح " معصوم " تھے ، پس یہ استغفار کا حکم کس لیے ہے ؟
اس سوال کے جواب میں ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ یہ تو ساری اُمت کے لیے ایک نمونہ و اسوہ اور دستور العمل ہے کیونکہ:
اولاً : اس طولانی مبارزہ کے طویل زمانہ میں ، جو بہت زیادہ سالوں تک جاری رہا (تقریباً بیس سال) اور مسلمانوں نے بہت سخت اور دردناک دن گزارے ، بعض اوقات تو حادثات ایسے پیچیدہ ہو جاتے تھے کہ جانیں لبوں تک پہنچ جاتی تھیں اور بعض لوگوں کے افکار میں خدائی وعدوں کے بارے میں بُرے گمان پیدا ہو جاتے تھے ، جیسا کہ قرآن جنگ " احزاب " کے بارے میں فرماتا ہے : وبلغت القلوب الحناجر و تظنون باللہ الظنونا : " اور دل گلے تک آگئے اور تم اللہ کے بارے میں (نامناسب) گمان کرنے لگے۔ (احزاب - ۱۰)
اب جب کہ کامیابی حاصل ہوگئی ہے تو وہ اس بات کو سمجھ گئے ہیں کہ وہ سب بدگمانیاں اور بے تابیاں غلط تھیں ، لہٰذا انہیں استغفار کرنا چاہیئے۔
ثانیاً : انسان چاہے جتنی بھی خدا کی حمد و ثنا کرے ، پھر بھی وہ اس کے شکر کا حق ادا نہیں کر سکتا ، لہٰذا اُسے حمد و ثنا کے آخر میں اپنی تقصیر و کوتاہی کی بنا پر " خدا کی بارگاہ میں " استغفار کرنا چاہیئے۔
ثالثاً : عام طور پر کامیابیوں کے بعد شیطانی وسوسے شروع ہو جاتے ہیں ، اور ایک طرف " غرور " اور دوسری طرف " تندروئی اور انتقام جوئی " کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس موقع پر خدا کو یاد رکھنا چاہیئے اور مسلسل استغفار کرتے رہنا چاہیئے ، تاکہ ان میں سے کوئی سی حالت بھی پیدا نہ ہو۔ یا اگر پیدا ہو بھی تو برطرف ہو جائے۔
رابعاً : جیسا کہ ہم نے سورہ کے آغاز میں بیان کیا ہے اس کامیابی کا اعلان تقریباً پیغمبرؐ کی ماموریت کے اختتام

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر کے پورا ہونے اور لقائے محبوب کے لیے جانے کے اعلان کے معنی میں ہے۔
اور یہ حالت "تسبیح" و "حمد" و "استغفار" سے مناسبت رکھتی ہے۔ اسی لیے روایات میں آیا ہے کہ اس سورہ کے نازل ہونے کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس جملہ کا بہت زیادہ تکرار فرماتے تھے :

"سبحانك اللّٰھم وبحمدك، اللّٰھم اغفرلی انك انت التواب الرّحیم:
"خداوندا! تُو پاک و منزہ ہے، اور مَیں تیری حمد و ثنا کرتا ہوں۔ خداوندا! مجھے بخش دے کہ تُو بہت ہی توبہ کو قبول کرنے والا اور مہربان ہے"[1]

۶۔ "انه کان توّابًا" کا جملہ مسئلہ استغفار کی علت کا بیان ہے۔ یعنی استغفار و توبہ کر کیونکہ خدا بہت ہی توبہ کو قبول کرنے والا ہے۔

ضمنی طور پر شاید اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ جب خدا تمہاری توبہ کو قبول کر لیتا ہے تو تم بھی کامیابی کے بعد جہاں تک ہو سکے کوتاہی کرنے والوں کی توبہ کو قبول کر لو۔ اور جب تک ان سے مخالفت کا ارادہ یا سازش کے آثار ظاہر نہ ہوں انہیں اپنے سے دُور نہ کرو۔ لہٰذا۔ جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس فتح مکّہ کے ماجرے میں شکست خوردہ کینہ وَر دشمنوں کے مقابلہ میں اسلامی رافت و رحمت کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا ہے۔

یہ صرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی سیرت نہیں ہے کہ آپ دشمن پر آخری اور اصلی فتح حاصل کرنے کے موقع پر تسبیح و حمد و استغفار میں مصروف ہو گئے، بلکہ سارے ہی انبیاء کی تاریخ میں یہ مطلب اچھی طرح نمایاں ہے۔

مثلاً حضرت "یوسف" علیہ السلام جب مصر کے تختِ حکومت پر بیٹھے اور ایک طویل جدائی کے بعد ان کے ماں باپ اور بھائی ان سے آکر ملے تو عرض کی : ربّ قد اٰتیتنی من الملك وعلّمتنی من تأویل الاحادیث فاطر السماوات والارض انت ولیّی فی الدنیا والاٰخرة توفّنی مسلمًا والحقنی بالصالحین : پروردگارا! تُو نے حکومت کا ایک بہت بڑا حصّہ مجھے دیا ہے اور تو نے مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم عطا کیا ہے، تُو ہی آسمان و زمین کو پیدا کرنے والا ہے اور تُو ہی دنیا و آخرت میں میرا سرپرست ہے۔ مجھے مسلمان کی حیثیت سے موت دینا اور صالحین کے ساتھ ملحق کرنا" (یوسف۔ ۱۰۱)

پیغمبرِ خُدا حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب ملکۂ سبا کے تخت کو اپنے سامنے حاضر دیکھا تو کہا :

"ھٰذا من فضل ربّی لیبلونی ءاشکر ام اکفر" :
"یہ میرے پروردگار کے فضل سے ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ آیا مَیں اس کا شکر ادا کرتا ہوں یا کفرانِ نعمت کرتا ہوں" (نمل۔ ۴۰)

ایک نکتہ

فتح مکّہ اسلام کی عظیم ترین فتح : فتح مکّہ نے۔ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے۔ تاریخ اسلام میں ایک نئی

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۵۴

فصل کا اضافہ کیا ہے اور تقریباً بیس سال کے بعد دشمن کی مقاومتوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ حقیقت میں فتح مکّہ سے جزیرۃ العرب سے شرک و بت پرستی کی بساط لپیٹ دی گئی اور اسلام دنیا کے دوسرے ممالک کی طرف حرکت کے لیے آمادہ ہوا۔

اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیبیہ کے عہد و پیمان اور صلح کے بعد کفار نے عہد شکنی کی اور اس صلح نامہ کو نظر انداز کر دیا، اور پیغمبر کے بعض حلیفوں کے ساتھ زیادتی کی، آپ کے حلیفوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شکایت کی تو رسول اللہؐ نے اپنے حلیفوں کی مدد کرنے کا ارادہ کر لیا۔

اور دوسری طرف مکّہ میں بت پرستی، شرک اور نفاق کا جو مرکز قائم تھا اس کے ختم ہونے کے تمام حالات فراہم ہو گئے تھے اور یہ ایک ایسا کام تھا جسے ہر حالت میں انجام دینا ضروری تھا۔ اس لیے پیغمبر خدا کے حکم سے مکّہ کی طرف جانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔

فتح مکّہ تین مراحل میں انجام پائی :-

پہلا مرحلہ "مقدماتی" تھا، یعنی ضروری قوا اور توانائیوں کو فراہم کرنا، زمانہ کے موافق حالات کا انتخاب اور دشمن کی جسمانی و رُوحانی قوت و توانائی کی مقدار و کیفیت کی حیثیت کے بارے میں کافی اطلاعات حاصل کرنا تھا۔

دُوسرا مرحلہ، فتح کے مرحلہ کو بہت ہی ماہرانہ اور ضائعات ذتلفات یعنی نقصان کے بغیر انجام دینا تھا۔

اور آخری مرحلہ، جو اصلی مرحلہ تھا، وہ اس کے آثار و نتائج کا مرحلہ تھا۔

۱۔ یہ مرحلہ انتہائی دقت، باریک بینی اور لطافت کے ساتھ انجام پایا، خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکّہ و مدینہ کی شاہراہ کو اس طرح سے قرق کر لیا تھا کہ اس عظیم آمادگی کی خبر کسی طرح سے بھی اہل مکّہ کو نہ پہنچ سکی۔ اس لیے انہوں نے کسی قسم کی تیاری نہ کی، وُہ مکمل طور پر غفلت میں پڑے رہے اور اسی وجہ سے اس مقدس سرزمین میں اس عظیم حملے اور بہت بڑی فتح میں تقریباً کوئی خون نہیں بہا۔

یہاں تک کہ وہ خط بھی، جو ایک ضعیف الایمان مسلمان " حاطب بن ابی بلتعہ " نے قریش کو لکھا تھا اور قبیلہ " مزینہ " کی ایک عورت " کنود " یا " سارہ " نامی کے ہاتھ مکّہ کی طرف روانہ کیا تھا، اعجاز آمیز طریقہ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے آشکار ہو گیا۔ علی علیہ السلام کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ بڑی تیزی سے اس کے پیچھے روانہ ہوئے، اُنہوں نے اس عورت کو مکّہ و مدینہ کی ایک درمیانی منزل میں جالیا اور اس سے وہ خط لے کر خُود اُسے بھی مدینہ واپس لے آئے جس کی داستان سُورہ ممتحنہ کی پہلی آیت کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی ہے[1]

بہر حال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ میں اپنا ایک قائم مقام مقرر کر کے ہجرت کے آٹھویں سال ماہِ رمضان کی دس تاریخ کو مکّہ کی طرف چل پڑے، اور دس دن کے بعد مکّہ پہنچ گئے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے راستے کے وسط میں اپنے چچا عباسؓ کو دیکھا کہ وہ مکّہ سے ہجرت کر کے آپ کی طرف آرہے ہیں۔ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اپنا سامان مدینہ بھیج دیجئے اور خود ہمارے

---

[1] " تفسیر نمونہ " جلد ۱۴ صفحہ ۹

ساتھ چلیں، اور آپ آخری مہاجر ہیں۔

۲۔ آخرکار مسلمان مکّہ کے قریب پہنچ گئے اور شہر کے باہر، اطراف کے بیابانوں میں اس مقام پر جسے "مرّالظہران" کہا جاتا تھا اور جو مکّہ سے چند کلو میٹر سے زیادہ فاصلہ پر نہ تھا، پڑاؤ ڈال دیا۔ اور رات کے وقت کھانا پکانے کے لیے (یا شاید اپنی وسیع پیمانہ پر موجودگی کو ثابت کرنے کے لیے) وہاں آگ روشن کردی۔ اہلِ مکّہ کا ایک گروہ اس منظر کو دیکھ کر حیرت میں ڈوب گئے۔

ابھی تک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور لشکرِ اسلام کے اس طرف آنے کی خبریں قریش سے پنہاں تھیں۔ اس رات اہلِ مکّہ کا سرغنہ ابوسفیان اور مشرکین کے بعض دوسرے سرغنے خبریں معلوم کرنے کے لیے مکّہ سے باہر نکلے۔ اس موقع پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا عباس نے سوچا کہ اگر رسول اللہؐ قہرآلود طریقہ پر مکّہ میں وارد ہوئے تو قریش میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ سے اجازت لی اور آپؐ کی سواری پر سوار ہو کر کہا کہ میں جاتا ہوں، شاید کوئی مل جائے تو اس سے کہوں کہ اہلِ مکّہ کو اس ماجرے سے آگاہ کردے تاکہ وہ آکر امان حاصل کر لیں۔

عباس وہاں روانہ ہوکر بہت قریب پہنچ گئے۔ اتفاقاً اس موقع پر انہوں نے "ابوسفیان" کی آواز سُنی جو اپنے ایک دوست "بدیل" سے کہہ رہا تھا کہ ہم نے کبھی بھی اس سے زیادہ آگ نہیں دیکھی۔ "بدیل" نے کہا، میرا خیال ہے کہ یہ آگ قبیلہ "خزاعہ" نے جلائی ہوئی ہے۔ ابوسفیان نے کہا: قبیلۂ خزاعہ اس سے کہیں زیادہ ذلیل و خوار ہیں کہ وہ اتنی آگ روشن کریں۔

اس موقع پر "عباس" نے "ابوسفیان" کو پکارا۔ ابوسفیان نے بھی عباس کو پہچان لیا اور کہا سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے؟

عباس نے جواب دیا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جو دس ہزار مجاہدینِ اسلام کے ساتھ تمہاری طرف آ رہے ہیں۔ ابوسفیان سخت پریشان ہوا اور کہا: آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں۔

عباس نے کہا: میرے ساتھ آؤ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے امان لے لو ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔

اس طرح سے عباس نے "ابوسفیان" کو اپنے ہمراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سواری پر ہی سوار کر لیا اور تیزی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پلٹ آئے۔ وہ جس گروہ اور جس آگ کے قریب سے گزرتے وہ یہی کہتے کہ یہ تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا ہیں جو آنحضرتؐ کی سواری پر سوار ہیں، کوئی غیر آدمی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس مقام پر آئے جہاں عمر ابنِ خطابؓ تھے۔ جب عمر بن خطابؓ کی نگاہ ابوسفیان پر پڑی تو کہا، خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے تجھ (ابوسفیان) پر مسلط کیا ہے، اب تیرے لیے کوئی امان نہیں ہے اور فوراً ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آکر آپ سے ابوسفیان کی گردن اُڑانے کی اجازت مانگی۔

لیکن اتنے میں عباسؓ بھی پہنچ گئے اور کہا، کہ اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نے اسے پناہ دے دی ہے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں بھی سردست اُسے امان دیتا ہوں۔ کل آپ اسے میرے پاس لے آئیں اگلے دن جب عباسؓ اُسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لائے تو رسول اللہؐ نے اس سے فرمایا:

"اے ابوسفیان! وائے ہو تجھ پر، کیا وہ وقت ابھی نہیں آیا کہ تو خدائے یگانہ پر

ایمان لے آئے۔

اُس نے عرض کیا : ہاں! اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا یگانہ ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اگر بتوں سے کچھ ہو سکتا تو میں یہ دن نہ دیکھتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : "کیا وہ موقع نہیں آیا کہ تُو جان لے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔"

اُس نے عرض کیا : میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں ابھی اس بارے میں میرے دل میں کچھ شک و شبہ موجود ہے۔ لیکن آخرکار ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں میں سے دو آدمی مسلمان ہو گئے۔

پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عباسؓ کو فرمایا :

"ابوسفیان کو اس درّہ میں جو مکّہ کی گزرگاہ ہے، لے جاؤ تاکہ خدا کا لشکر وہاں سے گزرے اور یہ دیکھ لے۔"

عباسؓ نے عرض کیا : "ابوسفیان ایک جاہ طلب آدمی ہے، اس کو کوئی امتیازی حیثیت دے دیجئے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا :

"جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے وہ امان میں ہے، جو شخص مسجد الحرام میں پناہ لے لے وہ امان میں ہے، جو شخص اپنے گھر کے اندر رہے اور دروازہ بند کر لے وہ بھی امان میں ہے۔"

بہرحال جب ابوسفیان نے اس لشکرِ عظیم کو دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ مقابلہ کرنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہی اور اس نے عباس کی طرف رُخ کر کے کہا : آپ کے بھتیجے کی سلطنت بہت بڑی ہو گئی ہے۔ عباس نے کہا : وائے ہو تجھ پر یہ سلطنت نہیں نبوت ہے۔

اس کے بعد عباس نے اس سے کہا کہ اب تو تیزی کے ساتھ مکّہ والوں کے پاس جا کر انہیں لشکرِ اسلام کا مقابلہ کرنے سے ڈرا۔

ابوسفیان نے مسجد الحرام میں جا کر پکار کر کہا :

"اے جمعیتِ قریش! محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ تمہاری طرف آیا ہے، تم میں اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ اس کے بعد اس نے کہا : جو شخص میرے گھر میں داخل ہو جائے وہ امان میں ہے، جو شخص مسجد الحرام میں چلا جائے وہ بھی امان میں ہے اور جو شخص اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے گھر کا دروازہ بند کر لے وہ بھی امان میں ہے۔"

اس کے بعد اس نے چیخ کر کہا : اے جمعیتِ قریش اسلام قبول کر لو تاکہ سالم رہو اور بچ جاؤ، اس کی بیوی "ہندہ" نے اس کی داڑھی پکڑ لی اور چیخ کر کہا : اس بڈھے احمق کو قتل کر دو۔

ابوسفیان نے کہا : میری داڑھی چھوڑ دے۔ خدا کی قسم اگر تُو اسلام نہ لائی تو تُو بھی قتل ہو جائے گی، جا کر گھر میں بیٹھ جا۔

اس کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لشکر اسلام کے ساتھ روانہ ہوئے اور "ذوی طوی" کے مقام تک پہنچ گئے، وہی بلند مقام جہاں سے مکہ کے مکانات صاف نظر آتے ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ دن یاد آگیا جب آپ مجبور ہو کر مخفی طور پر مکہ سے باہر نکلے تھے، لیکن آج دیکھ رہے ہیں کہ اس عظمت کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں، تو آپؐ نے اپنی پیشانی مبارک اونٹ کے کجاوے کے اوپر رکھ دی اور سجدہ شکر بجا لائے۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "حجون" میں (مکہ کے بلند مقامات میں سے وہ جگہ جہاں خدیجہؑ کی قبر ہے) اترے، غسل کر کے اسلحہ اور لباسِ جنگ پہن کر اپنی سواری پر سوار ہوئے، سورۂ فتح کی قرات کرتے ہوئے مسجد الحرام میں داخل ہوئے اور آوازِ تکبیر بلند کی۔ لشکرِ اسلام نے بھی نعرۂ تکبیر بلند کیا تو اس سے سارے دشت و کوہ گونج اٹھے۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اونٹ سے نیچے اترے اور بتوں کو توڑنے کے لیے خانہ کعبہ کے قریب آئے۔ آپ یکے بعد دیگرے بتوں کو سرنگوں کرتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے:

"جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا"

"حق آگیا اور باطل ہٹ گیا، اور باطل ہے ہی مٹنے والا۔"

کچھ بڑے بڑے بت کعبہ کے اوپر نصب تھے، جن تک پیغمبرؐ کا ہاتھ نہیں پہنچتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیرالمومنین علی علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپؐ کے دوش مبارک پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھ جائیں اور بتوں کو زمین پر گرا کر توڑ ڈالیں علیؑ نے آپؐ کے حکم کی اطاعت کی۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خانہ کعبہ کی کلید لے کر دروازہ کھولا اور انبیاؑ کی ان تصویروں کو جو خانہ کعبہ کے اندر در و دیوار پر بنی ہوئی تھیں، محو کر دیا۔

۴۔ اس سریع اور شاندار کامیابی کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خانہ کعبہ کے دروازے کے حلقہ میں ہاتھ ڈالا اور وہاں پر موجود اہل مکہ کی طرف رخ کر کے فرمایا:

"اب بتلاؤ تم کیا کہتے ہو؟ اور تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے بارے میں کیا حکم دوں گا؟ انہوں نے عرض کیا، ہم آپ سے نیکی اور بھلائی کے سوا اور کوئی توقع نہیں رکھتے! آپ ہمارے بزرگوار بھائی اور ہمارے بزرگوار بھائی کے فرزند ہیں آج آپ برسرِ اقتدار آگئے ہیں، ہمیں بخش دیجئے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے اور مکہ کے لوگ بھی بلند آواز کے ساتھ رونے لگے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"میں تمہارے بارے میں وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے کہی تھی کہ آج تمہارے اوپر کسی قسم کی کوئی سرزنش اور ملامت نہیں ہے، خدا تمہیں بخش دے گا، وہ ارحم الراحمین ہے۔[1]

اور اس طرح سے آپؐ نے ان سب کو معاف کر دیا اور فرمایا :

"تم سب آزاد ہو، جہاں چاہو جا سکتے ہو۔"

ضمنی طور پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حکم دیا تھا کہ آپ کے لشکری کسی سے نہ اُلجھیں اور بالکل کوئی خون نہ بہایا جائے۔ ایک روایت کے مطابق صرف چھ افراد کو مستثنیٰ کیا گیا تھا جو بہت ہی بدزبان اور خطرناک لوگ تھے

یہاں تک کہ جب آپؐ نے یہ سُنا کہ لشکرِ اسلام کے علمدار "سعد بن عبادہ" نے انتقام کا نعرہ بلند کیا ہے اور وہ یہ کہہ رہا ہے کہ : "الیوم یوم الملحمة" آج انتقام کا دن ہے" تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام سے فرمایا ——— "جلدی سے جا کر اس سے عَلم لے لو اور اُس سے عَلم لے کر یہ نعرہ لگاؤ کر :

"الیوم یوم المرحمة" آج عفو و بخشش اور رحمت کا دن ہے۔"

اور اس طرح مکّہ کسی خونریزی کے بغیر فتح ہوگیا، عفو و رحمتِ اسلامی کی اس کشش نے، جس کی انہیں بالکل توقع نہیں تھی، دلوں پر ایسا اثر کیا کہ لوگ گروہ در گروہ آکر مسلمان ہوگئے، اس عظیم فتح کی صدا تمام جزائر عربستان میں جا پہنچی، اِسلام کی شہرت ہر جگہ پھیل گئی اور مسلمانوں اور اسلام کی ہر جہت سے دھاک بیٹھ گئی۔[۲]

بعض تاریخوں میں آیا ہے کہ جب پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خانۂ کعبہ کے دروازے کے پاس کھڑے ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

" لا الٰہ الّا اللہ وحدہ، انجز وعدہ، و نصر عبدہ، وھزم الاحزاب وحدہ، الا ان کل مال او مأثرة او دم تدعی فھو تحت قدمی ھاتین !

" خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ یکتا و یگانہ ہے، یگانہ، اس نے آخر کار اپنے وعدہ کو پورا کر دیا۔ اور اپنے بندہ کی مدد کی، اور اس نے خود اکیلے ہی تمام گروہوں کو شکست دے دی۔ جان لو کہ ہر مال، ہر امتیاز، اور ہر وہ خون جس کا تعلق ماضی اور زمانۂ جاہلیت سے ہے، سب کے سب میرے ان دونوں قدموں کے نیچے ہیں۔

(یعنی اب اس خون کے بارے میں، جو زمانۂ جاہلیت میں بہایا گیا تھا، یا وہ اموال جو لوٹے گئے تھے، کوئی بات نہ کرنا) اور زمانۂ جاہلیت کے تمام اعزازات اور امتیازات بھی باطل ہوگئے ہیں اور اس طرح تمام گزشتہ فائلیں بند ہوگئی ہیں۔

یہ ایک بہت ہی اہم اور عجیب قسم کی پیش نہاد تھی جس میں عمومی معافی کے فرمان سے حجاز کے لوگوں کو ان کے تاریک اور پُر ماجرا ماضی سے کاٹ کر رکھ دیا اور انہیں اسلام کے سائے میں ایک نئی زندگی بخشی جو ماضی سے مربوط

---

[۱] سورۂ یوسف آیہ ۹۲

[۲] : "کامل ابن اثیر" جلد ۲ "تفسیر مجمع البیان" زیر بحث آیات کے ذیل میں اور دوسری کتابوں کا خلاصہ۔

کشمکشوں اور جنگوں سے مکمل طور پر خالی تھی۔
اس کام نے اسلام کی پیش رفت کے سلسلہ میں حد سے زیادہ مدد کی اور یہ ہمارے آج اور آنے والے کل کیلیے ایک دستورالعمل ہے۔
خداوندا ! تُو اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ اس دیرینہ عظمت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سُنّت کی اقتدا کے سائے میں مسلمانوں کے لیے دوبارہ پلٹا دے۔
پروردگارا ! ہمیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے دوستوں کے زمرہ میں قرار دے۔
بارِ الہا ! ہمیں ایسی توفیق مرحمت فرما کہ ہم دنیا میں عدلِ اسلامی کی حکومت کو اس طرح پھیلائیں کہ ساری دنیا کے لوگ فوج دَر فوج اسے دل و جان سے قبول کریں۔

آمین یا ربّ العالمین
سُورۂ نصر کا اختتام

ترجمہ کا اختتام
۶ شوال ۱۴۰۸ھ بروز اتوار
صبح بارہ بج کر چوبیس منٹ
بر مکان حقیر قم مقدس ایران

سُورَہ اللَّھَب (تبّت)

* یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔
* اس میں ۵ آیات ہیں۔

سورۂ لہب (تبت) کے مطالب اور اس کی فضیلت

یہ سورہ جو مکہ میں اور تقریباً پیغمبرِ اسلام کی آشکارا دعوت کے آغاز میں نازل ہوا تھا، وہ واحد سورہ ہے جس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اسلام کے دشمنوں میں سے اس زمانہ کے ایک دشمن (یعنی ابولہب) پر نام لے کر سخت حملہ کیا گیا ہے اور اس کا مضمون اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اُسے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ خصوصی عداوت تھی اور وہ اور اس کی بیوی کام بگاڑنے اور بدزبانی کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتے تھے۔

قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ وہ دونوں جہنمی ہیں اور ان کے لیے نجات کی کوئی راہ نہیں ہے۔ یہ معنی صحیح ثابت ہوا اور وہ دونوں کے دونوں انجام کار دنیا سے بے ایمان گئے۔ یہ قرآن کی ایک کھلی ہوئی پیش گوئی ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"من قرأها رجوت ان لا یجمع الله بینه و بین ابی لهب فی دار واحدة"

"جو شخص اس کی تلاوت کرے گا مجھے اُمید ہے کہ خدا اُسے اور ابولہب کو ایک گھر میں اکٹھا نہیں کرے گا (یعنی وہ اہلِ بہشت سے ہوگا، جب کہ ابولہب اہلِ دوزخ سے ہے)"[1]

یہ بات بغیر واضح ہے کہ یہ فضیلت اس شخص کے لیے ہے جو اس سورہ کو پڑھ کر اپنا راستہ ابولہب کے راستہ سے جُدا کرے، نہ کہ وہ لوگ جو زبان سے تو پڑھیں لیکن ابولہب جیسا عمل کریں۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۵۸

شانِ نزول

"ابنِ عباس" سے نقل ہوا ہے کہ جس وقت آیہ" وانذر عشیرتک الاقربین" نازل ہوئی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے قریبی رشتہ داروں کو انذار کرنے اور اسلام کی دعوت دینے (اور اپنی دعوت کا اعلان کرنے) پر مامور ہوئے، تو پیغمبر کوہِ صفا پر آئے اور پکار کر کہا "یا صباحاہ" (یہ جملہ عرب اس وقت کہتے تھے جب ان پر دشمن کی طرف سے غفلت کی حالت میں حملہ ہو جاتا تھا تاکہ سب کو باخبر کر دیں اور وہ مقابلہ کے لیے کھڑے ہو جائیں، لہٰذا کوئی شخص "یا صباحاہ" کہہ آواز دیتا تھا! "صباح" کے لفظ کا انتخاب اس وجہ سے کیا جاتا تھا کہ عام طور پر غفلت کی حالت میں حملے صبح کے وقت کیے جاتے تھے)۔

مکہ کے لوگوں نے جب یہ صدا سُنی تو انہوں نے کہا کہ یہ کون ہے جو فریاد کر رہا ہے۔

کہا گیا کہ یہ "محمد" صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ کچھ لوگ آپ کے پاس پہنچے تو آپ نے قبائل عرب کو ان کے نام کے ساتھ پکارا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز پر سب کے سب جمع ہو گئے تو آپ نے ان سے فرمایا:

"مجھے بتلاؤ! اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ دشمن کے سوار اس پہاڑ کے پیچھے سے حملہ کرنے والے ہیں، تو کیا تم میری بات کی تصدیق کرو گے۔"

انہوں نے جواب دیا: "ہم نے آپ سے کبھی بھی جھوٹ نہیں سُنا"

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"انی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید"

"میں تمہیں خدا کے شدید عذاب سے ڈراتا ہوں"

(میں تمہیں توحید کا اقرار کرنے اور بُتوں کو ترک کرنے کی دعوت دیتا ہوں) جب ابولہب نے یہ بات سُنی تو اس نے کہا: "تبّالک! أما جمعتنا الا لھذا !!" "تو ہلاک ہو جائے! کیا تُو نے ہمیں صرف اس بات کے لیے جمع کیا ہے"؟

اِس موقع پر یہ سُورہ نازل ہوا: تبّت یدا ابی لھب وتبّ" اے ابولہب! تُو ہی ہلاک ہو اور تیرے ہاتھ ٹوٹیں، تُو ہی زیاں کار اور ہلاک ہونے والا ہے۔

بعض نے اس موقع پر اس بات کا اضافہ کیا ہے کہ جب ابولہب کی بیوی "اُم جمیل" نے یہ خبر سنی کہ یہ سُورہ اس کے اور اس کے شوہر کے بارے میں نازل ہوا ہے تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئی، لیکن وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ دیکھ سکی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پتھر تھا اور وہ کہہ رہی تھی کہ میں نے سُنا ہے "محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میری ہجو کی ہے۔ خدا کی قسم اگر وہ مجھے مل گیا تو میں یہ پتھر اس کے منہ پر دے ماروں گی، میں خود بھی شاعر ہوں"! اس کے بعد اصطلاح کے مطابق اس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام کی مذمت میں شعر کہے۔

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسلام کے لیے ابولہب اور اس کی بیوی کا خطرہ اور ان کی عداوت اسی تک منحصر نہیں تھی۔ اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے ان پر سخت شدید حملہ کیا ہے اور صراحت کے ساتھ ان کی مذمت کر رہا ہے تو اس کی بہت سی وجوہات ہیں، جن کی طرف انشاء اللہ بعد میں اشارہ ہوگا۔

گزشتہ صفحہ کا حاشیہ

۱؎ "تفسیر قرطبی" جلد ۱۰ ص ۷۲۳۴ (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ) اسی مضمون کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ "طبرسی" نے "مجمع البیان" میں، "ابن اثیر" نے "الکامل جلد ۲ ص ۶۰" میں اور "درالمنثور" و "ابوالفتوح رازی" اور "فخر رازی" اور "فی ظلال القرآن" میں اس سورہ کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝

۲۔ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝

۳۔ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝

۴۔ وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝

۵۔ فِىْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ ابولہب کے دونوں ہاتھ کٹ جائیں (اور وُہ ہلاک ہو جائے)۔

۲۔ اس کے مال و دولت نے اور جو کچھ اس نے کمایا ہے اُسے ہرگز کوئی فائدہ نہ دیا۔

۳۔ وُہ جلدی ہی اس آگ میں داخل ہو جائے گا جس کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔

۴۔ اور اسی طرح سے اس کی وُہ بیوی جو ایندھن اُٹھانے والی ہے۔

۵۔ اور اس کی گردن میں خرما کی چھال کی رسّی ہے۔

تفسیر

ابولہب کا ہاتھ کٹ جائے

جیسا کہ ہم نے اس سورہ کے شانِ نزول میں بیان کیا ہے یہ سورہ حقیقت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا، عبدالمطلب کے بیٹے "ابولہب کی بُری باتوں کا جواب ہے جو اسلام کے سخت دشمنوں میں سے تھا اور جس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آشکار اور عمومی دعوت اور عذابِ الٰہی کے بارے میں آپ کے انذار کو سُن کر یہ کہا تھا کہ :

" تُو ہلاک ہو جائے، کیا تُو نے ہمیں انہی باتوں کے لیے پُکارا تھا" ؟

قرآن مجید اس بدزبان شخص کے جواب میں فرماتا ہے :

" ابولہب کے دونوں ہاتھ کٹ جائیں، یا وہ ہلاک ہو جائے اور خسارہ اُٹھائے "۔

(تبت یدا ابی لھب و تب)۔

"تب" و "تباب" (بروزنِ خراب) "مفردات" میں "راغب" کے قول کے مطابق دائمی خسارے کے معنی میں ہے لیکن طبرسیؒ نے "مجمع البیان" میں یہ کہا ہے کہ یہ اس نقصان کے معنی میں ہے جو ہلاکت پر منتہی ہو۔

بعض اربابِ لُغت نے اس کی "قطع کرنے" کے معنی میں بھی تفسیر کی ہے اور شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہلاکت پر منتہی ہونے والا دائمی نقصان طبعاً قطع ہونے اور کٹ جانے کا سبب بنتا ہے۔ ان معانی کے مجموعہ سے وہی بات معلوم ہوتی ہے جو ہم نے آیہ کے معنی میں بیان کی ہے۔

البتہ یہ ہلاکت اور نقصان ممکن ہے دنیوی پہلو رکھتا ہو یا معنوی و اُخروی یا دونوں۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن مجید نے اپنی روش اور سیرت کے برخلاف ایک شخص کا نام کیسے لے لیا اور اس شدت کے ساتھ اس پر حملہ کیوں کیا ہے ؟

لیکن ابولہب کی حیثیت معلوم ہونے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔

اس کا نام "عبدالعزیٰ" (عزیٰ بت کا بندہ) اور اس کی کنیت "ابولہب" تھی۔ اس کے لیے اس کنیت کا انتخاب شاید اس وجہ سے تھا کہ اس کا چہرہ سُرخ اور بھڑکتا ہوا تھا، چونکہ لغت میں لہب آگ کے شعلہ کے معنی میں ہے۔

وہ اور اس کی بیوی "اُم جمیل" جو ابوسفیان کی بہن تھی، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نہایت بدزبان اور سخت ترین دشمنوں میں سے تھے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ "طارق محاربی" نامی ایک شخص کہتا ہے : میں "ذی المجاز" کے بازار میں تھا۔ (ذی المجاز عرفات کے نزدیک مکہ سے تھوڑے سے فاصلہ پر ہے) اچانک مَیں نے ایک جوان کو دیکھا جو پکار پکار کر کہہ رہا تھا : اے لوگو ! لا الٰہ الّا اللہ کا اقرار کرلو تو نجات پا جاؤ گے۔ اور اس کے پیچھے پیچھے میں نے ایک شخص کو دیکھا

جو اس کے پاؤں کے پچھلے حصہ پر پتھر مارتا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کے پاؤں سے خون جاری تھا اور وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا "اے لوگو! یہ جھوٹا ہے، اس کی بات نہ ماننا"!

مَیں نے پوچھا کہ یہ جوان کون ہے؟ تو لوگوں نے بتایا: "یہ محمدؐ" صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جس کا گمان یہ ہے کہ وہ پیغمبر ہے اور یہ بوڑھا اس کا چچا ابولہب ہے جو اس کو جھوٹا سمجھتا ہے۔[1]

ایک اور دوسری روایت میں آیا ہے کہ "ربیع بن عباد" کہتا ہے: مَیں اپنے باپ کے ساتھ تھا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ وہ قبائل عرب کے پاس جاتے اور ہر ایک کو پکار کر کہتے: مَیں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تم خدائے یگانہ کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔

جب وہ اپنی بات سے فارغ ہو جاتا تو ایک خوبرو بھینگا آدمی جو ان کے پیچھے پیچھے تھا، پکار کر کہتا: "اے فلاں قبیلے یہ شخص یہ چاہتا ہے کہ تم لات و عزیٰ بُت اور اپنے ہم پیمان جنوں کو چھوڑ دو اور اس کی بدعت و ضلالت کی پیروی کرنے لگ جاؤ۔ اس کی بات نہ سُننا، اور اس کی پیروی نہ کرنا"!

مَیں نے پُوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو اُنہوں نے بتایا کہ "یہ اس کا چچا ابولہب ہے"۔[2]

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ جب مکہ سے باہر کے لوگوں کا کوئی گروہ اس شہر میں داخل ہوتا تھا تو وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کی رشتہ داری اور سن و سال کے لحاظ سے بڑا ہونے کی بنا پر ابولہب کے پاس جاتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں تحقیق کرتا تھا۔ وہ جواب دیتا: محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک جادوگر ہے۔ وہ بھی پیغمبرؐ سے ملاقات کیے بغیر ہی لوٹ جاتے۔ اسی اثناء میں ایک ایسا گروہ آیا جنہوں نے یہ کہا کہ ہم تو اُسے دیکھے بغیر واپس نہیں جائیں گے ابولہب نے کہا: "ہم مسلسل اس کے جنون کا علاج کر رہے ہیں! وہ ہلاک ہو جائے!"[3]

اِن روایات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اکثر مواقع پر سایہ کی طرح پیغمبرؐ کے پیچھے لگا رہتا تھا اور کسی خرابی سے فروگزاشت نہ کرتا تھا۔ خصوصاً اس کی زبان بہت ہی گندی اور آلودہ ہوتی تھی اور وہ رکیک اور چبھنے والی باتیں کیا کرتا تھا۔ اور شاید اسی وجہ سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب دُشمنوں کا سرغنہ شمار ہوتا تھا۔ اسی بناء پر زیرِ بحث آیات اس پر اور اس کی بیوی اُم جمیل پر ایسی صراحت اور سختی کے ساتھ تنقید کر رہی ہیں۔

وہی ایک اکیلا ایسا شخص تھا جس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بنی ہاشم کی حمایت کے عہد و پیمان پر دستخط نہیں کیے تھے اور اس نے آپ کے دشمنوں کی صف میں رہتے ہوئے دشمنوں کے عہد و پیمان میں شرکت کی تھی۔ ان حقائق کی طرف توجہ کرنے سے اس سُورہ کی استثنائی کیفیت کی دلیل واضح ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: اس کے مال و ثروت نے اور جو کچھ اس نے کمایا ہے اس نے اسے ہرگز کوئی فائدہ

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۵۹

[2] "فی ظلال القرآن" جلد ۸ ص ۶۹۷

[3] "تفسیر القرآن" جلد ۳۰ ص ۵۰۲

نہیں دیا اور وہ اسے عذابِ الٰہی سے نہیں بچائے گا: (ما اغنٰی عنہ مالہ وما کسب)۔[1]

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دولت مند مغرور شخص تھا جو اپنی اسلام دشمن کوششوں کے لیے اپنے مال و دولت پر بھروسہ کرتا تھا۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "وہ جلدی ہی اس آگ میں داخل ہوگا جس کے شعلے بھڑکنے والے ہیں": (سیصلٰی ناراً ذات لھب)۔

اگر اس کا نام "ابولہب" تھا تو اس کے عذاب کی آگ بھی "ابولہب" ہے اور وہ بہت ہی عظیم شعلے رکھتی ہے۔

(اس بات پر توجہ رہے کہ "لہب" یہاں نکرہ کی صورت میں آیا ہے اور یہ اس شعلہ کی عظمت کی دلیل ہے)۔

نہ صرف ابولہب کو بلکہ کسی بھی کافر اور بدکار کو اس کا مال و ثروت اور اس کی اجتماعی و معاشرتی حیثیت جہنم کی آگ اور خدا کے عذاب سے رہائی نہیں بخشیں گے۔ جیسا کہ سورہ شعراء کی آیہ ۸۸ و ۸۹ میں آیا ہے: یوم لا ینفع مال ولا بنون الّا من اتی اللہ بقلب سلیم: قیامت ایک ایسا دن ہے جس میں انسان کو نہ تو اس کا مال ہی کوئی فائدہ دے گا اور نہ ہی اس کی اولاد، سوائے اس شخص کے جو قلب سلیم (یعنی ایمان و تقویٰ کی رُوح کے ساتھ) پروردگار کے دربار میں حاضر ہو۔

مسلّم طور پر آیہ "سیصلٰی ناراً ذات لھب" سے مراد جہنم کی آگ ہے، لیکن بعض نے احتمال دیا ہے کہ اس میں دنیا کی آگ بھی شامل ہے۔

روایات میں آیا ہے کہ جنگ "بدر" اور سخت شکست کے بعد جو مشرکین قریش کو اُٹھانی پڑی تھی، ابولہب نے جو خود میدانِ جنگ میں شریک نہیں ہوا تھا ــــ ابوسفیان کے واپس آنے پر اس سے ماجرے کے بارے میں سوال کیا:

ابوسفیان نے قریش کے لشکر کی شکست اور سرکوبی کی کیفیت اس سے بیان کی۔ اس کے بعد اس نے مزید کہا: خدا کی قسم ہم نے اس جنگ میں آسمان و زمین کے درمیان ایسے سوار دیکھے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کے لیے آئے تھے۔

اس موقع پر "عباس" کے ایک غلام "ابورافع" نے کہا: میں وہاں بیٹھا ہوا تھا، میں نے اپنے ہاتھ بلند کیے اور کہا کہ وہ آسمانی فرشتے تھے۔

اس سے ابولہب بھڑک اُٹھا اور اس نے ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر دے مارا، مجھے اُٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے مجھے پیٹے چلے جا رہا تھا۔ وہاں عباس کی بیوی "اُم الفضل" بھی موجود تھی اس نے ایک چھڑی اٹھائی اور ابولہب کے سر پر دے ماری اور کہا: "کیا تُو نے اس کمزور آدمی کو اکیلا سمجھا ہے؟"

ابولہب کا سر پھٹ گیا اور اس سے خون بہنے لگا۔ سات دن کے بعد اس کے بدن میں بدبو پیدا ہوگئی، اس کی جلد میں طاعون کی شکل کے دانے نکل آئے اور وہ اسی بیماری سے واصلِ جہنم ہوگیا۔

اس کے بدن سے اتنی بدبو آ رہی تھی کہ لوگ اس کے نزدیک جانے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ وہ اسے مکہ سے باہر

۱۔ "ما کسب" میں "ما" ممکن ہے "موصولہ" یا "مصدریہ" ہو، بعض اس کے لیے ایک وسیع معنی کے قائل ہیں جو نہ صرف اس کے اعمال بلکہ اس کی اولاد کو بھی شامل ہے اور "ما اغنٰی عنہ" میں "ما" مسلّم طور پر "ما نافیہ" ہے۔

لے گئے اور دُور سے اس پر پانی ڈالا اور اس کے بعد اس کے اُوپر پتھر پھینکے۔ یہاں تک کہ اس کا بدن پتھروں اور مٹی کے نیچے چھُپ گیا۔[1]

بعد والی آیت میں اس کی بیوی "اُم جمیل" کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اس کی بیوی بھی جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگی، جو اپنے دوش پر ایندھن اُٹھاتی ہے"۔ (وامرأته حمالة الحطب)[2]

"اور اس کی گردن میں خرما کی چھال کی رسّی یا گردن بند ہے"۔ (فی جیدھا حبل من مسد)۔

کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ ابولہب کی بیوی۔ جو "ابوسفیان" کی بہن اور معاویہ کی پھوپھی تھی۔ اسلام کے برخلاف اپنے شوہر کی عداوتوں اور خرابیوں میں برابر کی شریک تھی لیکن اس بارے میں کہ قرآن نے اس کی حمالة الحطب (دوش پر ایندھن اُٹھانے والی عورت) کے ساتھ توصیف کیوں کی ہے، مفسرین نے متعدد تفسیریں بیان کی ہیں:

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ اس بنا پر ہے کہ وہ کانٹے دار جھاڑیاں کندھے پر اُٹھا کر لاتی تھی اور پیغمبرؐ کے راستہ میں ڈال دیا کرتی تھی تاکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاؤں میں چُبھ جائیں۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ تعبیر اس کی سخن چینی اور چغل خوری کے بارے میں آئی ہے، جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

میان دوکس جنگ چوں آتش است

سخن چین بدبخت ہیزم کش است

دو آدمیوں کے درمیان جنگ آگ کے مانند ہے اور

بدبخت چغل خور ایندھن اُٹھانے والا ہے۔

بعض اسے اس کے شدّتِ بخل سے کنایہ سمجھتے ہیں، کیونکہ وہ اتنی دولت مند ہونے کے باوجود کسی ضرورت مند کی مدد کے لیے تیار ہی نہیں ہوتی تھی۔ اسی لیے اسے "ہیزم کش" ایندھن اُٹھانے والے فقیر سے تشبیہ دی گئی ہے۔

بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ قیامت میں بہت سے گروہوں کے گناہوں کو اپنے کندھے پر اُٹھائے ہوئے ہوگی۔

اِن معانی میں سے پہلا معنی سب سے زیادہ مناسب ہے، اگرچہ ان کے درمیان جمع بھی بعید نہیں ہے۔

"جید" (بروزن دید) "گردن" کے معنی میں ہے اور اس کی جمع "اجیاد" ہے۔ بعض اربابِ لغت کا نظریہ یہ ہے کہ "جید" و "عنق" اور "رقبہ" تینوں کے ایک ہی معنی ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ "جید" سینے کے اُوپر والے حصّہ کو کہا جاتا ہے، "عنق" گردن کی پُشت یا ساری گردن کو اور "رقبہ" مطلقاً گردن کو کہا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات ایک انسان کو بھی "رقبہ" کہتے ہیں، مثلاً: "فک رقبة" یعنی انسان کو آزاد کرنا۔[3]

---

[1] "بحارالانوار" جلد ۱۹ ص ۲۲۷

[2] "امرأته" "سیصلی" میں پوشیدہ ضمیر پر عطف ہے اور حمالة الحطب" حال ہے اور منصوب ہے، اور بعض نے مثل "زمخشری" کے "کشاف" میں اسے "ذم" کے عنوان سے منصوب جانا ہے۔ اور تقدیر میں اسطرح ہے اذا حمالة الحطب لیکن مسلم طور پر پہلا معنی بہتر ہے۔

[3] "التحقیق فی کلمات القرآن الکریم" جلد ۲ ص ۱۵۸

"مسد" (بروزن حسد) اس رسی کے معنی میں ہے جو کھجور کے پتوں سے بنائی جاتی ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ "مسد" وہ رسی ہے جو جہنم میں اس کی گردن میں ڈالیں گے جس میں کھجور کے پتوں جیسی سختی ہوگی اور اس میں آگ کی حرارت اور لوہے کی سنگینی ہوگی۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ چونکہ بڑے لوگوں کی عورتیں اپنی شخصیت کو آلات و زیورات خصوصاً گردن کے قیمتی زیورات سے زینت دینے میں خاص بات سمجھتی ہیں، لہٰذا خدا قیامت میں اس مغرور و خود پسند عورت کی تحقیر کے لیے لیف خرما کا ایک گردن بند اس کی گردن میں ڈال دے گا۔ یا یہ اصلاً اس کی تحقیر سے کنایہ ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس تعبیر کے بیان کرنے کا سبب یہ ہے کہ "ام جمیل" کے پاس جواہرات کا ایک بہت ہی قیمتی گردن بند تھا اور اس نے یہ قسم کھائی تھی کہ وہ اسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دشمنی میں خرچ کرے گی، لہٰذا اس کے اس کام کے بدلے میں خدا نے بھی اس کے لیے ایسا عذاب مقرر کر دیا ہے۔

چند نکات

۱۔ قرآن کے اعجاز کی ایک اور نشانی

ہم جانتے ہیں کہ یہ آیات مکہ میں نازل ہوئیں اور قرآن کریم نے دو ٹوک طریقہ سے یہ خبر دی تھی کہ ابولہب اور اس کی بیوی جہنم کی آگ میں ہوں گے، یعنی وہ ہرگز بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ انجام کار ایسا ہی ہوا، بہت سے مشرکین مکہ تو واقعی طور پر ایمان لے آئے اور بعض ظاہری طور پر مسلمان ہوگئے، لیکن وہ افراد جو نہ تو واقع میں ایمان لائے اور نہ ہی ظاہر بظاہر، وہ یہ دونوں تھے۔ یہ قرآن مجید کے غیبی اخبار میں سے ایک ہے اور قرآن نے دوسری آیات میں بھی اس قسم کی خبریں دی ہیں جن میں قرآن کی غیبی خبروں کے عنوان کے تحت اعجاز قرآن کی ایک فصل کو مخصوص کیا گیا ہے اور ہم نے ان آیات میں سے ہر ایک کے ذیل میں مناسب بحث کی ہے۔

۲۔ ایک اور سوال کا جواب

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی ان پیشین گوئیوں کی موجودگی میں ممکن نہیں تھا کہ ابولہب اور اس کی بیوی ایمان لے آتے، ورنہ یہ خبر جھوٹی اور دروغ ہو جاتی۔

یہ سوال اسی معروف سوال کے مانند ہے جو "علم خدا" کے مسئلہ کے بارے میں جبر کی بحث میں پیش ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ خدا جو ازل سے ہر چیز کا عالم تھا، وہ گنہگاروں کے گناہ اور اطاعت گزاروں کی اطاعت کو جانتا تھا۔ اس بنا پر اگر گنہگار گناہ نہ کرتے تو خدا کا علم بجہالت میں بدل جائے۔

علماء اور فلاسفۂ اسلام قدیم سے اس سوال کا جواب دے چکے ہیں اور وہ یہ ہے کہ خدا جانتا ہے کہ ہر شخص اپنے

اختیار و آزادی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کون کون سے کام انجام دے گا، مثلاً زیر بحث آیات میں خدا ابتدا سے جانتا تھا کہ ابولہب اور اس کی بیوی اپنی خواہش و رغبت اور ارادہ و اختیار سے ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، جبری اور لازمی طور پر نہیں دوسرے الفاظ میں ارادہ و اختیار کی آزادی کا عنصر بھی خدا کو معلوم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بندے صفت اختیار کے ساتھ اور اپنے ارادہ سے کون سے عمل انجام دیں گے۔

مسلمہ طور پر ایسا علم اور مستقبل کے بارے میں اس قسم کی خبر دینا، مسئلہ اختیار کی تاکید ہے، جبر اور مجبوری کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ (غور کیجئے)

۲۔ بے بصیرت رشتہ دار ہمیشہ دُور ہوتے ہیں۔

یہ سُورہ ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کی تاکید کر رہا ہے کہ ایسی رشتہ داری جس میں ایمان اور عقیدہ کا رشتہ نہ ہو اس کی کوئی حیثیت اور قدر و قیمت نہیں ہوتی، اور مردانِ خدا منحرف، جبار اور سرکش لوگوں کے مقابلہ میں کسی قسم کا میلان نہیں رکھتے تھے چاہے وہ ان کے کتنے ہی قریبی رشتہ دار ہوں۔

باوجود اس کے کہ ابولہب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چچا تھا اور آپ کے قریب ترین رشتہ داروں میں شمار ہوتا تھا، جب اُس نے اپنا اعتقادی اور عملی راستہ آپ سے جُدا کر لیا تو اس کی بھی دوسرے منحرف اور گمراہ لوگوں کی طرح سخت ملامت اور سرزنش کی گئی۔ اس کے برعکس ایسے دُور دراز کے لوگ بھی تھے جو نہ صرف پیغمبر کے رشتہ داروں میں شمار نہ ہوتے تھے، بلکہ آپ کے خاندان اور اہل زبان سے بھی نہیں تھے، لیکن وہ فکری، اعتقادی اور عملی رشتہ کی بنا پر اس قدر نزدیک ہو گئے کہ مشہور حدیث سلمان منا اھل البیت (سلمان ہم اہل بیت میں سے ہیں) کے مطابق گویا خاندانِ رسالت کا جزء ہو گئے۔[۱]

یہ ٹھیک ہے کہ اس سُورہ کی آیات صرف ابولہب اور اس کی بیوی کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ صرف ان کے صفات کی وجہ سے اُن کی ایسی مذمت کی گئی ہے۔ اس بنا پر جو شخص یا جو گروہ اُنہیں اوصاف کا حامل ہوگا اس کی سرنوشت بھی اُنہیں جیسی ہوگی۔

خداوندا! ہمارے دل کو ہر قسم کی ہٹ دھرمی اور عناد سے پاک کر دے۔

پروردگارا! ہم سب اپنے انجام اور عاقبت کار سے ڈرتے ہیں، ہمیں امن و سکون اور آرام بخش دے واجعل عاقبۃ امرنا خیراً، (ہماری عاقبت بخیر کر)

بارِالٰہا! ہم جانتے ہیں کہ اس عظیم عدالت میں نہ تو مال و دولت کام آتے ہیں اور نہ ہی کوئی رشتہ داری فائدہ دیتی ہے، صرف تیرا لُطف و کرم ہی کام آتا ہے، لہٰذا ہم پر اپنا لُطف و کرم کر۔

آمین یا ربّ العالمین

سُورۂ لہب کا اختتام

[۱] ہم نے اس سلسلہ میں ۹ جلد ص۔۔۔ پر سُورۂ ھود کی آیہ ۴۶ کے ذیل میں نوح کے بیٹے کے حال کی مناسبت سے، زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

سُورۂ اخلاص

❖ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔

❖ اس میں ۴ آیات ہیں۔

سورۂ "اخلاص" کے مطالب اور اس کی فضیلت

یہ سورہ ___ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے (سورۂ اخلاص اور سورۂ توحید) پروردگار کی توحید اور اس کی یگانگت اور یکتائی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور چار مختصر سی آیات میں خدا کی وحدانیت کی اس طرح سے توصیف و تعریف کی ہے جس میں اضافہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اس سورہ کی شانِ نزول کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس طرح نقل ہوا ہے:

"یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے یہ تقاضا کیا کہ آپ ان کے لیے خدا کی توصیف بیان کریں۔ پیغمبرؐ تین دن تک خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا، یہاں تک کہ یہ سورہ نازل ہوا اور ان کو جواب دیا۔"

بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ سوال کرنے والا "عبداللہ بن صوریا" تھا۔ جو یہودیوں کے مشہور سرداروں میں سے ایک تھا اور دوسری روایت میں یہ آیا ہے کہ اس قسم کا سوال "عبداللہ بن سلام" نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے مکہ میں کیا تھا اور اس کے بعد وہ ایمان لے آیا تھا۔ لیکن اپنے ایمان کو اسی طرح سے چھپائے ہوئے تھا۔

دوسری روایات میں یہ آیا ہے کہ اس قسم کا سوال مشرکین مکہ نے کیا تھا۔[1]

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ سوال کرنے والا نجران کے عیسائیوں کا ایک گروہ تھا۔

ان روایات کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ یہ سوال اُن سب کی طرف سے ہوا ہو۔ اور یہی بات اس سورہ کی حد سے زیادہ عظمت و بزرگی کی ایک دلیل ہے جو مختلف افراد و اقوام کے سوالات کا جواب دیتا ہے۔

---

[1] المیزان جلد ۱۰ ص ۵۴۶

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں مشہور اسلامی منابع میں بہت سی روایات آئی ہیں، جو اس سورہ کی حد سے زیادہ عظمت کی ترجمان ہیں۔ منجملہ۔

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"ایعجز احدکم ان یقرأ ثلث القرآن فی لیلۃ"

"کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات سے عاجز ہے کہ ایک ہی رات میں ایک تہائی قرآن پڑھ لے۔"

حاضرین میں سے ایک نے عرض کیا، اے رسولِ خدا، ایسا کرنے کی کس میں طاقت ہے؟

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اقرءوا قل ھو اللہ احد"

"سورہ قل ھو اللہ پڑھا کرو"

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "سعد بن معاذ" کے جنازے پر نماز پڑھی تو آپ نے فرمایا:

"ستر ہزار فرشتوں نے، جن میں جبرئیلؑ بھی تھے، اس کے جنازے پر نماز پڑھی ہے۔ میں نے جبرئیل سے پوچھا ہے کہ وہ کس عمل کی بنا پر تمہارے نماز پڑھنے کا حق ہوا ہے؟"

جبرئیل نے کہا: "اُٹھتے بیٹھتے، پیدل چلتے اور سوار ہوتے اور چلتے پھرتے "قل ھو اللہ احد" پڑھنے کی وجہ سے"[1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"جس شخص پر ایک رات اور دن گزر جائے، اور وہ پنجگانہ نمازیں پڑھے اور ان میں قل ھو اللہ احد کی قرأت نہ کرے تو اس سے کہا جائے گا: یاعبداللہ! لست من المصلین"!

"اے بندۂ خدا تو نماز گزاروں میں سے نہیں ہے"[2]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"جو شخص خدا اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ ہر نماز کے بعد قل ھو اللہ احد کے پڑھنے کو ترک نہ کرے کیونکہ جو شخص اسے پڑھے گا خدا اس کے لیے

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۶۱

[2] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۶۱ اور تفسیر و حدیث کی دوسری کتابیں۔

خیر دنیا و آخرت جمع کر دے گا۔ اور خود اُسے اور اس کے ماں باپ اور اس کی اولاد کو بخش دے گا۔[1]

ایک اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ گھر میں داخل ہوتے وقت اس سُورہ کا پڑھنا، رزق کو بڑھاتا ہے اور فقر و فاقہ کو دُور کر دیتا ہے۔[2]

اس سُورہ کی فضیلت میں اتنی زیادہ روایات ہیں کہ وہ اس مختصر بیان میں نہیں سما سکتیں اور ہم نے جو کچھ نقل کیا ہے وہ صرف ان کا ایک حصّہ ہے۔

اس بارے میں کہ سُورہ " قل ھواللہ " قرآن کی ایک تہائی کے برابر کیسے ہوگیا ؛ تو بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ اس بنا پر ہے کہ قرآن " احکام " و " عقائد " اور " تاریخ " پر مشتمل ہے اور یہ سُورہ عقائد کے حصّہ کو اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

بعض دوسرے مفسّرین نے یہ کہا ہے کہ قرآن کے تین حصّے ہیں " مبدا " و " معاد " اور " جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے " اور یہ سُورہ پہلے حصّہ کی تشریح کرتا ہے۔

یہ بات قابلِ قبول ہے کہ قرآن کی تقریباً ایک تہائی توحید کے بارے میں بحث کرتی ہے، اور اس کا خلاصہ سُورۂ توحید میں آیا ہے۔

ہم اس گفتگو کو اس سُورہ کی عظمت کے بارے میں ایک دوسری حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔

امام علی بن الحسین علیہ السلام سے لوگوں نے سُورۂ توحید کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا:

" ان اللہ عزوجل علم انہ یکون فی اٰخر الزمان اقوام متعمقون ۔ فانزل اللہ تعالیٰ قل ھو اللہ احد، والاٰیات من سورۃ الحدید الی قولہ: " وھو علیم بذات الصدور " فمن رام وراء ذالک فقد ھلک "

" خداوند تعالیٰ جانتا تھا کہ آخری زمانہ میں ایسی قومیں آئیں گی جو مسائل میں تعمق اور غور و خوض کرنے والی ہوں گی، لہٰذا اس نے (مباحث توحید اور خدا شناسی کے سلسلہ میں) سُورہ قل ھو اللہ احد اور سُورۂ حدید کی ابتدائی آیات، علیم بذات الصدور تک نازل فرمائیں۔ جو شخص اس سے زیادہ کا طلب گار ہوگا وہ ہلاک ہو جائے گا۔[3]

---

[1] " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۵۶۱ اور تفسیر و حدیث کی دوسری کتابیں۔

[2] " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۵۶۱ اور تفسیر و حدیث کی دوسری کتابیں۔

[3] " اصول کافی " جلد ۱ باب النسبۃ حدیث ۳

۲۔ جملہ کا "ھو" کی ضمیر کے ساتھ آغاز، جو واحد غائب کی ضمیر ہے اور ایک مبہم مفہوم کو بیان کرتی ہے، حقیقت میں اس واقعیت کی ایک رمز اور اشارہ ہے کہ اس کی ذاتِ اقدس انتہائی خفا میں ہے اور انسانوں کے محدود افکار کی دسترس سے باہر ہے۔ اگرچہ اس کے آثار نے جہان کو اس طرح سے پُر کر رکھا ہے کہ وہ ہر چیز سے زیادہ ظاہر اور زیادہ آشکار ہے۔ جیسا کہ سُورہ حٰم سجدہ کی آیہ ۵۳ میں آیا ہے:

سنریھم اٰیاتنا فی الاٰفاق و فی انفسھم حتّٰی یتبین لھم انہ الحق:

"ہم جلدی ہی اطراف جہان اور ان کے نفسوں میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے، تاکہ واضح ہو جائے کہ وہ حق ہے"۔

اس کے بعد اس ناشناختہ حقیقت سے پردہ اُٹھاتے ہوئے کہتا ہے، "وہ یکتا و یگانہ خدا ہے"۔

ضمنی طور پر یہاں "قل" (کہہ دے) کا معنی یہ ہے کہ اس حقیقت کا اظہار کرو۔

ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپؑ نے اِس بات کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ کفار و بت پرست اسم اشارہ کے ساتھ اپنے بتوں کی طرف اشارہ کرتے تھے اور کہتے تھے:

"اے محمّد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یہ ہمارے خدا ہیں، تو بھی اپنے خدا کی تعریف توصیف کر تاکہ ہم اُسے دیکھیں اور اس کا ادراک کریں = تو خدا نے یہ آیات نازل کیں: قل ھو اللہ احد ... "ھا" "ھو" میں، مطلب کو ثابت کرنے اور توجہ دینے کے لیے ہے اور "واو" ضمیر غائب ہے، جو اس ذات کی طرف اشارہ ہے جو آنکھوں کے دیکھنے سے غائب اور حواس کے لمس سے دُور ہے"۔[۱]

ایک اور حدیث میں امیرالمومنین علی علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"جنگِ بدر کی رات میں نے "خضر" علیہ السلام کو خواب میں دیکھا اور ان سے کہا کہ مجھے کوئی ایسی چیز بتائیں جس کی مدد سے میں دشمنوں پر کامیاب ہوں تو انہوں نے کہا: کہیے:

"یاھو۔ یا من لا ھو الّا ھو"

پچھلے صفحہ کا حاشیہ [۱] بعض نے ھو کو یہاں "ضمیرِ شان" لیا ہے، اس بناء پر معنی یہ ہوگا کہ شان و مطلب یہ ہے کہ خدا ایک اکیلا ہے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ "ھو" کی پاک ذات کی طرف اشارہ ہو جو سوال کرنے والوں کے لیے غیر معلوم اور مبہم تھی۔ اس بناء پر "ھو" مبتدا ہے اور "اللہ" اس کی خبر اور "احد" خبر کے بعد کی خبر ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [۱] "بحارالانوار" جلد ۳ ص ۲۲۱ حدیث ۱۲ (تلخیص کے ساتھ)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ

۲۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ

۳۔ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ

۴۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۚ

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ کہہ دیجئے خُدا یکتا و یگانہ ہے۔

۲۔ خُدا ہی ہے کہ جس کی طرف تمام حاجت مند رُخ کرتے ہیں

۳۔ نہ تو اُس نے کسی کو جنا ہے اور نہ ہی وُہ کسی سے پیدا ہُوا ہے۔

۴۔ اور ہرگز اس کا کوئی ہم پلہ اور مانند نہیں ہے۔

تفسیر

وُہ یکتا اور بے مثال ہے

اِس سُورہ کی پہلی آیت بار بار کے ان سوالات کے جواب میں ہے جو مختلف اقوام یا افراد کی طرف سے پروردگار کے اوصاف کے سلسلہ میں ہوتے تھے، فرماتا ہے: "کہہ دیجئے وُہ یکتا و یگانہ ہے" (قل ھو اللہ احد) [1]

(1 حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جب صبح ہوئی تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں یہ واقعہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا :

" یا علی ! علمت الاسم الاعظم "

" اے علی آپ کو اسم اعظم کی تعلیم دی گئی ہے ۔"

اس کے بعد جنگِ بدر میں یہی جملہ میرا وردِ زبان رہا ۔ [1]

" عمار یاسرؓ نے جب یہ سُنا کہ حضرت امیرالمومنین علیہ السّلام صفین کے دن جنگ کے وقت یہی ذکر پڑھ رہے تھے تو عرض کیا : یہ کیا کنایات ہیں ؟ تو آپ نے فرمایا : یہ خدا کا اسمِ اعظم اور توحید کا ستون ہے ۔[2]

" اللہ " خدا کا اسم خاص ہے اور امام کی بات کا مفہوم یہ ہے کہ اسی ایک لفظ کے ذریعے اس کے تمام صفاتِ جلال و جمال کی طرف اشارہ ہوا ہے ، اور اسی بنا پر اس کو اسمِ اعظم الٰہی کا نام دیا گیا ہے ۔

اس نام کا خُدا کے سوا اور کسی پر اطلاق نہیں ہوتا جب کہ خدا کے دوسرے نام عام طور پر اس کی کسی صفتِ جمال و جلال کی طرف اشارہ ہوتے ہیں ، مثلاً : عالم و خالق و رازق ، اور عام طور پر اس کے غیر پر بھی اطلاق ہوتے ہیں ۔ (مثلاً رحیم ، کریم ، عالم ، قادر وغیرہ)

اس حال میں اس کی اصل اور ریشہ وصفی معنی رکھتا ہے اور اصل میں یہ " ولہ " سے مشتق ہے ، جو " تحیر " کے معنی میں ہے کیونکہ اس کی ذاتِ پاک میں عقلیں حیران ہیں ، جیسا کہ ایک حدیث میں امیرالمومنین علیؑ سے آیا ہے :

" اللّٰہ معناہ المعبود الذی یألہ فیہ الخلق و یؤلہ الیہ ، واللّٰہ ہو المستور عن درک الابصار ، المحجوب عن الاوہام والخطرات " ۔

" اللہ کا معنی ایک ایسا معبود ہے جس میں مخلوق حیران ہے اور اس سے عشق کرتی ہے اللہ وہی ذات ہے جو آنکھوں کے ادراک سے مستور اور مخلوق کے افکار و عقول سے محجوب ہے ۔[3]

بعض اوقات اسے " الاھۃ " (بروزن و بمعنی عبادت) کی اصل اور ریشہ سے بھی سمجھا گیا ہے اور اصل میں " الالٰہ " ہے ، جو " تنہا معبودِ حقیقی " کے معنی میں ہے ۔

لیکن ۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ۔ اس کا ریشہ اور اصل چاہے جو بھی ہو ، بعد میں اس نے اسمِ خاص کی صورت اختیار کر لی ہے اور یہ اسی جامع جمیع صفاتِ کمالیہ اور ہر قسم کے عیب و نقص سے خالی ذات کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔

---

[1] ، [2] ، [3] " بحار الانوار " جلد ۳ ، ص ۲۲۲

اس مقدس نام کا قرآن مجید میں تقریباً "ایک ہزار" مرتبہ تکرار ہوا ہے اور خدا کے اسمائے مقدسہ میں سے کوئی سا نام بھی اتنی مرتبہ قرآن میں نہیں آیا۔ یہ ایک ایسا نام ہے جو دل کو روشن کرتا ہے اور انسان کو قوت و توانائی اور سکون و آرام بخشتا ہے اور اُسے نور و صفا کے ایک عالم میں غرق کر دیتا ہے۔

لیکن "احد" کا لفظ "وحدت" کے مادہ سے ہی ہے اور اسی لیے بعض نے "احد" اور "واحد" کی ایک ہی معنی کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ دونوں ہی اس ذات کی طرف اشارہ ہیں جو ہر لحاظ سے بے مثل و بے نظیر ہے۔ علم میں یگانہ ہے، قدرت میں بے مثل ہے، رحمانیت و رحیمیت میں یکتا ہے اور خلاصہ یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے بے نظیر ہے۔

لیکن بعض کا نظریہ یہ ہے کہ "احد" اور "واحد" میں فرق ہے۔ "احد" اس ذات کو کہا جاتا ہے جو کثرت کو قبول نہیں کرتا، نہ تو خارج میں اور نہ ہی ذہن میں۔ لہٰذا وہ شمار کرنے کے قابل نہیں ہے اور ہرگز عدد میں داخل نہیں ہوتا۔ "واحد" کے برخلاف کہ اُس کے لیے دوسرے اور تیسرے کا تصور ہوتا ہے، چاہے وہ خارج میں ہو یا ذہن میں۔ اسی لیے بعض اوقات ہم یہ کہتے ہیں کہ: احدی ازاں جمعیت نیامد، یعنی اُن میں سے کوئی شخص بھی نہیں آیا۔ لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ: واحدی نیامد (ایک نہیں آیا) تو ممکن ہے کہ دو یا چند افراد آئے ہوں[1]

لیکن یہ فرق قرآن مجید اور احادیث کے مواردِ استعمال کے ساتھ چنداں سازگار نہیں ہے۔

بعض کا یہ بھی نظریہ ہے کہ: احد (جنس و فصل اور ماہیت و وجود) کے اجزائے ترکیبیہ خارجیہ یا عقلیہ کے مقابلہ میں خدا کی بساطتِ ذات کی طرف اشارہ ہے جب کہ واحد خارجی کثرتوں کے مقابلہ میں اس کی ذات کی یگانگت کی طرف اشارہ ہے۔

ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے کہ "احد" فردِ یگانہ کو کہتے ہیں، اور "احد" اور "واحد" کا ایک ہی مفہوم ہے، اور وہ ایک ایسی منفرد ذات ہے جس کا کوئی مثل و نظیر نہیں ہے۔ اور "توحید" اس کی یگانگت وحدت اور انفرادیت کا اقرار ہے۔

اسی حدیث کے ذیل میں آیا ہے:

> "واحد عدد نہیں ہے، بلکہ واحد اعداد کی بنیاد ہے۔ عدد دو سے شروع ہوتا ہے، اس بنا پر اللہ احد۔ "یعنی وہ معبود جس کی ذات کے ادراک سے انسان عاجز ہیں اور جس کی کیفیت کا احاطہ کرنے سے ناتواں ہیں" کا معنی یہ ہے کہ وہ الٰہیت میں فرد ہے اور مخلوقات کی صفات سے برتر ہے[2]

قرآن مجید میں "واحد" و "احد" دونوں کا خدا کی ذاتِ پاک پر اطلاق ہوا ہے۔

---

[1] "المیزان" جلد ۲۰، ص ۵۴۳۔

[2] "بحار الانوار" جلد ۳، ص ۲۲۲۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ توحید صدوق میں آیا ہے کہ جنگِ جمل میں ایک اعرابی نے کھڑے ہوکر عرض کیا
اے امیرالمومنین! کیا آپ یہ کہتے ہیں کہ خدا واحد ہے ؟ تو واحد کا کیا معنیٰ ہے ؟
اچانک لوگوں نے ہر طرف سے اس پر حملہ کر دیا اور کہنے لگے : "اے اعرابی یہ کیا سوال ہے ؟ کیا تو دیکھ نہیں رہا ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام مسئلہ جنگ کی فکر میں کتنے مشغول ہیں ؟ ہر سخن جائے و ہر نکتہ مقامی دارد! ہر بات کا ایک موقع اور ہر نکتہ کا ایک مقام ہوتا ہے۔
امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا :

" اسے اس کی حالت پر چھوڑ دو کیونکہ جو کچھ وہ چاہتا ہے وہی چیز ہم اس دشمن گروہ سے چاہتے ہیں. (وہ توحید کے بارے میں پوچھ رہا ہے، ہم بھی مخالفین کو کلمۂ توحید ہی کی دعوت دے رہے ہیں)"۔

اس کے بعد آپؑ نے فرمایا :

" اے اعرابی یہ جو ہم کہتے ہیں کہ خدا " واحد " ہے تو اس کے چار معانی ہو سکتے ہیں جن میں سے دو معانی خدا کے لیے صحیح نہیں ہیں اور اس کے دو معانی صحیح ہیں۔

" اب وہ دو جو صحیح نہیں ہیں، ان میں سے ایک وحدت عددی ہے۔ یہ خدا کے لیے جائز نہیں ہے (یعنی ہم یہ کہیں کہ وہ ایک ہے دو نہیں ہیں) کیونکہ اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے لیے دوسرے کا تصور ہو سکتا ہے لیکن وہ موجود نہیں ہے۔ حالانکہ مسلّمہ طور پر حق تعالیٰ کی غیر متناہی ذات کے لیے دوسرے کا تصور ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ جس چیز کا کوئی ثانی ہی نہیں ہے وہ باب اعداد میں داخل نہیں ہوتی۔ کیا تو دیکھتا نہیں کہ خدا نے ان لوگوں کی، جنھوں نے یہ کہا تھا کہ : " ان اللہ ثالث ثلاثۃ " (خدا تین میں کا تیسرا ہے)، تکفیر کی ہے۔
" واحد کا دوسرا معنی جو خدا کے لیے صحیح نہیں ہے یہ ہے کہ وہ واحد نوعی کے معنی میں ہو، مثلاً، ہم یہ کہیں کہ فلاں آدمی لوگوں میں سے ایک ہے، یہ بھی خدا کے لیے صحیح نہیں ہے۔ (کیونکہ خدا کی کوئی جنس اور نوع نہیں ہے) اس بات کا مفہوم تشبیہ ہے، اور خدا ہر قسم کی تشبیہ اور نظیر سے برتر و بالاتر ہے۔
" اب رہے وہ دو مفہوم جو خدا کے بارے میں صحیح اور صادق ہیں، ان میں سے پہلا یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ خدا واحد ہے یعنی اشیاء عالم میں کوئی اس کی شبیہ نہیں ہے، ہاں! ہمارا پروردگار ایسا ہی ہے۔
" دوسرے یہ کہ یہ کہا جائے کہ ہمارا پروردگار احدی المعنی ہے، یعنی اس کی ذات ناقابلِ تقسیم ہے، نہ تو خارج میں نہ عقل میں اور نہ ہی وہم میں، ہاں! خدائے بزرگ ایسا ہی ہے۔[1]
" خلاصہ یہ ہے کہ خدا واحد و احد ہے اور یگانہ و یکتا ہے۔ واحد عددی یا نوعی و جنسی کے معنی میں نہیں بلکہ وحدت

---

[1] " بحارالانوار " جلد ۳، ص ۲۰۶، حدیث ۱

ذاتی کے معنی ہیں، زیادہ واضح عبارت میں اس کی وحدانیت کا معنی یہ ہے کہ اس کا کوئی مثل و نظیر اور مانند و شبیہ نہیں ہے۔"

اس بات کی دلیل بھی واضح و روشن ہے: وہ ایک ایسی ذات ہے جو ہر جہت سے غیر متناہی ہے اور مسلّم طور پر ہر جہت سے دو غیر متناہی ذاتیں ناقابل تصور ہیں، کیونکہ اگر دو ذاتیں ہوں گی تو وہ دونوں محدود ہو جائیں گی، اس میں اُس کے کمالات نہ ہوں گے اور نہ اُس میں اِس کے کمالات (غور کیجئے)۔

بعد والی آیت میں اس یکتا ذاتِ مقدس کے بارے میں فرماتا ہے: "وہ ایسا خدا ہے کہ تمام حاجت مند اسی کی طرف رُخ کرتے ہیں۔" (اللہ الصمد)۔

"صمد" کے لیے روایات اور مفسرین و اربابِ لغت کے کلمات میں بہت زیادہ معانی بیان ہوئے ہیں۔

"راغب" "مفردات" میں کہتا ہے: صمد اس آقا اور بزرگ کے معنی میں ہے جس کی طرف کاموں کی انجام دہی کے لیے جاتے ہیں۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ "صمد" اس چیز کے معنی میں ہے جو اندر سے خالی نہ ہو بلکہ پُر ہو۔

"مقاییس اللغۃ" میں آیا ہے کی دو اصلی جڑ بُنیادیں ہیں: ایک قصد کے معنی میں ہے اور دُوسرا صلابت و استحکام کے معنی میں، اور یہ جو خدا کو "صمد" کہا جاتا ہے تو یہ اس بنا پر ہے کہ بندے اس کی بارگاہ کا قصد و ارادہ کرتے ہیں۔

اور شاید یہی وجہ ہے کہ ذیل کے متعدد معانی بھی لُغت کی کتابوں میں "صمد" کے لیے ذکر ہوئے ہیں:
ایسی بزرگ ہستی جو انتہائی عظمت میں ہو، اور ایسی ذات جس کی طرف لوگ اپنی حاجات لے کر جاتے ہیں، ایسی ذات جس سے برتر کوئی چیز نہیں ہے، ایسی ہستی جو مخلوق کے فنا و نابود ہونے کے بعد بھی دائم اور باقی رہنے والی ہے۔

اسی لیے امام حسین بن علی علیہما السلام نے ایک حدیث میں "صمد" کے لیے پانچ معانی بیان کیے ہیں۔ "صمد" اس ہستی کو کہتے ہیں جو انتہائی سیادت و آقائی میں ہو۔

"صمد" وہ ذات ہے جو دائم اور ازلی و ابدی ہو۔
"صمد" وہ موجود ہے جو جوف (اندر سے خلا) نہ رکھتا ہو۔
"صمد" وہ ہستی جو نہ کھاتی ہو نہ پیتی ہو۔
"صمد" وہ ہستی جو کبھی نہ سوتی ہو۔[1]

اور دوسری عبارتوں میں یہ آیا ہے کہ: "صمد اس ہستی کو کہتے ہیں جو قائم بہ نفس ہو اور غیر سے بے نیاز ہو۔"
"صمد" اس ہستی کو کہتے ہیں جس میں تغیّرات اور کون و فساد نہیں ہے۔

امام علی بن الحسین علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:
"صمد" اس ہستی کو کہتے ہیں جس کا کوئی شریک نہ ہو کسی چیز کی حفاظت کرنا اس کے لیے مشکل نہ ہو اور کوئی چیز اس سے مخفی نہیں رہتی۔[2]

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "صمد" اس ذات کو کہتے ہیں کہ وہ جب بھی کسی چیز کا ارادہ کرے تو اُسے کہتا ہے

---

[1]، [2] "بحارالانوار" جلد ۳، ص ۲۲۳۔

ہوجا، تو وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ "اہل بصرہ" نے امام حسن علیہ السلام کی خدمت میں ایک خط لکھا اور "صمد" کے معنی دریافت کیے۔ امام علیہ السلام نے ان کے جواب میں فرمایا:

"بسم اللہ الرحمان الرحیم، امابعد قرآن میں آگاہی کے بغیر بحث و گفتگو نہ کرو، کیونکہ میں نے اپنے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سُنا ہے، آپ فرما رہے تھے: جو شخص علم کے بغیر بات کرے گا اسے آگ میں اس مقام پر رہنا پڑے گا جو اُس کے لیے معین ہے۔ خدا نے خود "صمد" کی تفسیر بیان فرمائی ہے "لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوًا احد" نہ اُسے کسی نے جنا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا، اور نہ ہی کوئی اس کی مانند اور مثل و نظیر ہے۔ ہاں! خداوند "صمد" وہ ہے جو کسی چیز سے وجود میں نہیں آیا، اور نہ ہی وُہ کسی چیز کے اندر موجود ہے۔ نہ کسی چیز کے اُوپر قرار پایا ہے، وہ تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا اور ان کا خالق ہے، تمام چیزوں کو وہی اپنی قدرت سے وجود میں لایا ہے۔ جن چیزوں کو اس نے فنا کے لیے پیدا کیا ہے وہ اس کے ارادہ سے متلاشی ہو جائے گی، اور جسے بقا کے لیے پیدا کیا ہے، وہ اس کے علم سے باقی رہے گی۔ یہ ہے خداوند صمد ......"[1]

اور بالآخر ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ "محمّد بن حنفیہ" نے امیرالمومنین علی علیہ السلام سے "صمد" کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا:

"صمد" کی تأویل یہ ہے کہ وہ نہ اسم ہے اور نہ جسم ہے نہ اس کا کوئی مثل ہے نہ نظیر ہے، نہ صُورت ہے، نہ تمثال ہے، نہ حد ہے نہ محدود ہے، نہ محل ہے، نہ مکان ہے، نہ حال ہے، نہ یہ ہے، نہ یہاں ہے، نہ وہاں ہے، نہ پُر ہے نہ خالی ہے، نہ کھڑا ہے، نہ بیٹھا ہے، نہ ساکن ہے نہ متحرک ہے، نہ ظلمانی ہے، نہ نورانی ہے، نہ نفسانی۔ اس کے باوجود کوئی جگہ اس سے خالی نہیں ہے اور کسی مکان میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ نہ وہ رنگ رکھتا ہے، نہ انسان کے دل میں سماتا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی بُو ہے۔ یہ سب چیزیں اس کی ذاتِ پاک سے منتفی ہے۔[2]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰، ص ۵۶۵

[2] "بحارالانوار" جلد ۳، ص ۲۳۰، حدیث ۲۱

یہ حدیث اچھی طرح سے نشان وہی کرتی ہے کہ "صمد" کا ایک بہت ہی جامع اور وسیع مفہوم ہے۔ جو اس کی ساحتِ قدس سے مخلوقات کی ہر قسم کی صفات کی نفی کرتا ہے، کیونکہ مشخص اور محدود اسماء، اور اسی طرح جسم و رنگ و بو و مکان و سکون و حرکت و کیفیت و حد و حدود اور اسی قسم کی دوسری چیزیں، یہ سب ممکنات و مخلوقات کی صفات ہیں، بلکہ زیادہ تر عالم مادہ کے اوصاف ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ خدا ان سب سے برتر و بالاتر ہے۔

آخری انکشافات سے معلوم ہوا ہے کہ جہانِ مادہ کی تمام چیزیں بہت ہی چھوٹے چھوٹے ذرات سے مل کر بنی ہیں جنہیں "ایٹم" کہا جاتا ہے۔ اور "ایٹم" خود بھی دو عمدہ حصّوں کا مرکب ہے۔ مرکزی ذرہ اور وہ الکٹرون جو اس کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اس ذرہ اور الکٹرونوں کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ ہے۔ (البتہ یہ زیادہ ایٹم کے حجم کے اندازہ سے ہے) اس طرح سے کہ اگر یہ فاصلہ اُٹھا دیا جائے تو اجسام اس قدر چھوٹے ہو جائیں گے کہ وہ ہمارے لیے حیرت میں ڈالنے والے ہوں گے۔

مثلاً اگر ایک انسان کے وجود کے ایٹمی ذرات کے فاصلے ختم کر دیں اور اُسے مکمل طور پر دبا دیں تو ممکن ہے کہ وُہ ایک ذرہ کی صُورت اختیار کر لے، جس کا آنکھ کے ساتھ دیکھنا مشکل ہو جائے۔لیکن اس کے باوجود وہ ایک انسان کے بدن کے سارے وزن کے برابر ہوگا، (مثلاً، یہی معمولی ذرہ ۶۰ کلو وزنی ہوگا)۔

بعض نے اس علمی انکشاف سے استفادہ کرتے ہوئے اور اس بات کی طرف توجہ دیتے ہوئے کہ "صمد" کا ایک معنی ایسا وجود ہے جو اندر سے خالی نہیں ہے، یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن اس تعبیر سے یہ چاہتا ہے کہ خدا سے ہر قسم کی جسمانیت کی نفی کر دے، کیونکہ تمام اجسام ایٹم سے بنے ہوئے ہیں اور ایٹم اندر سے خالی ہوتے ہیں۔ اور اس طرح یہ آیت قرآن کے علمی معجزات میں سے ایک ہو سکتی ہے۔

لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ اہل لغت میں "صمد" ایک ایسی عظیم ہستی کے معنی میں ہے جس کی طرف تمام حاجت مند رُخ کرتے ہیں اور وُہ ہر لحاظ سے کامل ہو، اور ظاہراً باقی تمام معانی اور تفاسیر جو اس کے لیے بیان کی گئی ہیں اسی اصل کی طرف لوٹتی ہیں۔

اس کے بعد اگلی آیت میں نصاریٰ، یہود اور مشرکین عرب کے عقائد کی رد پیش کرتے ہوئے — جو خدا کے لیے بیٹے یا باپ کے قائل تھے — فرماتا ہے: "اس نے نہ تو کسی کو جنا ہے اور نہ ہی وُہ خُود کسی سے پیدا ہوا ہے": (لم یلد ولم یولد)۔

اس بیان کے مقابلہ میں ان لوگوں کا نظریہ ہے جو تثلیث (تین خداؤں) کا عقیدہ رکھتے تھے، باپ خدا، بیٹا خدا اور رُوح القدس۔

نصاریٰ "مسیح" کو خدا کا بیٹا کہتے تھے اور یہود "عزیر" کو اس کا بیٹا سمجھتے تھے، وقالت الیھود عزیر ابن اللہ وقالت النصاری المسیح ابن اللہ ذالک قولھم بافواھھم یضاھئون قول الذین کفروا من قبل قاتلھم اللہ انی یؤفکون:

" یہود نے تو یہ کہا کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے یہ کہا کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے ۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو وہ اپنی زبان سے کہتے ہیں اور ان کی یہ بات گزشتہ کافروں کے قول کے مانند ہے ۔ ان پر خدا کی لعنت ہو ، وہ حق سے کیسے منحرف ہو جاتے ہیں" (توبہ - ۳۰)

مشرکینِ عرب کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ ملائکہ خدا کی بیٹیاں ہیں' وخرقوا له بنين و بنات بغير علم : " انہوں نے جھوٹ اور جہالت کی بنا پر خدا کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑلی تھیں" (انعام - ۱۰۰)

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آیہ " لم يلد ولم يولد " میں تولد ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور اُس سے ہر قسم کی مادی و لطیف چیزوں کے خروج اس ذاتِ مقدس کے دوسری مادی و لطیف چیزوں سے خروج کی نفی کرتا ہے ۔

جیسا کہ اسی خط میں ـ جو امام حسینؑ نے " اہلِ بصرہ" کے جواب میں صمد کی تفسیر میں لکھا تھا "لم يلد ولم يولد" کے جملہ کی اس طرح تفسیر کی گئی تھی :(لم يلد) یعنی کوئی چیز اس سے خارج نہیں ہوئی ، نہ تو بیٹے جیسی کوئی مادی چیز اور نہ ہی وہ تمام چیزیں جو مخلوق سے خارج ہوئی ہیں (جیسے ماں کی چھاتیوں سے دودھ) اور نہ ہی نفس جیسی کوئی لطیف چیز اور نہ ہی قسم قسم کے حالات ، جیسے خواب و خیال ، حزن و اندوہ ، خوشحال ہونا ، ہنسنا اور رونا ، خوف و رجاء ، شوق و ملالت ، بھوک اور سیری وغیرہ ۔ خدا اس سے برتر و بالاتر ہے کہ کوئی چیز اس سے خارج ہو ،

اور وہ اس بات سے بھی برتر و بالاتر ہے کہ وہ کسی مادی چیز سے متولد ہو ۔۔۔ جیسا کہ کسی زندہ موجود کا کسی دوسرے زندہ موجود سے خارج ہونا اور گھاس کا زمین سے ، پانی کا چشمہ سے ، پھل کا درختوں سے اور اشیائے لطیف کا اپنے منابع سے جیسے نگاہ کا آنکھ سے ، سماعت کا کان سے ، سونگھنے کا ناک سے ، چکھنے کا منہ سے ، گفتگو کا زبان سے ، معرفت و شناخت کا دل سے اور آگ کی چنگاری کا پتھر سے نکلنا[1]

اس حدیث کے مطابق تولد ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو ہر قسم کے خروج اور ایک چیز کے کسی دوسری چیز کا نتیجہ ہونے کو شامل ہے ، اور یہ حقیقت میں آیت کا دوسرا معنی ہے اور اس کا پہلا اور ظاہری معنی وہی تھا جو ابتداً میں بیان کیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ دوسرا معنی پہلے معنی کی تحلیل کرنے سے پورے طور پر قابلِ ادراک ہے کیونکہ اگر خدا کے بیٹا نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مادی عوارض سے پاک و منزہ ہے ۔ یہی معنی تمام مادی عوارض میں بھی صادق آتا ہے ۔ (غور کیجیے)

اور آخر میں اس سورہ کی آخری آیت میں خدا کے اوصاف کے بارے میں مطلب کو مرحلۂ کمال تک پہنچاتے ہوئے فرماتا ہے : اور ہرگز اس کا کوئی شبیہ اور ہمسر نہیں ہے ۔ (ولم يكن له كفوًا احد)[2]

"کفو" اصل میں مقام و منزلت اور قدر میں ہم پلّہ کے معنی میں ہے اور اس کے بعد اس کا ہر قسم کے شبیہ اور مانند پر اطلاق ہوا ہے ۔

اس آیت کے مطابق مخلوقات کے تمام عوارض اور موجودات کی صفات اور ہر قسم کا نقص و محدودیت اس کی ذات پاک سے منتفی ہے ۔ یہ وہی توحیدِ ذاتی و صفاتی ہے جو اُس توحیدِ عددی و نوعی کے مقابلہ میں ہے جس کی طرف اس سورہ کے

---

[1] " بحار الانوار " جلد ۳ ص ۲۲۴

[2] " احد " " کان " کا اسم ہے اور " کفوًا " اس کی خبر ہے ۔

آغاز میں اشارہ ہوا ہے۔

اس بنا پر نہ تو ذات میں اس کا کوئی شبیہ ہے اور نہ صفات میں کوئی اس کے مانند ہے، اور نہ ہی افعال میں کوئی اس کا مثل و نظیر ہے، وہ ہر لحاظ سے بے مثل و بے نظیر ہے۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:

"لم یلد" فیکون مولودًا" "ولم یولد" فیصیر محدودًا۔۔۔۔
ولا "کفء" له فیکافئه" ولا نظیر له فیساویه

"اس نے کسی کو نہیں جنا کہ وہ خود بھی مولود ہو۔ اور وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا ورنہ وہ محدود ہو جاتا۔۔۔ اس کا کوئی مثل و نظیر نہیں ہے کہ وہ اس کا ہم پلہ ہو جائے" اور اس کے لیے کسی شبیہ کا تصور نہیں ہو سکتا کہ وہ اس کے مساوی ہو جائے"[1]

اور یہ ایک ایسی عمدہ تفسیر ہے جو توحید کے عالیترین دقائق کو بیان کرتی ہے۔ (سلام اللہ علیک یا امیرالمومنین)

چند نکات

۱۔ توحید کے دلائل

توحید، یعنی ذاتِ خدا کا یکتا و یگانہ ہونا اور اس کا کوئی شریک و شبیہ نہ ہونا، دلائل نقلی اور قرآن مجید کی آیات کے علاوہ بہت سے عقلی دلائل سے بھی ثابت ہے جن میں سے ایک حصّہ کو ہم مختصر طور پر یہاں نقل کرتے ہیں۔

۱۔ برھان صرف الوجود۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا وجودِ مطلق ہے اور اس کے لیے کوئی قید و شرط اور حد نہیں ہے۔ اس قسم کا وجود یقینی طور پر غیر محدود ہوگا، کیونکہ اگر اس میں محدودیت ہوگی تو وہ ضروری طور پر عدم سے آلودہ ہوگا، لیکن وہ ذاتِ مقدس جس کی ہستی و وجود خود بخود موجود ہے وہ ہرگز عدم و نیستی کا مقتضی نہیں ہوگا، اور وہ خارج میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو عدم کو اس پر ڈال دے اس بنا پر وہ کسی حد کے ساتھ محدود نہیں ہوگا۔

دوسری طرف سے عالم میں دو غیر محدود ہستیاں تصور میں ہی نہیں آسکتیں، کیونکہ اگر دو موجود پیدا ہو جائیں تو یقیناً ان میں سے ہر ایک دوسرے کے کمالات کا فاقد ہوگا۔ یعنی اس میں دوسرے کے کمالات نہیں ہوں گے۔ اس بنا پر وہ دونوں ہی محدود ہو جائیں گے، اور یہ خود ذات واجب الوجود کی یگانگت اور یکتائی پر ایک واضح دلیل ہے۔ (غور کیجیے)

۲۔ برھان علمی۔ جب ہم اس وسیع و عریض جہان پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ابتداء میں ہم عالم کو پراگندہ موجودات کی صورت میں دیکھتے ہیں، زمین و آسمان، سورج، چاند، ستارے، انواع و اقسام کی نباتات و حیوانات، لیکن ہم جتنا

---

[1] "نہج البلاغہ" خطبہ ۱۸۶

زیادہ غور کرتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ اس عالم کے اجزاء و ذرات اس طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور پیوستہ ہیں کہ مجموعی طور پر وہ ایک منظم چیز بناتے ہیں اور اس جہان پر معیّن قوانین کا ایک سلسلہ حکومت کرتا ہے۔

انسانی علم و دانش کی پیش رفت جس قدر زیادہ ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس جہان کے اجزاء کا انسجام و وحدت زیادہ آشکار اور ظاہر ہوتا جا رہا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات ایک چھوٹے سے نمونہ (مثلاً ایک سیب کے درخت سے گرنے) کی آزمائش اس بات کا سبب بن جاتی ہے کہ ایک بہت بڑا قانون جو سارے عالم ہستی پر حکم فرما ہے، منکشف ہو جاتا ہے۔ (جیسا کہ "نیوٹن" اور "قانونِ جاذبہ" کے بارے میں ہے)۔

نظام ہستی کی یہ وحدت، اس پر حاکم قوانین اور اس کے اجزاء کے درمیان انسجام و یکتائی، اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اس کا خالق یکتا و یگانہ ہے۔

۳۔ برهان تمانع۔ (فلسفی علمی دلیل) دوسری دلیل جو علماء نے خُدا کی ذات کی یکتائی اور وحدت کے لیے بیان کی ہے اور قرآن نے سُورۂ انبیاء کی آیہ ۲۲ میں جس کے بارے میں ہدایت کی ہے، وہ برهان تمانع ہے، فرماتا ہے:

لوکان فیهما اٰلهة الا الله لفسدتا فسبحان الله رب العرش عما یصفون "اگر زمین و آسمان میں خدائے واحد و یکتا کے علاوہ اور بھی خدا ہوتے تو آسمان و زمین میں فساد ہو جاتا، اور نظام جہاں درہم و برہم ہو جاتا، پس وہ خدا جو عرش کا پروردگار ہے ان کی توصیف سے پاک و منزہ ہے۔

ہم اس دلیل کی جلد ۱۳ ص ۲۸۶ میں "برهان تمانع" کے عنوان کے ماتحت تفصیل کے ساتھ وضاحت کر چکے ہیں۔

۴۔ **خداوند یگانہ کی طرف انبیاء کی عمومی دعوت**: اثباتِ توحید کے لیے یہ ایک اور دلیل ہے کیونکہ اگر عالم میں دو واجبُ الوجود ہوتے تو دونوں کو ہی منبع فیض ہونا چاہیئے تھا، کیونکہ ایک بے نہایت کامل وجود کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی نور افشانی میں بُخل کرے، کیونکہ وجودِ کامل کے لیے عدمِ فیض نقص ہے۔ اور اس کے حکیم ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سب کو اپنا فیض پہنچائے۔

اس فیض کی دو شاخیں ہیں، (عالم خلقت میں) فیض تکوینی، اور (عالمِ ہدایت میں) فیض تشریعی۔ اس بنا پر اگر متعدد خدا ہوتے تو ضروری تھا کہ ان کی طرف سے بھی پیغمبر اور رسول آتے، اور ان کے فیض تشریعی سب کو پہنچاتے۔

حضرت علی علیہ السلام اپنے فرزند گرامی امام مجتبیٰ علیہ السلام کے وصیت نامہ میں فرماتے ہیں:

"واعلم یا بنی انه لوکان لربك شریك لاتتك رسله ولرأیت اٰثار ملکه وسلطانه، ولعرفت افعاله وصفاته، ولکنه الله واحد کما وصف نفسه۔"

"اے بیٹا! جان لو کہ اگر تیرے پروردگار کا کوئی شریک ہوتا تو اس کے بھیجے ہوئے نمائندے تیرے پاس آتے، اور تو اس کے ملک و سلطنت کے آثار کا بھی مشاہدہ کرتا، اور تو اس کی صفات و افعال سے بھی آشنا ہوتا، لیکن وہ

ایک اکیلا معبود ہے، جیسا کہ خود اس نے اپنی توصیف فرمائی ہے۔[1]

یہ سب اس کی ذات کی یکتائی کے دلائل ہیں۔ باقی رہا اس کی ذاتِ پاک میں ہر قسم کی ترکیب و اجزاء کے نہ ہونے کی دلیل تو وہ روشن و واضح ہے کیونکہ اگر اس کے لیے اجزائے خارجیہ ہوں تو طبعاً وہ ان کا محتاج ہوگا، اور واجب الوجود کے لیے محتاج ہونا معقول نہیں ہے اور اگر "اجزائے عقلیہ" (ماہیت و وجود یا جنس و فصل کی ترکیب) مراد ہو، تو وہ بھی محال ہے، کیونکہ ماہیت و وجود سے ترکیب اس کے محدود ہونے کی فرع ہے۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ اس کا وجود غیر محدود ہے، اور جنس و فصل کی ترکیب ماہیت رکھنے کی فرع ہے۔ لیکن وہ ذات جس کی کوئی ماہیت نہیں ہے، اس کی جنس و فصل بھی نہیں ہے

۲۔ توحید کی اقسام

عام طور پر توحید کی چار اقسام بیان کی جاتی ہیں:

۱۔ **توحید ذات**: (جس کی اوپر تشریح کی گئی ہے)۔

۲۔ **توحید صفات**: یعنی اس کی صفات اس کی ذات سے الگ نہیں ہیں اور ایک دوسرے سے بھی جدا نہیں ہیں، مثلاً ہمارا "علم" و "قدرت" دو الگ الگ صفات ہیں جو ہماری ذات پر عارض ہیں، ہماری ذات ایک الگ چیز ہے اور ہمارا علم و قدرت دوسری چیزیں ہیں جیسا کہ "علم" و "قدرت" بھی ہم میں ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ہمارے علم کا مرکز ہماری روح ہے، جب کہ ہماری قدرتِ جسمانی کا مرکز ہمارے بازو اور عضلات ہیں۔ لیکن خدا میں نہ اس کی صفات اس کی ذات پر زائد ہیں اور نہ ہی وہ ایک دوسرے سے جدا ہیں، بلکہ وہ ایک ایسا وجود ہے جو سارا کا سارا علم ہے، سارا کا سارا قدرت ہے اور سب کا سب ازلیت و ابدیت ہے۔

اگر اس کے علاوہ صورت ہو تو اس کا لازمہ ترکیب ہے اور اگر وہ مرکب ہوگا تو اجزاء کا محتاج ہوگا، اور محتاج چیز ہرگز واجب الوجود نہیں ہوتی۔

۳۔ **توحید افعالی**: یعنی ہر وجود، ہر حرکت اور ہر حرکت جو دنیا میں ہو رہی ہے اس کی بازگشت خدا کی پاک ذات کی طرف ہے۔ وہی مسبب الاسباب ہے اور اس کی پاک ذات ہی علت العلل ہے، یہاں تک کہ وہ افعال بھی جو ہم سے سرزد ہوتے ہیں ایک معنی میں اسی کے افعال ہیں، چونکہ اسی نے ہمیں قدرت و اختیار اور ارادہ کی آزادی عطا فرمائی ہے۔ اس بناء پر ہم اپنے افعال کے فاعل اور ان کے مقابلہ میں مسئول و جواب دہ ہونے کے باوجود ایک لحاظ سے فاعل خدا ہی ہے، کیونکہ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب اسی کی طرف سے ہے۔

(لا مؤثر فی الوجود الا اللہ) (عالمِ وجود میں خدا کے سوا اور کوئی مؤثر نہیں ہے)۔

۴۔ **توحید در عبادت**: یعنی صرف اسی کی عبادت کرنا چاہیئے اور اس کا غیر لائقِ عبادت نہیں ہے، کیونکہ عبادت ایسی ذات کی ہونا چاہیئے جو کمالِ مطلق اور مطلقِ کمال ہے، جو سب سے بے نیاز اور تمام نعمتوں کا بخشنے والا

---

[1] "نہج البلاغہ" وصیت امام مجتبیٰ (حصہ خطوط خط ۳۱)۔

اور تمام موجودات کا پیدا کرنے والا ہے ، اور یہ صفات اس کی پاک ذات کے سوا کسی میں جمع نہیں ہو سکتیں۔
عبادت کا اصلی مقصد اس کمال مطلق اور بے پایاں ہستی کا قرب حاصل کرنا اور اس کی صفات جمال و کمال کو اپنی رُوح کے اندر منعکس کرنا ہے، جس کا نتیجہ ہوا و ہوس سے دُوری اور تہذیب نفس اور خود سازی کی طرف رُخ کرنا ہے
یہ ہدف اور مقصد "اللہ" کی عبادت کے بغیر، جو وہی کمالِ مطلق ہے ، اِمکان پذیر نہیں ہے۔

۳۔ توحید افعالی کی اقسام

" پھر توحید افعالی کی بھی بہت سی اقسام ہیں جن میں سے ہم یہاں چھ اہم ترین اقسام کی طرف اشارہ کرتے ہیں"
۱۔ **توحیدِ خالقیت** ؛ جیسا کہ قرآن کہتا ہے : قل اللہ خالق کل شیء : " کہہ دیجئے خدا ہی ہر چیز کا خالق ہے" (رعد - ۱۶)
اس کی دلیل بھی واضح ہے ۔جب گزشتہ دلائل سے ثابت ہو گیا کہ واجب الوجود ایک ہی ہے اور اس کے علاوہ ہر چیز ممکن الوجود ہے تو اس بناء پر تمام موجودات کا خالق بھی ایک ہی ہو گا۔
۲۔ **توحیدِ ربوبیت** ؛ یعنی عالمِ ہستی کا مدبّر و مدیر، مربّی اور اس کا نظام بخش صرف خدا ہے ، جیسا کہ قرآن کہتا ہے :۔ قل اغیر اللہ ابغی ربًا وھو رب کل شیء" کہہ دیجئے کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو اپنا پروردگار مان لوں حالانکہ ہر چیز کا پروردگار وہی ہے" ؟ (انعام - ۱۶۴)۔
اس کی دلیل بھی واجبُ الوجود کی وحدت اور عالمِ ہستی میں خالق کی توحید ہے
۳۔ **توحید تشریع و قانون گزاری** ؛ جیسا کہ قرآن کہتا ہے : ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکافرون : " جو شخص اس کے مطابق حکم نہیں کرتا ، جو خدا نے نازل کیا ہے، وُہ کافر ہے" (مائدہ - ۴۴)
کیونکہ جب ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ مدبّر و مدیر وہی ہے،تو مسلّمہ طور پر اس کے غیر میں قانون گزاری کی صلاحیت نہیں ہو سکتی ، کیونکہ اس کے غیر کا تدبیرِ عالم میں کوئی حصّہ نہیں ہے ۔ لہٰذا وہ نظامِ تکوین سے ہم آہنگ قوانین وضع نہیں کر سکتا۔
۴۔ **توحید در مالکیت** چاہے "حقیقی مالکیت" ہو یعنی کسی چیز پر تکوینی تسلّط ، یا "حقوقی مالکیت" ہو ، یعنی کسی چیز پر قانونی تسلّط ، یہ سب اسی کے لیے ہیں جیسا کہ قرآن کہتا ہے : "وللہ ملک السماوات والارض" " آسمانوں اور زمین کی مالکیت و حاکمیت خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے" (آل عمران - ۱۸۹)
اور یہ بھی فرماتا ہے : " وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیه " " خدا نے جن اموال میں تمہیں اپنا نمائندہ قرار دیا ہے، ان میں سے (راہِ خدا) میں خرچ کرو" (حدید - ۷)
اس کی دلیل بھی وہی توحید در خالقیت ہے ۔جب تمام اشیاء کا خالق وہی ہے ، تو طبعاً تمام چیزوں کی مالک بھی اسی کی ذات مقدس ہے ، اس بناء پر ہر ملکیت کا سرچشمہ اسی کی مالکیت کو ہونا چاہیئے۔

۵۔ توحیدِ حاکمیت

یقیناً انسانی معاشرہ حکومت کا محتاج ہے، کیونکہ اجتماعی زندگی حکومت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ذمہ داریوں کی تقسیم، پروگراموں کی تنظیم، مدیریتوں کا اجراء اور تجاوزات کو روکنا، صرف حکومت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

ایک طرف تو انسانوں کی اصل آزادی یہ کہتی ہے کہ کوئی شخص کسی شخص پر حقِ حکومت نہیں رکھتا مگر جسے اصل مالک اور حاکمِ حقیقی اجازت دے، اور یہی وجہ ہے کہ ہم ہر اس حکومت کو جو حکومتِ الٰہی پر منتہی نہیں ہوتی مردود سمجھتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ہم حکومت کی مشروعیت کو صرف پیغمبرؐ کے لیے سمجھتے ہیں، اور پیغمبرؐ کے بعد آئمہ معصومین کے لیے اور ان کے بعد فقیہ جامع الشرائط کے لیے جانتے ہیں۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ لوگ کسی کو یہ اجازت دے دیں کہ وہ ان پر حکومت کرے، لیکن چونکہ پورے معاشرے کے تمام افراد کا اتفاق عادتاً ممکن نہیں ہے، لہٰذا عملی طور پر اس قسم کی حکومت ممکن نہیں ہے۔[1]

البتہ اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ توحیدِ ربوبیت عالمِ تکوین کے ساتھ مربوط ہے اور توحیدِ قانون گزاری و حکومت کا تعلق عالمِ تشریع کے ساتھ ہے۔

قرآن مجید کہتا ہے: ان الحکم الا للّٰہ: "حکم اور حکومت کرنا صرف خدا کے لیے ہے"۔ (انعام ۔۵۷)

۶۔ توحیدِ اطاعت

یعنی جہان میں واجب الاطاعت ہونے کا مقام صرف خدا کی ذاتِ پاک کے لیے ہے اور ہر دوسرے مقام کی اطاعت کی مشروعیت کا سرچشمہ یہیں سے ہونا چاہیئے، یعنی اس کی اطاعت بھی خدا ہی کی اطاعت شمار ہوگی۔

اس کی دلیل بھی واضح ہے۔ جب حاکمیت اسی کے ساتھ مخصوص ہے، تو مطاع ہونا بھی اُسی کے ساتھ مخصوص ہے اسی لیے ہم انبیاءؑ کی اطاعت، آئمہ معصومین کی اطاعت اور ان کے جانشینوں کی اطاعت کو بھی خدا ہی کی اطاعت کا پرتو شمار کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے: یا ایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم:

"اے ایمان لانے والو! خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اور صاحبانِ امر (آئمہ معصومین) کی اطاعت کرو۔" (نساء ۵۹)

البتہ اُوپر والے مباحث میں سے ہر ایک کے لیے بہت ہی زیادہ شرح و بسط کی ضرورت ہے اور ہم نے اس بناء پر کہ ہم بحثِ تفسیری سے خارج نہ ہو جائیں، انہیں اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔

خداوندا! ہمیں ساری عمر توحید کے راستہ پر ثابت قدم رکھ۔

پروردگارا! شرک کی شاخیں بھی توحید کی شاخوں کی طرح بہت زیادہ ہیں، و تیرے لطف کے بغیر شرک سے

---

[1] اس بناء پر اگر کوئی حکومت عوام اور اکثریت کی رائے سے معین ہو تو ضروری ہے کہ وہ فقیہ جامع الشرائط کے ذریعے نافذ ہو، تاکہ وہ مشروعیتِ الٰہیہ پیدا کر سکے۔

نجات ممکن نہیں ہے۔ تو ہمیں اپنے لطف کا مشمول قرار دے۔

بارِ الٰہا ! ہمیں توحید کے ساتھ زندہ رکھنا اور توحید کے ساتھ ہی ہمیں موت دینا، اور حقیقت توحید کے ساتھ ہمیں محشور کرنا۔

آمین یا ربّ العالمین

سُورۂ اخلاص کا اختتام

سُورَہ اَلفَلَق

* یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔
* اس میں ۵ آیات ہیں۔

سورۂ "فلق" کے مطالب اور اس کی فضیلت

ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا اگرچہ مفسرین کی ایک دوسری جماعت اسے "مدنی" سمجھتی ہے۔
اس سورہ کے مطالب ایسی تعلیمات ہیں جو خدا نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بالخصوص، اور سب مسلمانوں کو بالعموم، تمام اشرار کے شر سے، اس کی ذاتِ پاک سے پناہ مانگنے کے سلسلہ میں دی ہیں، تاکہ خود کو اس کے سپرد کر دیں اور اس کی پناہ میں ہر صاحب شر موجود کے شر سے امان میں رہیں۔

اس سورہ کے شانِ نزول کے بارے میں اکثر کتبِ تفاسیر میں کچھ روایات نقل ہوئی ہیں جن کے مطابق بعض یہودیوں نے پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو کر دیا تھا، جس سے آپ بیمار ہو گئے تھے۔ جبرئیل نازل ہوئے اور جس کنویں میں جادو کے آلات چھپائے ہوئے تھے اُس جگہ کی نشان دہی کی، اسے باہر نکالا گیا، پھر اس سورہ کی تلاوت کی تو پیغمبرِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حالت بہتر ہو گئی۔

لیکن مرحوم طبرسی اور بعض دوسرے محققین نے اس قسم کی روایات کو، جن کی سند صرف "ابن عباسؓ" اور عائشہؓ تک منتہی ہوتی ہے، قابلِ اعتراض سمجھا ہے اور درست قرار نہیں دیا، کیونکہ:

اولاً: یہ سورہ مشہور قول کے مطابق مکی ہے اور اس کا لب و لہجہ بھی مکی سورتوں والا ہے، جب کہ پیغمبرؐ کا یہودیوں سے واسطہ مدینہ میں پڑا اور خود یہی بات اس قسم کی روایات کی عدم اصالت کی ایک دلیل ہے۔

دوسری طرف اگر پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادوگر اتنی آسانی کے ساتھ جادو کر لیا کریں کہ وہ بیمار پڑ جائیں اور بسترِ علالت پر دراز ہو جائیں تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آپؐ کو آپ کے عظیم ہدف اور مقصد سے آسانی سے روک دیں۔ مسلّمہ طور پر وہ خدا جس نے آپ کو اس قسم کی ماموریت اور عظیم رسالت کے لیے بھیجا ہے، وہ آپ کو جادوگروں

کے جادو کے نفوذ سے بھی محفوظ رکھے گا تاکہ نبوّت کا بلند مقام ان کے ہاتھ میں بازیچہ اطفال نہ بنے۔

سوم اگر یہ مان لیا جائے کہ جادو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم میں اثر انداز ہو سکتا ہے، تو پھر ممکن ہے کہ لوگوں کے ذہن میں یہ وہم پیدا ہو جائے کہ جادو آپؐ کی رُوح میں بھی اثر انداز ہو سکتا ہے، اور یہ ممکن ہے کہ آپ کے افکار جادوگروں کے جادو کا شکار ہو جائیں - یہ معنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اعتماد کی اصل کو عام لوگوں کے افکار میں متزلزل کر دیں گے۔

اس لیے قرآن مجید اس معنی کی نفی کرتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو کیا گیا ہو، فرماتا ہے: وقال الظالمون ان تتبعون الا رجلا مسحورًا انظر کیف ضربوا لك الامثال فضلوا فلا یستطیعون سبیلاً "

" اور ظالموں نے کہا تم تو ایک سحر زدہ شخص کی پیروی کرتے ہو، دیکھو تو سہی! تیرے لیے انہوں نے کیسی کیسی مثالیں بیان کی ہیں اور ایسے گمراہ ہوئے ہیں کہ راستہ پا ہی نہیں سکتے" (فرقان - ۸، ۹)

" مسحور " چاہے یہاں اس شخص کے معنی میں ہو جس پر عقلی لحاظ سے جادو کیا گیا ہو یا اس کے جسم پر، دونوں صُورتوں میں ہمارے مقصود پر دلالت کرتا ہے۔

بہرحال ایسی مشکوک روایات کے ساتھ مقامِ نبوّت کی قدرت پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی فہمِ آیات کے لیے ان پر تکیہ کیا جا سکتا ہے۔

اس سُورہ کی فضیلت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے، آپؐ نے فرمایا:

" انزلت علیّ آیات لم ینزل مثلهن : المعوذتان "

" مجھ پر ایسی آیتیں نازل ہوئی ہیں کہ ان کی مثل اور مانند اور نازل نہیں ہوئیں اور وہ دو سورتیں " فلق " اور " ناس " ہیں۔[1]

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السّلام سے آیا ہے:

" جو شخص نماز " وتر " میں سُورہ " فلق " و " ناس " اور قل ھو اللہ احد " کو پڑھے گا، تو اس کو یہ کہا جائے گا کہ اے بندۂ خدا تجھے بشارت ہو، خدا نے تیری نمازِ وتر قبول کر لی ہے "[2]

ایک روایت میں پیغمبر اکرمؐ سے بھی آیا ہے کہ آپؐ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا:

" کیا تُو چاہتا ہے کہ مَیں تجھے ایسی دو سُورتوں کی تعلیم دوں جو قرآن کی سُورتوں میں سب سے زیادہ افضل و برتر ہیں؟

اس نے عرض کیا: ہاں! اے رسول اللہؐ - تو حضرت نے اُسے معوذتین (سورہ فلق و ناس) کی تعلیم دی اس کے بعد دونوں کی نماز صبح میں قرأت کی اور اس سے فرمایا، جب تو بیدار ہو یا سونے لگے تو ان کو پڑھا کر۔[3] یہ بات واضح ہے کہ یہ سب کچھ ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنی رُوح و جان اور عقیدہ و عمل کو اس کے مطالب کے ساتھ ہم آہنگ کریں۔

(حاشیہ جات اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہوں)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۙ

۲۔ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ

۳۔ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۙ

۴۔ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۙ

۵۔ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ کہہ دیجئے میں سفیدۂ صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

۲۔ ان تمام چیزوں کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہیں۔

۳۔ اور ہر مزاحمت کرنے والے موجود کے شر سے جب کہ وہ وارد ہو۔

۴۔ اور اُن کے شر سے جو گرہوں میں دم کرتے ہیں۔ (اور ہر طرح کے ارادہ کو کمزور کر دیتے ہیں)۔

(حاشیہ گذشتہ صفحہ)

۱۔ "نورالثقلین" جلد ۵ ص ۷۱۶ و "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۶۷

۲، ۳۔ "نورالثقلین" جلد ۵ ص ۷۱۶ و "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۶۷

۵۔ اور ہر حسد کرنے والے کے حسد سے جب وہ حسد کرے۔

تفسیر

مَیں سپیدۂ صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

قرآن اس سُورہ کی پہلی آیت میں خود پیغمبرؐ کو ایک نمونہ اور پیشوا کے عنوان سے اس طرح حکم دیتا ہے: کہہ دیجئے، میں سفیدۂ صبح کے پروردگار سے پناہ مانگتا ہوں جو رات کی سیاہی کو چیر دیتا ہے۔ (قل اعوذ برب الفلق)۔

ان تمام چیزوں کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہیں۔ (من شر ما خلق)۔

تمام شریر موجودات کے شر سے، شریر انسانوں سے، جنوں، حیوانات، شر کے پیش آنے والے واقعات اور نفس امارہ کے شر سے۔

"فلق" (بروزن شفق)، "فلق" (بروزن خلق) کے مادہ سے اصل میں کسی چیز میں شگاف کرنے اور ایک کو دوسرے سے جُدا کرنے کے معنی میں ہے، اور چونکہ سفیدۂ صبح کے پھوٹنے کے وقت رات کا سیاہ پردہ چاک ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ لفظ طلوعِ صبح کے معنی میں استعمال ہوا۔ جیسا کہ "فجر" کا بھی اسی مناسبت سے طلوع صبح پر اطلاق ہوتا ہے۔

بعض اسے تمام موالید اور تمام زندہ موجودات کے معنی میں سمجھتے ہیں، چاہے وہ انسان ہو یا حیوان و نباتات کیونکہ ان موجودات کا پیدا ہونا، جو دانہ یا گٹھلی وغیرہ کے شگافتہ ہونے سے صورت پذیر ہوتا ہے، وجود کے عجیب ترین مراحل میں سے ہے اور حقیقت میں تولد کے وقت اس موجود میں ایک عظیم تحرک رُونما ہوتا ہے اور وہ ایک عالم سے دوسرے عالم میں قدم رکھتا ہے۔

سُورۂ انعام کی آیہ ۹۵ میں آیا ہے: ان اللہ فالق الحب والنوٰی یخرج الحی من المیت ومخرج المیت من الحی "خدا دانہ اور گٹھلی کا شگافتہ کرنے والا ہے، جو زندہ کو مُردہ سے اور مُردہ کو زندہ سے خارج کرتا ہے۔"

بعض نے "فلق" کے مفہوم کو اس سے بھی زیادہ وسیع معنی میں لیا ہے اور اس کا ہر قسم کی آفرینش و خلقت پر اطلاق کیا ہے، کیونکہ ہر موجود کی آفرینش و خلقت سے عدم کا پردہ چاک ہو جاتا ہے، اور وجود کا نور ظاہر و آشکار ہو جاتا ہے۔

ان تینوں معانی (طلوع صبح، زندہ موجودات کا تولد، اور ہر موجود کی خلقت و آفرینش) میں سے ہر ایک عجیب و غریب وجود میں آنے والی چیز ہے جو پروردگار اور اس کے خالق و مدبر کی عظمت کی دلیل ہے، اور اس وصف کے ساتھ خدا کی توصیف ایک عمیق مفہوم و مطلب رکھتی ہے۔

بعض احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ " فلق " دوزخ میں ایک کنواں یا زندان ہے اور وہ جہنم کے وسط میں ایک شگاف کی مانند دکھائی دیتا ہے۔

یہ روایت ممکن ہے اس کے مصادیق میں سے ایک مصداق کی طرف اشارہ ہو، لیکن یہ " فلق " کے وسیع مفہوم کو محدود نہیں کرتی۔

"من شر ما خلق " کی تعبیر کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ آفرینش و خلقتِ الٰہی اپنی ذات میں کوئی شر رکھتی ہے کیونکہ آفرینش خلقت تو ایک ایجاد ہی ہے، اور ایجاد و وجود خیر محض ہیں، قرآن کہتا ہے : الّذی احسن کل شیء خلقہ " وہی خدا جس نے جس چیز کو بھی پیدا کیا بہتر اور زیادہ سے زیادہ اچھا کر کے پیدا کیا" (الم سجدہ - ۷)

بلکہ شر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مخلوقات قوانینِ آفرینش سے منحرف ہو جائیں اور معینہ راستے سے الگ ہو جائیں مثلاً ڈنک اور جانوروں کے کاٹنے والے دانت ایک دفاعی حربہ ہیں، جنہیں وہ اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں استعمال کرتے ہیں اب اگر یہ ہتھیار اپنے موقع و محل پر استعمال ہوں تو خیر ہی خیر ہیں، لیکن اگر یہ بے موقع اور دوست ہی کے مقابلہ میں استعمال ہونے لگیں تو پھر شر اور برائی ہیں۔

بہت سے ایسے امور ہیں، جنہیں ہم ظاہر میں شر سمجھتے ہیں، لیکن وہ باطن میں خیر ہیں، مثلاً بیدار کرنے والے اور ہوشیار و خبردار کرنے والے حوادث بلائیں اور مصائب، جو انسان کو خوابِ غفلت سے بیدار کر کے خدا کی طرف متوجہ کرتے ہیں، یہ مسلمہ طور پر شر نہیں ہیں۔

اس کے بعد اس مطلب کی توضیح و تفسیر میں مزید کہتا ہے: " اور ہر مزاحمت کرنے والے موجود کے شر سے جب کہ وہ وارد ہوتا ہے۔" (ومن شر غاسق اذا وقب)۔

" غاسق " " غسق " (بروزن شفق) کے مادہ سے " مفردات " میں " راغب " کے قول کے مطابق، رات کی ظلمت کی اس شدت کے معنی میں ہے جو آدھی رات کے وقت ہوتی ہے، اسی لیے قرآن مجید نمازِ مغرب کے اختتام کے وقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے : الیٰ غسق اللیل ' اور یہ جو لغت کی بعض کتابوں میں " غسق " کی آغازِ شب کی تاریکی کے معنی میں تفسیر ہوئی ہے، بعید نظر آتا ہے، خصوصاً جب کہ اس کا اصلی ریشہ اور جڑ، امتلاء (پُر ہونے) اور بہنے کے معنی میں ہے، اور مسلمہ طور پر رات کی تاریکی اس وقت زیادہ یعنی پُر اور لبریز ہوتی ہے جب آدھی رات ہو جائے۔ اس کے مفاہیم میں سے ایک، جو اس معنی کا لازمہ ہے، ہجوم کرنا اور حملہ آور ہونا ہے، اس لیے یہ اس معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

اس بنا پر زیرِ بحث آیت میں " غاسق " کا معنی یا تو حملہ کرنے والا شخص ہے، یا ہر وہ شریر موجود ہے جو حملہ کرنے کے لیے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتا ہے، کیونکہ نہ صرف درندے اور ڈنک مارنے والے جانور ہی رات کے وقت اپنے بلوں اور ٹھکانوں سے باہر نکل آتے ہیں، بلکہ شریر و ناپاک اور پلید افراد بھی اپنے برے مقاصد کے لیے عام طور پر رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

"وقب" (بروزن شفق) "وقبۃ" (بروزن لقب) کے مادہ سے گڑھے اور خندق کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد اس کا فعل گڑھے میں داخل ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ گویا شریر اور نقصان پہنچانے والے موجودات رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نقصان پہنچانے والے گڑھے کھود کر اپنے پلید اور گندے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے اقدام کرتے ہیں۔ یا یہ ہے کہ یہ تعبیر "نفوذ کرنے" کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور ان کے شر سے جو گرہوں میں دم کرتے ہیں"۔ (و من شرّ النفّاثات فی العقد)۔

"نفّاثات" "نفث" (بروزن حبس) کے مادہ سے اصل میں تھوڑی سی مقدار میں تھوکنے کے معنی میں ہے، اور چونکہ یہ کام پھونک مارنے کے ساتھ انجام پاتا ہے، لہٰذا "نفث" "نفخ" (پھونکنے اور دم کرنے) کے معنی میں بھی آیا ہے۔

لیکن بہت سے مفسرین نے "نفّاثات" کی "جادوگر عورتوں" کے معنی میں تفسیر کی ہے۔ (نفاثات جمع مونث ہے اور اس کا مفرد "نفاثۃ" "نفث" کے مادہ سے صیغہ مبالغہ ہے) وہ عورتیں کچھ اوراد پڑھتی تھیں اور گرہوں پر دم کیا کرتی تھیں اور اس طرح وہ جادو کرتی تھیں، لیکن کچھ لوگ اسے وسوسے پیدا کرنے والی عورتوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو مسلسل مردوں کے، خصوصاً اپنے شوہروں کے کان بھرتی رہتی تھیں، تاکہ مثبت کاموں کے انجام دینے میں ان کے آہنی عزم کو کمزور کر دیں اور اس قسم کی عورتوں کے وسوسوں نے طول تاریخ میں کیسے کیسے حوادث پیدا کیے، کیسی کیسی آگ بھڑکائی، اور کیسے کیسے استوار و مضبوط ارادوں کو کمزور کر کے رکھ دیا۔

"فخر رازی" کہتا ہے، عورتیں مردوں کے دلوں میں اپنی محبت کے نفوذ کی بنا پر تصرف کر لیتی ہیں۔[1]

یہ معنی ہمارے زمانہ میں ہر وقت سے زیادہ ظاہر ہے کیونکہ دنیا کے سیاست دانوں میں جاسوسوں کے نفوذ کرنے کا ایک اہم ترین ذریعہ جاسوسہ عورتوں سے فائدہ اٹھانا ہے، کیونکہ ان "نفاثات فی العقد" کے ذریعے پوشیدہ بھیدوں کے صندوقوں کے تالے کھل جاتے ہیں اور وہ انتہائی مرموز اور پوشیدہ مسائل سے باخبر ہو جاتی ہیں، اور انہیں دشمن کے حوالے کر دیتی ہیں۔

بعض نے نفاثات کی "نفوس شریرہ" یا "وسوسے پیدا کرنے والی جماعتوں" کے ساتھ بھی تفسیر کی ہے جو اپنے مسلسل پروپیگنڈوں کے ذریعے پختہ ارادوں کی گرہوں کو کمزور کر دیتے ہیں۔

بعید نہیں ہے کہ یہ آیت ایک عام اور جامع مفہوم رکھتی ہو جو ان تمام معانی کو شامل ہو، یہاں تک کہ سخن چینی کرنے والوں اور چغل خوروں کی باتوں کو بھی، جو محبت کے مراکز کو سست، کمزور اور ویران کر دیتے ہیں۔

البتہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ سابقہ شان نزول سے قطع نظر، آیت میں کوئی ایسی نشانی موجود نہیں ہے کہ اُس سے خصوصیت کے ساتھ جادوگروں کا جادو مراد ہو اور بالفرض اگر ہم آیت کی اس طرح تفسیر بھی کریں، تو بھی یہ اس شان نزول کی صحت

---

[1] "تفسیر فخر رازی" جلد ۳۲ ص ۱۹۶

پر دلیل نہیں ہوگی۔ بلکہ یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جادوگروں کے شر سے خدا کی پناہ مانگ رہے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح سے جیسے صحیح و سالم افراد سرطان کی بیماری سے پناہ مانگتے ہیں، چاہے وہ ہرگز بھی اس میں مبتلا نہ ہوئے ہوں۔

اس سورہ کی آخری آیت میں فرماتا ہے: اور ہر حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے "(و من شرّ حاسد اذا حسد)۔

یہ آیت اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ حسد بدترین اور قبیح ترین صفات رذیلہ میں سے ہے، کیونکہ قرآن نے اسے درندہ جانوروں، ڈسنے والے سانپوں اور وسوسے ڈالنے والے شیاطین کے کاموں کے ساتھ قرار دیا ہے۔

چند نکات

۱۔ شر و فساد کے اہم ترین سرچشمے

اس سورہ کے آغاز میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ وہ تمام شریر مخلوقات کے شر سے خدا کی پناہ مانگیں، اس کے بعد اس کی وضاحت میں تین قسم کے شروں کی طرف اشارہ کرتا ہے:

۱۔ اُن تاریک دل حملہ کرنے والوں کے شر سے جو تاریکیوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے حملہ آور ہوتے ہیں۔

۲۔ ان وسوسہ پیدا کرنے والوں کے شر سے جو اپنی باتوں اور بُرے پروپیگنڈوں سے، ارادوں، ایمانوں عقیدوں محبتوں اور رشتوں کو سُست اور کمزور کر دیتے ہیں۔

۳۔ اور حسد کرنے والوں کے شر سے۔

اس اجمال و تفصیل سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے شرور و آفات کا سرچشمہ یہی ہیں' اور شر و فساد کے اہم ترین منابع یہی تینوں ہیں۔ اور یہ بات بہت ہی پُر معنی اور قابل غور ہے۔

۲۔ آیات کا تناسب

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس سورہ کی پہلی آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ شر والی تمام موجودات کے شر سے "فلق" کے پروردگار سے پناہ مانگ۔ "رب فلق" کا انتخاب شاید اس بنا پر ہے کہ شریر موجودات سلامتی و ہدایت کے نور اور روشنی کو منقطع کر دیتے ہیں، لیکن فلق کا پروردگار ظلمتوں اور تاریکیوں کو شگافتہ کرنے والا ہے۔

۳۔ جادو کی تاثیر

ہم نے پہلی جلد میں، سورہ بقرہ کی آیہ ۱۰۲ و ۱۰۳ کے ذیل میں، گزشتہ اور موجودہ زمانہ میں جادو کی حقیقت

کے بارے میں، اور اسلام کی نظر میں جادو کے حکم، اور اس کے اثر کرنے کی کیفیت کے سلسلے میں تفصیلی بحث کی ہے، اور ان مباحث میں ہم نے جادو کی تاثیر کو اجمالی طور پر قبول کیا ہے، لیکن اس صورت میں نہیں، جیسا کہ خیالی پلاؤ پکانے والے، اور بیہودہ لوگ اس کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ زیادہ وضاحت کے لیے اسی بحث کی طرف رجوع کریں۔

لیکن وہ نکتہ جس کا ذکر کرنا یہاں ضروری ہے یہ ہے کہ اگر وہ زیرِ بحث آیات میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ حکم دے رہا ہے کہ جادوگروں کے جادو یا اس کے مانند چیزوں سے خدا کی پناہ مانگو تو اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ پیغمبرؐ پر انہوں نے جادو کر دیا تھا۔ بلکہ اس کی ٹھیک مثال یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہر قسم کی غلطی اور خطا و گناہ سے بھی خدا کی پناہ مانگتے تھے۔ یعنی خدا کے لطف سے استفادہ کرتے ہوئے ان خطرات سے بچے رہیں۔ اور اگر خدا کا لُطف نہ ہوتا تو آپ پر جادو کے اثر کرنے کا امکان تھا۔ یہ بات تو ایک طرف رہی۔

دُوسری طرف ہم پہلے ہی یہ بیان کر چکے ہیں کہ اس بات کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ "النفاثات فی العقد" سے مُراد جادوگر ہوں۔

۴۔ حاسدوں کا شر

"حسد" ایک بُری شیطانی عادت ہے جو مختلف عوامل جیسے ایمان کی کمزوری، تنگ نظری اور بُخل کی وجہ سے انسان میں پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا مطلب دوسرے شخص کی نعمت کے زوال کی درخواست اور آرزو کرنا ہے۔

حسد بہت سے گناہانِ کبیرہ کا سرچشمہ ہے۔

حسد، جیسا کہ روایات میں وارد ہوا ہے، انسان کے ایمان کو کھا جاتا ہے اور اُسے ختم کر دیتا ہے، جیسا کہ آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

جیسا کہ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ان الحسد لیأکل الایمان کما تأکل النار الحطب"[1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے:

"آفة الدین الحسد والعجب والفخر"

"حسد" "خود کو بڑا سمجھنا" اور ایک دوسرے پر "فخر" کرنا، دین کے لیے آفت ہے۔[2]

اس کی وجہ یہ ہے کہ حسد کرنے والا حقیقت میں خدا کی حکمت پر اعتراض کرتا ہے کہ اس نے کچھ افراد کو نعمت سے کیوں نوازا ہے؟ اور انہیں اپنی عنایت کا مشمول کیوں قرار دیا ہے؟ جیسا کہ سورۂ نساء کی آیہ ۵۴ میں آیا ہے: ام یحسدون الناس علیٰ ما آتاھم اللہ من فضلہ۔

---

[1] "بحارالانوار" جلد ۷۳، ص ۲۳۷

[2] "بحارالانوار" جلد ۷۳، ص ۲۴۸

حسد کا معاملہ ممکن ہے کہ اس حد تک پہنچ جائے کہ محسود سے نعمت کے زوال کے لیے حاسد خود کو پانی اور آگ تک میں ڈال کر نابود کرلے، جیسا کہ اس کے نمونے داستانوں اور تواریخ میں مشہور ہیں۔

حسد کی مذمت میں بس یہی کافی ہے کہ دُنیا میں جو سب سے پہلا قتل ہوا وہ "قابیل" کی طرف سے "ہابیل" پر "حسد" کرنے کی وجہ سے ہوا تھا۔

"حسد کرنے والے" ہمیشہ ہی انبیاء و اولیاء کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے رہے ہیں، اسی لیے قرآن مجید پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ حکم دے رہا ہے کہ وہ حاسدوں کے شر سے خدا اور ربّ فلق سے پناہ مانگیں۔

اگرچہ اس سورہ میں اور بعد والے سورہ میں خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مخاطب ہے، لیکن مسلّمہ طور پر اس سے نمونہ اور اُسوہ مراد ہے، اور سب لوگوں کو حاسدوں کے شر سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیئے۔

خداوندا! ہم بھی حاسدوں کے شر سے تیری مقدس ذات سے پناہ مانگتے ہیں۔

پروردگارا! ہم تجھ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ تو ہمیں بھی دوسروں پر حسد کرنے سے محفوظ رکھ۔

بارِ الٰہا! ہمیں نفّاثات فی العقد اور راہِ حق میں وسوسے ڈالنے والوں کے شر سے بھی محفوظ رکھ۔

آمین یا ربّ العالمین

اختتام سورۂ فلق

سُورَہ اَلنَّاسْ

❁ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔

❁ اس میں ۶ آیات ہیں۔

سورۂ "الناس" کے مطالب اور اس کی فضیلت

اِنسان ہمیشہ انسانی وسوسوں کی زد میں ہے اور شیاطینِ جنّ و انس کی یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ اس کے قلب و رُوح میں نفوذ کریں۔ انسان کا مقام علم میں جتنا بالا ہوتا جاتا ہے اور اس کی حیثیت اجتماع اور معاشرے میں جتنی بڑھتی جاتی ہے شیاطین کے وسوسے اتنے ہی زیادہ شدید ہوتے چلے جاتے ہیں، تاکہ اس کو راہِ حق سے منحرف کر دیں اور ایک دانش ور عالم کے فساد و خرابی سے سارے جہان کو تباہ و برباد کر ڈالیں۔

یہ سورہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ایک نمونہ و اُسوہ کے طور پر اور پیشوا و رہبر کی حیثیت سے یہ حکم دے رہی ہے کہ تمام وسوسے ڈالنے والوں کے شر سے خدا کی پناہ طلب فرمائیں۔

اِس سُورہ کے مطالب ایک لحاظ سے سُورۂ " فلق " سے مشابہ ہیں، اور دونوں میں ہی شرور و آفات سے خداوندِ بزرگ کی پناہ مانگنے کو بیان کیا گیا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ سُورۂ فلق میں شرور کے مختلف انواع و اقسام بیان کیے گئے ہیں، لیکن اس سُورہ میں صرف نظر نہ آنے والے وسوسہ گروں (وسواس الخناس) پر تکیہ ہوا ہے۔

اس بارے میں بھی کہ یہ سُورہ مکہ میں نازل ہوا ہے یا مدینہ میں، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ اسے " مکی " سمجھتا ہے جب کہ دُوسری جماعت اسے " مدنی " شمار کرتی ہے۔ لیکن اس کی آیات کا لب ولہجہ " مکی " سُورتوں سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ روایات کے مطابق یہ سُورہ اور سُورۂ فلق اکٹھے نازل ہوئے ہیں، اور سُورۂ فلق ایک کثیر جماعت کے نظریہ کے مطابق مکی ہے چنانچہ بہت ممکن ہے کہ یہ سُورہ مکی ہی ہو۔

اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ ایک

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سخت بیمار پڑ گئے تو (خدا کے دو عظیم فرشتے) جبرئیل و میکائیل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے۔ جبرئیل تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر کی طرف بیٹھ گئے اور میکائیل پاؤں کی طرف۔ جبرئیل نے سورہ " فلق " کی تلاوت کی اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کے ذریعے خدا کی پناہ میں دے دیا اور میکائیل نے سورہ " قل اعوذ برب الناس " کی تلاوت کی۔[1]

ایک روایت میں جو امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی اور ہم اس کی طرف پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں، یہ آیا ہے کہ :

" جو شخص نماز وتر میں " معوذتین " (سورۂ فلق و ناس) اور
" قل ھو اللہ احد " کی تلاوت کرے گا تو اس سے کہا جائے گا،
اے بندۂ خدا ! تجھے بشارت ہو کہ خدا نے تیری نماز وتر کو قبول کر لیا ہے !"[2]

[1و2] " نور الثقلین " جلد ۵، ص ۷۲۵، و " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۵۶۹۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ

۲۔ مَلِكِ النَّاسِ ۙ

۳۔ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ

۴۔ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۙ

۵۔ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ

۶۔ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۧ

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ کہہ دیجیے میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

۲۔ لوگوں کے مالک و حاکم کی۔

۳۔ لوگوں کے خدا اور معبود کی۔

۴۔ خنّاس کے وسوسوں کے شر سے

۵۔ جو انسانوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔

۶۔ چاہے وہ جنّات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔

تفسیر

لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں

اس سورہ میں، جو قرآن مجید کا آخری سورہ ہے، لوگوں کے لیے نمونہ اور پیشوا ہونے کے لحاظ سے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رُوئے سخن کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کہہ دیجئے، میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں"۔ (قل اعوذ برب الناس)۔

"لوگوں کے مالک و حاکم کی"۔ (ملک الناس)۔

"لوگوں کے خدا و معبود کی"۔ (الٰہ الناس)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہاں خدا کے عظیم اوصاف میں سے تین اوصاف (ربوبیت، ملکیت اور الوہیت) کا ذکر ہوا ہے جو سب کی سب براہِ راست انسان کی تربیت اور وسوسے ڈالنے والوں کے چنگل سے نجات کے ساتھ ارتباط رکھتی ہیں۔

البتہ خدا سے پناہ مانگنے سے مُراد یہ نہیں ہے کہ انسان صرف زبان سے یہ جُملہ کہے، بلکہ فکر و نظر اور عقیدہ و عمل کے ساتھ بھی انسان خود کو خدا کی پناہ میں قرار دے۔ شیطانی راستوں، شیطانی پروگراموں، شیطانی افکار و تبلیغات، شیطانی مجالس و محافل سے خود کو دُور رکھے، اور رحمانی افکار و تبلیغات کے راستے کو اختیار کرے۔ ورنہ وُہ انسان جو عملی طور پر ان وسوسوں کے طوفان میں ٹھہرا رہے گا وہ صرف اس سُورہ کے پڑھنے اور ان الفاظ کے کہنے سے کہیں نہیں پہنچے گا۔

وہ "رب الناس" کہنے کے ساتھ پروردگار کی ربوبیت کا اعتراف کرتا ہے اور خود کو اس کی تربیت میں قرار دیتا ہے۔

"ملک الناس" کہنے سے خود کو اس کی ملکیت سمجھتا ہے اور اس کے فرمان کا بندہ ہو جاتا ہے۔

اور الٰہ الناس" کے کہنے سے اس کی عبودیت کے راستہ میں قدم رکھ دیتا ہے اور اس کے غیر کی عبادت سے پرہیز کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ جو شخص ان تینوں صفات پر ایمان رکھتا ہو اور خود کو ان تینوں کے ساتھ ہم آہنگ کرلے، وہ وسوسہ ڈالنے والوں کے شر سے امان میں رہے گا۔

درحقیقت یہ تینوں اوصاف تین اہم تربیتی دروس، پیش رفت کے تین پروگرام اور وسوسے ڈالنے والوں کے شر سے نجات کے تین ذریعے ہیں اور یہ سُورہ انسان کا ان کے مقابلہ میں بیمہ کر دیتا ہے۔

اسی لیے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "وسوسے ڈالنے والے خناس کے شر سے" (من شر الوسواس الخناس)۔

"وہی جو انسانوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتے ہیں"۔ (الذی یوسوس فی صدور الناس)۔

"جنوں اور انسانوں میں سے وسوسے ڈالنے والے"۔ (من الجنۃ والناس)۔

"وسواس" کا لفظ "مفردات" میں "راغب" کے قول کے مطابق اصل میں ایسی آہستہ آواز ہے جو آلات زینت کے آپس میں ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے۔

اس کے بعد ہر آہستہ آواز پر بولا جانے لگا اور اس کے بعد ایسے نامطلوب اور بُرے افکار و خیالات پر، جو انسان کے دل و جان میں پیدا ہوتے ہیں، اور ایسی آہستہ آواز کے مشابہ جو کان میں کہی جاتی ہے، اطلاق ہوا ہے۔

"وسواس" مصدری معنی رکھتا ہے، لیکن بعض اوقات "فاعل" (وسوسہ ڈالنے والا) کے معنی میں بھی آتا ہے اور زیر بحث آیت میں یہی معنی ہے۔

"خناس" "خنوس" (بروزن خسوف) کے مادہ سے، صیغہ مبالغہ ہے، جو جمع ہونے اور پیچھے جانے کے معنی میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب خدا کا نام لیا جاتا ہے تو شیاطین پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور چونکہ یہ کام پنہاں ہونے کے ساتھ توام ہے، لہٰذا یہ لفظ "اختفاء" کے معنی میں بھی آیا ہے۔

اس بنا پر آیات کا مفہوم اس طرح ہوگا: "کہہ دیجئے میں شیطان صفت وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے، جو خدا کے نام سے بھاگتا ہے اور پنہاں ہو جاتا ہے، خدا کی پناہ مانگتا ہوں"۔

اصولاً "شیاطین" اپنے پروگراموں کو چھپ کر کرتے ہیں اور بعض اوقات انسان کے دل کے کان میں اس طرح سے پھونک مارتے ہیں کہ انسان یہ یقین کر لیتا ہے کہ یہ فکر خود اسی کی فکر ہے اور خود اسی کے دل میں خود بخود پیدا ہوئی ہے، اور یہی بات اس کے بہکنے اور گمراہی کا سبب بن جاتی ہے۔

شیاطین کا کام زینت دینا، باطل کو حق کے لعاب میں چھپانا، جھوٹ کو سچ کے چھلکے میں لپیٹ کر گناہ کو عبادت کے لباس میں اور گمراہی کو ہدایت کے سرپوش میں پیش کرنا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ خود بھی مخفی ہوتے ہیں اور ان کے پروگرام بھی پنہاں ہوتے ہیں، اور یہ راہ حق کے ان تمام رہ رووں کے لیے ایک تنبیہ ہے جو یہ توقع نہیں رکھتے کہ شیاطین کو ان کے اصلی چہرے اور قیافہ میں دیکھیں یا ان کے پروگراموں کو انحرافی شکل میں مشاہدہ کریں۔ سوچنے کی بات ہے، وسوسے ڈالنے والے خناس ہوتے ہیں اور ان کا کام چھپ[illegible]نا، جھوٹ بولنا، دھوکہ دینا، ریاکاری کرنا، ظاہر سازی اور حق کو پوشیدہ کرنا ہے۔

اگر وہ اصلی چہرے میں ظاہر ہو جائیں، اگر وہ باطل کو حق کے ساتھ نہ ملائیں، اگر وہ صریح اور صاف بات کریں تو علی علیہ السلام کے قول کے مطابق لم یخف علی المرتادین: خدا کی راہ پر چلنے والوں پر مطلب مخفی نہ رہتا۔

وہ ہمیشہ [illegible] حصہ تو "اِس" سے لیتے ہیں، اور کچھ حصہ "اُس" سے، اور انہیں آپس میں ملا دیتے ہیں، تاکہ لوگوں پر [illegible] ہو سکیں، جیسا کہ امیر المومنین علیہ السلام اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں: "فھنالک یستولی الشیط[illegible] [illegible] اولیائہ"[1]

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۵۰

"الذی یوسوس فی صدور الناس" کی تعبیر، اور لفظ "وسوسہ" کا انتخاب، اور لفظ "صدور" (سینے) بھی اسی معنی کی تاکید ہیں۔

یہ سب کچھ تو ایک طرف، دوسری طرف سے "من الجنۃ والناس" کا جملہ خبردار کرتا ہے کہ "وسوسے" میں ڈالنے والے خناس، صرف ایک ہی گروہ، ایک ہی جماعت، ایک ہی طبقہ، اور ایک ہی لباس میں نہیں ہوتے، بلکہ یہ جن و انس میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہر لباس اور ہر جماعت میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا ان سب پر نظر رکھنی چاہیئے اور ان سب کے شر سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیئے۔

نامناسب دوست، منحرف ہم نشین، گمراہ اور ظالم پیشوا، جبّار اور طاغوتی کارندے، فاسد مقررین اور لکھنے والے ظاہر فریب الحادی والتقاطی مکاتب اور اجتماعی طور پر وسوسے ڈالنے والوں کے وسائل ارتباط وغیرہ سب کے سب "وسواس خناس" کے وسیع مفہوم میں داخل ہیں کہ جن کے شر سے انسان کو خدا کی پناہ مانگنی چاہیئے۔

چند نکات

۱۔ ہم خدا کی پناہ کیوں مانگتے ہیں؟

انسان کے لیے ہر لمحہ انحراف کا امکان موجود ہے اور اصولی طور پر جب خدا اپنے پیغمبر کو یہ حکم دے رہا ہے کہ "وسواس خناس" کے شر سے خدا کی پناہ مانگیں، تو یہ خناسوں اور وسوسہ ڈالنے والوں کے دامِ فریب میں گرفتار ہونے کے امکان کی دلیل ہے۔

باوجود اس کے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لُطفِ الٰہی، غیبی امدادوں اور اپنے آپ کو خدا کے سپرد کرنے کی بنا پر ہر قسم کے انحراف سے محفوظ تھے، لیکن پھر بھی وہ ان آیات کو پڑھتے تھے اور ان کے ذریعے وسواس خناس کے شر سے پناہ مانگتے تھے۔ ان حالات میں دوسروں کا معاملہ واضح و روشن ہے۔

لیکن مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ان مخرب وسوسہ ڈالنے والوں کے مقابلہ میں مومن بندوں اور راہِ حق کے رہروؤں کی مدد کے لیے آسمانی فرشتے آتے ہیں۔ ہاں! مومن تنہا نہیں ہیں، فرشتے ان پر نازل ہوتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں": ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیهم الملائکۃ "(حم سجدہ۔ ۳۰)

لیکن بہرحال مغرور ہرگز نہیں ہونا چاہیئے، اور خود کو موعظہ و پند و نصائح اور خدائی امدادوں سے بے نیاز نہیں سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ ہمیشہ اس سے پناہ مانگنی چاہیئے اور ہمیشہ بیدار اور ہوشیار رہنا چاہیئے۔

۲۔ اس بارے میں کہ تین آیات میں "ناس" کا تکرار کیوں ہوا ہے؟ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا ہر مقام پر الگ الگ معنی ہے۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ خدا کی ان تین صفات کی عمومیت کی تاکید کے لیے ہے اور تینوں مقام پر ایک ہی

معنی رکھتا ہے۔

۴۔ ایک روایت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"ما من مؤمن الا ولقلبہ فی صدرہ اذنان: اذن ینفث فیھا الملك واذن ینفث فیھا الوسواس الخناس فیؤید الله المؤمن بالملك فھو قولہ سبحانہ: وایدھم بروح منہ:

"ہر مومن کے دل میں دو کان ہوتے ہیں، ایک کان میں تو فرشتہ پھونک مارتا ہے اور دوسرے کان میں وسواس خناس پھونک مارتا ہے۔ پس خدا مومن کی فرشتہ کے ذریعے تائید فرماتا ہے۔ اور آیہ " وایدہ بروح منہ" کا مطلب یہی ہے"[1]

ایک لرزہ خیز اور پُرمعنی حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ:

"جب آیہ والذین اذا فعلوا فاحشۃ او ظلموا انفسھم ذکروا الله فاستغفروا لذنوبھم: (وہ لوگ جو کبھی کوئی بُرا کام انجام دیتے ہیں، یا خُود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں تو خدا کو یاد کرتے ہیں، اور اپنے گناہوں کے لیے استغفار کرتے ہیں) نازل ہوئی، تو ابلیس مکہ میں ایک پہاڑ کے اُوپر گیا اور اُونچی آواز کے ساتھ فریاد بلند کی اور اپنے لشکر کے سرداروں کو جمع کیا۔

اُنہوں نے کہا: اے آقا! کیا ماجرا ہے، آپ نے ہمیں کیوں بُلایا ہے۔؟

اس نے کہا: یہ آیت نازل ہوئی ہے (اس آیت نے میری کمر میں لرزہ پیدا کر دیا ہے اور یہ آیت نجات بشر کا باعث) تم میں سے کون ہے جو اس کا مقابلہ کرے؟

بزرگ شیطانوں میں سے ایک نے کہا: میں ایسا کر سکتا ہوں، میرا منصوبہ یہ ہے۔

ابلیس نے اس کے اس منصوبہ کو ناپسند کر دیا! تو دُوسرا کھڑا ہوا اور اس نے اپنا منصوبہ پیش کیا، لیکن یہ بھی قبول نہ کیا گیا۔

اس موقع پر " وسواس خناس کھڑا ہوا اور اس نے کہا، میں اس کام کو انجام دوں گا۔

ابلیس نے کہا: وہ کیسے؟

اس نے کہا: میں انہیں وعدوں اور آرزوؤں میں سرگرم کر دوں گا، یہاں تک کہ وہ گناہ میں آلودہ ہو جائیں گے، جب وہ گناہ کرلیں گے تو میں انہیں توبہ کرنا بُھلا دوں گا۔

ابلیس نے کہا: تُو اس کام سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ (تیرا منصوبہ بہت ماہرانہ اور عالی ہے) اور یہ کام قیامت

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۷۱

تک اس کو سپرد کر دیا۔[1]

خداوندا! ہمیں ان سب وسوسہ ڈالنے والوں کے شر سے اور خناس کے تمام وسوسوں سے محفوظ فرما۔

پروردگارا! دام فریب سخت ہے، اور دشمن بیدار اور اس کے منصوبے مخفی اور پنہاں ہیں اور تیرے لطف کے بغیر نجات ممکن نہیں ہے۔

بارِ الٰہا! ہم نہیں جانتے کہ اس عظیم نعمت کا شکر تیری بارگاہ میں کس طرح پیش کریں کہ تُو نے ہم پر یہ احسان کیا ہے اور ہمیں یہ عظیم افتخار اور توفیق عطا فرمائی ہے کہ ہم نے اس وقت تقریباً پندرہ سال کے بعد اس تفسیر کو مکمل کر دیا ہے۔

خدایا! تو جانتا ہے کہ اس لمحہ ایک ایسی ناقابلِ توصیف خوشی اور شکر کے ساتھ ملی ہوئی شادمانی ہمارے سارے وجود میں موجزن ہے، ایسا احساس جس کی کسی بیان کے ساتھ تشریح اور اس کے شکر کی ہم میں توانائی نہیں ہے، ہم تیری بارگاہ میں ہاتھ اُٹھا کر دعا کرتے ہیں۔

آفریدگارا! ممکن ہے ہم سے ان آیات کی تفسیر میں کچھ لغزشیں ہوگئی ہوں، تو وہ سب ہمیں بخش دے اور ہم اُمید رکھتے ہیں کہ تیرے بندے بھی ہمیں بخش دیں گے۔

اور آخری جملہ میں ہم یہ عرض کرتے ہیں:

اے خدائے رحیم و مہربان! اپنے کرم سے یہ ناچیز خدمت ہم سب سے قبول فرما لے اور اسے ہماری معاد اور روزِ جزا کا ذخیرہ قرار دے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

سورۃ النّاس اور جلد ۲۷ کا اختتام

در تاریخ ۱۴ / ۴ / ۱۳۶۶

مطابق آٹھ ذیقعد ۱۴۰۷ قمری

تفسیر نمونہ ختم شد

خداوندا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تُو نے اس حقیر پُرتقصیر کم علم و عقل کو یہ توفیق عطا فرمائی کہ تقریباً چھ سال کے عرصہ میں اس تفسیر کا ترجمہ، جو قم مقدس میں شروع ہوا تھا، اور قم ہی میں اپنے مکان پر بروز بدھ بوقت صبح دس بجکر نو منٹ پر بتاریخ ۹ شوال ۱۴۰۸ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۹۸۸ء اختتام پذیر ہوا۔ خداوندا! ممکن ہے مجھ سے کچھ فروگزاشتیں ہوگئی ہوں تُو انہیں معاف فرما دے، اور اپنی بارگاہ میں اسے قبول فرما اور میری اور میرے والدین کی آخرت کے لیے اسے ذخیرہ قرار دے اور مومنین اور اہلِ اسلام کو اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کی توفیق عنایت فرما، والحمد للہ اوّلاً و آخراً وصلی اللہ علیٰ محمد و آلہ

احقر صفدر حسین
۲۵ - ۵ - ۸۸

[1] ("المیزان" جلد ۲۰، ص ۵۵۷)

تفسیرِ نمونہ کا اختتام

◎

مقارن ساعت آخر عصر روز جمعہ (عید سعید غدیر)

* ۱۸، ذی الحجہ ۱۴۰۷ ھ
* ۲۳، مرداد ۱۳۶۶

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلًا وَّ اٰخِرًا

◎

تمام جلدوں کی اجمالی فہرست

اس سے مقصد یہ ہے کہ تفسیر نمونہ کی طرف رجوع کرنے والوں کے کام کی سہولت کے لیے ایک ایسی فہرست پیش کی جائے جس سے یہ معلوم ہو کہ تفسیر نمونہ کی ہر جلد میں کس سورہ اور کن آیات کی تفسیر ہوئی ہے اور انشاءاللہ ایک تفصیلی اور وسیع فہرست (موضوعات کی صورت میں) ایک الگ جلد میں " راہنمائے تفسیر نمونہ " کے نام سے بعد میں شائع کی جائے گی۔

جلد اول : سورۂ حمد و سورۂ بقرہ تا آیہ ۱۸۷۔
جلد دوم : سورہ آل عمران اور سورہ نساء
جلد ۳ : سورہ مائدہ اور سورۂ انعام
جلد ۴ : سورۂ اعراف سورۂ انفال و سورۂ توبہ
جلد ۵ : سورۂ یونس۔ سورہ ھود سورۂ یوسف اور سورۂ رعد
جلد ۶ : سورۂ ابراھیم سورۂ حجر سورہ نحل اور سورۂ" اسراء "
جلد ۷ : سورۂ کھف ۔سورۂ " مریم " سورۂ " طٰہٰ سورۂ "انبیاء "
اور سورۂ سورۂ حج'
جلد ۸ : سورۂ مومنون سورۂ نور ۔سورۂ فرقان، سورۂ شعراء اور سورۂ نمل ۔
جلد ۹ : سورۂ قصص، سورۂ عنکبوت سورۂ روم سورۂ لقمان، سورۂ الم سجدہ
اور سورۂ احزاب ۔
جلد ۱۰ : سورۂ سبا، سورۂ فاطر سورۂ یٰسین سورۂ صافات، سورۂ ص
جلد ۱۱ : سورۂ زمر سورۂ مؤمن، سورۂ حٰم سجدہ سورۂ شوریٰ سورۂ زخرف
جلد ۱۲ : دُخان ،جاثیہ ، احقاف ،محمد سورۂ فتح ،حجرات ، ق ، ذاریات
جلد ۱۳ : طور ، نجم ۔سورۂ قمر ، رحمٰن ، واقعہ ، حدید ، مجادلہ ، حشر
سورۂ ممتحنہ ، صف ، جمعہ ، منافقون،

جلد ۱۴ : تغابن ، طلاق، تحریم ،ملک ،قلم وحاقہ سورۃ معارج ،نوح ،جن ، مزمل، مدثر،
قیامت ، دھر، مرسلات سورۃ نبأ ، نازعات ، عبس ،

جلد ۱۵ : تکویر، انفطار، مطففین ، انشقاق ، بروج ،طارق، اعلیٰ ، غاشیہ ،فجر ،
سورۃ بلد ، والشمس، واللیل ، والضحیٰ ، الم نشرح ، تین ، علق ، قدر،
بینہ ، زلزال ، عادیات ، قارعہ ، تکاثر ، عصر، ھمزہ ، فیل، لایلاف قریش،
ماعون ، کوثر ، کافرون ،نصر، لھب، اخلاص ، فلق اور ناس ۔

تفسیر نمونہ میں اجتماعی کام کا طریقہ

مختلف طبقات کے تفسیر نمونہ کے بہت سے قارئین یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس تفسیر میں کام کا طریقہ کس طرح تھا اور دس افراد کا گروہ (اور کبھی اس سے کم) تقریباً ۱۵ سال تک اُستاد کے زیر نظر کیسے آپس میں ہم آہنگ اور مسلسل کوشش کرتے رہے۔ شاید اس پروگرام کی تفصیل دوسرے علمی اجتماعی کاموں کی پیش رفت میں مدد کر سکے۔

اصولی طور پر یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ وسیع اور جامع کام انفرادی قوت سے بہت کم آگے بڑھتے ہیں اور اگر آگے بڑھیں بھی تو اس کے لیے بہت طولانی وقت کی ضرورت ہے۔ لیکن گروہی اور اجتماعی کام زیادہ تیز بھی ہوتے ہیں اور زیادہ عمیق اور گہرے، اور خطا و غلطی سے دُور بھی۔ اگرچہ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ماحول میں گروہی اور اجتماعی کام بہت ہی کم انجام پاتا ہے اور اگر انجام پائے بھی تو عام طور پر بہت کم تکمیل کو پہنچتا ہے۔ جب کہ دوسرے لوگوں میں تقریباً تمام کاموں کی بُنیاد گروہی اور اجتماعی کام پر قائم ہوتی ہے اور انہوں نے اس سے بہت سے نتائج اخذ کیے ہیں۔

بہرحال ہدف و مقصد یہ نہیں ہے کہ تفسیر نمونہ کے کام کے شروع کرنے کے اسباب کی تشریح کی جائے، کیونکہ اس تفسیر کی مختلف جلدوں کے مقدموں میں اس سلسلہ میں کافی گفتگو ہو چکی ہے، بلکہ ہدف و مقصد یہ ہے کہ اس تفسیر کے لکھنے کا طریقہ اور طرزِ عمل بیان کیا جائے۔ شاید برادرانِ اہلِ علم اور محققینِ اسلامی، جو گروہی کام انجام دینے کی طرف مائل ہوں، وُہ اس تجربہ سے اپنے کاموں میں فائدہ اُٹھا سکیں اور مسائلِ اسلامی کو زیادہ جامع صورت میں ہمارے معاشرے کے سامنے، جو اس کے لیے بہت زیادہ تشنگی رکھتا ہے، پیش کر سکیں۔

اِس تفسیر میں طریقہ کار اور طرزِ عمل کا کئی مراحل میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ **تقسیم آیات** : اس مرحلہ میں اُستاد گرامی قدر اور محقق توانا آیات کو برادران میں تقسیم کر دیتے اور ہر ایک کا حصہ قرآن مجید کے ایک سے دو صفحات تک جا پہنچتا اور ہر جلد کے لیے یہ تقسیم آیات کئی مرتبہ صورت پذیر ہوتی ہے، اور اس طرح سے ہر شخص کی ذمّہ داری معیّن ہو جاتی ہے۔

۲۔ **انفرادی کام کا مرحلہ** : تقسیم آیات کے بعد ہر شخص (اور ابتداء میں دو دو افراد مل کر کام کرتے) کی یہ ذمّہ داری ہوتی تھی کہ وہ اسلام کے بزرگ علماء کی ان مختلف تفاسیر کو جو وُہ یادگار کے طور پر چھوڑ گئے ہیں۔ چاہیے وہ شیعہ ہوں یا اہل سنّت ۔ تحقیق و مطالعہ کرے اور کافی مطالعہ کے بعد اپنے حاصل مطالعہ اور ان سے اخذ کردہ

نتائج کو خاص قسم کے کاغذوں پر ـــ جن پر " حلیہ تفسیر" کا عنوان چھپا ہوا ہوتا تھا ـــ لکھ کر حا کے حوالے کرتے۔
وہ تفاسیر جن کا مطالعہ کیا جاتا تھا عام طور پر وہ وہی ہوتی تھیں جن کے نام پر جلد کے آغاز میں لکھے گئے ہیں، اور بعض اوقات دوسری تفاسیر بھی ہوتی تھیں۔

۳۔ **مشترک جلسہ میں مطالعہ** : روزانہ حضرت استاد اور دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ ایک جلسہ منعقد ہوتا تھا اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان جلسوں میں کسی قسم کی کوئی تعطیل نہیں ہوتی تھی اور یہ سارے سال میں بغیر استثناء کے منعقد ہوتے تھے، یہاں تک کہ مخصوص سوگواری اور تعطیلی دنوں میں بھی (سوائے اس صورت کے کہ کوئی مسافرت پیش آجائے) یہاں تک کہ ان دنوں میں بھی جب اُستاد " مہاباد " اور " انارک نائین " میں آمریم طاغوت کے زمانہ میں جلا وطن تھے، تفسیر کا کام معطل نہیں ہوا اور ساتھی باری باری (ہر دس دن میں دو افراد) کام کو جاری رکھنے کے لیے جلاوطنی کے مقام کی طرف سفر کرتے تھے اور صبح اور عصر کے وقت بحثِ تفسیر کو جاری رکھتے تھے۔

بہرحال مشترک جلسہ میں شرکاء جلسہ اپنی باری کے مطابق اپنی تحریر کی قرات کرتے تھے۔

۴۔ **آیات کی تفسیر میں اجتماعی غور و خوض** : مذکورہ تحریروں کی قرات کے بعد حضرت استاد آیات کے حساس نکات کی طرف ـــ جن پر غور کرنا ضروری ہوتا ـــ توجہ فرماتے اور تمام ساتھیوں کی یہ ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ زیرِبحث آیات کے خاص حساس نکات یا مبہم اور پیچیدہ مطالب کو مختلف اسلامی تفاسیر میں ـــ جو اس مجلس میں ان کے پاس ہوتی تھیں ـــ ملاحظہ کرکے بیان کریں۔ اور اگر انہیں کوئی اور نیا اور عمدہ نکتہ ملے تو اُسے پڑھیں یا اس کا خلاصہ بیان کریں اور اس طرح سے ہر آیت اور ہر نکتہ پر کافی غور و بحث ہوتی تھی۔ لیکن جن باتوں میں اختلاف ہوتا تھا اُن میں اُستاد کے نکتہ نظر کو مقدم رکھا جاتا تھا۔

۵۔ **مطالب کا املاء اور ان کی تحریر** : اس مرحلہ کے بعد مطالب کو لکھنے کی نوبت آتی تھی۔ اس موقع پر حضرت اُستاد زیرِ بحث مطالب کو اپنے نظریات اور ان یادداشتوں کے ساتھ، جو انہوں نے پہلے سے تیار کرکے رکھی ہوئی ہوتی تھیں، ملا کر انہیں جلسہ تفسیر کے مخصوص کاغذوں پر ایک تیز نویس برادر کے ذریعے لکھواتے۔ (حقیقت میں انشاء اور قلم انہیں کا ہوتا تھا۔

اوسطاً روزانہ تقریباً چار صفحے لکھے جاتے تھے (البتہ گرمیوں اور تعطیل کے دنوں میں جب ایک سے زیادہ جلسے ہوتے تھے، یہ مقدار دس صفحات یا اس سے کچھ زیادہ تک پہنچ جاتی تھی)۔

۶۔ **تصیح اور تحقیق و مطالعہ** : یہ بات واضح ہے کہ جلسہ میں املا چاہے جتنے غور اور مہارت سے ہو اس کی مکمل طور پر تحریر نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا حضرتِ اُستاد ان تحریروں کو دوبارہ خود پڑھتے تھے اور اس میں ہر قسم کی ضروری اصلاح اور کمی بیشی عمل میں لاتے تھے۔

۷۔ **آیات کا ترجمہ** : جیسا کہ آپ تفسیر میں ملاحظہ فرماتے ہیں آیات کے بعد ترجمہ حروف ریز کے ساتھ آیا ہے

اور پھر آیات کی تفسیر بیان ہوئی ہے۔

آیات کا ترجمہ حضرتِ اُستاد خُود تحریروں کو دوبارہ پڑھنے اور تصیح کرنے کے بعد لکھتے تھے، تاکہ ترجمہ مکمل طور پر تفسیر آیات کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور مطالعہ کرنے والے ترجمہ کے مطالعہ سے آیات کی اس تفسیر کو جو جمع بندی کے بعد انتخاب ہوئی ہے سمجھ سکیں اور جو لوگ یہ چاہتے ہوں کہ صرف قرآن کے ترجمہ سے استفادہ کریں تو خالص ترجمہ بغیر کسی زحمت کے ان کے اختیار میں ہو۔

۸۔ چھپائی کے لیے حروف چینی کا مرحلہ : اب تفسیر کے مطالب چھاپنے کے لیے تیار ہیں، مطالب کی فوٹو کاپی لینے کے بعد چھاپنے اور نشر کرنے کے مسئول کے حوالے کر دی جاتی، (فوٹو کاپی اس لیے لی جاتی ہے کہ اگر کوئی چیز گم ہو جائے، تو دوبارہ اسے فراہم کرنے کے لیے دردسری نہ ہو۔ علاوہ ازیں فوٹو کاپی کے تمام مجلدات ایک خطی مجلد کے طور پر خوبصورت قسم کی جلد کر کے مدرسہ امیرالمومنین کے کتاب خانہ میں خاص طور پر تفسیر کی اصلی سند کے عنوان سے محفوظ کر لی جاتی ہے)۔

مسئول چاپ و نشر بھی اُسے دقت و باریک بینی کے ساتھ پڑھتا ہے تاکہ اگر کوئی سوال یا ابہام اس نسخہ میں اس کی نظر میں آئے تو حضرتِ اُستاد کے سامنے پیش کر دے۔

۹۔ آخری تصیح : حروف چینی اور مقدماتی چھاپ کے بعد ایک نسخہ تصیح اور مدارک کے ساتھ مقابلہ کے لیے جلسہ تفسیر میں بھیجا جاتا ہے اور نئے سرے سے کنٹرول کے لیے جلسہ کے شرکا میں تقسیم ہو جاتا ہے، تاکہ ہر ایک اپنے حصّہ کو اچھی طرح سے دیکھ لے اور اگر مطلب یا کوئی مدرک غلط ہو تو اس کی اصلاح کریں اور اگر کسی بات میں ان کو شک ہو تو اس پر نشان لگا دیں اور فہرست کو بھی تیار کر کے سب کچھ اُستاد کے حوالے کر دیں۔

۱۰۔ مکرر غور و مطالعہ : اُستاد ایک مرتبہ پھر غلطیوں کی اصلاح کے بعد اسے اور فہرست کو کنٹرول کرتے اور اگر بعض مطالب میں کچھ ابہام ہوتا تو اصلاح کرتے اور ضروری اصلاح کے بعد چھاپنے کی اجازت دے دیتے اور مسئول چاپ اسے چھاپ کر ملک کے نشر و اشاعت کے مراکز میں بھیج دیتے۔

اس کے باوجود چونکہ یہ ایک وسیع کام ہے اور انسان بہرحال جائز الخطا ہے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ چھپائی میں غلطیاں ہو گئی ہوں یا اتفاقیہ بعض آیات یا مطالب میں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو عام طور پر فاضل قارئین اس کی طرف توجہ دلا دیتے اور دفتر کو لکھتے، ایسے تمام خطوط اور اصلاحی نظریات ایک فائل میں جمع کیے جاتے تاکہ دوسری مرتبہ چھپائی کے موقع پر اس پر توجہ دی جائے اور اگر خطوں میں کوئی ایسا اعتراض ہو جو وارد نہ ہوتا ہو تو خط کے جواب میں غلط فہمی کو رفع کر دیا جاتا ہے۔

اور اسی وجہ سے یہاں پھر ایک مرتبہ تمام قارئین محترم اور صاحبانِ نظر سے یہ تقاضا کیا جاتا ہے کہ اگر مطالعہ کے بعد کسی حصہ میں کوئی غلطی نظر آئے تو مضائقہ نہ کریں اور ہمیں لکھیں اور مطمئن رہیں اگر وہ اعتراض صحیح ہوا تو نہ صرف بلا تعصب اس کی اصلاح کر دی جائیگی بلکہ اس عظیم کام کی تکمیل میں ہمکاری کرنے کی بنا پر ہم ممنون و متشکر بھی ہوں گے۔

هیئت همکاران تفسیر نمونه

کلام حق تفسیر نمونہ کے ذریعے جلوے دکھاتا ہے

شہرستان فسا کے برادر آقای " احمد شریعتی " کے اشعار بدیع ۔
ان کے اشعار کی تعداد اس سے بہت زیادہ تھی چونکہ وہ بہت زیادہ تعریف اور اظہار محبت پر مشتمل تھے لہذا انہیں مصلحتاً مختصر کرکے نقل کیا جاتا ہے' ان کے شکریہ کے ساتھ ۔

آن زمان کز ترکش جہل و ضلال و بُت پرستی
نسلِ آدم را بدل بنشستہ ، صد تیر نمونہ
سر نگوں در چاہ عصیاں و اسیر جاہلیت
در تلاش حضر گور خود بہ تحفیر نمونہ
ماندہ تنہا از کتاب انبیا برگی محرف
صدق و عدل و مردمی پامال تزویر نمونہ
راستی در کاستی ، کذب و رذائل در فزونی
قلب ہا را دست شیطان کردہ تسخیر نمونہ
باسر انگشت جہالت ، پارہ منشور عدالت
رُوحِ انسانیت از ہر در بہ تحقیر نمونہ
بر نجاتِ آدمی از تنگنای این مصیبت
عاملی بایست پر قدرت بہ تاثیر نمونہ
خوش بیاباں آمد از الطافِ حق دوران فترت
فطرتِ انسان شگو فاشد بہ تغییر نمونہ
فجر صادق بردمید و شد ہمہ آفاق روشن
صفحۂ گیتی منور شد بہ تنویر نمونہ
آدمی را خود بکف منشور آزادی کہ آمد
خوش ۔ او نازل ہمی فرمان تحریر نمونہ

تا کلام الله اعظم بر رسول الله اکرم — از مقام وحی نازل شد به تقریر نمونه

نغمهٔ جان بخش جاء الحق رسید از حق بجان — مژده ها بخشید عالم را به تبشیر نمونه

نور و قرآن و کتاب آورد و برهان بر خلائق — آدمی را مکرمت بخشید و توقیر نمونه

ده که الباد حیات آدمی در برگرفته — بطن در بطن کلام حق به تدبیر نمونه

چون کتاب امر و تدوین از کتاب خلق تکوین — هست یک فهرست نام آور به تعبیر نمونه

خود بقرآن مبین مطرح بود با استقامت — حرف حرف عالم خلقت به تجهیز نمونه

با دو علم از چهرهٔ تکوین و تدوین پرده گیر — آدمی دانای کار آمد به تشمیر نمونه

*

علم در موضوع تکوین خارج از گفتار حاضر — باید از تدوین سخن گفتن به تیسیر نمونه

علم تفسیر است کز چهر عروس علوی ما — پرده برگیرد پیاپی خود به تحریر نمونه

وز همان روز نخستین نزول وحی آمد — واجب و لازم بر آن تفسیر و تبصیر نمونه

هر کسی چند که در تاب و توان ذاتی او — بوده و باشد، قلم در کف به تسطیر نمونه

باوجود این تنوع در تفاسیری که دائم — با زبان مختلف در حال تکثیر نمونه

مقتضای عصر حاضر در مقام ارزیابی — بود تفسیری ثمین با عرض تسعیر نمونه

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ادارہ امامیہ قرأت کالج

سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے قرآن پاک (تفسیر نمونہ جلد ۱۵) کے اس نسخہ کو حرف بحرف بغور پڑھا۔ میں تصدیق کرتا ہوں کہ متن میں کوئی اعرابی یا لفظی غلطی نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حافظ محمد طفیل (سلطان الافاضل)
مدرس / مینجر
امامیہ قرأت کالج
اندرون موچی دروازہ۔ لاہور

تا کلام الله اعظم بر رسول الله اکرم — از مقام وحی نازل شد به تقریر نمونه

نغمهٔ جان بخش جاء الحق رسید از حق سبحان — مژده‌ها بخشید عالم را به تبشیر نمونه

نور و قرآن و کتاب آورد و برهان بر خلائق — آدمی را مکرمت بخشید و توقیر نمونه

وه که ابعاد حیات آدمی در برگرفته — بطن در بطن کلام حق به تدبیر نمونه

چون کتاب امر و تدوین از کتاب خلق تکوین — هست یک فهرست نام آور به تعبیر نمونه

خود بقرآن مبین مطرح بود با استقامت — حرف حرف عالم خلقت به تجهیز نمونه

با دو علم از چهرهٔ تکوین و تدوین پرده گیر — آدمی دانای کار آید به تشمیر نمونه

علم در موضوع تکوین خارج از گفتار حاضر — باید از تدوین سخن گفتن به تیسیر نمونه

علم تفسیر است کز چهر عروس علوی ما — پرده برگیرد پیاپی خود به تحریر نمونه

وز همان روز نخستین نزول وحی آمد — واجب و لازم بر آن تفسیر و تبصیر نمونه

هر کسی چند که در تاب و توان ذاتی او — بوده و باشد، قلم در کف به تسطیر نمونه

باوجود این تنوع در تفاسیری که دائم — با زبان مختلف در حال تکثیر نمونه

مقتضای عصر حاضر در مقام ارزیابی — بود تفسیری ثمین با عرض تسعیر نمونه

تا نمونه آید از هر بعد و باب و درک دیدی
درّ همه گلها گلی باشد به تعطیرِ نمونه

در هزار و سیصد و پنجاه و دو تفسیر قرآن
با چنین وضع و شرایط دید تصبیرِ نمونه

این مهم را خوش تکفل کرده باعزمی توانا
جمعی از فرزانگان عصر و تحریر نمونه

جمله از قرآن شناسان جامع فضل و مکارم
"ناصر دین" با چنین جمع به تنصیرِ نمونه

پانزده سال از شروع کار بگذشت و برآمد
ماه "تفسیر نمونه" با چه تحریر نمونه

راستی کاین گل ز هر باغی نمونه زانکه داد
خوبی خوبان همه در حد تحصیرِ نمونه

هست انموذج ز هر تفسیر و خود بالنفس قائم
آفرین بر این "اثر" وین طرز تأثیرِ نمونه

با زبان روز و علم روز و بحث روز دارد
مردم امروز را تبشیر و تنذیر نمونه

با بیابان روشن و امثال روشن فکر روشن
رهروان را راه آسان شد به تیسیرِ نمونه

در نکات مجلش بنهفته صد باب مفصل
کز نمودار زمان بنموده تصویر نمونه

از دل ناپاک مغرض، هر تعارض هر نشانه
برگرفته سخت و محکم، کرده تطهیر نمونه

نیک باین و دیگرها خود بر این تفسیر شاید
نام (تفسیر نمونه) وه چه تعبیر نمونه

بشنو از (بیدار) سال ختم این تفسیر اعظم
"جلوه ها دارد کلام حق به تفسیر نمونه"[1]

---

[1] قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آخری مصرع تکمیل تفسیر کا مادہ تاریخ ہے جو (سال ۱۳۶۶) کو لطیف و زیبا تعبیر میں بیان کرتا ہے۔

خدا کے نام سے

بخواں آیات بس زیبای قرآن
کلام نغمہ و روح افزای قرآن

سحرگاہاں تلاوت کن باخلاص
سپس اندیشہ در معنای قرآن

بخواں این معجزہ و آنگہ بیندیش
ہمیں بس شاہد گویای قرآن

شفای آنچہ درد است و مصائب
بجوی از مکتب والای قرآن

ہدایت آفرین است و سعادت
اطاعت گرکنی فتوای قرآن

نہی بر اہل عصیان و منافق
زباں آرد شگفتی ہائی قرآن

بلی، آثار ذات کبریائی
نمودار است در ہرجای قرآن

نگنجد فہم اسرارش بہ افکار
کہ بی پایاں بود دریای قرآن

بخواں تا میتوانی علم تفسیر
ولی کوشش نما اجرای قرآن

خدایا رحمتی فرما بہ ذوقی
شود جو بندہ و دانای قرآن

تہران عبد الغفور ذوقی طالقانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادارہ امامیہ قرأت کالج

سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے قرآن پاک (تفسیر نمونہ جلد ۱۵) کے اس نسخہ کو حرف بحرف بغور پڑھا۔ میں تصدیق کرتا ہوں کہ متن میں کوئی اعرابی یا لفظی غلطی نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حافظ محمد طفیل (سلطان الافاضل)
مدرس / مینجر
امامیہ قرأت کالج
اندرون موچی دروازہ ۔ لاہور

اشاریہ

تفسیر نمونہ ـــــــ جلد ۱۵

ترتیب و تزئین ـ ـ ـ ـ ـ ـ سیّد شکیل حسین موسوی

ـ ـ ـ ـ ـ ـ سیّد محمد حسین زیدی الباھروی

مضامین:

اُصول و عقائد

اسمائے باری تعالیٰ

توحید

عدل

نبوّت

قیامت

فرشتے

جنّت

جہنم

معجزہ

احکام

نماز

زکوٰۃ

جہاد

انفاقِ اموال

اخلاقیات

اخلاقِ حسنہ

اخلاقِ رذیلہ

اقوامِ سابقہ

ثمود

عاد

قومِ فرعون

شخصیات

حضرت آسیہ

ابراہیمؒ بن ادہم

حضرت ابراہیم علیہ السلام

حضرت امام جعفر صادقؑ (امام ششم)

حارث بن قیس

حسانؓ بن ثابت (شاعر)

حضرت امام حسنؑ (امام دوم)

حضرت امام حسینؑ (امام سوم)

حضرت خدیجۃ الکبریٰ (ام المومنین)

عبداللہ بن صوریا

عبداللہ ابنِ عباسؓ

عبداللہ ابنِ عبدالمطلبؑ

عبداللہ ابنِ عمرؓ

عبداللہ ابنِ مسعودؓ

عبداللہ ابنِ مکتوم

عتبہ ابنِ ربیعہ

عثمانؓ بن صہیب

حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ (امام اوّل)

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام (امام پنجم)

ولید بن مغیرہ

حضرت ہود علیہ السلام

حضرت یوسف علیہ السلام

علماء و دانشور

کتبِ آسمانی

تورات

قرآنِ حکیم

سورۂ تکویر

سورۂ انفطار

سُورۂ طارق

مضامین :

ثوابِ تلاوت :

سُورۂ اعلیٰ

مضامین :

ثوابِ تلاوت :

سُورۂ غاشیہ

مضامین :

ثوابِ تلاوت :

سُورۂ فجر

مضامین :

ثوابِ تلاوت :

سورۂ بلد

مضامین:

ثوابِ تلاوت:

سورۂ شمس

مضامین:

ثوابِ تلاوت:

سورۂ اللّیل

مضامین:

ثوابِ تلاوت:

شانِ نزول:

سورۂ والضحیٰ

مضامین:

ثوابِ تلاوت:

شانِ نزول:

سورۂ الم نشرح

سورۂ التّین

سورۂ علق

سورۂ قدر

سورۂ بیّنہ

سورۂ زلزال

مضامین :

ثوابِ تلاوت :

سورۂ والعادیات

مضامین :

ثوابِ تلاوت :

شانِ نزول :

سورۂ قارعہ

مضامین :

ثوابِ تلاوت :

سورۂ تکاثر

مضامین :

ثوابِ تلاوت :

شانِ نزول :

سورۂ ماعون

سورۂ کوثر

سورۂ کافرون

سورۂ نصر

سورۂ تبّت

لُغاتِ قرآن

(ا)

متفرق موضوعات

آنکھ، زبان اور ہدایت کی نعمت

آنکھ کی حیرت انگیزیاں

ابرار و متقین کون ہیں

تھک کر داخلِ جہنم ہوں گے، پینے کو کھولتا ہوا پانی اور کھانے کو بدبودار ضریع کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ ۲۰۶ تا ۲۰۹

بہترین و بدترین مخلوق

جو اس جدید دن سے کافر ہو گئے وہ دوزخی ہیں، اور جو ایمان لائے ان کی جزا بہشت ہے۔ اللہ ان سے خوش اور وہ اللہ سے خوش ہیں۔ ۳۹۹ تا ۴۰۱

بہشت کے رُوح پرور مناظر

چہرے شاداب اور اپنی سعی پر خوش ہوں گے، بلند تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے، چشمے جاری ہوں گے۔ قریب لبریز پیالے رکھے ہوں گے۔ وہاں لغو بیہودہ بات نہ ہو گی۔ ۲۱۰ تا ۲۱۴

بے بصیرت رشتہ داری

جس رشتہ داری میں ایمان و عقیدہ کا رشتہ نہ ہو، اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ ۵۵۲

بیدار مجاہدین کی قسم!

دوڑتے گھوڑوں کی قسم جو اپنے سُموں سے چنگاریاں نکالتے اور صبح سے قبل دشمن کی صفوں میں در آتے ہیں، انسان ناشکرا مال سے محبت رکھتا ہے۔

وہ نہیں جانتا قبروں سے مُردے زندہ ہوں گے، سینہ کے راز ظاہر ہو جائیں گے۔ اُن کا رب واقف کار ہے۔ ۴۲۲ تا ۴۳۰

تشدد کرنیوالے عذابِ الٰہی کے سامنے

مومن مردوں اور عورتوں پر ظلم کرنے والے دوزخ میں جلیں گے۔ مومنین و صالحین کے لیے جنتِ نعیم ہے۔ رب کی گرفت سخت ہے۔ پیدا کرتا ہے، پلٹاتا ہے، بخشنے والا اور مومنین پر مہربان ہے، صاحبِ عرشِ مجید ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ ۱۵۸ تا ۱۶۲

تقویٰ اور امدادِ الٰہی

رات کی قسم جب وہ ڈھانپ لے، دن کی قسم جب وہ روشن ہو، قسم ہے اس کی جس نے مذکر و مونث پیدا کیے۔ جو راہِ خدا میں انفاق کرے اس کی جزا حسنیٰ اور جو جھٹلائے اس کے لیے عذاب ہے۔ ۳۰۰ تا ۳۰۲

تکاثر و تفاخر کی مصیبت

مال و اولاد کی کثرت کے تفاخر نے تمہیں مشغول کر لیا یہاں تک کہ گور کنارے پہنچ گئے، تمہیں عنقریب پتہ چل جائے گا۔ اگر آخرت پر یقین

مقامات

شام

فارس

کوفہ

مدینہ

مرالظہران

مکہ

نجران

نجف

وادی القریٰ

یمن

یونان

کتب مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

1۔ تفسیر نمبر (15 جلدیں) فی جلد -/400 روپے
2۔ تفسیر نمونہ (10 جلدیں) -/4500 روپے مکمل سیٹ
3۔ تفسیر پیام قرآن (1 تا 7 جلدیں) -/2100 روپے مکمل سیٹ
4۔ تفسیر موضوعی (12 جلدیں) -/3500 روپے مکمل سیٹ
5۔ تفسیر فصل الخطاب (تین جلدیں) 20 x 30/8 -/1500 روپے مکمل سیٹ
6۔ تفسیر فصل الخطاب (تین جلدیں) 20 x 30/8 گفٹ پیک -/1800 روپے مکمل سیٹ
7۔ تفسیر فصل الخطاب (تین جلدیں پانچ رنگ میں) 23 x 36/16 -/1000 روپے مکمل سیٹ
8۔ تفسیر فصل الخطاب (تین جلدیں پانچ رنگ میں) 23 x 36/16 گفٹ پیک -/1200 روپے مکمل سیٹ
9۔ میزان الحکمت (1 تا 8 جلدیں) 20 x 30/8 -/4000 روپے مکمل سیٹ
10۔ میزان الحکمت (1 تا 8 جلدیں) 23 x 36/16 -/2500 روپے مکمل سیٹ
11۔ اسوۃ الرسولؐ (تین جلدیں دوکلر) -/1500 روپے مکمل سیٹ
12۔ اسوۃ الرسولؐ (تین جلدیں دوکلر) گفٹ پیک -/1800 روپے مکمل سیٹ
13۔ ۱۔ احسن المقال (دو جلدیں) ۲۔ انتخاب تاریخ طبری۔ ۳۔ تذکرۃ الاطہار۔ ۴۔ ہمارے آئمہؑ (پانچ جلدیں مکمل سیٹ پانچ رنگ میں) -/2000 روپے مکمل سیٹ
14۔ سیرت امیر المومنین، نہج البلاغہ، صحیفہ کاملہ (ترجمہ مفتی جعفر حسینؒ) مکمل سیٹ (پانچ رنگ میں)
15۔ قرآن پاک ترجمہ شیخ محسن علی نجفی 20 x 30/8 (تین مختلف اقسام میں)
16۔ قرآن پاک ترجمہ مولانا سید فرمان علیؒ 23 x 36/8 (تین مختلف اقسام میں)
17۔ سپارہ سیٹ ترجمہ مولانا سید فرمان علیؒ
18۔ آخری نجات دہندہ (تین جلدیں پانچ کلر میں) -/1000 روپے مکمل سیٹ

زیرِ طبع کتب مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

1۔ تفسیر نمونہ (15 جلدیں) نئی کمپوزنگ
2۔ تفسیر نور (10 جلدیں)
3۔ تفسیر فیضان الرحمان (10 جلدیں)
4۔ تفسیر عمدۃ البیان (تین جلدیں)
5۔ میزان الحکمت (14 جلدیں) نیا ایڈیشن
6۔ تفسیر آیت الکرسی
7۔ معاد (تین جلدیں)
8۔ کودک (بچپن میں اولاد کی تربیت کیسے ہو؟) (2 جلدیں)
9۔ نوجوان (جوانوں کی تربیت کیسے ہو؟) (2 جلدیں)
10۔ صحیفہ مہدیؑ (2 جلدیں)
11۔ تاریخ اسلام
12۔ علم الاخلاق (3 جلدیں)
13۔ مفاتیح الجنان (ترجمہ سید رضی جعفر نقوی)
14۔ مفاتیح الجنان (ترجمہ سید شہنشاہ حسین نقوی)
15۔ سیرت امیر المومنینؑ (8 جلدیں)
16۔ معان علم (3 جلدیں)
17۔ معراجِ خطابت
18۔ اقوال امیر المومنینؑ
19۔ قصص القرآن
20۔ 110 سوال و جواب
21۔ دعا اور توبہ
22۔ غرر الحکم (دو جلدیں)